بیاد

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

نور اللہ مرقدہٗ

نذرانہ عقیدت

برصغیر پاک و ہند کے مشاہیر اہل قلم کے مقالات جس میں میر کارواں
حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ کے حالات، امتیازات، افکار و نظریات
دعوتی، علمی، تصنیفی اور اصلاحی و تجدیدی خدمات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

مرتبہ
فضل ربی ندوی

مجلس نشریات اسلام
۱۔ کے ۳۔ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱۔ کراچی ۷۴۶۰۰

نام کتاب	ـــــــــ بیادِ مفکرِ اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نذرانۂ عقیدت
مرتب	ـــــــــ فضل ربی ندوی
طباعت	ـــــــــ القادر پرنٹنگ پریس کراچی
ضخامت	ـــــــــ ۲۶۸ صفحات
ٹیلیفون	ـــــــــ ۶۲۱۸۱۷

اسٹاکسٹ : مکتبہ ندوۃ قاسم سینٹر اردو بازار۔ کراچی

ناشر

فضل ربی ندوی

مجلسِ نشریاتِ اسلام

۱۔کے ۳۰ ناظم آباد مینشن، ناظم آباد ۱ کراچی ۷۴۶۰۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۱۔	عرض مرتب۔ ——— فضل ربی ندوی، ناظم مجلس نشریات اسلام کراچی	۱
۲۔	مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ جامع صفات اور مجددانہ شان۔ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء	۱
۳۔	حضرت مولانا علی میاں ندویؒ بحیثیت مفسر قرآن ——— مولانا عبداللہ عباس ندوی ———	۶
۴۔	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور تصوف وسلوک۔ مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء	۱۱
۵۔	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ بحیثیت ایک اردو ادیب۔ پروفیسر وصی احمد صدیقی معتمد مال دارالعلوم ندوۃ العلماء	۱۹
۶۔	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ بحیثیت ادیب اور ناقد۔ سلمان علی خان لکھنوی سابق انفارمیشن آفیسر گورنر اتر پردیش	۲۶
۷۔	عالم ربانی کی یاد میں ——— (نظم) ——— کامل چائلی ———	۳۵
۸۔	ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت مولاناؒ کی محبت و وارفتگی۔ پروفیسر محمد اجتباء ندوی سابق صدر شعبہ عربی الہ آباد یونیورسٹی	۳۶
۹۔	ہند کا وہ رہنمائے مہرباں ——— (نظم) ——— جگن ناتھ آزاد ———	۴۰
۱۰۔	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اور عصری مسائل۔ مولانا سید محمد واضح رشید ندوی صدر شعبہ عربی دارالعلوم ندوۃ العلماء	۴۱
۱۱	زہے وہ سرزمیں وہ شاہ علم اللہؒ کا تکیہ۔ ——— (نظم) ——— صوفی عبدالرب صاحب ———	۴۷

نمبر شمار	مضامین		صفحہ نمبر
۱۲۔	مفکر اسلام حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ایک جامع اور متوازن شخصیت۔	سید جعفر مسعود حسنی ندوی مدیر تحریر "بانگ درا" لکھنؤ	۴۸
۱۳۔	حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ کی شخصیت تعلیم و مطالعہ اور تصنیفات کے آئینے میں۔	مولانا نذر الحفیظ ندوی ازہری استاذ ادب دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ	۵۳
۱۴۔	تاریخ وفات	(نظم) قمر سنبھلی	۶۲
۱۵۔	نازش قوم و وطن	(نظم) محمد امین بھیلونی	۶۲
۱۶۔	تبرکات ماجدی۔ مفسر قرآن حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ کے بارے میں ارشاد گرامی		۶۳
۱۷۔	حضرت مولاناؒ کا ندوۃ العلماء سے تعلق	مولانا عبداللہ عباس ندوی	۶۴
۱۸۔	بے مایہ ملّت کی ایک مایۂ گرانمایہ سے محرومی	مولانا محمد سالم قاسمی مہتمم دار العلوم (وقف) دیوبند	۷۳
۱۹۔	مفکر اسلامؒ اپنی شخصیت کے آئینے میں	مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء	۷۸
۲۰۔	سرمایۂ ملت کے پاسباں	مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ کراچی	۸۳
۲۱۔	ربّانی امت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ	علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی	۸۶
۲۲۔	عرفان و علم کا مہِ کامل نہیں رہا	(نظم) پروفیسر سید طفیل احمد مدنی	۹۴
۲۳۔	توصیف کیا بیاں کریں ان کے کمال کی	مولانا مفتی محمد تقی عثمانی نائب صدر دار العلوم کراچی	۹۵
۲۴۔	"کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے"	مولانا ضیاء الدین اصلاحی مدیر "معارف" اعظم گڈھ	۹۸
۲۵۔	صدی کی شخصیت	مولانا وحید الدین خاں	۱۰۴
۲۶۔	وہ ایک لفظ منور مفکر اسلام	(نظم) تسنیم فاروقی لکھنوی	۱۰۵
۲۷۔	ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے	پروفیسر ضیاء الحسن ندوی	۱۰۶

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۲۸۔	سراپا عزیمت و دعوت ——— خواجہ حسن ثانی نظامی نئی دہلی	۱۰۹
۲۹۔	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ عرب علماء و دانشوروں کی نظر میں محمد شاہد ندوی بارہ بنکوی	۱۱۰
۳۰۔	مولانا علی میاں ندویؒ علالت سے وفات تک ——— حسین امین	۱۱۶
۳۱۔	وہ جن کا رتبہ عالی رہا اعلیٰ قیادت میں ——— (نظم) ——— مجیب بستوی	۱۲۰
۳۲۔	مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے (حضرت مولاناؒ کی وفات پر سمینار و رسائل کے خصوصی نمبر) محمد شاہد ندوی بارہ بنکوی	۱۲۱
۳۳۔	عالم تھے باعمل تھے محب وطن بھی تھے ——— (نظم) ——— قمر الحفیظ قمر	۱۳۰
۳۴۔	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی معروف تصنیفات	
	اور ان کا پیغام ——— (ایک تجزیہ) ——— پروفیسر وصی احمد صدیقی	۱۳۱
۳۵۔	بیاد مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ——— (نظم) ——— رؤف دانش فیض آبادی	۱۳۵
۳۶۔	مرد مومن کا آخری سفر ——— ترتیب۔ مولانا نذر الحفیظ ندوی	۱۳۶
۳۷۔	علی ٹھنڈک ہو آنکھوں کی، علی راحت ہو سینوں کی ——— (نظم) محترمہ خیر النساء بہتر (والدۂ محترمہ علی میاںؒ)	۱۴۱
۳۸۔	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ماہ و سال کے آئینے میں۔ جعفر مسعود حسنی ندوی	۱۴۲
۳۹۔	امام العرب والعجم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی شخصیت	
	کے عناصر ترکیبی اور ان کا تعارف خود ان کے آئینے میں۔ ——— مولانا سید سلمان حسینی ندوی	۱۴۸
۴۰۔	حضرت مولاناؒ کی شخصیت سازی میں والدہ کے خطوط کا حصہ ——— مولانا سید محمد واضح رشید ندوی	۱۷۲
۴۱۔	رمضان کی مبارک ساعتیں زندگی کے آخری ایام ——— محمود حسن حسنی ندوی	۱۷۵
۴۲۔	مولانا علی میاںؒ اور مفردات قرآنی کی لغوی تحقیق ——— ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۱۷۸
۴۳۔	مولانا علی میاںؒ اور علم حدیث ——— مولانا ابوسحیان روح القدس ندوی	۱۸۴
۴۴۔	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ بحیثیت سیرت نگار ——— مولانا محمد وسیم صدیقی ندوی	۱۹۲

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۴۵۔	مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور اسلامی ادب میں ان کا بلند مقام	مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی ۱۹۹
۴۶۔	داعی انسانیت	مولانا عبدالکریم پاریکھ ۲۰۲
۴۷۔	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور دعوت وخطبات	مولانا سید شرافت علی ندوی ۲۰۳
۴۸۔	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور تبلیغی جماعت	مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی ندوی ۲۰۹
۴۹۔	دو تاریخی خط	شاہ فیصل بن عبدالعزیز۔ جنرل محمد ضیاء الحق ۲۱۷
۵۰۔	مولانا سید ابوالحسن ندویؒ ایک عہد ساز شخصیت	پروفیسر ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی کراچی ۲۱۸ سابق ڈائریکٹر عربک چیئر۔ کراچی یونیورسٹی
۵۱۔	میرے علی بھائیؒ	پروفیسر عطیہ خلیل عرب چیئر پرسن شعبہ عربی جامعہ کراچی ۲۳۱
۵۲۔	دنیائے اسلام کے محبوب ومحترم مولانا علی میاںؒ	پروفیسر خورشید احمد مدیر "ترجمان القرآن" لاہور ۲۳۴
۵۳۔	مدینے والا	پروفیسر ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی کراچی ۲۳۹
۵۴۔	پیغام	ہارون الرشید (کالم نگار روزنامہ جنگ) ۲۴۲
۵۵۔	وہ دلوں کی انجمن کے ہوں امیر انجمن (نظم)	مولانا محمد ثانی حسنیؒ ۲۴۴
۵۶۔	ایک عظیم علمی روایت کا خاتمہ	خورشید ندیم (کالم نگار روزنامہ جنگ) ۲۴۵
۵۷۔	موت العالِم موت العالَم	مولانا سمیع الحق مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ۲۴۸
۵۸۔	طاب حیًا وطاب میتًا (زندگی بھی خوشگوار موت بھی شاندار)	مولانا عبداللہ عباس ندوی ۲۵۲
۵۹۔	مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے چار خطوں کا عکس (بنام فضل ربی ندوی)	۲۵۴

عرضِ مرتب

از: فضلِ ربّی ندوی
ناظمِ مجلس نشریاتِ اسلام، کراچی

دنیائے اسلام کے عظیم رہنما، میر کارواں، مفکرِ اسلام، داعی الی الحق حضرت مرشدی ومربی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نوراللہ مرقدہ، کی شہرہ آفاق کتابیں ان کے ایما اور اجازت سے مجلس نشریات اسلام کے تحت طبع کرتے ہوئے اس عاجز کو تقریباً تیس سال ہوگئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل وکرم ہے۔

قارئین کرام! یہاں میں اپنے ایک مضمون[1] کا اقتباس پیش کررہا ہوں، جس سے اس عاجز کا تعارف، حضرت مخدومی ومرشدی رحمتہ اللہ علیہ سے تعلق اور مجلس نشریات اسلام کے قیام کی تفصیل آپ کے سامنے آجائے گی۔

"ہمارا تعلق پنجابی سوداگراں دہلی سے ہے۔ ہماری برادری کاروباری ہونے کے ساتھ خاصا مذہبی رجحان رکھتی ہے۔ یہ 1957ء کی بات ہے کہ میں کلکتہ میں ایک انگلش اسکول میں زیر تعلیم تھا۔ اس وقت میری عمر کوئی پندرہ سال ہوگی۔ والد محترم حاجی محمد عارفین رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت مولانا علی میاں ندوی قدس سرہ اور ندوۃ العلماء سے تعلق کی وجہ سے مجھے اسکول سے نکال کر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو میں داخل کردیا۔ یہ اللہ کا عظیم احسان اور میری بڑی سعادت اور خوش قسمتی کی بات تھی۔ اس طرح میں ندوہ کے قیام کے دوران حضرت مرشدی رحمتہ اللہ علیہ کی زیر نگرانی وسرپرستی میں 1964ء تک رہا۔

ان سات برسوں میں حضرت مرشدی رحمتہ اللہ علیہ کو قریب سے دیکھا آپ کی مجلسوں میں بیٹھا، تکیہ رائے بریلی میں بھی خدمت میں رہا۔ حضرت رحمتہ اللہ علیہ کی ذات مجموعہ محاسن تھی۔ اخلاص، سچائی، متانت، دل جوئی، پاک دلی، عمل کی قوت، تواضع وخاکساری، عبادت وریاضت، اللہ تعالیٰ نے ان تمام اوصاف سے مزین فرمایا تھا۔ مجھ ناچیز پر حضرت رحمتہ اللہ کی محبتیں اور شفقتیں ناقابل فراموش ہیں۔ اللہ تبارک تعالیٰ میرے حضرت قدس سرہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ہم سب لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔

1972ء کے موسم حج میں حضرت مرشدیؒ کے چہیتے بھتیجے محترم محمد میاں صاحبؒ (مولانا محمد الرابع ندوی مدیر البعث الاسلامی) سے خوب ملاقاتیں رہیں۔ اکثر ہم دونوں مسجد نبوی ﷺ کے سامنے بخاری آئس کریم والے کی دکان پر عالم اسلام اور دنیائے اسلام کی ضرورتوں اور زمانہ کے تقاضوں کی باتیں کرتے۔ اثنائے گفتگو میں یہ مسئلہ آیا کہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام اور ندوۃ العلماء کی کتابیں پاکستان کے اہل علم اور اہل ذوق کو نہیں ملتیں اور ہندوستان سے کتابیں پاکستان بھیجنا نہایت مشکل کام ہے۔ محترم محمد میاں مدظلہ نے اس عاجز کا ایک طرح سے ذہن بنایا کہ یہ اشاعت کتب کا کام تم اہتمام سے اور منظم طریقے پر کرو۔ اس طرح مجلس نشریات اسلام کراچی کی بنیاد میں محترم مولانا محمد میاں رحمتہ اللہ کا خلوص، حضرت مرشدی نوراللہ مرقدہ کی دعائیں، توجہ، فکر اور مدینہ منورہ کی برکات شامل ہیں۔ آج

[1] یہ مضمون کتاب "مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے خطوط بنام فضل ربی ندوی" مطبوعہ مجلس نشریات اسلام کراچی میں شائع ہوا ہے۔

جب میں سوچتا ہوں تو میری سمجھ میں نہیں آتا مجھ نااہل سے اتنا بڑا کام کیسے ہو گیا' جبکہ طباعت کتب کے کام کا پہلے مجھے بالکل تجربہ نہیں تھا نیز اتفاق سے پورے خاندان میں کوئی بھی فرد ایسا نہیں تھا جو اشاعت کتب کا تجربہ رکھتا ہو اور مجھے مشورہ دے سکے۔ یہ اللہ تبارک تعالیٰ کا اس عاجز پر کرم اور فضل اور حضرت مرشدیؒ کی توجہ اور دعائیں تھیں کہ آج مجلس نشریات اسلام پاکستان کا ایک بڑا دینی اشاعتی ادارہ بن گیا ہے اور الحمد للہ اب تک تقریباً 350 ٹائیٹل کتب شائع کر چکا ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ خلوص نیت عطا فرمائے اور اشاعت دینی کتب کی کوشش کو قبول فرمائے اور مزید توفیق اور ہمت عطا فرمائے اور اب تک جو کوتاہی ہوئی ہے اس سے درگزر فرمائے' آگے ہر طرح کی مشکلات اور پریشانیوں سے محفوظ فرمائے صحت وقوت عطا فرمائے' اور میرے بیٹوں کو بھی دین کی سربلندی کیلئے اشاعت کتب کی توفیق اور ہمت عطا فرمائے آمین"۔

مجلس نشریات اسلام کے بارے میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمتہ اللہ علیہ "کاروان زندگی" حصہ دوم صفحہ 266 پر تحریر فرماتے ہیں۔

"پاکستان کے اس سفر میں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مولوی فضل ربی ندوی کی کوشش وتوجہ سے جنہوں نے ہماری تصنیفات کی اشاعت کے لئے پاکستان میں مجلس نشریات اسلام' کے نام سے ناظم آباد کراچی میں مستقل ادارہ مکتبہ ایک ہی دو سال پہلے قائم کیا تھا' میری تصنیفات پاکستان میں خوب پھیل گئی ہیں اور اہل ذوق نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔ اکثر جلسوں میں حاضرین خاص طور پر نوجوان کوئی نہ کوئی کتاب لئے کھڑے ہوتے تھے اور اس پر دستخط کرنے کی فرمائش کرتے تھے اور مجھے فطری طور پر یہ دیکھ کر خوشی اور اطمینان ہوا کہ ان کتابوں کی اشاعت اس ملک میں اتنے وسیع پیمانے پر ہوئی جتنی شاید ہندوستان میں بھی نہیں ہوئی"۔

عالم اسلام کے میر کارواں داعی الی الحق' علامہ وقت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمتہ اللہ علیہ کی وفات کے بعد دنیائے اسلام' ہندوستان اور پاکستان کے اخبارات وجرائد میں حضرت مولانا رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی وکارناموں اور دعوتی علمی سرگرمیوں پر مضامین کے ایک ختم نہ ہونے والے سلسلہ کا آغاز ہوا' جو اب تک جاری ہے۔ پندرہ روزہ "تعمیر حیات" جو دارالعلوم ندوۃ العلماء کا ترجمان ہے اور ماہنامہ "بانگ درا لکھنو" نے حضرت مولانا رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں ضخیم اور وقیع نمبر شائع کئے۔

پاکستان کے اخبارات ورسائل مثلاً الحق اکوڑہ خٹک' البلاغ کراچی' الفاروق کراچی' بینات کراچی' ختم نبوت کراچی' الرشید لاہور' انوار مدینہ لاہور' حق چاریار لاہور' نور علیٰ نور کراچی' ترجمان القرآن لاہور القاسم نوشہرہ' الحماد کراچی' اور دیگر اخبارات ورسائل نے حضرت مولانا رحمتہ اللہ علیہ کی شخصیت پر تفصیلی مضامین چھاپے۔ ان کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے رسالہ "تہذیب" نے بھی حضرت مولانا نوراللہ مرقدہ کے بارے میں خصوصی شمارہ شائع کیا جس کے کچھ مضامین اس مجموعہ میں شامل ہیں۔

عالم اسلام اور دنیا کے اکثر بڑے شہروں میں علمی دینی اور ادبی اداروں' تنظیموں انجمنوں کے زیر اہتمام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمتہ اللہ علیہ کی ہمہ گیر شخصیت پر علمی مذاکرے' سیمینار اور کانفرنسیں ہوئیں۔ پاکستان کے بھی اکثر شہروں میں تعزیتی جلسے اور سیمینار ہوئے' اسلام آباد کی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں بھی ایک سیمینار منعقد ہوا جس میں وقیع مقالے پڑھے گئے۔ اس سیمینار میں سابق صدر پاکستان محترم جناب رفیق تارڑ صاحب نے خصوصی دلچسپی لی اور شرکت فرمائی۔

محترم قارئین! وقت تیزی سے گزرتا جارہا تھا اور میں پریشان تھا کہ مجلس نشریات اسلام کی طرف سے حضرت نوراللہ مرقدہ کے بارے میں کوئی مجموعہ پیش نہ کر سکا ادھر

سننے میں آرہا تھا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حضرت نوراللہ مرقدہ کی سوانح ترتیب دی جارہی ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ اس کی تکمیل میں ابھی وقت لگے گا۔ خیال آیا اور دوستوں نے مشورہ دیا کہ ان خصوصی نمبروں کے عمدہ اور منفرد مقالات کا ایک مجموعہ شائع کیا جائے۔ ہندوستانی رسالے پاکستان میں نہیں ملتے یوں اہم اور قیمتی مقالات پاکستان کے اہل ذوق تک پہنچ سکیں گے۔

اللہ کا نام لے کر خاکسار راقم الحروف نے کام شروع کر دیا اور جناب محمد راشد شیخ سے درخواست کی کہ وہ ان تمام مقالات کا ایک عمدہ انتخاب کر دیں۔ جناب راشد شیخ نے حضرت مولانا علی میاںؒ سے شدید عقیدت اور کام کی اہمیت کے پیش نظر یہ مواد حاصل کیا' یوں یہ مجموعہ مقالات مرتب ہو گیا۔ اس مجموعہ مقالات میں محترم قارئین کو مولانا کی زندگی کے اہم پہلوؤں اور ہمہ گیر دینی کاموں کے بارے میں مستند' واقف اور حضرت رحمتہ اللہ علیہ سے قریبی تعلق رکھنے والوں کے مضامین ملیں گے' حضرت مولانا رحمتہ اللہ مفسر قرآن حکیم تھے۔ حدیث وفقہ پر گہری نظر رکھتے تھے' تصوف کو انہوں نے صحیح طور پر "تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک" کی شکل میں پیش کیا۔

حضرت مولانا رحمتہ اللہ اردو اور عربی کے ایک جلیل القدر اسلامی ادیب بھی تھے ان کے خاکوں' سفرناموں' تاثراتی مضامین' ادبی تنقید' اور سیرت نگاری نے اردو ادب کو گہرائی بھی دی' حسن بھی اور تنوع بھی۔

قارئین کرام مقالات کے انتخاب میں ہم نے ان تمام پہلوؤں کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ لکھنے والوں میں آپ کو مختلف مکاتب فکر کے لوگ نظر آئیں گے۔ ندوہ سے وابستہ افراد' علمائے دین' یونیورسٹیوں کے پروفیسر' ادیب' صحافی' دانشور' صوفی اور خانقاہوں کے سجادہ نشین اور غیر مسلم ارباب فکر بھی۔

قارئین محترم مجھے افسوس ہے اس مجموعہ مقالات کی ضخامت ہم نے کم رکھی ہے۔ تاکہ اس کی اشاعت زیادہ سے زیادہ ہو سکے اس پابندی کے سبب بہت سے مضامین اس مجموعہ میں شامل نہ ہو سکے۔

اس مجموعہ مقالات کی اہم بات یہ ہے کہ تعمیر حیات اور بانگ درا کی انفرادیت ان کے مدیروں کی کوشش اور محنت کو باقی رکھا گیا ہے۔ اور ان کے مضامین الگ الگ شامل کیے گئے ہیں۔ تعمیر حیات کا مفکر اسلام نمبر 350 سے زائد صفحات پر مشتمل تھا' اور بانگ درا کا نمبر 266 صفحات پر' آپ اس مجموعہ مقالات سے ان دونوں نمبروں کی اہمیت اور معیار کا اندازہ کر سکیں گے میں محترم مولانا شمس الحق ندوی صاحب مدیر تعمیر حیات اور محترم امین الدین شجاع الدین صاحب مدیر بانگ درا کا شکر گزار ہوں۔ حقیقتاً زیر نظر مجموعہ مقالات میں ان حضرات کی محنت بھی شامل ہے۔

میں تمام مضمون نگاروں اور شاعروں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی نگارشات اس مجموعہ مقالات میں شامل ہیں۔

محترم جناب ڈاکٹر پروفیسر سید ابوالخیر کشفی صاحب کا میں شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس عاجز پر شفقت فرمائی اور اس مجموعہ مقالات کی تدوین میں اپنے مفید مشوروں سے نوازا' اور محترم جناب محمد راشد شیخ صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اس مجموعہ مقالات کی ترتیب میں میرے ساتھ تعاون کیا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے ان تمام حضرات کو جنہوں نے میرے ساتھ اعانت فرمائی۔

قارئین کرام اس مجموعہ مقالات میں جو خامیاں اور معیار میں کمی ہے وہ میری ہیں مجھے اس کا اعتراف ہے۔ اس عاجز راقم نے تھوڑے وقت میں جو کچھ کیا اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کاوش کو شرف قبولیت عطاء فرمائے اور امت کیلئے نافع بنائے' آمین۔

مسلمانوں کے زوال وادبار کے حقیقی اسباب

اس وقت مسلمانوں میں زوال وادبار کی جو کھلی ہوئی علامتیں اور بے برکتی، نحوست، فضیحت ورسوائی، بدنامی وجگ ہنسائی کے جو قوی اسباب پائے جاتے ہیں، ان میں تعلقات کی کشیدگی، قطع رحمی اور اس سے آگے بڑھ کر ناچاقی، عداوت، ایک دوسرے کی عزت کے درپے ہونا، اس کو خاک میں ملانے کی کوشش کرنا، اور اس کے نتیجہ میں مقدمہ بازی، مال اور وقت کی بربادی اور نہ ختم ہونے والی پریشانیاں ہیں۔ سیکڑوں بلکہ ہزاروں خاندان ہیں جن میں زمین وجائداد کے سلسلہ میں اور کبھی بعض افسوسناک واقعات کے نتیجہ میں سخت درجہ کی ناچاقی وکشیدگی دیکھنے میں آتی ہے۔ خاندان دو حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ ملنا جلنا سلام کلام بھی موقوف ہوجاتا ہے بعض اوقات صرف غمی کے موقعے برسوں بچھڑے ہوئے ملتے ہیں اور بعض اوقات اس کی بھی توفیق نہیں ہوتی، سالہا سال تک اور نسل در نسل اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اور دل ودماغ کی بہترین صلاحیتیں اور توانائیاں دوسروں (اور وہ غیر نہیں خونی اور رشتہ کے بھائیوں) کو نیچا دکھانے اور ان کے گھر کی اینٹ سے اینٹ بجوادینے میں صرف ہوتی ہے۔ کسی بھائی کی سبکی اور ناکامی پر ایسی خوشی منائی جاتی ہے، جیسے کبھی (دورِ اقبال میں) کسی قلعہ کی فتح اور کسی نئی سلطنت کے حصول پر منائی جاتی تھی۔ جو لوگ اس پستی سے کچھ بلند ہیں اور اتنے گئے گذرے نہیں اور ان کو کچھ دینی تعلیم یا نیک صحبت حاصل ہے اور وہ اچھے دین دار بھی نظر آتے ہیں، وہ بھی صلۂ رحمی کے مفہوم سے ناآشنا، اس کے فضائل سے بے خبر، قرآن وحدیث میں اس کا جو درجہ ہے اس سے یکسر غافل اور اس دولت بے بہا اور سنت جلیلہ سے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت محبوب اور عزیز تھی، اور جس کا رنگ سیرت نبویؐ میں بہت نمایاں اور غالب ہے بالکل محروم ہیں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

از:- اصلاح ص ۳

علیدی مقالہ

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

جامع صفات اور مجددانہ شان

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، ناظم ندوۃ العلماء

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ برصغیر کی ایک ممتاز اور غیر معمولی شخصیت کی حیثیت سے زندگی گزار کر گذشتہ سال کے اختتام پر اس دنیا سے رخصت ہوئے، ان کی وفات پر یہ صدی اختتام کے قریب پہونچی، اس صدی کو برصغیر کی تاریخ میں گذشتہ صدیوں پر یہ امتیاز حاصل رہا کہ اس میں یورپ کے جدید ترقی یافتہ تمدن سے برصغیر کو سابقہ پڑا جس نے اس کی تمدنی و اخلاقی قدروں پر خاصا اثر ڈالا، دوسری طرف غیر ملکی اقتدار کی چیرہ دستیوں اور حق تلفیوں کے ردعمل کے طور پر جذبۂ حریت کو فروغ ہوا، جس سے یہاں انقلاب کی راہ ہموار ہوئی، اور اس کے نتیجہ میں پورا برصغیر اپنے پرانے دور سے نکل کر نئے دور میں داخل ہوا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کا نشوونما اور ذہن کی تشکیل ان خاص حالات میں ہوئی اور انھوں نے حالات کو دیکھا اور سمجھا پھر اسلامی نقطۂ نظر سے ان کو دیکھا وہ ایسے حالات کو سمجھنے اور ان میں مثبت و تعمیری رویہ اختیار کرنے کے سلسلہ میں اعلیٰ خاندانی پس منظر رکھتے تھے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ اسلام کے مدوجزر کا اچھا مطالعہ کیا تھا انھوں نے سادہ دل مشرق اور شاطر و ہوشیار مغرب کی کشاکش کو دیکھا اور سمجھا، اور غیر ملکی اقتدار کے دور کے ختم کرنے کی کوششوں کا بھی مشاہدہ کیا، اور ان سے دلچسپی لی، پھر آزادی کا دور شروع ہونے پر انقلاب کے بعد کے مراحل کو بھی دیکھا اور اس کی پیچیدگیوں اور زندگی کی قدروں پر ان کے اثرات دیکھے، پھر ایک عالم دین اور ایک حساس دل رکھنے والے دانشور، اور ایک داعئ حق اور ملت اسلامیہ کے دردمند فرزند کی حیثیت سے وقت کے تقاضوں کو سمجھنے اور اعلیٰ قدروں کی حامل زندگی کو استوار کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے علمی میدان میں داخل ہوئے، اور اپنے فکر و عمل سے ۶۵ سال سے زیادہ مدت تک ایک عظیم مفکر، معلم اور مصلح کی ذمہ داری انجام دی، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی یہ ممتاز و سنجیدہ شخصیت کیسے بنی اس کا جواب خود ان کی شخصیت کی تشکیل میں کارفرما عوامل و اسباب میں ملتا ہے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان کے ممتاز مؤرخ اور علم و ثقافت سے گہری واقفیت رکھنے والے عالم دین اور مصنف تھے، اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے ایک بڑے دینی و علمی ادارے (ندوۃ العلماء) کے سربراہ بھی تھے، ان کا جب انتقال ہوا تو ان کے ان صاحبزادے کی عمر صرف ۹ سال کی تھی، لہٰذا ان کو اپنے ان کم عمر صاحبزادے کی تعلیم و تربیت کا باقاعدہ موقع نہیں ملا، لیکن ان کے چھوڑے ہوئے اثرات سے اور ان کے سمجھ دار و ذمہ دار پسماندگان سے اس کا ازالہ ہوا، ان کے بڑے بیٹے مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ جو دینی تعلیم مکمل کر کے عصری تعلیم کے مراحل بھی پورے کر رہے تھے اور ان کی عالی ہمت اور دیندار اہلیہ یعنی مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ ماجدہ، پھر وہ قیمتی سرمایہ کتب جو اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے جو گھر کے اندر موجود تھا اور جس میں خود ان کی غیر معمولی خصوصیت کی حامل تصنیفات تھیں، ان کے ان نوخیز صاحبزادے کی تربیت کا ایک اچھا ذریعہ بنیں، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والد سے ملے ہوئے ذوق مطالعہ کے اثر سے اپنے گھر کے اندر موجود سرمایہ علمی سے آغاز عمر ہی میں اور خاص طور پر اردو ادب اور اخلاق و سیرت کے دائرہ میں خوب استفادہ کیا، پھر فکری و دعوتی مزاج کی تشکیل کے سلسلہ میں ان کے بڑے بھائی نے پوری توجہ کی، وہ قدیم و جدید دونوں علمی راہوں سے گذرے تھے، وہ دینی و علمی درسگاہ سے فضیلت کر کے جدید علوم کی طرف متوجہ ہوئے تھے اور سائنس میں B.Sc. کی امتیازی کامیابی حاصل کر کے (M.B.B.S.) کے کورس کی تکمیل کی تھی، اور اس کے اور میڈیکل پریکٹس کے ذریعہ سماجی زندگی کے معاملات اور اسلامی تقاضوں سے بخوبی واقف ہوئے تھے۔ وہ اسلامی سربلندی کے داعی اور اسلامی قدروں پر پورا اعتماد رکھتے تھے، چنانچہ اپنے نوخیز بھائی کی بہتر تعلیم نیز اخلاقی و دینی تربیت پر انھوں نے اور والدہ صاحبہ نے پوری توجہ صرف کی، والدہ صاحبہ اپنے لائق شوہر کے جلد انتقال کر جانے کی وجہ سے اپنی اولاد کو سنوارنے اور بنانے پر سارا توجہ مرکوز رکھنا ضروری سمجھتی تھیں، مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنے گھریلو سرمایۂ علم و ادب کے مطالعہ اور اپنی والدہ اور بھائی کی رہنمائی و تربیت سے آگے بڑھے تو ان کو علم و ادب کے دیگر پہلوؤں

میں کمال پیدا کرنے کے لئے وقت کے مشہور اساتذہ ملے، خاص طور پر حدیث شریف تفسیر قرآن اور ادب عربی میں ان کو امتیازی شان پیدا کرنے کے ذرائع حاصل ہوئے، تاریخ کے موضوع میں نمایاں صلاحیت خود اپنے گھر کے سرمایۂ علمی کے ذریعہ اور علمی رجحان اپنے خصوصی ماحول سے حاصل ہو چکا تھا، اس کے ساتھ ساتھ گھر کے دینی ذوق کے اثر سے باطنی اصلاح و تزکیۂ نفس کی طرف میلان ہوا جس کے حصول اور اس میں ترقی کی راہ وقت کے مشہور و مستند بزرگوں کی صحبت و استفادہ کے ذریعہ آسان ہو لی۔

ان تمام اسباب نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو متعدد و متنوع کمالات و خصوصیات کا حامل انسان بنا دیا، وہ ایک طرف ممتاز مفکر و مصلح، دوسری طرف کامیاب معلم و مربی، اور تیسری طرف بااثر صاحب قلم اور صاحب اسلوب ادیب بنے۔

تاریخ کے مطالعہ سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے قوموں اور ملکوں کے عروج و زوال کے اسباب کو سمجھا، ہندوستان کے غلامانہ دور کی پریشانیوں و پسماندگی کا مشاہدہ کرنے کے ساتھ نئی حاصل ہونے والی آزادی کے بعد کی پیچیدگیوں نیز فرقہ وارانہ و طبقاتی کشمکش کے دلسوز مناظر دیکھ کر ملک و قوم کو بربادی سے بچانے کے جذبہ کے حامل بنے۔ علوم دینیہ میں دستگاہ پیدا ہونے سے مسلمانوں کی فلاح و صلاح کی مفید صورتوں سے آگاہ ہوئے اور اس کے لئے قدیم و جدید وسائل کا مفید اور صالح طریقہ کار اخذ کیا۔

تصنیف و ذوق ادبی کے ذریعہ ذہنوں کو بیدار کرنے اور ترقی و کامرانی کی صحیح راہ دکھانے کی صلاحیت سے کام لینے کی کوشش کی، اور اپنی زندگی کو مفید اور تربیتی کاموں میں وقف کر دیا۔

اس سلسلہ میں مولاناؒ نے دو خاص صفتیں کو حرزِ جان بنایا: ایک تو قوم و ملت کی خیر خواہی و خیر طلبی، اور دوسرے زہد و قناعت کے ساتھ حصولِ مقصد کے لئے لگن اور قربانی، اس کے ساتھ ساتھ طبیعت کی نرمی، کریمانہ اخلاق، والہانہ جذبۂ عمل، فہم و فراست اور مقصد کی بلند نگاہی جیسی ممتاز صفات مولاناؒ کی خصوصیات نہیں، اپنی انہی صلاحیتوں سے انھوں نے متعدد اہم ترین مسائل حل کئے اور قوم کے دانشوروں اور رہبروں کو متاثر کیا، اور اپنوں اور غیروں کے دلوں میں اپنی جگہ بنالی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت میں دو نمایاں صفتیں خاص طور پر قابلِ ذکر رہی ہیں، ایک تو ممکنہ حد تک وسعتِ قلبی، دوسری صفت دوسروں کی دل آزاری سے پرہیز، وسعتِ قلبی کا تو یہ حال تھا کہ دین و ملت کی تعمیر میں حصہ لینے والے تمام لوگوں کے لئے اپنے دل میں جگہ رکھتے تھے، اور ان کی خوبیوں کا اعتراف کرتے، ان سے ملتے اور اظہارِ قدر کرتے تھے، بشرطیکہ وہ دین و ملت کی بنیادی قدروں اور مسلمہ اصولوں کے خلاف کام نہ کر رہے ہوں۔ چنانچہ فقہی مسلک کا اختلاف، مکتبِ فکر کا فرق یا طریقۂ کار کا تنوع مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں دوری اور ٹکراؤ کا سبب نہ تھا، بشرطیکہ اس کا کام اصل دین، اور ملت کی تقویت کو نقصان پہونچانے والا نہ ہو، اسی قاعدہ کے بموجب مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور جامعہ سلفیہ بنارس، اسی طرح جمعیت علماء ہند، جماعت اسلامی وغیرہ سب کو ان کی تعمیری اور ملی کوششوں اور دینِ حق کی نصرت کے زاویہ سے دیکھا، اور ان کے لئے اظہار قدر کیا، ان کے ذمہ داروں سے اخوت و ہمدردی کا معاملہ رکھا اور حسبِ ضرورت تعاون کیا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری صفت دوسروں کی دل آزاری سے پرہیز رہی ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی یہ صفت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ کوئی شخص مولاناؒ کی تحقیر و تنقیص کرتا تو بھی مولاناؒ اس کا جواب نہ دیتے، اور اپنے معاونین و محبین کو بھی ہدایت کرتے کہ وہ کوئی انتقامی رویہ اختیار نہ کریں، اور ان سے ایسا آدمی ملتا تو وہ اس سے اس بات کی شکایت بھی نہ کرتے، بلکہ شرافتِ نفس کے ساتھ معاملہ کرتے، اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ مولاناؒ کو تنقیص و تحقیر کے رویہ سے تکلیف نہیں ہوتی تھی، وہ حساس طبیعت تھے، ان کو ایسی بات سے تکلیف ضرور ہوتی تھی، لیکن انھوں نے اپنا وطیرہ برداشت اور رواداری کا رکھا، وہ یہ شعر پڑھتے تھے ؎

آسائشِ دو گیتی تفسیرِ ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف، با دشمناں مدارا

دوسروں کا برا چاہنا یا انتقام لینا مولاناؒ کے یہاں بالکل نہ تھا، وہ دوسروں کی عیب جوئی سے بھی دور رہتے تھے، جن کو برا سمجھتے تھے بلا ضرورت ان کی برائی کا بھی تذکرہ نہیں کرتے تھے، حتیٰ کہ ان کے خدام کو بعض وقت یہ دھوکا ہو جاتا تھا کہ مولانا اپنے فلاں مخالف کے بارے میں بالکل ناواقف ہیں اور اس سے اس ناواقفیت میں دھوکا کھا سکتے ہیں، لیکن کسی نے توجہ دلائی تو اندازہ ہوا کہ مولانا بے خبر نہیں ہیں لیکن ظاہر نہیں کرتے۔ مولاناؒ کے اس رویہ کے فیض میں ان سے متعدد دوری رکھنے والے ان کا محبت ہی کا رویہ دیکھ کر بالآخر ان سے قریب ہوئے۔

مولاناؒ کی ایک اہم خصوصیت دین و ملت کی خدمت و دفاع کا جذبہ تھا، وہ کسی کو بھی دین و ملت کو نقصان پہونچاتے دیکھتے یا دین کے مسلمہ حقائق یا دین کے بنیادی حقوق پر حملہ آور

ہوتا دیکھتے تو اس کا سخت نوٹس لیتے تھے، اور اس میں کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے، اس کی مثالیں ان کے مختلف مضامین اور تصنیفات میں بآسانی دیکھی جاسکتی ہیں، انھوں نے عربوں کے ساتھ عقیدت ومحبت کے باوجود عرب قومیت کی مخالفت بلکہ سخت تردید کی، اور ترک قوم کے کارناموں کی وجہ سے ان کی قدر ومحبت رکھنے کے باوجود موجودہ ترک حکمرانوں کے الحادی رویہ کی سخت مذمت کی، اور اپنی اسی غیرتِ دینی کے تقاضے سے حسب ضرورت اپنی زبان وقلم کو موثر ڈھنگ سے استعمال کیا۔ انھوں نے ہندوستان میں اسلامی ثقافت کو غیر اسلامی ثقافت میں مدغم کرنے کی کوششوں کی کھل کر مخالفت کی، اور اس سلسلہ میں تقریریں کیں اور مضامین لکھے، اور اس ملک میں مسلمانوں کی کثیر آبادی کے بسے ہونے کے ناطے اس بات کی تحریک چلائی کہ تمام مذاہب کو اپنے اپنے طریقہ سے کام کرنے کا موقع ملے، اور اکثریت اپنی اکثریت کی بنیاد پر اقلیت پر اپنے مذہب وتہذیب کو عائد نہ کرے، اور سب شریف پڑوسی کی طرح زندگی گذاریں۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ ملت اسلامیہ کی سماجی تعلیمی اور سیاسی ضرورتوں اور تقاضوں پر ان کی اہمیت کے مطابق نظر رکھتے تھے، اور کام کرنے والوں کے مابین طریقہ کار اور نقطہائے نظر کا جو فرق ہوتا اس کو اختلاف اور کشمکش کا موضوع نہ بنانے ہوئے اپنا ضروری تعاون دیتے تھے، ان کا مسلم پرسنل لا بورڈ، مسلم مجلس مشاورت، دینی تعلیمی کونسل سے تو ذمہ دارانہ بلکہ سرپرستانہ تعلق تھا، لیکن اس کے ساتھ وہ جمعیۃ علماء ہند، مسلم لیگ، ودیگر قومی کام کرنے والی جماعتوں کی مثبت اور لائق ستائش کوششوں کی بھی پوری قدر کرتے تھے، تعلیمی تحریکات میں، دینی تعلیم کی درسگاہوں کے علاوہ جن سے ان کا گہرا ربط تھا، ملت کی عصری درسگاہوں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، جامعہ ملیہ دہلی وغیرہ کی بھی اہمیت وضرورت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کی مشکلات کے حل کے لئے جو ادنی واخلاقی تعاون دے سکتے تھے وہ دیتے تھے، ان کی نظر میں ملت کی بقاء وحفاظت وترقی کی ضروری فکر کرنا مشترک فریضہ تھا، اس کے لئے اپنے جماعتی ونظریاتی اختلافات سے بلند ہوکر کام کرنے کی ضرورت سمجھتے اور اس پر عمل کرتے تھے، اور اس کے لئے ان کے اختیار میں جو تعاون ہوسکتا تھا وہ دیتے تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کی تمام جماعتیں ان پر متفق ہوجایا کرتی تھیں، اور اپنے آپس کے اختلاف وفرق کے باوجود ان کو اپنا مشترک ہمدرد اور مشیر سمجھتی تھیں۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے مختلف النوع ومتعدد الفکر گروہوں کے ساتھ تعاون وتائید کا یہ مطلب نہیں ہوتا تھا کہ ان کی خود کوئی الگ رائے نہیں ہوتی تھی، بلکہ وہ محض ملت کی بقاء اور ترقی کی مصلحت کی خاطر چھوٹی اور انفرادی مصلحتوں کو نظر انداز کرکے بڑی مصلحت کے لئے ہمدردی وتعاون کرتے تھے ورنہ وہ ہر سلسلہ میں اپنی متعین رائے رکھتے تھے، اور غلط اور منحرف رجحانات کے ساتھ کوئی لوچ نہیں رکھتے تھے، بلکہ ان کے خلاف مثبت جدوجہد کرتے تھے، اور یہ بات ان کی تقریروں اور تصنیفات میں پوری طرح عیاں ملتی ہے، پھر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا خدمتِ دین وملت کا دائرہ صرف ہندوستان اور برصغیر تک محدود نہیں تھا، بلکہ پورے عالم اسلامی تک پھیل گیا تھا، وہ مشرق میں ملیشیا وانڈونیشیا تک اور مغرب میں افغانستان وایران ترکی مصر الجزائر اور مراکش تک تھا، بلکہ یورپ وامریکہ میں مقیم مسلمانوں کی سوسائٹیاں تک مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے فکر وعمل کے دائرے میں تھیں، وہ جہاں جس تعاون کا تقاضہ سمجھتے اس کے کرنے کی کوشش کرتے، اور جہاں کمزوری اور انحراف محسوس کرتے وہاں اصلاح وتنقید کی اپنی آواز پہونچاتے، اور صحیح اسلام اور ملت کی صحیح مصلحت کی پاسداری کی طرف توجہ دلانے کا جرأت مندانہ کام انجام دیتے تھے، اس کے لئے عوام میں عمومی خطاب کا، اور حکومت کے ذمہ داروں کے لئے ملاقات وافہام وتفہیم کا طریقہ اختیار کرتے، مولانا نے دینی وملی خدمت کے لئے اپنا جو مزاج بنایا تھا اس میں مخاطب کے لئے اس کے مقام وحیثیت کے لحاظ سے جو اسلوب کلام مناسب ہوتا اور اس کا جو اچھا کام ہوتا اس کے لحاظ اور اس کے اعتراف کے ساتھ بات کرتے، لیکن اس سے کہنے والی بات زوردار طریقہ سے کہہ دیتے، تنقید ہوتی لیکن انداز محبانہ ومشفقانہ ہوتا، چنانچہ ان کی تلخ بات بھی برداشت کرلی جاتی، اس سلسلہ میں ان کو اپنے ملک کے چوٹی کے لیڈروں سے اور غیر ممالک کے سربراہان مملکت سے بات کرنے کے جو مواقع حاصل ہوئے انھوں نے ان مواقع سے فائدہ اٹھایا، اور استغناء کے ساتھ اور یہ محسوس کراتے ہوئے بات کی کہ ان کی کوئی مادی غرض نہیں ہے، اور یہ محض خیر خواہی میں ہے، اس کی تھوڑی بہت تفصیل ان کی خود نوشت سوانح اور ان کے مضامین اور سفرناموں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

مولانا کا یہ عمل غیر معمولی انداز کا ہوتا تھا، میں نے خود کئی ایسے موقعے دیکھے کہ جہاں رواداری اور تنقید کو جمع کرنا خاصا دشوار تھا لیکن مولانا ان سے حکمت اور جرأت کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے۔

مولاناؒ عرب اور مسلم حاکموں اور بادشاہوں سے ملے، ان میں ہر ایک کو نصیحت کی اور ان کے ملک کی خرابیوں کی طرف متوجہ کیا، خاص طور پر وہ سعودی بادشاہوں سے ملے، اردن کے بادشاہ اور مراکش کے بادشاہ اور مختلف حاکموں سے ملے، سب کو اصلاحِ حال اور ملک کی خدمت کی اور اعلاء کلمۃ اللہ کی تلقین کی، ان ملاقاتوں اور بااثر لوگوں سے اپنی ملاقاتوں میں اپنے نجی معاملہ میں پورے استغناء سے کام لیا، کبھی اپنی ذات یا خاندان کے کسی فرد کے لئے سفارش نہیں کی اور نہ ہدیہ قبول کیا، اور اگر کسی طرح ہدیہ یا انعام ملا تو اس کو ملی و دینی مقاصد کے اداروں کو دیدیا، اسی طرح فیصل ایوارڈ کے معاملہ میں کیا اور ملی اداروں کو دیدیا، دبئی سے ملنے والی ایک کروڑ ۱۲ لاکھ کی رقم سیکڑوں مدارس میں تقسیم کردی، برونائی سے ملنے والی رقم بھی دو دن میں تقسیم کردی، ان کا یہ استغناء اس لئے نہیں تھا کہ ان کو رقم کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، ان کو بعض وقت خاصی تنگی پیش آتی تھی تب بھی یہی کرتے تھے، کہتے تھے کہ ہم اگر کسی حاکم سے کچھ لیں گے تو ممنون ہوں گے، پھر جرأت کے ساتھ نصیحت یا تنقید نہ کرسکیں گے، چنانچہ ان کو جرأت سے بات کرنے میں ڈر نہیں لگتا تھا، لیکن حکمتِ دعوت کے تقاضہ سے خوش اخلاقی جتنی ضروری تھی وہ کرتے تھے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنے سماجی و ملی کاموں میں طریقۂ نبوت پر عامل ہونے کی کوشش کرتے تھے کہ مخاطب سے اس کی زبان اور فہم کے مطابق بات کی جائے، اور مخلصانہ و ہمدردانہ انداز میں اور اصل مرض کو سامنے رکھتے ہوئے معالجانہ جذبہ سے بات کی جائے۔

قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے پیغام حق پہونچانے کا جو تذکرہ آیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ میں جو تفصیل ملتی ہے انھوں نے اس کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنایا، نیز تاریخ میں اہل ایمان و عزیمت و مصلحینِ امت کے جو تذکرے ملتے ہیں ان سے اخذ فیض کیا، اور طریقۂ کار کے اس تنوع کو بھی سمجھا جو مختلف زمانوں اور مختلف ماحولوں اور مختلف حالات میں مصلحینِ امت نے اختیار کئے، اس میں مولاناؒ کے سامنے امام احمد بن حنبلؒ کا کلمۂ حق پر جمنا اور سخت آزمائش اور اذیت کے باوجود حق پر قائم رہنا، امام غزالیؒ کا علم میں کمال پیدا کرنے کے ساتھ اصلاحِ باطن اور روحانی ترقی کی فکر کرنا اور اس کی اہمیت کی تلقین کرنا، امام ابن تیمیہؒ کا دین کی بنیادی قدروں کی وضاحت کے ساتھ سماجی خرابیوں اور بدعتی کا اپنی تصنیفات کے ذریعہ مقابلہ کرنا، اور دین کی صحیح فکر کی ترجمانی کرنا، مولانا جلال الدین رومیؒ کا حکیمانہ و مصلحانہ انداز کا ناصحانہ و مربیانہ کلام، حضرت مجدد الف ثانیؒ کا توحید پر زور اور حاکمانِ وقت کی بالواسطہ ناصحانہ انداز میں اصلاحِ حال کی کوشش، خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کی روحانی و مصلحانہ زندگی اور حکیمانہ انداز تربیت و اصلاح، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی سماجی و تہذیبی بگاڑ اور سیاسی بدحالی کے دور میں حکیمانہ طریقہ سے اصلاحِ حال کی کوشش اور تعلیم و تربیت کے نظام کی درستگی، اور رہنمائی کا کام، پھر حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقاء کی اصلاحِ عقیدہ و عمل کے ساتھ ہجرت و جہاد کے عمل کو قائم کرنے کی کوشش شامل ہے۔ وہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے طریقۂ دعوت و عمل سے بہت متاثر تھے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ناصحانہ و مشفقانہ طرزِ دعوت کو دیکھ کر بعض ناقدین نے کمزوری اور جذبۂ جہاد سے دوری کا شبہ کیا ہے حالانکہ یہ مولاناؒ کی حکمت پسندی اور افادیت کے خیال سے ہوتا تھا، وہ جہاد کو اہم فریضہ سمجھتے تھے لیکن شریعت نے اس کے لئے موقع و محل کی رعایت اور حکمت عملی کا جو قاعدہ مقرر کیا ہے اس کا لحاظ ضروری سمجھتے تھے۔

حضرت مولانا نے مذکورۃ الصدر اسلاف سے استفادہ کیا تھا اور موجودہ زندگی کے ان گوشوں میں جو مذکورہ بالا ائمہ امت کے یہاں ملتے ہیں، اپنے طریقۂ کار کے لئے رہنمائی حاصل کی تھی اس سلسلہ میں ان کی مثال شہد کی مکھی کی طرح رہی جو ہر طرح کے پھولوں سے اپنی ضرورت کا رس لیتی اور شہد بناتی ہے، جو دوسروں کے کام آتا ہے۔ اس کے جسم میں ڈنک بھی ہوتا ہے جو کہ وہ اس وقت استعمال کرتی ہے جب اس کو تنگ کیا جائے، اور رکاوٹ ڈالی جائے، لیکن اس بات میں مولاناؒ قدرے مختلف تھے، وہ حتی الوسع انتقام نہیں لیتے تھے اس کے بار بار موقع آئے کہ مولاناؒ کو جواب دینا چاہئے تھا لیکن مولاناؒ نے صبر اور خاموشی کو ترجیح دی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنی فکر بلند، معاملہ فہم اور حق شناسی سے اور اسی کے ساتھ انحراف و گمراہی کے خطرات کو جلد محسوس کرتے ہوئے اپنی علمی صلاحیت اور داعیانہ طریقۂ کار کو مؤثر زبان و قلم کے ذریعہ بروئے کار لاتے، وہ ان کے ذریعہ اصلاحِ حال اور تلقین و تربیت کا کام لیتے تھے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے امتِ اسلامیہ کی مجموعی و بنیادی مصلحت اور امت اسلامیہ کی وحدت و اتفاق کی اہمیت برابر رہتی تھی اس لئے وہ فکر صحیح کی ترویج ہو، انحراف و گمراہی کا مقابلہ ہو، امت کے اتحاد و سربلندی کا معاملہ ہو، دشمنانِ ملت کی گمراہ کن ریشہ دوانی کا مقابلہ ہو امتِ مسلمہ کو اس کے ماضی کے بلند مقام پر واپ

لانے کا معاملہ ہو، مولانا رحمۃ اللہ علیہ ان سب کاموں کے لئے کوشاں رہتے تھے، اور ان میں اپنی عقلی و عملی توانائیاں صرف کرتے تھے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ ملک و بیرون ملک کے متعدد اداروں کے صدر یا ناظم اعلیٰ تھے ان کو عموماً ان کی شخصیت کے وزن کی وجہ سے اور خدمت دین و ملت میں گروہی اختلاف سے ان کے بلند ہونے کی بنا پر یہ اعلیٰ منصب دیئے گئے، ان مختلف اداروں نے ان کے زیر سرکردگی متعدد اہم کامیابیاں حاصل کیں، اور بڑی ترقی کی، اس میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی مخصوص حکمت عملی اور مخلصانہ فکرمندی کا خاصا دخل تھا، اداروں اور اجتماعی وحدتوں کی سربراہی کے فرائض انجام دینے میں مولاناؒ کا رویہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں اور خصوصی معاونین پر عموماً اعتماد و اختیار کا ہوتا تھا، وہ اپنے جس معاون کی کارکردگی کو مقصد کے مطابق اور مخلصانہ محسوس کرتے، اس کو اس کی سمجھ اور معاملہ فہمی کے مطابق کام کرنے کا پورا موقع دیتے، اور اس کام کے کسی جزء میں اس سے کوئی غلطی ہو جاتی تو اس کو برداشت کرتے، اور صرف متوجہ کر دینے پر اکتفا کرتے، لیکن اپنے معاون کے کام کے سلسلہ میں اس بات پر پوری نظر رکھتے تھے، کہ کام صحیح راستے سے ہٹ نہ جائے، اور مقصد کے خلاف نہ ہو، اس سلسلہ میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے خود اپنے خاص تجربہ سے یہ سمجھ لیا تھا، کہ ان کے متعدد و متنوع کاموں میں کس کام میں کون بہتر اور کارگزار اور زیادہ قابل اعتماد معاون ہے، پھر اس کو نہ صرف یہ کہ اس کام کا ذمہ دار بلکہ اس کام میں اپنا ترجمان بنا لیتے تھے، چنانچہ مولاناؒ کے مختلف کاموں اور منصبوں میں مختلف معاونین رہے، جن کو ان کے متعلقہ کاموں میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے خاصا اعتماد حاصل رہتا تھا، وہ بھی اپنے متعلقہ کام کے مزاج اور حکمت عملی کے سلسلہ میں کوئی معاملہ ہوتا تو مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے رجوع کرتا، اور رہنمائی حاصل کرتا، لیکن جزوی اور عمومی معاملات میں اس کو اپنی صوابدید پر عمل کرنے کی آزادی ہوتی تھی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے فکر و عمل کے دائرہ میں ندوۃ العلما کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی، اور اللہ تعالیٰ نے مولانا کے دور نظامت میں اس ادارہ کو بہت نوازا، اور اس کی شہرت اور اہمیت پورے عالم اسلام میں تسلیم کرائی گئی اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہوا، اور اس کے شعبوں اور شاخوں کی تعداد خاصی بڑھی، ظاہری ترقی کے ساتھ باطنی ترقی بھی خوب ہوئی، اس سب میں ایک طرف مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے معاونین کا بڑا حصہ ہے، اور دوسری طرف مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی اس فکرمندی کو کہ ادارہ اپنی خصوصیت اور معنویت اور اپنے مقام و منصب سے ہٹنے نہ پائے، بڑا دخل ہے، وہ وقتاً فوقتاً ذمہ داروں کو خطاب فرماتے، طلبا کو وقتاً فوقتاً نصیحت کرتے، اور صالح اور بلند کردار کی طرف متوجہ کرتے، اس سلسلہ میں ان کی تقریریں بڑی مؤثر اور دل پر اثر کرنے والی ہوتیں، وہ اپنے ماتحت اہم ذمہ داروں سے وقتاً فوقتاً دریافت کرتے کہ کام کی مقدار اور رفتار کیا ہے، اہم اور فیصلہ طلب معاملات میں رہنمائی کرتے، لیکن یہ سب ایسے محبانہ رویہ کے ساتھ ہوتا، کہ کام کرنے والوں کا دل بڑھتا، اور ان کے جذبہ میں ترقی ہوتی، ندوۃ العلما کے دائرہ میں نائب ناظم مولانا معین اللہ صاحب ندوی ان کے سب سے بڑے معتمد رہے، اور ان کی فکر و توجہ کا ندوۃ العلماء کی ان ترقیات میں جو مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے دور نظامت میں ہوئیں بڑا دخل ہے، اللہ تعالیٰ ان کی فکرمندیوں اور محنتوں کا بہترین صلہ عطا فرمائے، اور درجات بلند فرمائے، اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑا دینی جذبہ اور کام کا حوصلہ عطا فرمایا تھا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی زیر سرپرستی دیگر اداروں اور انجمنوں کے معاملہ میں بھی تھا ——— ان کی طرف سے کم و بیش یہی مذکورہ اعتماد و ہمت افزائی کا طریقہ تھا اور امت اسلامیہ کے مصالح کے لئے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی فکر و نظر ایک ہی سطح اور طاقت کی ہوتی تھی۔

وہ آج اپنے ملک و قوم، اپنی ملت، اور اپنے قدردانوں سے جدا ہو گئے ہیں لیکن اپنے پیچھے اپنے کاموں اور اپنی خصوصیات و صفات کے روشن نقوش چھوڑ گئے ہیں جن کو قائم رکھنا اور آگے بڑھانا ان کے قدردانوں کی ذمہ داری ہے، اور اس ذمہ داری کو پورا کرنے میں ہماری اجتماعی و انفرادی بھلائی مضمر ہے۔

شوخیٔ تحریر تیری کس قدر تھی تابناک
عالم اسلام کی خاطر تھا تو بدر منیر
دین و ملت کیوں نہ ہو نازاں تری خدمات پر
پرسنل لا کے محافظ دین احمد کے مشیر

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ

بحیثیت مفسرِ قرآن

مولانا عبداللہ عباس ندوی

حضرت مولاناؒ کے اسلوب تفسیر کو سمجھنے کے لئے اور ان کی قرآن فہمی کا انداز جاننے کے لئے ہم ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ دوسرے اسالیب تفسیر کو سامنے رکھیں تاکہ آپ کے اسلوب کا امتیازی نشان واضح ہو سکے۔

تفسیر کا ایک رنگ وہ ہے جس کی نمائندگی شیخ جار اللہ محمود بن عمر زمخشری (م ۵۳۸ھ) صاحب "کشاف" کرتے ہیں، الفاظ کے لغوی معنی اور عربی کے قابل استناد دور کے اشعار سے ان کی تصدیق، نحوی ترکیب کی وضاحت اور جہاں ایک سے زیادہ امکانات پائے جاتے ہیں اور جن کی وجہ سے ایک آیت کی تفسیر مختلف شکلوں سے کی جا سکتی ہے ان کی توضیح، نیز قرآن کے اعجازی پہلو کو واضح کرنا، کلامی مسائل میں معتزلہ کے مسلک کی تائید، صاحب کشاف کی تفسیر کے جلی عنوانات ہیں۔ شیخ محمود کے معتزلانہ استدلال کی تردید کشاف کے موجودہ نسخوں میں ملتی ہے جو شیخ ناصر الدین احمد بن المنیر المالکی کی نظر سے کبھی اوجھل نہیں ہوئی۔

دوسرا طرز تفسیر امام طبری (م ۳۱۰ھ) اول المفسرین کا ہے جو ہر آیت کی تشریح کے لئے احادیث نبویہ سے استدلال کرتے ہیں، دوسرے مفسرین میں امام فخر الدین رازی (م ۶۰۶ھ) ہیں وہ قرآن کے تمام مضامین کا احاطہ کرنے والے تھے، ان کے یہاں احادیث سے استدلال بھی ہے، الفاظ کی تحقیق بھی ہے اور اپنے عصر کے یونانی فلاسفہ کے اعتراضات کے جوابات بھی ہیں، دل کو نرم کرنے والے اور قرآن سے شغف پیدا کرنے والے واقعات سے یہ تفسیر مزین ہے۔ لوگوں نے یہ بڑی بے انصافی کی ہے کہ ان کی تفسیر پر یہ پھبتی کس دی ہے کہ "فیہ کل شئی الا التفسیر" یعنی اس میں تفسیر کے علاوہ سب کچھ ہے، امام رازی نے ایک انوکھی بات یہ بھی کی ہے کہ التزام کے ساتھ ہر آیت کا تو نہیں لیکن بہت سی آیتوں کے درمیان ترابط اور نظم دکھایا ہے۔ یہودی اور نصرانی ناقدین نے جن کو اصطلاح میں "مستشرق" کہا جاتا ہے نظم آیات کے نظریے کی تردید اس طرح کی ہے کہ موجودہ ترتیب سورتوں کی تعداد کے مطابق ہے، سورۂ فاتحہ کو چھوڑ کر جتنی سورتیں ہیں ان میں جو سب سے طویل سورت ہے وہ پہلے ہے اور جو اس سے کم آیتوں پر مشتمل سورہ ہے وہ بعد میں، اسی طرح آخر تک نظم سور کی پابندی نظر آتی ہے۔ جن لوگوں نے اس ملک میں نظم آیات اور ربط معانی پر زور دیا ان میں شیخ عبید اللہ سندھی (م ۱۹۴۵ء) اور علامہ عبد الحمید فراہی (م ۱۹۳۰ء) سب سے آگے ہیں، شیخ سندھی کے انداز تفسیر کے ایک بڑے متبع حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ (م ۱۳۸۱ھ) تھے جو مفسر ہونے کے ساتھ ساتھ صوفیانہ مجاہدہ اور علم و تقویٰ میں نمایاں مقام رکھتے تھے، ہمارے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے قدس سرہ حضرت لاہوریؒ کے خاص "عزیز ترین" محبوب ترین شاگرد تھے، جن کو حضرت لاہوریؒ اپنی اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ناچیز راقم کی تالیف "میر کارواں" اور مولانا مشاد علی قاسمی کی تالیف "حضرت مولانا مشاہیر امت کی نظر میں" اور خود حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خود نوشت سوانح "کاروان زندگی" کا پہلا حصہ) حضرت مولانا پر حضرت لاہوریؒ کے احتیاط و تقویٰ اور زہد و ریاضت کا اثر پورا پورا پڑا لیکن تفسیر کے معاملہ میں مولانا کا مذاق مختلف رہا۔ انھیں خاندانی بزرگوں اور خانوادۂ شاہ علم اللہؒ و سید احمد شہیدؒ کے علماء کے رنگ تفسیر سے مناسبت رہی جو براہ راست حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ) کا فیض تھا، کسی نے لکھا تو نہیں ہے مگر راقم اتنی جسارت کر سکتا ہے کہ یہ کہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے یہاں بھی آیات و سور میں ربط و نظم ہے جس طرح ایک درخت کی جڑ کو اس کے شاخوں سے ربط رہتا ہے اور ہر ڈالی اپنی اصل سے مربوط رہتی ہے لیکن یہ کہنا کہ ایک آیت کے بعد دوسری آیت اور دوسری کے بعد تیسری معنوی طور پر سب مربوط ہیں اور ترتیب مصحف کے مطابق ایک سورۃ دوسری سورۃ سے مربوط ہے صحیح نہیں ہے، خواہ اس کے داعی امام رازی ہوں یا ماہیم ہوں یا شیخ سندھی ہوں یا علامہ فراہی۔ راقم نے قرآن کے اسباق حضرت مولانا سے لئے ہیں، ان کے مواعظ سنے ہیں، قرآنی آیات سے استدلال اور ان سے ایسے نتائج نکالنا جو صرف ایک وہبی صلاحیت اور خداداد ذہانت کا طالب ہے، سنا ہے

مگر کبھی ربط آیات کی وہ بات نہیں سنی جو ربط ونظم کے ماننے والے حضرات کے یہاں ہے۔ حضرت مولانا علی میاں کی زندگی کا قرآن سے تعلق وہی رہا جو جسم کو روح سے ہوتا ہے، میں خیال کے طور پر آپ کے طرز استدلال کو آپ کے بعض مواعظ سے نقل کرتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ آپ کو قرآن کریم پر کتنا یقین، کس درجہ اعتماد اور کتنا گہرا شغف تھا، حضرت مولانا نے زندگی بھر ــــــــ آیات قرآنیہ سے پوری ملت کے لئے پیغام تلاش کیا، اور ایسے پیغامات جن کی طرف متقدمین یا متأخرین کی نگاہ نہیں گئی تھی، مثلاً حضرت یعقوبؑ کا اپنے آخر وقت میں اپنی اولاد کو جمع کرکے یہ پوچھنا "مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ" میرے بعد تم کس کو پوجوگے؟ اس واقعہ سے استدلال کہ ایک پیغمبر وقت کو دنیاوی زندگی میں سب سے اہم اور خطرناک موڑ یہی نظر آتا ہے کہ اس کی اولاد دین پر قائم رہے گی یا دنیا پرست ہو جائے گی، سوال یہ ہے کہ تم دین کو مانوگے یا دنیا کی پوجا کروگے، احکام الٰہی کے آگے سربسجود ہوگے یا دنیاوی آرائش کے پیچھے بھاگوگے، اس آیت سے یہ لطیف استدلال کسی نے نہیں کیا تھا، اسی طرح جب آپ ۱۹۵۶ء میں ترکی تشریف لے گئے جہاں لحد ملیشری کی حکومت ہے اور جہاں آج کل سیکولر کا مفہوم یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو اسلام کے مخالف اور معاند طریقہ کار ہو اور جہاں مردوں کو داڑھی منڈانے اور عورتوں کو بے سر ڈھکے رہنے پر مجبور کیا جاتا ہو وہاں ہمارے مولانا نے ایک پیشین گوئی سنائی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شکنجہ سے اسلام پسندوں کو نکالے گا اور دین کا جھنڈا یہاں کی فضا میں پھر لہرائے گا، جس آیت سے استدلال کیا ہے وہ سورہ کہف کی وہ آیت ہے جس میں حضرت خضرؑ ایک گاؤں میں جب جاتے ہیں اور لوگوں سے مہمانی طلب کرتے ہیں بستی والے مہمان بنانے پر راضی نہیں ہوتے مگر وہاں ایک گرتی ہوئی دیوار آپ دیکھتے ہیں اور اس کی مرمت کرنے لگتے ہیں حضرت موسیٰؑ جو اللہ کے حکم کے مطابق جناب خضرؑ کے مرافق تھے چیخ اٹھتے ہیں" لَوْ شِئْتَ لَاتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا" حضرت خضر جواب میں کہتے ہیں کہ اس گرتی ہوئی دیوار کی جڑ میں ایک خزانہ ہے جو ان بچوں کی میراث ہے جن کا باپ صالح تھا.

"وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا۔"

اور جو دیوار تھی سو وہ یتیم لڑکوں کی تھی جو شہر میں رہتے تھے اور اس کے نیچے ان کا خزانہ مدفون تھا، اور ان کا باپ ایک نیک بخت آدمی تھا۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ یہ بچے جوان ہوں اور اپنا خزانہ نکال لیں کیونکہ اللہ کی رحمت کا یہی تقاضہ ہے اور خضرؑ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ کام اپنی طرف سے نہیں کیا تھا (بلکہ یہ اللہ کا حکم تھا).

"فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا، رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ۔"

تو تمہارے پروردگار نے چاہا کہ وہ اپنی جوانی کو پہونچ جائیں اور پھر اپنا خزانہ نکالیں یہ تمہارے پروردگار کی مہربانی ہے اور یہ کام میں نے اپنی طرف سے نہیں کئے۔

حضرت مولانا نے ترکوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اس ملک میں دین کا خزانہ دفن ہے اور تمہارے صالح آباء و اجداد دین سے وابستہ تھے آج یہ دین کی دیوار اس ملک میں گرتی ہوئی نظر آرہی ہے اور ظاہر بیں نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ یہ دیوار اب گری جب گری۔ لیکن غیرت خداوندی کا تقاضہ کچھ اور ہے، دین کی دیوار اس سرزمین پر استوار رہے گی اور آج نہیں تو کل سب سے زیادہ پائدار، سب سے زیادہ پختہ اور مستحکم دیوار دین کی دیوار ہوگی۔

یہ استدلال اور یہ قوت ویقین اور اللہ تعالیٰ کے کلام پر اور اس کے ہر ہر لفظ پر اس درجہ گہرا یقین ایک وہبی طاقت کا مظہر ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ ابوالحسن علی کو عطا فرمایا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی رہے اور اپنے انعامات سے ان کو راضی رکھے، اور یہ پیشین گوئی پوری کرے۔

حضرت مولانا مرحوم کا اسلوب تفسیر حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تقلید تو نہیں ہے اور نہ اس کی مکمل پیروی، لیکن جس طرح شاہ صاحب کی نظر قرآن کی عمومی تذکیر اور اس کی آفاقی دعوت پر ہے، اسی طرح حضرت مولانا علی میاںؒ کی نظر بھی دعوت دین کے عالمگیر پہلو پر ہے اور جیسا شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ نماز کی مشروعیت (داخل شرع ہونا) اللہ تعالیٰ کے ذکر و مناجات کے لئے ہے جیسا کہ ارشاد ہے:۔

"وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ۔"

(طٰہٰ آیت ۱۴)

یعنی نماز میرے ذکر کے لئے قائم کرو،

ــــ اور تاکہ انسان کے حواس و قویٰ رویت باری تعالیٰ کے لئے آخرت میں تیار ہو سکیں جیسا کہ حدیث میں ہے:

ستَرون ربكم كما ترون هٰذا القمر لا تضامون في رويته فان استطعتم الا تغلبوا على صلاة قبل طلوع الشمس وصلاة قبل غروبها فافعلوا۔

تم اپنے رب کو اس طرح دیکھوگے جیسے اس چاند کو دیکھ رہے ہو، اس رویت میں

کوئی دھندلکا نہیں ہے جہاں تک ہو سکے فجر اور عصر کی نمازوں سے غافل نہ رہو۔

اور جیسا کہ زکوٰۃ کے بارے میں شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ اس کی مشروعیت اس لئے ہے کہ طبیعت کے اندر سے بخل کا مادہ نکلے اور ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کا جذبہ ابھرے، اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے لئے فرمایا:

فَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (آل عمران۔ ۱۸۰)

اور جو لوگ اس مال میں بخل کرتے ہیں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے دے رکھا ہے وہ ہرگز یہ نہیں سمجھیں کہ یہ ان کے حق میں اچھا ہے۔ نہیں بلکہ ان کے حق میں بہت برا ہے یقیناً انھیں قیامت کے روز طوق پہنایا جائے گا اس مال کا جس میں انھوں نے بخل کیا۔

یا یہ کہ حج کی فرضیت اس لئے ہوتی ہے کہ شعائر اللہ کی عظمت لوگوں کے دلنشیں کر دی جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي الخ (آل عمران۔ ۹۶)

بے شک پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا کہ....

یا یہ آیت کریمہ:

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ (البقرۃ۔ ۱۵۸)

صفا و مروہ اللہ کے شعائر میں ہیں۔

اسی طرح قصاص، جہاد، احکام و معاملات کی آیات میں شاہ صاحب کی نظر عمومی حقیقت کی طرف رہتی ہے۔[۱] بعینہٖ یہی اندازِ تفسیر اپنے استاذ محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے یہاں دیکھا اور طالب علمی کے زمانہ سے اب تک یہی رنگ ان پر غالب ہے، یہی نہیں بلکہ تمام دینی و اختلافی مسائل میں ان کی نظر ایک عمومی حکم پر رہتی ہے، ان کا پہلا دعوتی رسالہ "دعوتان متنافستان" دیکھئے اس میں حق و باطل کا معرکہ کسی خاص واقعہ سے متعلق نہیں ہے۔ بلکہ ایمان کی دعوت اور اس کے مقابلہ میں جاہلیت کی دعوت دونوں کے مزاج سے بحث کی ہے اور جس طرح شاہ صاحب نماز، روزہ، حج، زکاۃ، کی مشروعیت پر کوئی آیت اور احادیث پیش کرتے ہیں مولانا بھی سیرتؐ و سیر صحابہؓ کا کوئی واقعہ بطور استشہاد لے آتے ہیں اس کی ایک تازہ مثال ہے کہ ردِ شیعیت میں سیکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں شیعہ عقائد، ان کی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان میں گستاخی و بے ادبی، تقیہ اور متعہ کا ان کی کتابوں سے ثابت ہونا اور اس کی نوعیت پر بحث ہوتی ہے، زیادہ تر ان کے عقائد شیعہ کو انہی کی کتابوں سے ثابت کیا گیا ہے اس طرز کی بیسیوں نہیں بلکہ سیکڑوں کتابیں مناظرانہ انداز کی موجود ہیں مگر اس موضوع پر مولانا کا رسالہ "صورتان متضادتان"[۲] "دو متضاد تصویریں" ایک عمومی رنگ لئے ہوئے ہے، اور اس میں اصولی باتیں ہیں، جن کو عقل عام تسلیم کرے اور پھر کسی مناظرہ کی ضرورت بھی نہ رہ جائے۔[۳] یہی حال تفسیر کا ہے، ان کے درس تفسیر میں انسانیت کے لئے عام دعوت جو ہر زمانہ اور ہر مقام کے لئے یکساں طور پر فطرت کا تقاضہ بن کر سامنے آتی ہے نمایاں ہے۔

حضرت مولانا نے تفسیری مطالعہ اور قرآن فہمی کی نعمت پر متعدد جگہوں پر تفصیل سے لکھا ہے، جن کو راقم نے اپنی کتاب "میر کارواں" میں نقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ نیز "میرے مطالعۂ قرآن کی سرگذشت" کے عنوان سے رسالہ "صبح صادق" (لکھنؤ) قرآن نمبر میں شائع ہوا تھا جس کو راقم نے "میر کارواں" میں نقل کیا ہے، اس مقالہ میں مولانا لکھتے ہیں:

"ادب کے نصاب کی تکمیل کے بعد جو شیخ خلیل عرب کا طبع زاد اور خود ایجاد تھا مجھے خوش قسمتی سے علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی کی صحبت میسر آئی جو عربیت اور نحو میں عصر حاضر کے یگانہ اشخاص میں سے تھے اور ان کو امام فن کہنا بجا ہوگا، ادب کے بعد میں نے کچھ فقہ کی تعلیم حاصل کی اور دو سال ندوۃ العلماء میں مولانا حیدر حسن خاں صاحب سے درس حدیث کی تکمیل کی، اسی زمانہ میں کچھ تفسیر بیضاوی کا حصہ مولانا سے پڑھا، جو درس نظامی کے بڑے فاضل استاد اور کہنہ مشق مدرس تھے، کچھ عرصہ کے لئے میں نے لاہور جا کر مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کے طرز پر ان کے شاگرد رشید مولانا احمد علی صاحبؒ کے تفسیر کے درس میں شرکت کی، اس درس پر قرآن مجید سے سیاسی نکات کے استنباط کا ذوق غالب تھا، اس طرز سے مجھ کو زیادہ مناسبت نہیں ہوئی، لیکن مولانا کے اخلاق، ان کی زاہدانہ زندگی اور ان کے جذبۂ توحید سے بہت نفع ہوا۔

لاہور سے آنے کے بعد اور حدیث سے فارغ ہونے کے بعد کا زمانہ کلیتہً تفسیر کے مطالعہ میں گذرا، میں یہ کہنا بھول گیا تھا کہ میں نے

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی بعض تفسیریں اور مولانا حمید الدین فراہی کے رسائل بھی پڑھے، اب سارا وقت تفاسیر کے مطالعہ میں گذرنے لگا، زیادہ تر خود مطالعہ کرتا تھا اور جو اشکال پیش آتا اس کو دوسری کتابوں سے حل کرنے کی کوشش کرتا، اس زمانہ میں تفسیر جلالین نیسر علامہ بغوی کی ضخیم تفسیر معالم التنزیل، علامہ زمخشری کی کشاف کا لفظ بہ لفظ پڑھا علامہ نسفی کی مدارک کا نصف حصہ تو مجھے یاد ہے، لفظاً لفظاً پڑھا، دوسرے حصے پر نظر ڈالی۔

تفسیر کے مطالعہ کے سلسلے میں ایک عجیب تجربہ ہوا کہ ہر شخص کی کسی ایک سے تشفی نہیں ہوسکتی، ذہن وعقلیت کے مدارج اتنے مختلف اور متضاد ہیں کہ ایک شخص کو بیک وقت مطمئن نہیں کرسکتا، بعض اوقات ایک عبی آدمی کو ایک شبہ پیش آتا ہے، ذہین آدمی کا ذہن بھی اس شبہ کی طرف منتقل نہیں ہوتا وہ اس سے تعرض کئے بغیر گذر جاتا ہے، میرے بعض اشکالات معروف تفسیروں سے حل نہیں ہوئے کسی حاشیہ یا کسی غیر معروف تفسیر میں ان کا جواب مل گیا، اس سلسلہ کی تفصیلات طویل ہیں۔

جب دار العلوم ندوۃ العلماء میں تفسیر کا درس میری حقیر ذات سے متعلق ہوا تو تفسیر کا زیادہ گہرا مطالعہ کرنے کا موقع ملا، اس زمانہ میں علامہ آلوسی کی تفسیر روح المعانی سے بڑی مدد ملی، تجربہ یہ ہوا کہ تفسیر کبیر ہمارے جدید حلقوں میں جس قدر بدنام ہے بہانک کہا گیا کہ "فیہ کل شیئ الا التفسیر" اس بدنامی وحقارت کی وہ ہرگز مستحق نہیں، بہت سے زوائد کے باوجود اس میں بعض بڑی کام کی باتیں ہیں، اور بعض ایسی چیزیں ہیں جو عام کتابوں میں نہیں ملتیں، اس زمانۂ تدریس میں اگرچہ احیاناً بعض اور تفسیروں کے دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا مثلاً ابو حیان کی "البحر المحیط" لیکن ان کا ذہن پر کوئی اثر نہیں، علامہ رشید رضا کی "تفسیر المنار" بھی قابل استفادہ ہے اور اس سے بھی جدید مباحث میں مدد مل سکتی ہے، مدرسانہ نقطۂ نظر سے فی الجملہ بڑی مفید ثابت ہوئی "اعراب القرآن" سے بھی کافی مدد ملی۔

اس وقت تک مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کی تفسیر ماجدی شائع نہیں ہوئی تھی، انگریزی میں ان کے حواشی تیار ہو رہے تھے مجھے بعض اشکالات کے سلسلہ میں جن کا تعلق قدیم تاریخ اور دوسرے مذاہب وصحف سے تھا کبھی کبھی استفادہ کے لئے دریاباد جانے کا اتفاق ہوا، اور بعض بڑی کام کی باتیں معلوم ہوئیں، اب یہ معلومات تفسیر ماجدی میں نشر ہو چکی ہیں، اور قرآن مجید کے طالب علم کے لئے اس کا مطالعہ نہایت مفید ہے، خصوصاً ان لوگوں کے لئے جن کے پاس اصل مآخذ کی طرف رجوع کرنے کا وقت یا ذریعہ نہ ہو۔

زمانۂ تدریس کے بعد جب اپنی بعض علمی ضرورتوں کی بنا پر تفسیر طبری دیکھنے کا اتفاق ہوا تو آنکھیں کھل گئیں اور معلوم ہوا کہ یہ نہ صرف تفسیر بلکہ تاریخ وادب کا بھی ایک وسیع کتب خانہ ہے جس کا کسی کے پاس موجود ہونا ایک نعمت عظمیٰ ہے۔ عرب جاہلیت کے عادات وعقائد معاشرت اور احکام قرآنی کا ماحول اور پس منظر جاننے کے لئے اس سے زیادہ مستند اور وسیع ذخیرہ نہیں۔

اس سلسلہ میں بڑی کوتاہی دنیا سے یہ ہوگی اگر ایک ایسی کتاب کا ذکر نہ کیا جائے جو اگرچہ کوئی مفصل تفسیر نہیں لیکن فہم قرآن کا بہت بڑا خزانہ ہے اور تفسیر کے طالب علموں کے لئے ایک نادر تحفہ ہے شاید بہت سے قارئین کا ذہن متوجہ نہ ہو، یہ حضرت شاہ عبد القادر علیہ الرحمہ کا ترجمہ ہے اس کی قدر ان لوگوں کو ہوسکتی ہے جو تفسیر کا تفصیلی اور اعلیٰ مطالعہ کر چکے ہوں اور ان کو مشکلات قرآن کا اندازہ ہو اور یہ معلوم ہو کہ اہل تفسیر کو قرآن مجید کے بعض مطالب کے ادا کرنے میں اور اس کے بعض مفردات کی شرح وتفسیر میں کیسی کیسی دقتیں پیش آتی ہیں اس کے بعد جب وہ شاہ صاحب کا ترجمہ پڑھیں گے تو اندازہ ہوگا کہ شاہ صاحب نے کس خوبی اور کامیابی کے ساتھ ان مشکلات کو عبور کیا ہے، اور قرآنی الفاظ کے لئے وہ اردو کے کیسے موزوں الفاظ لے آتے ہیں جو بعض اوقات بالکل برمحل معلوم ہوتے ہیں اس کے لئے مثال کے طور پر صرف ایک آیت پیش کرتا ہوں، سورۂ شعراء کی آیت ہے:

"قَالُوا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ إِنَّا لَنَحْنُ الْغَالِبُونَ" "عزت میں عزت کا لفظ نہ صرف غلبہ کا مرادف ہے اور نہ صرف

شرف کا اور دونوں لفظ مل کر بھی اس موقع پر اس مفہوم کو ادا نہیں کر سکتے، زمخشری جیسے صاحب ذوق اور راسخ الفہم ادیب کو بھی اس کا پورا مترادف نہیں مل سکا۔ شاہ صاحب نے اس کا جو ترجمہ کیا ہے اس میں اس لفظ کی صحیح ترجمانی آگئی ہے، وہ فرماتے ہیں "اور بولے فرعون کے اقبال سے ہم ہی زبر رہیں گے"۔ یہی اس آیت کا صحیح ترجمہ ہے، شاہ صاحب کے بعد جس نے بھی اس ترجمہ کو اختیار کیا اس نے شاہ صاحب کی تتبع میں اختیار کیا۔ یہ ایک مثال ہے۔ شاہ صاحب کے ترجمے میں ایسے نوادر اور جواہرات بہت ملتے ہیں، ہمارے استاذ مولانا حیدر حسن خاں صاحب فرماتے تھے کہ مدرسہ سہارنپور کے بانی مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی علیہ الرحمۃ سب تفسیریں پڑھانے کے بعد آخر میں شاہ صاحب کا ترجمہ پڑھ دیتے تھے۔

ان تعلیمی تجربات میں اتنا اضافہ کرتا ہوں کہ قرآن مجید کے فہم کا اصل دروازہ تب کھلتا ہے، جب آدمی بغیر کسی انسانی مجاہلے ذریعہ اس کلام کے ذریعہ صاحب کلام سے ہم کلام ہو، اس کا راستہ قرآن مجید کی بکثرت تلاوت ہے اور نوافل اور ان بندگانِ خدا کی صحبت جو اس کتاب کے حقیقی لذت آشنا اور حقیقت شناس ہیں اور جن کے رگ و پے میں یہ کلام بس گیا ہے، ضرورت اس کی ہے کہ پڑھنے والا اس کتاب سے براہ راست تعارف و انس حاصل کرے اور اس کو ایسا محسوس ہو کہ براہ راست مخاطب ہے، شاعر نے کچھ غلط نہیں کہا کہ ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی، نہ صاحب کشاف"۔

۱؎ ملاحظہ ہو مقدمہ حجۃ اللہ البالغہ۔

۲؎ یہ کوئی مستقل کتاب نہیں تھی بلکہ مولانا محمد منظور نعمانی کی رد شیعیت پر کتاب کا مقدمہ تھا۔ اس مقدمہ کے شاہزادہ طلال بن عبدالعزیز نے اپنے خرچ پر دہ ہزار نسخے چھپوائے۔

۳؎ یہی وجہ ہے کہ ایران و ہند کے شیعہ علماء اور اہل قلم نے اس کا نوٹس لیا اور اس کے جواب میں دس سے زائد رسائل شائع ہو چکے ہیں، بقیہ اعتراضات تو ہمیشہ سے سنتے آئے ہیں اور اس پر مناظرے بھی ہو چکے ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر قائم ہیں۔

قیادت

اگر مسلمانوں کے لئے ترقی کا کوئی راستہ ہے اس ملک میں عزت پانے کا، قیادت کا تو یہ کہ وہ داعی بن کر قیادت کریں، حریف بن کر نہیں عددی اقلیت ہونے نے تو ایک طرح سے قسمت پر مہر لگا دی ہے۔ اگر مسلمان داعی کی حیثیت حاصل کریں گے تو اللہ اس کے طفیل میں آپ کو سب کچھ عنایت کرے گا۔

(حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ)

عملی زندگی

اسلام کے اعلیٰ اصولوں میں دنیا اسی وقت کشش محسوس کرے گی جب ان کا مظاہرہ ہم اپنی عملی زندگی میں کریں گے۔

(حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ)

روحِ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ سے

• از عنبر ناصری القاسمی

گری ہے برق مرے گھر پہ تیرے جانے سے
جگر ہے زخم سے چھلنی مرا زمانے سے
ترے فراق میں ہوش و حواس کھو بیٹھے
نہ آسکیں گے کبھی اب مرے منانے سے
زمانہ اور کبھی لایا مگر وہ عاجز ہے
ادیبِ وقت تمہاری نظیر لانے سے
جہاں میں آہ و بکا ہے "علی میاں" نہ رہے
سبھی نڈھال ہوئے غم کے تیر کھانے سے
شبِ فراق نہیں کم کسی قیامت سے
یہاں خرد بھی ہراساں ہے آزمانے سے
تڑپ رہے ہیں قلم رو رہی ہیں تصنیفیں
جمالِ علم و ادب! تیرے چلے جانے سے
تری مثال زمانے میں کوئی آتا ہے
ہزار سال میں قدرت کے کارخانے سے
چمن میں شور بپا ہے کہ گلستاں نہ رہا
اُدھر سے چیخ نکلتی ہے آشیانے سے
عرب عجم میں یتیمی سی چھا گئی ہے تمام
تمہاری ذات کا رشتہ تھا اس گھرانے سے
کہاں سے آپؒ کی مدحت بیاں کرے عنبر
یہی دعا ہے خدا دے کوئی خزانے سے۔

تاریخ وفات

یَا غَفُوْرُ یَا سَتَّارُ یَا وَاحِدُ
۱۹۹۹ء

یَا قَاسِمُ یَا کَوْثَرُ یَا شَفِیْعُ
۱۴۲۰ھ

آہ چراغ علوم دیں
۱۴۲۰ھ

آہ حضرت آہ
۱۴۲۰ھ

آہ بے بہا شخصیت
۱۴۲۰ھ

بے بہا روشنی ملت گم شد
۱۴۲۰ھ

آہ داغ مولانا علی میاں ندوی
۱۴۲۰ھ

آفود وفات بے بہا شخصیت
۱۹۹۹ء

• ـــــــ رزاق افسر

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
اور
تصوّف وسلوک

مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی۔ استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

تصوف ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن جن حضرات کو اس کے صحیح حاملین اور اس راہ کے معتبر اور صحیح رہنماؤں کی صحبت وزیارت کی توفیق نہیں ہوسکی۔ ان کے سامنے تصوف کی اصطلاح ایک معمّا اور چیستاں بن کر رہ گئی، اور اسکے پس پردہ ایک ایسا خرافاتی نظام نظر آنے لگا جو روح شریعت سے متصادم اور کتاب وسنت کا متوازی نظام تھا جو ظاہر ہے۔ کوئی توحید کا متوالا اور سنت کا شیدائی، غیرت ایمانی اور حمیت اسلامی رکھنے والا انسان برداشت نہیں کرسکتا اور نہ کرنا چاہیئے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے۔

اس صورتحال سے ہم کو اندازہ ہوتا ہے کہ اس اصطلاح "تصوف" نے دین کی کتنی عظیم کتنی روشن اور کتنی اہم حقیقت پر پردہ ڈال دیا ہے اور بہت سے لوگوں کی راہ میں اس حقیقت کے حصول میں مانع بن گیا ہے۔

اس کے آگے مزید وضاحت کرتے ہوئے اس چیز کا ذکر فرماتے ہیں، جس نے خاص طور سے اس دینی حقیقت کو اور زیادہ غبار آلود کردیا ہے۔

"وہ پیشہ ور اور جاہ طلب و حقیقت فروش اور الحاد شعار اور فاسد العقیدہ، نام نہاد صوفی ہیں جنھوں نے دین میں تحریف کرنے، مسلمانوں کو گمراہ کرنے، معاشرہ میں انتشار پیدا کرنے، آزادی و بے قیدی کی تبلیغ کرنے کیلئے تصوف کو آلۂ کار بنایا۔ اور اس کے محافظ و علمبردار بن کر لوگوں کے سامنے آئے، نتیجہ یہ ہوا۔ اہل غیرت واہل حمیت مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد ان سے بدظن ہوگئی، کچھ غیر محقق صوفی ایسے تھے جو اس شعبہ کی روح اور اس کے حقیقی مقاصد سے آشنا تھے، وہ مقصد و وسیلہ میں تمیز نہ کرسکے، بعض اوقات انھوں نے وسائل پر تو بہت اصرار کیا۔ اور مقاصد کو نظر انداز کردیا۔ اور اس شعبہ یا اس فن میں ایسی چیزیں داخل کیں جن کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا، اور اس کو فن کی روح اور اس کا کمال قرار دیا بلکہ مقصود ومطلوب سمجھ بیٹھے

(تزکیہ واحسان ص۱۵، ص۱۶)

اس سلسلہ میں ان حضرات کو جنھوں نے اس شعبہ سے بالکل ہی گریز اختیار کرلیا مشورہ دیتے ہیں۔

"بہرحال واقعات ہمیشہ انسان کی خواہش کے تابع نہیں ہوتے۔ اب ہم کو فراخ دلی کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیئے اور قیود واصطلاحات اور خواہشات وتعصبات سے آزاد ہوکر سوچنا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم ایک دینی حقیقت سے محض ایک نئی اصطلاح اور ایک مروج نام کی وجہ سے گریز اختیار کرنے لگیں"۔

حضرت نے تصوف وسلوک کو ایک الہامی نظام قرار دیا ہے اور مثالیں دیکر اس کی خوب وضاحت فرمائی ہے۔ اذان کی خواب میں تلقین لیلۃ القدر کا طاق راتوں میں دیکھنا۔ تراویح کا اجتماعی نظام، قرآن مجید کا مصاحف میں جمع کرنا، قراءات وتلاوت اور اس کے بعد کی ابتدائی صدیوں میں حدیث کی جمع وتدوین کا کام، مجتہدین کا استنباط علم نحو وقرأت، اصول فقہ اور قرآن اور اس کی زبان کو محفوظ کرنے والے تمام مفید علوم کی تدوین اور مدارس کی تعمیر، کتابوں کی نشر واشاعت وغیرہ ان مثالوں کو قدرے تفصیل کے ساتھ تحریر فرمانے کے بعد رقمطراز ہیں۔

"تزکیۂ نفس وتہذیب اخلاق کا وسیع ومحکم نظام جس نے بعد کی صدیوں میں ایک مستقل علم وفن کی شکل اختیار کرلی نفس وشیطان کے مکائد کی نشاندہی۔ نفسانی واخلاقی برائیوں کا علاج، تعلق مع اللہ اور نسبت باطنی کے ذرائع وطرق کی تشریح وتربیت جس کی اصل حقیقت تزکیہ واحسان کے مأثور شرعی الفاظ میں پہلے سے موجود تھے اور جس کا عرفی واصطلاحی نام بعد کی صدیوں میں "تصوف" پڑگیا۔ اس اجتماعی الہام کی

ایک درخشاں مثال ہے":
اس تربیت گاہ سے جو حضرات تیار ہو کر میدان میں آئے اور تاریخ میں قائدانہ کردار ادا کیا، ان کے بارے میں فرماتے ہیں۔

اس گروہ کی افادیت اور اس کی خدمات سے انکار یا تو وہ شخص کریگا جس کی تاریخ اسلام پر نظر نہیں، یا جس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہوئی ہے" (تزکیہ واحسان ص۲۹، ص۳۰ اس موضوع پر اس کتاب میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے مکمل کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا)

ایک جگہ اس شعبہ کے تعلق سے لکھتے ہیں۔

"دین کے اس شعبہ اور اسلام کے اس رکن کا جس کو ہم تزکیہ یا احسان یا فقہ باطن کہتے ہیں صاف اقرار کرتے اور اس بات کو بلا تامل قبول کرتے، کہ وہ شریعت کی روح، دین کا لب لباب اور زندگی کی بنیادی ضرورت ہے، اور یہ کہ جب تک اس شعبہ کی طرف کما حقہ توجہ نہ کی جائے اس وقت تک کمال دین حاصل نہیں ہو سکتا اور اجتماعی زندگی کی بھی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اور نہ صحیح معنی میں زندگی کا لطف آسکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد بعثت میں اس کو بیان کیا گیا ہے اور جو اوصاف تعلیم کتاب و حکمت وغیرہ کے بیان کئے گئے ہیں۔ ان اوصاف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخصوص صفت "تزکیہ" ہے"۔

تزکیہ کا مطلب کیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کس طرح عمل کیا اور کیا اثرات مرتب ہوئے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"تزکیہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ صرف پڑھ کر سنا دینے اور سمجھا دینے پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ اس تلاوت و تعلیم کا رنگ ان پر چڑھا دیتے ہیں۔ اس کتاب و تعلیم کو ان کے کانوں اور دماغوں سے گزار کر ان کے قلوب و ارواح کو رنگین کرتے ہوئے ان کے اعضاء و جوارح سے جاری کر دیتے ہیں۔

اسی لئے آپ دنیا کے سب سے کامیاب ہادی و مرشد تھے صحابہ کی سیرت اخلاقی روحانی اخلاقی، ذہنی، علمی، تبدیلی اور اسلام کی ابتدائی کامیابی کا راز یہی تھا اور آج اسی کی کمی اسلامی زندگی کے ہر گوشہ میں سب سے زیادہ نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔"

آگے تحریر فرماتے ہیں۔

تزکیہ کرنے والے آپ کی امت کے وہ اہل دل اور صاحب حال بزرگ ہیں جو آپ کے انفاس و انوار کے وارث و حامل ہیں انبیاء کی بعثت کا مقصد پورا کرنے کیلئے اور ان کی برکات پہونچانے کیلئے تزکیہ بھی اتنا ہی ضروری کام ہے جتنی کتاب و حکمت کی تعلیم، یوں سمجھنا چاہیئے کہ یہ تعلیم ہے وہ تربیت اور تکمیل انسانیت کے لئے دونوں کی ضرورت ہے۔

تزکیہ کی کمی اعلیٰ تعلیم کے باوجود اسی طرح محسوس ہوتی ہے جس طرح کھانے میں نمک کی کمی اور دونوں کے نتائج میں وہی فرق ہے جو اکبر مرحوم نے بیان کیا ہے، ع

زباں گو صاف ہو جاتی ہے دل طاہر نہیں ہوتا

روز بروز یہ حقیقت واضح ہوتی جاتی ہے کہ دین جس چیز کا نام ہے وہ اعلیٰ سے اعلیٰ دینی تعلیم سے بھی نہیں پیدا ہوتی۔ ع

دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اہل دل نے ہمیشہ یہ ضرورت پوری کی اور امت کی اصلاح میں اور دین کی خدمت میں علماء کا اچھی طرح ہاتھ بٹایا، دونوں نے مل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل نیابت کا فرض انجام دیا۔

(سیرت سید احمد شہید ص۲۶۸ طبع ثانی)

اس مرتبۂ احسان کی اہمیت و عظمت کو بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

مرتبۂ احسان جو نقد جان بلکہ دولت کونین دے کر بھی مل جائے تو ارزاں ہے۔ ؎

متاع وصل جاناں بس گراں است
گر ایں سودہ بجاں بودے چہ بودے

احسان سے مراد یقین و استحضار کی وہ کیفیت ہے جس کے لئے ہر صاحب ایمان کو کوشاں ہونا چاہیئے اور جس کا شوق ہر مرد مومن کے دل میں موجزن ہونا چاہیئے۔

(تزکیہ واحسان ص۱۷)

اہل دل کی خدمت میں:۔

یہ وہ شعبہ ہے جس کا تعلق قال سے کم حال سے زیادہ ہے یہ شنیدن سے زیادہ چشیدن ہے، یہاں کام قلب بریاں اور چشم گریاں کا ہے نہ عقل حیراں اور فکر پریشاں کا۔

یہ مشاہداتی اطمینان و سکون ہے نہ کہ اخباری معلومات اور نظری تخیلات، یہ سراپا عشق ہے جس سے اخلاص کے سوتے جاری ہوتے ہیں۔

علامہ اقبال نے اس کو یوں بیان کیا ہے ؎

سر دیں ما را خبر او را نظر
او درون خانہ ما بیرون در
ما کلیسا دوست ما مسجد فروش
او ز دست مصطفیٰ پیمانہ نوش

اس فن کے ماہرین نے اس مقام پر فائز ہونے کے لئے چند امور کی بہت تاکید کی ہے جن میں سے تین بہت اہم اور بنیادی سمجھے گئے۔
۱. صحبت محبت کے ساتھ، (۲) کثرت ذکر، (۳) خودرائی سے مکمل پرہیز۔

حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری کی خدمت میں

اللہ والوں کی صحبت حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو شروع سے حاصل رہی، خاندان میں بھی ایسے حضرات موجود تھے جن کی صحبت سے استفادہ جاری تھا لیکن جس شخصیت کا اثر پڑا اور اس کی صحبت زندگی میں تبدیلی کا سبب بنی، وہ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کی ذات گرامی ہے۔ مولانا نے کوچۂ یار کی دریافت اور کیفیات ایمانی و احسانی کی یافت کو نہایت خوبصورتی سے بیان کرتے ہوئے قارئین کو بھی اس نعمت بے بہا اور دولت سرمدی کی طلب پیدا کرنے اور اس کے لئے سعی کرنے کی تلقین کی ہے۔

"میری زندگی کا وہ بڑا مبارک دن اور بڑی سعید گھڑی تھی جب مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ سے نیاز حاصل ہوا۔ اگر حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ سے ملاقات نہ ہوئی ہوتی تو میری زندگی اچھی یا بری، بہر حال میری موجودہ زندگی سے بہت مختلف ہوتی۔ اور شاید اس میں ادب و تاریخ اور تصنیف و تالیف کے سوا کوئی ذوق و رجحان نہ پایا جاتا۔ خداشناسی اور خدارسی راہ یابی دراصل روئی تو بڑی چیزیں ہیں۔ مولانا کی صحبت میں کم سے کم خدا طلبی کا ذوق، خدا کے نام کی حلاوت، مردانِ خدا کی محبت، اپنی کمی اور اصلاح و تکمیل کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا اور ہم عامیوں کے لئے یہی بڑی دولت و نعمت ہے بلکہ بعض حقیقت شناسوں کے نزدیک یہی اصل دولت ہے۔"
(پرانے چراغ حصہ اوّل ص ۱۳۴)

اس تعلق کے بعد اپنے روحانی استفادہ کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"میرا روحانی ربط اور مراسلت کا سلسلہ برابر جاری رہا اور ان کو بھی میرے حال پر وہ شفقت و عنایت رہی جس کا اندازہ ان کے مکاتیب سے ہوتا ہے۔ ۴۶ء میں جب وہ سفر حج سے واپس آئے تو میں نے تہنیت کا خط لکھا مولانا نے اس کے جواب میں مجھے لاہور بلایا، میں ہوشیار پور، جالندھر ٹھہرتا ہوا لاہور حاضر ہوا، مولانا نے ایک روز تنہائی میں مجھے اپنے سلسلہ قادریہ میں اجازت مرحمت فرمائی اور اس کے لئے استخارہ و دعا کا انھوں نے جو غیر معمولی اہتمام مسجد خیف منیٰ میں کیا تھا اس کا ذکر فرمایا والحمد للہ علی ذالک۔"

مولانا احمد علی صاحبؒ نے اپنے خط میں تحریر فرمایا تھا

"میرے دل میں جو آپ کی عزت ہے اس کو ضبط تحریر میں لانے کی ضرورت نہیں سمجھتا، اسی محبت و عزت کا نتیجہ ہے کہ میں نے حج کی رات مسجد خیف میں آپ کے درجات کی ترقی کیلئے بارگاہِ الٰہی سے استدعا کی اور الحمد للہ اس نے بارگاہِ الٰہی میں قبولیت پائی"

ایک دوسرے خط میں اپنی محبت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

"چونکہ آپ میرے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ کا جو فضل بھی آپ پر ہو وہ میرے لئے صد فخر ہے۔ مجھے جس طرح مولوی حبیب اللہ سلمہ (حضرت کے بڑے صاحبزادہ) کی ترقی سے فرحت ہوسکتی ہے اسی طرح بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بعض وجوہ کی بنا پر اس سے زیادہ خوشی اور سرور آپ کے درجات کی ترقی سے ہوتا ہے۔"

ایک خط میں اپنے تعلق کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں"

عزیز القدر سعادت شعار شرافت مآب ناشر لدین اللہ لحصول رضا اللہ تعالیٰ
مولوی ابوالحسن علی صاحب زیدت معالیکم۔
آپ کی دینی خدمات سے جتنا مجھے سرور حاصل ہوتا ہے غالباً اتنا دنیا میں کسی اور کو نہیں۔"

حضرت رائے پوریؒ کی خدمت میں

مولانا محمد الیاس صاحب کی خدمت میں حاضری اور کام میں مشغولیت کے ساتھ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سے تعارف ہوا۔ اور خود حضرت مولانا کے الفاظ ہیں:

"یہ تعلق یوماً فیوماً نہیں آناً فاناً ترقی پذیر رہا اور شیخ اتنی جلدی بے تکلف ہوگئے جیسے میں برسوں سے حاضر ہوتا رہا ہوں۔"[1]

(1) (مولانا محمد الیاس سے تعلق، دعوت سے مناسبت، بنگلہ والی مسجد میں آمد و رفت کی تفصیل اور حضرت شیخ سے ان کے تعلقات، خصوصی شفقتوں اور ملاقاتوں اور مراسلت کی تفصیل کیلئے سوانح حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب، مولانا محمد الیاس صاحب اور انکی دینی دعوت، مکاتیب مولانا الیاس" ملاحظہ فرمائیں)

حضرت شیخ باوجود اپنے بلند روحانی مقام اور مرجع خلائق ہونے کے اہل تعلق کو اپنے وقت کے مستند و مسلم مشائخ بالخصوص شیخ وقت حضرت مولانا عبدالقادر رائپوری کی طرف امداد و تاکید سے متوجہ فرماتے رہتے تھے، ایک مکتوب میں حضرت مولانا کو لکھتے ہیں۔

"رائے پور کے جناب کے سفر کی حقیقی اہمیت بندہ کے نزدیک بہت ہے اس کو بار بار کیا عرض کروں، بندہ تو بہت ہی ضروری خیال کرتا ہے کہ اہل حضرات وہیں جائیں۔ جب بھی موقع مل سکے چند روز یکسوئی کے ساتھ ضرور تشریف لائیں"

(سوانح شیخ الحدیث ص۲۱۵)

ایک دوسرے مکتوب میں اس کی اہمیت اس طرح واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"انجمن میں آگ کی ضرورت ہوتی ہے اور للہی آگ انھیں درباروں سے ملتی ہے"

اس کے بعد رائپور حاضری کا سلسلہ شروع ہوگیا اور طرفین میں ایسا تعلق بڑھا کہ لوگوں کے لئے رشک و حسد کا ذریعہ بن گیا۔

"حضرت رائپوری نے ایسی شفقت و محبت کا برتاؤ کیا کہ حضرت اس کو شفقت مادری سے تعبیر فرماتے ہیں اور خطوط بھی اسی انداز کے تحریر فرماتے رہے،

ایک خط میں حضرت رائے پوری نے محبت آمیز اشعار لکھے، اور حضرت کو شمس تبریز اور اپنے کو مولانا روم کی جگہ قرار دیا ہے"

ایک خط میں اپنے مرید کو تحریر فرمایا:

سیدی و مولائی حضرت اقدس دامت برکاتہم

حضرت مولانا حضرت کو سیدی و مرشدی لکھا کرتے تھے اس کے جواب میں تحریر فرمایا۔

"حضرت آپ مجھے کیا سیدی و مرشدی لکھتے ہیں، احقر تو حضرت کا خادم ہے، اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند درجے نصیب فرمائے، اکثر اوقات حضرت کا خیال رہتا ہے"۔ وغیرہ۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنی مجلسوں میں حضرت کا تذکرہ بڑے والہانہ انداز سے فرماتے اور جب جب ذکر آتا طبیعت منشرح ہو جاتی اور اکثر یہ شعر پڑھتے۔

ذھب الذین یعاش فی اکنافھم

جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب خدمت میں حاضری ہوتی ہوگی تو کیا کیفیت ہوتی ہوگی۔

انبساط عید دیدن روئے تو
عید گاہ ما غریباں کوئے تو

حضرت نے ایک جگہ خود تحریر فرمایا ہے،

"ایسے عاشقانہ اور والہانہ تعلق کو مناسبت اور ترقی باطنی میں ہزار افکار اور ریاضتوں سے زیادہ دخل ہے"

اس تعلق کی تکمیل اجازت و خلافت سے ہوئی۔ کاروان زندگی میں تحریر فرماتے ہیں، حضرت رائپوری نے اپنے سفر لکھنؤ کے موقع پر جو اپریل ۱۹۴۸ء میں ہوا تھا، ۲۴ اپریل ۴۸ء کو ہمارے وطن دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی کو دوبارہ شرف بخشا۔ وہیں ایک روز بے سان و گمان حضرت شاہ علم اللہ اور سید صاحب کی مسجد سے باہر نکلتے ہوئے مجھ سے فرمایا میں آپ کو چاروں سلسلوں بالخصوص حضرت سید صاحب کے سلسلہ میں اجازت دیتا ہوں۔ (کاروان زندگی اول ص۳۵۳)

ان دو حضرات کے علاوہ بھی آپ اپنے زمانہ کے مشائخ اور اہل قلوب کی خدمت میں برابر حاضری دیتے اور ان کی بابرکت صحبتوں سے فیضیاب ہوتے رہے، ان تمام حضرات نے بھی نہیں کہ عنایت و شفقت فرمائی بلکہ بہت ہی بلند کلمات بھی فرمائے جو مختلف کتابوں میں درج ہیں

حضرت تھانویؒ نے مجمع الکمالات لکھا اس وقت آپ کی عمر تقریباً ۱۹، ۲۰ سال کی تھی حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے دعا دی، حضرت سید احمد شہیدؒ قدس اللہ سرہ العزیز کی تجدید ملت اسلامیہ کے خدمت کا علمبردار بنا کر نعمائے لدنیہ سے مالامال کرے۔

حضرت مولانا محمد الیاسؒ بانی جماعت تبلیغ نے "سیدی و سید عالم" لکھ کر خطاب کیا، حضرت شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوریؒ، حضرت شاہ یعقوب صاحب مجددیؒ، مولانا محمد احمد صاحب پرتاپگڈھیؒ سے بڑے بلند کلمات سنے گئے۔

غرضیکہ آپ اپنے زمانہ کے اہل دل اور اہل علم کے منظور نظر اور محبوب رہے، عالم اسلام میں جہاں بھی گئے وہاں کے اہل قلوب متوجہ ہوگئے اور آپ کی قدردانی میں انھوں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس طرح آپ کو علمائے ربانی اور مشائخ حقانی کی صحبت کا جتنا موقع ملا معاصرین میں سے کسی کو نہیں ملا۔ اور یہ بات بھی بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ جتنا فیض آپ کو مختلف مشائخ سے پہونچا کسی کو نہیں پہونچا حضرت نے ہر پھول سے اس کا حسن و جمال اور ہر گل سے اس کی لطافت و بانکپن بیکر پوری انسانیت کیلئے ایسا شہد تیار کر دیا جس میں تمام طبقوں کیلئے شفا کا سامان ہے۔

ذکر الٰہی اور مجاہدہ

ذکر کی اہمیت و فضیلت سے قرآنی آیات

اور نبوی تعلیمات معمور ہیں تصوف میں اس کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی ہے، اس کے بغیر انسان سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا۔ متقدمین اور متأخرین سب اس پر متفق ہیں۔ ان حضرات نے ذکر الٰہی کے مختلف طرق اختیار کئے ہیں تاکہ بآسانی قلیل سے قلیل مدت میں اس کے نتائج و اثرات ذاکر پر مرتب ہو سکیں۔

ذکر کی کثرت ہی سے یقین و اطمینان حضوری و دھیان، اخلاص و استحضار، جذب و کیف انوار و برکات حاصل ہوتے ہیں۔ بلکہ اس کو زندگی کی روح اور ماحصل قرار دیا گیا ہے

اللہ اللہ ہے تو یارو جان ہے
ورنہ یارو جان بھی بے جان ہے

حضرت رحمہ اللہ سے ایک طالب نے ذکر کی تاثیر کے بارے میں سوال کیا، اثبات و نفی کے بارے میں فرمایا کہ اس سے ایمان و یقین مضبوط ہوتا ہے اور اثبات محض کی تاثیر کے بارے میں فرمایا۔ اس سے تعلق مع اللہ مضبوط ہوتا ہے۔

حضرت والا نے بھی جب سلوک کی وادی میں قدم رکھا تو اس کو طے کرنے کے لئے ذکر الٰہی کو حرز جاں بنایا اور سلاسل میں جو طریقے ذکر کے مروج ہیں۔ اس کو اپنا کر منازل سلوک طے کئے اور بامراد اور کامران رہے۔

ہمارے حضرت کو اخفائے حال کا اس قدر خیال رہتا تھا کہ عرصہ دراز تک جو حضرات قریب رہے ان کے سامنے بھی اپنے حالات و کیفیات کے اظہار سے ہمیشہ گریز کیا۔ کاروانِ زندگی میں نہایت ہلکا سا اشارہ کیا ہے، لکھتے ہیں۔

"۱۹۳۴ء کے غالباً اپریل کے مہینہ میں مولانا کی ہدایت اور ایماء پر میں کچھ دن کے لئے ان کی صحبت و تربیت میں رہنے اور یکسوئی کے ساتھ ذکر و شغل کرنے کے لئے لاہور حاضر ہوا۔ مولانا نے ہدایت فرمائی کہ میں شاہی مسجد کے کسی حجرہ میں علیحدہ رہوں۔ مطالعہ اور علمی اشتغال سے بھی حتی الامکان احتراز کروں۔"

"تین مہینہ لاہور میں قیام رہا مسجد کے قیام میں کیا کیا اعمال و اشغال تھے تفصیل سے کبھی کسی سے نہیں بیان کیا، جستہ جستہ ذکر کر دیا کرتے تھے۔ ایک پوچھنے والے سے اتنا بتایا کہ سوائے ذکر و تلاوت کے اور کوئی دوسرا کام نہیں تھا تنہا اتنی بڑی مسجد میں قیام تھا۔ نہ کسی سے ملاقات کی اجازت تھی اور نہ علمی کام کرنے کی۔

لطائف پر چھ ہزار اسم ذات کا ذکر فرمایا کرتے، ذکر قلبی کا بڑا اہتمام تھا جس کی وجہ سے ہمہ وقت ذاکر رہتے تھے۔

تہجد سے فارغ ہو کر نفی اثبات جہری سے کیا کرتے تھے۔ جس کا معمول آخر تک باقی رہا چوتھائی میں اوابین کے بعد عشا تک ذکر میں مشغول رہتے؛

تنہا ایصال ثواب کے لئے گیارہ مرتبہ سے تیرہ مرتبہ تک سورۂ یٰسین کی تلاوت فرماتے، اور قرن اول کے اصحاب سے لیکر اس وقت کے ہر چھوٹے بڑے تعلق والے کا نام لیتے، اور جن حضرات کا نام لیتے پورے القاب و آداب کے ساتھ لیتے، رواروی میں نام نہ لیتے، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا جب نام لیتے تو فاتح ہندوستان ضرور فرماتے، نام لینے میں گھنٹہ سوا گھنٹہ لگتا اور تقریباً روز کا معمول تھا۔

قرآن مجید تدریس کے زمانہ میں یاد کرنا شروع کیا۔ آپ کے بعض رفقاء کا بیان ہے کہ صبح سے دوپہر تک ٹہل ٹہل کر یاد کرنے کا معمول بھی رہا ہے۔ اس کے علاوہ تلاوت کے الگ معمولات تھے۔ اشراق وغیرہ سے فارغ ہو کر زبانی بھی سناتے تھے اور دیکھ کر بھی تلاوت فرماتے۔

آخر میں اپنے والد صاحب کی کتاب تہذیب الاخلاق جو حدیث کا انتخاب ہے کا مطالعہ فرماتے اور بہت مسرور ہوتے۔

صحیح بخاری کے ڈیڑھ دو صفحے سننے کا بھی معمول ہو گیا تھا جو بیماری کے دن تک جاری رہا، تکیہ کے قیام میں عزیز القدر مولوی بلال عبدالحی حسنی ندوی سلمہ اللہ و نفع بکم کے ذمہ یہ خدمت سپرد ہوئی اور دار العلوم کے قیام میں راقم کو یہ سعادت حاصل ہوتی، سنتے وقت اہتمام سے بیٹھ جاتے، خود بھی بسم اللہ پڑھتے اور اور نہایت خشوع سے یہ دعا کرتے۔ اللھم انفعنا بالآیات والذکر الحکیم اور توجہ فرماتے پھر میں تلاوت شروع کر دیتا۔

جہاں تک مجاہدہ و ریاضت کا تعلق ہے پوری زندگی اس کا عکس جمیل ہے۔ ندوہ کے قیام میں بکثرت ایسا ہوتا کہ ناشتہ کی نوبت ہی نہ آتی بغیر اس کے تدریس میں مشغول ہو جاتے، سخت بیماریوں میں پر مشقت اسفار کی کثرت، دوسروں کی دلداری کی خاطر جان و مال کی پرواہ نہ کرنا، اس کو قلم بند کرنے کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔

(بعض حضرات نے مستقل اس پر مضامین لکھے ہیں ان کو دیکھا جا سکتا ہے۔)

خود نمائی سے پرہیز

ایک عارف نے کوچۂ عشق میں قدم رکھنے کی شرط بیان کی ہے۔ اور اس کو ضروری قرار دیا ہے ؎

جب تک فنائے رائے کی ہمت نہ پائیے
کیوں آپ اہل عشق کی محفل میں آئیے

یہ اس راہ کا دستور ہے سب ہی اس پر چل کر کامیاب ہوگئے ہیں حضرت مولانا نے بھی اس کو نبھایا۔ بلکہ پوری زندگی اس پر عمل کر کے دکھایا۔ حضرت اپنی تمام علمی اور فکری بلندیوں کے باوجود ہمیشہ اپنے بڑوں کی بات مان کر چلے، اپنے بڑے بھائی کی ہمیشہ بات مانی، فرماتے تھے، بات ماننے میں ہمیشہ فائدہ ہوا۔ ایک دو دفعہ نہیں مانی اس کی وجہ سے نقصان اٹھانا پڑا۔

حضرت رائپوری کے تعلق سے فرمایا۔ ایک دفعہ ایک اہم سفر درپیش تھا۔ حضرت رائے پوری کی رائے یہ تھی کہ اس وقت سفر نہ کروں میں نے فوراً بات مان لی، حضرت نے امتحاناً میرے چہرے کو دیکھا کہ ناگواری تو نہیں ہوئی حضرت فرماتے تھے کہ الحمد للہ مجھ پر بالکل اثر نہیں پڑا۔ حضرت رائے پوری اس سے بہت خوش ہوئے۔ اس کے بعد عنایات و شفقتیں بہت فرمائیں۔

حضرت فرماتے، یہ حضرات یہ بات بہت دیکھتے ہیں کہ خوشی دلی کے ساتھ کون بات مانتا ہے، حضرت رائے پوری کے وصال کے بعد حضرت شیخ الحدیث سے اہم چیزوں میں مشورہ کرنے لگے تھے یہ بھی معمول ہمیشہ قائم رہا، اور خوردوں میں بھی جو بات مانتا، اس سے بہت خوش ہوتے اس کو دعائیں دیتے۔ اس کو اس کے لئے ترقی کا زینہ قرار دیتے۔

تربیت و تعلیم

حضرت مولانا طالبین و سالکین کی تربیت میں ان کی طبیعت، ذوق، مشغلہ ضرورت، صحت و محل اور استعداد و ترقی کی صلاحیت کا لحاظ رکھتے تھے وہ ہر ایک کے حال کے مطابق اس کو ذکر کی تلقین کرتے تھے اور اس بات کا بھی خاص خیال رکھتے تھے کہ اس توہمات، خرافات اور بدعی اثرات کے دور میں عقیدۂ توحید پر ضرب نہ پڑنے پائے اور مقاصد و وسائل کا تمیز بھی مجروح نہ ہو۔

ایک مسترشد نے عرض کیا میں دفتر میں کام کرتا ہوں میز پر آپ کی تصویر رکھنا چاہتا ہوں حضرت نے سختی سے روک دیا۔

ایک پرانے طالب نے تصور شیخ کی اجازت چاہی۔ فرمایا حضرات نقشبند کے یہاں ہے، لیکن ہمارے سلسلہ میں حضرت سید صاحبؒ کے بعد سے متروک ہے۔ (تصور شیخ کے سلسلہ کی تفصیلات کیلئے سیرت سید احمد شہیدؒ کا مطالعہ مفید ہے)

مہولت کا بھی خاص خیال فرماتے، ابتدائی طور سے صرف تین تسبیحات کی پابندی بتاتے بعض طالبین نے مزید چاہا، اجازت نہیں دی، بعض کو سورۃ الاخلاص کی ایک دو تسبیحیں بتا دیں۔

بعض کو معاملات کی صفائی، فرائض کی پابندی، جن دینی کاموں میں لگے ہوئے ہیں ان میں نیت کا استحضار رکھنے کی تلقین فرماتے۔

اکثر طالبین کو قلبی ذکر پانچ سو مرتبہ بتا دیتے ورنہ حسب استعداد و صلاحیت ذکر جہری بھی بتلاتے۔

بعض کو بیعت کے بعد ہی چوبیس گھنٹہ کے معمولات بتا دیتے۔

معمولات کی پابندی ضروری سمجھتے۔ ایک، طالب کو لکھتے ہیں کہ معمولات کی پابندی رکھئے اس سے کام میں برکت و نورانیت آتی ہے۔ اکثر و بیشتر بیعت کے الفاظ دہرانے کے بعد ہی حالات میں تغیر شروع ہو جاتا تھا۔ ایسے بے شمار واقعات ہیں کہ سلسلہ میں منسلک ہونے کے بعد ہی دل کی حالت بدل گئی۔ ایک صاحب جو بیعت وغیرہ کے قائل نہیں تھے، وہ بیعت ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، ان الفاظ کا ان پر یہ اثر ہوا کہ گریہ طاری ہو گیا۔ اور پھر استخارہ وغیرہ کرنے کے بعد بیعت ہو گئے۔ مشائخ میں تنہا حضرت کی ذات تھی جن سے وہ حضرات بھی بیعت ہوئے جو بظاہر اس کے قائل نہ تھے بلکہ وہ ایسی جماعتوں سے ربط رکھنے والے ہوتے تھے جو تصوف کے نام سے گھبراتے ہیں ایسے ہی ایک موقع پر مزاحاً حضرت نے فرمایا "میری خانقاہ ماڈرن خانقاہ ہے"۔

حضرت بیعت میں جن باتوں کا عہد لیتے وہ نیچے درج کی جا رہی ہیں، بیعت کے بعد عام لوگوں سے خاص طور سے فرماتے، نہ دلی سے نہ قلب سے نہ ابدال سے کسی سے کچھ نہیں ہو سکتا سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے، یہ الفاظ بھی بیعت کے الفاظ کے ساتھ درج کئے جا رہے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ؕ

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ، اللہ کے سوا کوئی مالک و معبود نہیں ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں۔

یا اللہ ہم توبہ کرتے ہیں کفر سے، شرک سے بدعت سے، زنا سے، چوری سے، پرایا مال ناحق کھانے سے، کسی پر بہتان لگانے سے، نماز چھوڑنے سے جھوٹ بولنے سے اور سب گناہوں سے جو ہم نے اپنی ساری عمر میں کئے، چھوٹے ہوں یا بڑے اور اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ تیرے سب حکموں کو مانیں گے، تیرے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کریں گے۔

اے اللہ تو ہماری توبہ قبول فرما، ہمارے گناہوں کو بخش دے، ہمیں توفیق دے نیک عملوں کی اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کی۔

اس کے بعد ہاتھ چھوڑ دیتے اور فرماتے۔

یہ عقیدہ رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ہی اس دنیا کا خالق ہے اور وہی حاکم و منتظم ہے اس نے دنیا کو

بنایا۔ اور وہی اس کو چلا رہا ہے، اس کے حکم کے بغیر نہ پتہ ہل سکتا ہے اور نہ ذرہ اڑ سکتا ہے وہی روزی دیتا ہے۔ وہی شفا دیتا ہے، وہی عزت دیتا ہے، وہی ذلت دیتا ہے، وغیرہ کبھی اس کے ساتھ اور باتیں بھی فرما دیتے۔

بیعت ہونے کے بعد مراسلت کے ذریعہ بھی خدمت میں حاضر ہو کر اور خاص طور سے رمضان المبارک میں خدمت میں طالبین رہ کر اپنے حالات بتاتے اور رہنمائی لیتے، حضرت نے اس سلسلہ میں جن کو مناسب سمجھا اجازت بھی مرحمت فرمائی۔

ارادت و بیعت کا تعلق رکھنے والوں کے لئے جو شجرے سلاسل کے طبع کرائے گئے تھے ان کے لئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ہدایات و مشورے دیئے، جن کو اس کے ساتھ طبع کر دیا گیا تھا۔ یہاں ان ہدایات کو نقل کیا جا رہا ہے تاکہ تمام قارئین اور خاص طور سے حضرت کے متعلقین و متوسلین کو اس پر عمل کرنا آسان ہو جائے۔

بیعت کرنا اور سلسلہ میں داخل ہونا کوئی رسمی اور شوقیہ چیز نہیں ہے جس کے لئے کچھ ماننا اور کرنا نہ پڑے، محض برکت یا شہرت مقصود ہو، یہ ایک عہد و معاہدہ اور ایک نئی دینی و ایمانی زندگی کا آغاز ہے جس میں زندگی میں کچھ تبدیلیاں، کچھ پابندیاں اور کچھ ذمہ داریاں ہیں۔

۱۔ سب سے پہلی اور ضروری بات یہ ہے کہ بیعت اور سلسلہ میں داخل ہونا کلمہ کی تجدید اور اسلامی عہد و معاہدہ اور اللہ و رسول کے احکام کے مطابق دینی و ایمانی زندگی شروع کرنے اور اسی کے مطابق زندگی گزارنے کا قصد و ارادہ اور عہد و معاہدہ سمجھا جائے۔

۲۔ سب سے ضروری بات یہ ہے کہ عقیدہ درست اور پختہ کیا جائے۔ اور اس بات کا اقرار اور اس پر ایمان ہو کہ اللہ کے سوا کسی کے ہاتھ میں جلانے اور مارنے، صحت اور شفا دینے، اولاد دینے، روزی دینے اور تسمت اچھی بری کرنے کا اختیار نہیں ہے اور اس کے سوا کوئی بندگی کا مستحق نہیں، نہ اس کے سوا کسی کے سامنے سجدہ کیا جا سکتا ہے، نہ بندگی کی کوئی شکل اختیار کی جا سکتی ہے، نہ حاجت روائی اور مشکل کشائی کا سوال کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ سید المرسلین و خاتم النبیین محمد رسول اللہ کو اللہ کا آخری نبی، ذریعہ ہدایت، وسیلۂ شفاعت اور سب سے زیادہ محبت اور اتباع و پیروی کا مستحق سمجھا جائے۔ اور زیادہ سے زیادہ آپ کی سنتوں پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے اور دینی و دنیوی زندگیوں میں آپ کی ہدایات آپ کے معمول اور دستور پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے۔ آپ کی سیرت پاک کے مطالعہ کا اہتمام کیا جائے۔ اور آپ کی احادیث کے مجموعوں اور سیرت کی کتابوں کے مطالعہ کا شوق پیدا کیا جائے۔

۴۔ زندگی کو اسلامی قالب میں ڈھالنے اور صحیح مقاصد زندگی معلوم کرنے کے لئے راقم کی کتاب "دستور حیات" کو مطالعہ میں رکھا جائے نیز حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ کے مواعظ و ملفوظات کا مطالعہ کیا جائے۔

۵۔ سب سے اہم فریضہ اور ضروری چیز نمازوں کو اپنے وقت پر پڑھنا اور اہتمام اور سنتوں کی پابندی کے ساتھ ادا کرنا ہے۔ اس میں غفلت اور تساہلی کی تلافی کوئی چیز نہیں کر سکتی، نمازیں جماعت کے ساتھ حتی الامکان مسجد میں ادا کی جائیں، مستورات ان نمازوں کو اپنے وقت پر پڑھنے کی کوشش کریں، جو عام طور پر کاموں کی مصروفیت اور ذمہ داریوں کی وجہ سے فوت ہو جاتی ہیں۔ یا ان کا وقت نکل جاتا ہے۔

۶۔ دینی و دنیوی دونوں کاموں میں ثواب اور رضائے الٰہی کی نیت کی مشق کی جائے اخلاق و معاملات اور زندگی کے معمولات میں بھی اس کا اہتمام کیا جائے۔ تاکہ ان پر عبادت کا ثواب ملے اور ان کو حتی الامکان شریعت اور سنت کے مطابق کرنے کی کوشش کی جائے۔ اخلاقی و مزاجی کمزوریوں، حسد و کینہ، حد سے بڑھے ہوئے غصے، بدگوئی اور بدزبانی اور مال و دولت اور دنیا کی حد سے بڑھی ہوئی محبت سے بچنے کی حتی الامکان کوشش کی جائے۔

۷۔ قرآن مجید کی جس قدر سہولت کے ساتھ ممکن ہو تلاوت کا معمول بنایا جائے۔

۸۔ فجر کی نماز سے پہلے یا بعد مغرب یا عشاء کے بعد (جس وقت آسانی سے ممکن ہو اور پابندی ہو سکے) ایک تسبیح درود شریف کی، ایک کلمہ سوم کی۔ اور ایک استغفار کی پڑھ لی جائے اور اگر اللہ تعالیٰ توفیق دے تو آخر شب میں کچھ رکعتیں تہجد کی بھی پڑھنے کی کوشش کی جائے۔ اور اپنے سلسلے کے مشائخ اور متعلق والوں کے لئے دعا کی جائے۔

باطنی کیفیات اور چند نمایاں صفات

عشق و محبت

حضرت نے ایک جگہ خود تحریر فرمایا ہے کامل الاحوال بزرگوں کی باطنی کیفیات کا اندازہ عامی کیا لگا سکتے ہیں ان حضرات کا احوال و مسلک یہ ہے کہ ؎

عشق عصیاں است اگر مستور نیست
لیکن پھر بھی پیمانہ جب لبریز ہوتا ہے

مرا دردیست اندر دل چو می گویم زبان سوزد
اگر دم در کشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

یہی درد کبھی زبان پر آکر آہ وفغاں میں تبدیل ہو جاتا، کبھی مسلمانوں کی کوتاہیوں اور ناسمجھیوں پر درد وقلق کے اظہار اور ملامت وتنبیہ پر آمادہ کرتا کبھی تنہائی میں آنسوؤں میں تبدیل وتحلیل ہو جاتا لیکن وہ دم کے ساتھ تھا اور اس سے کسی وقت قرار نہ تھا۔

چوتھی صفت
فنائیت وبے نفسی

حضرت نے اپنے مربی ومرشد حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی فنائیت وبے نفسی کے متعلق اپنا ذاتی مشاہدہ وتاثر جو کچھ بیان فرمایا وہ ہم سب حاضرین اور سفر وحضر میں ساتھ رہنے والوں کا بعینہ ـــــ حضرت کی ذات کے متعلق ہے کہ کبھی ایک کلمہ بھی ایسا نہیں سُنا جس میں اپنی تعریف کی بو آتی ہو۔ حب جاہ کا یہاں سرکٹا ہوا تھا۔

حضرت نے اپنے مرشد حضرت رائے پوری کا یہ واقعہ کئی مرتبہ سنایا کہ ایک مرتبہ کچھ بڑے حضرات خدمت میں حاضر ہوئے مجلس لگی ہوئی تھی حضرت خاموش تھے، خدام کو فکر ہوئی کہ حضرت کچھ کلام فرمائیں تاکہ نئے حاضرین پر اچھا اثر پڑے تو کسی نے پوچھا حضرت صبر کا کیا مطلب ہے حضرت خاموش رہے، پوچھنے والا سمجھا کہ حضرت نے سُنا نہیں ذرا بلند آواز سے دوبارہ پوچھا۔ حضرت نے مولانا کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ علی میاں سے پوچھ لو، مولانا نے عرض کیا میں تو صرف اس کے ظاہری معنی بتا سکتا ہوں، اس پر حضرت نے فرمایا کہ میں تو وہ بھی نہیں بتا سکتا۔ اس کے بعد پھر برابر خاموشی رہی۔

یہی حال ہمارے حضرت کا پوری زندگی رہا، کوئی آئے نہ آئے، معتقد ہو نہ ہو کبھی کسی اشارہ کنایہ میں بھی نہیں کہا کہ مجھ سے بیعت ہو جائے۔ شروع میں تو اکثر دوسرے مشائخ کی خدمت ہی میں بھیجنے کا معمول تھا، جو حضرات اصرار کرتے ان کو بیعت فرما لیتے

حضرت نے اپنی زندگی میں نہ جانے کتنے کام کئے کیسے کیسے کارنامے آپ کی ذات سے وابستہ ہیں لیکن آج تک کسی نے یہ نہیں سُنا کہ یہ میں نے کیا ہے یہ ہمارا کارنامہ ہے، میں اور ہم گویا آپ کی لغت میں تھے ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بحر جود وسخا میں "ہم اور میں" ایسے گم ہو چکے تھے کہ جب زبان تحدیث نعمت کیلئے کھلی تو یہی سُنا گیا کہ اللہ کی توفیق سے یہ کام ہو گیا یہ ہمارے والد صاحب کا اخلاص بھائی صاحب کی تربیت کا نتیجہ، ماں کی دعاؤں کا ثمرہ اور بزرگان دین کی صحبت اور شیخ کی توجہ کا اثر ہے ورنہ میں ایک دیہات کا رہنے والا نہ زیادہ ذہین نہ حافظہ ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل
نسیم صبح تیری مہربانی

یہ کہتے ہوئے آپ کی آنکھیں آبدیدہ ہو جاتیں خاص طور سے اپنے بھائی مولانا ڈاکٹر عبدالعلی صاحب جو اصلاً آپ کے مربی رہے۔ جب کبھی ذکر کرتے تو آنکھیں ضرور اشک کا نذرانہ پیش کرتیں۔

چاروں طرف سے مبشرات کے خطوط آتے زبانی بھی لوگ آکر بیان کرتے اور خود آپ بھی خواب میں دیکھتے، کبھی اپنے متعلق، کبھی کسی تصنیف کے تعلق سے، کبھی ان کا دوسروں کے سامنے ذکر کرتے اور نہ کبھی کسی تصنیف میں درج کرتے صرف ایک بات فرماتے، میں تو اس لائق نہیں ہوں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کے تعلق سے کوئی آپ کو خوشخبری دیتا تو دو ایک آنسو ٹپک جاتے۔ اور ایک آدھ اپنی نا اہلی کا لفظ کہکر خاموش ہو جاتے۔

یہ صفت شروع سے اخیر تک قائم رہی اس کو آپ سلوک کیلئے بہت ضروری سمجھتے تھے ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں۔

اپنی نا اہلی کا احساس اور اپنے کو سب سے ادنیٰ اور کسی قابل نہ سمجھنا اس راہ کی سب سے اونچی بات ہے۔ اور اسی میں سالک کی حفاظت اور اس کی ترقی کا راز ہے"۔

اپنے متعلق حضرت رائپوری کو ایک خط میں حاضری کے تاثرات لکھتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں "جب اپنی بد عملی اور قطعی نا اہلی پر نظر جاتی تھی اور خیال ہوتا تھا کہ ہم جیسے ایسی پاکیزہ مجلس کے حواشی میں بیٹھنے کے لائق نہیں تو حضرت کی عنایات خصوصی پر بہت ہی ندامت اور شکر کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ اور دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کو ہم نا اہلوں کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائیں"۔

اس فن میں حضرت کا کیا مقام تھا یہ اہل مقام جانیں، چند باتیں اس کے تعلق سے عرض کردی گئی ہیں کیفیات کی کچھ جھلکیاں پیش کرنے کی کوشش کردی گئی۔ ؏

سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کیلئے

کوئی ہشت پہل ہیرا کہتا ہے، کوئی مجموعہ حسنات، کوئی پھولوں کا گلدستہ قرار دیتا ہے کوئی قوس وقزح کوئی علم کا آفتاب کہتا ہے، کوئی عشق کا ماہتاب، کوئی ؏

اے طبیب جملہ علت ہائے ما

کوئی حکیم ودانائے راز کہکر پکارتا ہے جس کے ہزار پہلو ہوں، ہیچدانوں کے لیے کسی ایک کا بھی حق ادا کرنا مشکل ہے، بازار میں اپنی پونجی لے کر یہ غریب بھی نام لکھانے آتا ہے شاید اس کے حصہ میں بھی کچھ آجائے اور دامان رحمت میں جگہ پانے کا مستحق ہو جائے۔

واللہ ولی التوفیق۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

بحیثیت ایک اُردو ادیب

پروفیسر وصی احمد صدیقی، معتمد مال ندوۃ العلماء

اس حقیر مضمون نگار نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں کی تلخیص لکھی، مضامین لکھے مگر نفسِ مضمون میں ہمیشہ ایسا کھویا رہا کہ تحریر کی ادبیت، اس کی سادگی اور پُرکاری کو اپنے بیان میں نہیں لا سکا، یہ وحدت الشہود والی بات ہے، کہ آفتاب کی روشنی کے سامنے ستاروں کی روشنی ماند ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے نفسِ مضمون کو میں نے آفتاب اور پیرایہ بیان کو ستاروں سے تشبیہ دی ہے مگر ان ستاروں کی آنکھوں کو تراوٹ بخشنے والی ہلکی روشنی بھی اپنا حُسن رکھتی ہے۔ یہ مضمون اِنھیں ستاروں کی جھلمل ہے،

حضرت مولاناؒ نے زیادہ تر عالمِ اسلام کی اصلاحی اور تجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ لیا ہے، نامور مصلحین اور ممتاز اصحاب دعوت وعزیمت کا مفصّل تعارف کرایا ہے، اُن کے عملی کارناموں کی روداد بیان کی ہے، جو کچھ بھی لکھا ہے وہ ذاتِ محمدیؐ سے عشق اور نبوت محمدیؐ کی پیروی کا بیان ہے، کوئی بھی نغمہ ہو لے ہمیشہ حجازی رہی اُسی سے محبت کرتے ہیں اور اُسی کا بیان کرتے ہیں جن کی صفات حضرت مولاناؒ سے مشترک ہوں۔ یعنی دین کا احیاء اور مسلمانوں کی حفاظت کا کام۔ وہ لوگ جن کا مسلمانوں پر احسان ہے۔ ان حضرات کی سیرت اور تذکرہ کے سلسلے میں اُن کے زمانہ کی علمی اور فکری سطح کو بھی نمایاں کیا ہے اور ان کے علمی کمالات ہی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ بلکہ ان کی زندگی کے باطنی پہلو کو بھی اجاگر کیا ہے۔

یہ مضمون اپنی فرد گزاشت کی تلافی کے لئے لکھا جا رہا ہے لیکن عرض کر دوں کہ صوفیا کا قول کہ نابودن دیگر و نادیدن دیگر میرے حسبِ حال کی کوشش رہے گی کہ حضرت مولاناؒ کے طرز انشاء کا بیان بھی ہو جائے تاکہ خامہ نخل رطب نشاں ہو جائے

حضرت مولاناؒ کی تحریر اتنی دلکش کیوں ہوتی ہے اور کیوں لوگوں کے احساسات کو چھوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی تحریر میں مجرد افکار ہوں یا خالص حقیقتوں کا بیان ہو تو گو وہ ایک علمی تحریر ہوگی مگر اثر ڈالنے والی نہ ہوگی۔ مولاناؒ کا بیانِ حقیقت جذبات کی شکل میں دل میں ورود کرتا ہے۔ ان جذبات کا بیان حقیقی اور فطری زبان میں ہوتا ہے اور شاعرانہ زبان کے ملمع سے بالکل محفوظ۔ یقیناً مناسب موقع پر حضرت مولانا پُرجوش اور استعارہ آمیز تحریر لکھ جاتے ہیں جا بجا انداز تکلف سے بالکل دور۔ مولانا کی زبان سالم اور مکمل افکار کی تصویر ہوتی ہے۔ حقیقت اور جمال ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ فکر اور ادراک اور اظہار الگ ہونے کے باوجود ایک وحدت میں تبدیل ہو جاتے ہیں علم لغت کی لفظی کثرت مترادفات کا زیادہ استعمال مولانا کی تصانیف میں کہیں کہیں مل جاتی ہے مگر وہ متن پر حاشیوں سے زائد نہیں

مولانا کی زبان کی ہم آہنگی اس درجہ کی ہے کہ اس سے اونچا درجہ تخیل میں نہیں آتا۔

حضرت مولانا حرف و معنی کے اندرونی رشتہ سے بخوبی واقف ہیں۔ فکر کی گہرائی اور تخیل کی رعنائی اُن الفاظ سے ہم آہنگ ہوگا جو مولانا استعمال کرتے ہیں۔ اضطراب اور خلش کا بیان، مردانِ کار کے کارناموں کا ذکر، اقدار حیات کا تعین سب کے لئے الفاظ سے بنی ہوئی فضا الگ ہو جاتی ہے۔ لیکن آفاقیت اور ہمہ گیری سے کوئی بیان خالی نہیں ہوتا۔ اور یہ کمال بھی کہ چشمِ ذہن میں اشیاء کے باطن کو سامنے کر دیا۔ اس شوق، عشق تپش، اور جذب کے ساتھ جو ان کے بیان کا خاصہ ہے۔ روانی اور بے ساختگی میں کہیں فرق نہیں آتا۔ ان کی مثالیں میں ابھی آپ کے سامنے لاؤں گا۔

حضرت مولاناؒ نے زیادہ تر تاریخ، فلسفۂ تاریخ، مذہب، سیرت اور سوانح کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان دائروں میں وسعت کم ہو جاتی ہے مگر حضرت مولاناؒ کے اندر جو تخلیقی فنکار چھپا ہے وہ چنگاری سے ستارہ ڈھونڈھتا ہے اور ستارہ سے آفتاب۔ عرفان حقیقت کا انحصار ادراک اور جستجو دونوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اولین بات حقیقت ہے پھر خیال، مشاہدے کی احساسیت اور دلکشی اور پڑھنے والے میں انشراحِ صدر کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ یہ کاشفِ اسرارِ دین ہیں اور ان کے ضمیر پر نزولِ کتاب ہوتا ہے۔ حضرت مولانا کی کتابوں میں ایک ربطِ فکری ہوتا ہے۔ موضوعات الگ الگ ہونے کے باوجود سارے مضامین

ایک دوسرے کے معاون ہوتے ہیں، ایک دوسرے کی تشریح کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی معنویت میں اضافہ کرتے ہیں۔ الفاظ کا دروبست ایسا کہ ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے۔

حضرت مولاناؒ نے اپنی تحریروں میں خطیبانہ اثر انگیزی کو جگہ نہیں دی ہے۔ ان کے باطنی تقاضے اور فکری زاویے، کیفیتِ نفسی اُن کے سادہ بیان سے قاری تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ زبان محاکاتی اور استدلالی ہوتی ہے نہ کہ قصہ آفریں تحریر کی تشبیہ ایک شفاف شیشے سے دی جا سکتی ہے جس کے اندر سے لکھنے والے کے جذبات جھلک رہے ہیں۔ اعلیٰ پایہ کی تحریر کے لئے ایسی پرکار سادگی بالکل ایک خوبصورت سہل ممتنع غزل کی طرح طبیعت کو خوشی سے بھر دیتی ہے۔

یہ چھوٹا سا مضمون مولاناؒ کی ساری تصانیف کا احاطہ نہیں کر سکتا، بہر حال اُن کی چند بہت معروف کتابوں سے اپنے بیان کی وضاحت کیلئے نمونے پیش کرتا ہوں۔ سب سے پہلے میں حضرت مولاناؒ کی پہلی تصنیف سیرت سید احمد شہیدؒ کو لیتا ہوں۔ اس وقت کے نوجوان عالم کے قلم کی روشنائی شہید کے خون کی سُرخی سے مل گئی ہے ؎

اک خونچکاں کفن پر کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

روانیٔ بیاں کا اعجاز دیکھئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک غیر فانی معجزہ یہ ہے کہ آپ کے فیض کا چشمہ کبھی خشک نہیں ہونے پاتا۔ آپ کا نمونہ کبھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ آپ کے اُمت کی ضرورتیں زیادہ دیر تک اٹکی نہیں رہتیں۔ اور وہ اس طرح کہ آپ کی مشعلِ نور سے براہِ راست مسلسل طریقہ پر سیکڑوں مشعلیں روشن ہوتی رہی ہیں۔ آپ کی کامل پیروی سے ہر زمانے میں اور تقریباً ہر جگہ کم و بیش ایسے انسان پیدا ہوتے رہے جن سے آپ کی یاد تازہ ہوتی تھی اور انبیاءؑ کی شان نظر آتی تھی۔ جن سے ظاہر ہوتا کہ اللہ کا کام بند نہیں ہوا۔ اور اللہ کا دین زندہ ہے

ان بزرگوں کے کئی طبقے ہیں، پہلے اور سب سے اونچے طبقہ کو صحابہ کرام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس طرح آنحضرتؐ نے نبوت و کمالاتِ نبوت کی تکمیل کر دی۔ اس طرح ان حضرات نے آپ کی کامل پیروی کا حق ادا کر دیا۔ اس کے بعد سلفِ صالحین اولیائے کاملین، مجاہدین، مرشدین، مصلحین و مجددین ہیں۔ یہ سب آپ کے کفش بردار اور آپ کے دین کے خادم ہیں اس سے زائد کچھ نہیں۔

اس تسلسل میں اب مولاناؒ کا الفاظ پر قابو دیکھئے۔ تشبیہات اور مثالوں کا ایسا حسن کہیں اور دیکھنے میں مشکل سے ملے گا۔

ان لوگوں سے اللہ ہمیشہ اپنا کام لیتا رہا اِن سے ہزاروں کی آنکھیں روشن ہوئیں، ہزاروں کے دل کے کنول کھلائے۔ ہزاروں کو جگایا۔ اِن کا ذکر عبادت ہے۔ اِن کی محبت ذخیرۂ آخرت ہے۔

یہ لوگ شب بیدار و شہسوار۔ اللہ کیلئے محبت کرتے تھے۔ تو اللہ ہی کیلئے دشمنی بھی کرتے تھے۔

اب اس تشبیب کے بعد گریز دیکھئے۔

پشاور کے فاتح اور تیرھویں صدی کے امیر المؤمنین کی زندگی میں اتباعِ نبوت کی حیثیت بہت نمایاں نظر آئیگی انھوں نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ اسلام عقائد و رسوم کا نام نہیں۔ وہ زمانے کی فضا۔ طبیعتِ بشری کا مذاق اور سوادِ اعظم کا رنگ بدلنا چاہتا ہے۔ یہ اس وقت ہو سکتا ہے کہ اس کو مادی اور سیاسی اقتدار حاصل ہو، شرعی حکومت کے بغیر شریعت پر پورا عمل بھی نہیں ہو سکتا۔ اور دینی کے لئے سیاسی اقتدار اور مادی قوت کی ضرورت ہے۔

سید صاحب نے "مسلمان" نام کی ایک قوم کے غلبہ کے لئے نہیں بلکہ "اسلام" نام ک ایک مکمل دین۔ عقیدہ۔ عمل اور مسلک زندگ کو قائم کرنے کے لئے اپنے خون کا پہلا اور آخر قطرہ بہایا۔

کیفیتِ ایمانی کے جان نواز جھونکے تار اسلام میں بارہا چلے ہیں۔ لیکن ایمان و یقیر خلوص و للّٰہیت کی ایسی بادِ بہاری ہمارے علم میں کم سے کم ہمارے ملک میں اس سے پہلے نہیں چلی۔ آدم گری اور مردم سازی۔ اصلاح و انقلاب کے ایسے محیر العقول واقعات بھی اصلاح و تربیت کی تاریخ میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں

سید صاحب کے رفیقوں کے ذکر پر جب آتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ غار کے رفیق ان کے ذہن میں آ جاتے ہیں۔

"صدیق کے لئے ہے خدا کا رسول بس"

مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی کا ذکر مختصر مولاناؒ نے دردؔ کی ایک رباعی لکھی ہے جسے د پڑھتے تھے کتاب دل کی بڑی سے بڑی تفسیـ اس رباعی کے اثر کے برابر نہیں ہو سکتی۔

اتنا پیغام درد کا کہنا۔ جب صبا کوئے یار سے گذرے
کون سی رات آپ آئیں گے۔ دن بہت انتظار میں گذرے

حضرت اسمٰعیل شہیدؒ رحمۃ اللہ علیہ کے بیا میں مولانا جذباتی ہو جاتے ہیں۔ دیکھئے کیسی دا کو پگھلا دینے والی تحریر لکھی ہے۔

سرحد کا قیام اور ہجرت کے بعد کا زما ایک مسلسل جہاد کا زمانہ تھا جس میں یا تو عملاً جنگ تھی یا اس کی تیاری جنگ کی تدابیر اور انتظام، اور جنگی مہموں کی قیادت میں سب سے بڑا حصہ آ ہی کا تھا۔ اس مدت میں میدانِ جنگ سے

نشیب و فراز اور حالات کے سب تغیرات پیش آئے۔ فتوحات بھی ہوئی۔ علمداری بھی قائم ہوئی۔ ایک دینی ریاست کا بھی انتظام کرنا پڑا۔ شکستیں بھی ہوئیں فتح کیا ہوا علاقہ بارہا ہاتھ سے نکل نکل گیا۔ دن رات کے ساتھیوں اور عمر بھر کے رفیقوں کو بارہا اپنے ہاتھ سے قبر میں اتارا، برسوں کی کھیتی دنوں اور گھنٹوں میں لٹ پھنک گئی۔ بالآخر عین میدانِ کارزار میں اپنے محبوب مقصد کیلئے اپنے محبوب امام و رفیق کے ساتھ راہِ خدا میں سر دیکر ثابت کر دیا کہ۔

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

یہ تو اس شہید کے کارنامے کا ذکر تھا اب مولانا اس ناقدری کا ذکر کرتے ہیں جو ملت کے ایک حصہ نے ان کے ساتھ روا رکھی مولانا کا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔

۱۳۶ برس کے طویل عرصہ میں شاید ہی کوئی دن ایسا طلوع ہوا ہو جس کی صبح کو اس شہید اسلام کی تکفیر و تفسیق کا کوئی فتویٰ نہ نکلا ہو۔ لعنت اور سب و شتم کا کوئی صیغہ نہ استعمال کیا گیا ہو۔ یہ ان لوگوں نے کیا جن کے جسم نازک میں آج تک اللہ کیلئے ایک پھانس بھی نہیں چبھی، جن کے پیروں میں اللہ کے راستہ میں کوئی کانٹا نہیں چبھا، جن کو (خون چھوڑ کر اس کا یہاں کیا ذکر) اسلام کی صحیح خدمت میں پسینے کا ایک قطرہ بھی بہانے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ تاریخ دعوت و عزیمت کی تمہید ملاحظہ کیجیے

اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام ہے اور کامل و مکمل طور پر دنیا کے سامنے آچکا ہے اور اعلان کیا جا چکا ہے کہ آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور دین کے حیثیت سے اسلام کو تمہارے لئے پسند کر چکا۔

ایک طرف تو اللہ کا دین مکمل ہے دوسری طرف یہ حقیقت ہے کہ زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے اور اس کا شباب ہر وقت قائم ہے۔

جاوداں پیہم دواں ہر دم رواں ہے زندگی

امام غزالی کے بارے میں لکھتے ہیں علو ہمت ان کی زندگی کا طغرائے امتیاز ہے انھوں نے علم و عمل کے دائرہ میں اپنے زمانہ کی سطح اور اپنے ہم عصروں کی کسی منزل پر قناعت نہیں کی وہ علم و عمل کے جس ترقی یافتہ مقام پر پہنچے ان کے کانوں میں یہی صدا آئی ۔

مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں ہے

مولانا روم کے بارے میں لکھتے ہیں:

توفیق الٰہی نے جب ان کو معرفت و آگہی کے مقام تک پہنچایا۔ اور قال سے حال۔ خبر سے نظر الفاظ سے معانی اور اصطلاحات و تعریفات کے لفظی علوم سے ترقی کر کے حقیقت و مغز تک پہنچے تو ان کو فلسفہ و علم کلام کی کمزوریوں اور استدلال اور قیاس کی غلطیوں کا اندازہ ہوا۔

دلوں میں دوبارہ دینی و غیبی حقائق کی وقعت۔ علوم انبیاء کی عظمت۔ عالمِ غیب کی وسعت اور قلب و روح۔ ایمان اور وجدان کی اہمیت کا نقش قائم کر دیا۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

حضرت خواجہ کی سیرت اور زندگی کا مرکزی نقطہ جو ان کے تمام اخلاق و اعمال اور احوال کا محور ہے وہ عشق الٰہی کی نعمت خداداد ہے۔

ان کے تمام حالات اور اشغال گفتگو اور مجالس، اشعار اور ان کے انتخاب و واقعات اور ان کی تخیل غرض ہر چیز اسی سوز باطن اور اسی حرارت عشق کا اظہار ہوتا ہے۔

شعلہا آخر ز ہر موئیم دمید
از رگِ اندیشہ ام آتش چکید

پرانے چراغ میں حضرت مولانا نے لکھا ہے کہ ان کو اپنے بیتے ہوئے دن، اپنے برتے ہوئے اشخاص اپنے بچھڑے ہوئے بزرگ اور گزرے ہوئے حالات سے بہت دلچسپی ہے، اس دشت کی سیاحی میں اُن کی تیسری پشت ہے۔

خوبصورت تراکیب اور بہترین جملے پوری سیر برا میں بکھیرے ہوئے ہیں۔ بیت کے بجائے رب البیت۔ مکان کے بجائے مکیں سے واصل ہو گئے۔ سمندر کو شکایت نہیں رہی کہ وہ اس دولت سے یکسر محروم رہے، جو زمین کے نصیب میں آئی۔

صحفِ سماوی کا انداز بیان۔ خطیبوں کا جوش اور برجستگی۔ عشاق کی مستی و وارفتگی عقل و جذب کی لطیف آمیزش ان جملوں کی داد دینے کیلئے خود قاری سخن فہم ہونا چاہیئے۔

شیخ حسن البناء مرحوم کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ان کی طاقت اور قوت کا اصل سرچشمہ فطرتِ سلیم۔ دل کی پاکیزگی، روح کی بالیدگی۔ اپنی غیرت و حمیت اور اسلام کے لئے اضطراب اور بے چینی ہے۔ اُن کی دعوت نے عالم عربی کی نئی نسل میں اسلام کی سدابہار صلاحیت اور اس کے دائمی ہونے کا اعتماد بحال کیا۔ اور جدید دلوں میں ایمان کی نئی چنگاری روشن کی۔

مولوی محمد ثانی مرحوم پر حضرت مولانا نے جو مضمون تحریر کیا ہے اس میں قدیم عرب شاعر ابوالحسن التہامی کے دلدوز قصیدہ کا ذکر کیا ہے جو اس نے اپنے جوان مرگ بیٹے کے مرثیے میں کہا ہے۔

موت کا قانون پوری مخلوق پر جاری و ساری ہے حقیقت میں یہ دنیا بقا اور استقرار کی جگہ نہیں اپنے مرحوم بیٹے سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ہم تم دونوں ایک ہی میدان کے راہی تھے تم نے پیش قدمی کی۔ اور منزل پر پہنچ گئے۔ اور تمہارا باپ ابھی سرگرم سفر ہے۔

میرے پیش نظر صرف وہ کتابیں ہیں جو حضرت مولانا نے اردو میں لکھی ہیں یا خود اردو میں ان کا ترجمہ کیا ہے لوگ بتاتے ہیں کہ عربی میں لکھی ہوئی کتابوں میں حضرت مولانا نے روانیِ بیاں کا دریا بہا دیا ہے۔ اردو تحریروں میں جو بہار کی فضا رہتی ہے گو ذکر خزاں کا ہو اُس سے اُس گلستاں کے رنگ و بو کا بھی قیاس کیا جا سکتا ہے مجھے انگریزی شاعر کیٹس کی وہ لائن بے حد پسند ہو اس نے اپنی شہرۂ آفاق نظم THE GRECIAN URN میں لکھی ہے۔

سُنے ہوئے نغمے میٹھے ہوتے ہیں مگر ان سُنے نغمے اور زیادہ میٹھے ہوتے ہیں۔

حضرت مولانا کی کتاب "الطریق الی المدینہ" کا ترجمہ کاروانِ مدینہ کے نام سے ہوا ہے۔ اس کتاب نے بڑی شہرت پائی ہے اور اس کے مضامین ایسے ہیں جو ازدل خیزد بر دل ریزد کے مصداق ہیں۔ وہی اثرات مرتب ہوتے ہیں جو قدسی یا جامی یا سعدی یا خسرو کے نعتوں کو پڑھ کر ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے اِس عالم آب و گل سے الگ ہو جانا۔ اور اس خنک شہر میں پہنچ جانا جہاں اپنے سرکار آرام فرما رہے ہیں۔ مصنف کا دل امڈا آرہا ہے لیکن میرا یہ مضمون معنی سے زیادہ بیان کے ذکر میں ہے۔ ایک مضمون عالم نو جو اردو میں لکھا ہوا ہے اس کے چند جملے نقل کرتا ہوں۔

زمانہ کی رُت بدل گئی۔ انسان کیا بدلا جہاں بدل گیا۔ زمین و آسمان بدل گئے۔ آدم کی اولاد پر آدم کے کسی فرزند کا اتنا احسان نہیں جیسا محمد رسول اللہ علیہ وسلم کا دنیا کے انسانوں پر ہے۔ اگر اس دنیا سے وہ سب لے لیا جائے جو محمد رسول اللہ نے اس کو عطا کیا ہے تو انسانی تہذیب ہزاروں برس پیچھے چلی جائے گی۔

حضورؐ کی پیدائش کا دن مبارک کیوں نہ ہو کہ اس دن دنیا کا سب سے مبارک انسان پیدا ہوا جس نے اس دنیا کو نیا ایمان اور نئی زندگی عطا کی۔

بہار اب جو دنیا میں آتی ہوئی ہے
وہ سب پود انھی کی لگائی ہوئی ہے۔

یہ دنیا کوئی خود رو جنگل نہیں بلکہ یہ مالی کا لگایا ہوا آراستہ باغ ہے۔ اور انسان اس باغ کا سب سے اعلیٰ پھول ہے۔ یہ پھول جو ہزاروں بہاروں کا سرمایہ ہے۔ انسان کا جوہر انسانیت کی اس خالق کے سوا کوئی قیمت نہیں لگا سکتا۔

جب رات کو پورا شہر میٹھی نیند سوتا ہے اور یہ جیتی جاگتی دنیا ایک وسیع قبرستان ہوتی ہے دفعتاً موت کی اس بستی میں زندگی کا چشمہ اس طرح اُبلتا ہے جس طرح رات کی سیاہی میں صبح کی سپیدی نمودار ہو۔ الصلوٰۃ خیر من النوم سے اونگھتی ہوئی انسانیت کو تازگی اور زندگی کا نیا پیغام ملتا ہے جب کسی طاقت و سلطنت کا کوئی فریب خوردہ اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی اور مَالَکُمْ مِنْ اِلٰہٍ غَیْرِیْ کا نعرہ لگاتا ہے۔ تو ایک غریب مؤذن اسی کی مملکت کی بلندیوں سے اَللّٰہُ اَکْبَر کہہ کر اس کے دعوائے خدائی کا تمسخر اڑاتا ہے۔ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہہ کر حقیقی بادشاہت کا اعلان کرتا ہے،

ہماری آپ کی دنیا میں حکما اور فلاسفہ بھی آئے۔ ادبا و شعراء بھی، فاتح و کشور کشا بھی سیاسی قائد اور قومی رہنما بھی مگر کسی کے آنے سے دنیا میں وہ بہار آئی جو پیغمبروں کے آنے سے پھر سب سے آخر سب سے بڑے پیغمبر محمدؐ کے آنے سے آئی۔ کون اپنے ساتھ شادابی وہ برکتیں، وہ رحمتیں نوع انسانی کے لئے وہ دولتیں اور انسانیت کے لئے وہ نعمتیں لے کر آیا جو محمدؐ دے کر گئے، تیرہ سو برس کی انسانی تاریخ پورے وثوق کے ساتھ آپ کو خطاب کر کے کہتی ہے۔

سرسبز شد ہو جو ترا پائمال ہو
ٹھہرے تو جس شجر کے تلے وہ نہال ہو

حضرت مولانا کے مضمون حضور و سرور سے چند لائنیں۔

نظر اٹھا کر دیکھئے دونوں طرف پہاڑوں کی قطاریں ہیں۔ کیا عجب کہ ناقۂ نبوی اس راستہ سے گزرا ہو۔ یہ فضا کی دلکشی۔ یہ ہوا کی مشک بیزی اسی وجہ سے ہے۔

بھینی بھینی ہوا ہے اور ہلکی ہلکی چاندنی جس قدر طیبہ قریب ہوتا جا رہا ہے۔ ہوا کی خنکی۔ پانی کی شیرینی اور ٹھنڈک لیکن دل کی گرمی بڑھتی جا رہی ہے۔ سُنیئے کوئی کہہ رہا ہے ؎

بادِ نسیم آج بہت مشکبار ہے
شاید ہوا کے رُخ پہ کھلی زلفِ یار ہے

وہ ایک بار ادھر سے گئے مگر اب تک
ہوائے رحمتِ پروردگار آتی ہے

وہ دانائے سُبل ختم الرُّسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

داغِ غلامیت کرد رتبہ فرو بلند
میر ولایت شود بندہ کہ سلطان خرید

محمد عربی کا بروے ہر دو سرا است
کسے کہ خاک درش نیست خاک بر سر او

حضرت مولانا علامہ اقبال سے بے حد متاثر ہیں۔ کئی مضامین ان پر لکھے۔ اقبال در دولت پر ان کا بہترین مضمون ہے جسے عربی تقریر سے محمد الحسنیؒ اردو میں لائے ہیں ایسے ہی ایک کتاب "روائع اقبال" کے نام سے

عربی میں لکھی جس کا اردو ترجمہ مولانا شمس تبریز خاں صاحب نے کیا ہے۔ اور واقعی ترجمہ کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس حقیر مضمون نگار کو اپنے مضمون کیلئے بہترین مواد اس کتاب سے مل سکتا ہے۔

شاعر اسلام اقبال۔ ان کی شخصیت کے تخلیقی عناصر۔ ان کا نظریہ علم و فن۔ ان کی طویل نظموں جیسے مسجد قرطبہ اور ذوق و شوق سب پر حضرت مولانا کی بہترین تحریریں ہیں۔ مگر میں نے خود سے عہد کیا تھا کہ صرف ان کتابوں کو سامنے رکھوں گا جو حضرت مولانا نے اردو میں لکھی ہیں یا خود ان کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس لئے اقبال کے موضوع کو چھوڑ رہا ہوں مگر کتاب کے مقدمے سے جو پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے اور ظاہر ہے اردو میں لکھا ہے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔

مولانا سید ابو الحسن علی صاحب ندویؒ جس گھرانے کے چشم و چراغ ہیں وہ صدیوں سے اب تک غیر منقطع طور پر مذہب و اخلاق رشد و ہدایت تصنیف و تالیف اور زبان و ادب کا گہوارہ رہا ہے ان حسنات کی جلوہ گری ان کی شخصیت ہی میں نہیں، علمی ادبی اور دینی خدمات میں بھی ملتی ہیں۔ عربی زبان و ادب نیز تحریر و تقریر میں موصوف کو جو غیر معمولی درک ہے اور عالم اسلام میں جو وزن اور وقعت حاصل ہے وہ ہندوستان کے شاید کسی عالم دین کے حصہ میں آئی ہو۔ اس بناء پر سید صاحبؒ کو ملت کا سفیر کبیر بننے کا حق پہونچتا ہے۔

سید صاحب کے ایک متبحر اور روشن خیال عالم دین اور شعر و ادب کے مبصر ہونے کی حیثیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ موصوف نے اقبال کی تائید اور ترجمانی جس خوبی سے خوبی سے کی ہے اس سے میرے ایک دیرینہ خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ اقبال کا کلام ہمارے لئے اس صدی کا علم کلام ہے۔

حضرت والا کی تاریخ ادب اردو خاص طور پر اردو شاعری پر بے مثال نگاہ رکھنے کا اندازہ مجھے گلِ رعنا مؤلفہ جناب حکیم عبدالحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ (حضرت کے والد ماجد) پر مضمون لکھنے کے دوران ہوا۔ حضرت کا بے مثال مفسر قرآن اور محدث ہونا۔ ادبیات عربی کا زبردست واقف کار ہونا تو سب ہی کے علم میں ہے لیکن اس پر حیرت اس لئے نہیں کہ حضرت کی۔ ع

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

کے مصداق تھے۔ تاریخ اور فلسفۂ تاریخ سے ماہرانہ تعلق بھی سمجھ میں آتا ہے۔ اردو اور فارسی کی شاعری سے لطف اندوز ہونا۔ اور اپنے مضامین میں ان کا حوالہ دینا بھی اس درجہ کے عالم کے لئے جو انتہائی خوش ذوق بھی ہو کوئی خاص بات نہ تھی مگر ادبِ اردو کی تاریخ۔ اردو شاعری کا ارتقاء اس پر ناقدانہ نظر اس کمال کے ساتھ تو ان باکمالوں کیلئے مخصوص تھا۔ جنھوں نے اپنی طالب علمی سے اس کی ابتدا کی ہو۔ اور اسی پر انتہا بھی ہو۔ انتہا سے میری مراد اُن کے علم کی پہچان اور قبولیت سے ہے۔

حضرت کو کب وقت ملا کہ وہ تاریخ ادب اردو کا مطالعہ کریں۔ حضرت نے انتہائی کم عمری میں سیرت سید احمد شہید جیسی تاریخی کتاب لکھی پھر ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین لکھی جو کہ تاریخ مذاہب اور فلسفۂ تاریخ اور مسلمانوں کے عروج و زوال کے منطقی اسباب کے بیان حرفِ آخر ہے اور جس نے لوگوں کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ وہ کتاب جو مولانا کی پہچان بن گئی تھی اور ممالکِ اسلامیہ میں مولانا کا وزیٹنگ کارڈ کا کام کرنے لگی تھی۔ مقدمہ ابن خلدون نے یورپ کو چونکایا تھا اور حضرت مولانا کی کتاب نے اسلامی دنیا کے ساتھ ساتھ مغرب کو بھی۔ میں اکثر غور کرتا رہا ہوں کہ حضرت نے زوال مسلمین کے بجائے انحطاطِ مسلمین کیوں لکھا، پھر یہی خیال آیا کہ حضرت مولانا کا حساس دل زوال لفظ کی تاب نہیں لا سکا اور لا تقنطو کا پیغام ہمیشہ اُن کے سامنے رہا۔

اس کے بعد تو حضرت کی بے مثال کتابیں آنا شروع ہوئیں۔ تاریخ دعوت و عزیمت کی سیریز۔ کاروانِ زندگی کی سیریز۔ پرانے چراغ کی سیریز۔ نبی رحمت۔ المرتضیٰ اور دوسری کتابیں جو حالات حاضرہ سے متعلق تھیں جیسے مغرب سے صاف صاف باتیں۔ امریکہ میں صاف صاف باتیں وغیرہ وغیرہ۔ پھر حضرت مولانا کو کب وقت ملا کہ وہ اردو شاعری کی تاریخ اور تنقید کا مطالعہ کریں اور وہ کتابیں جو اس تاریخ سے متعلق تھیں نکات الشعرا، گلشن بے خار، وغیرہ پڑھیں۔ حضرت کے پاس کب فرصت تھی۔ اس بات کو لکھنے کی وجہ صرف اپنی حیرت کا اظہار ہے اور میرا یہ فیصلہ کہ گو حضرت مولانا نے استادوں سے پڑھا مگر وہ اصل میں تلمیذ الرحمٰن تھے اور مصرعے

"آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں"

کا مصرعہ غالب نے ان ہی کیلئے لکھا ہوگا۔ غالب جیسے بے مثال شاعر کی نگاہ مستقبل میں جھانک سکتی تھی۔ غالب کی شاعری میری نگاہ میں وادیوں میں بھٹکنے والی بھی تھی اور جزدیست از پیغمبری بھی، جہاں ان کے روز ابر اور شب ماہتاب کے شغل کا خیال آتا ہے وہاں وہ شعر بھی ذہن میں آتا ہے۔

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتن
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں حضرت مولانا کے مقدمہ گلِ رعنا کی طرف لوٹ کر آتا ہوں۔

مقدمہ کی ابتدا اس نکتہ کی تفصیل سے ہوتی ہے کہ فارسی ادبیات کا آغاز و حصہ اور

اس کے ایسے دلکش و دل آویز نمونے نصابِ تعلیم میں داخل تھے، جن سے عام طور پر فارسی کا ذوق اور شعر و ادب سے لطف اٹھانے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی۔ اور چونکہ فارسی اور اردو کا گہرا تعلق ہے اس لئے اردو میں بھی اس سے بیش قیمت مدد ملتی تھی۔ ۱۸۵۷ء اور اس کے کچھ عرصہ بعد تک جب تک ملک میں نیا نظامِ تعلیم رائج اور مقبول نہیں ہوا تھا علمی اور ادبی محفلوں میں اس قدیم نصاب کے ساختہ و پرداختہ فضلاء صدر نشین ہوتے اس دور کے بعد بھی اس طبقہ کے ہاتھ میں ملک کی ادبی اور علمی قیادت رہی۔ مولوی محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی اور علامہ شبلی نعمانی جو زبان و ادب کے چار ستون تھے اسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے،

شعرائے اردو کے تذکرے فارسی میں تھے اور مولوی محمد حسین آزاد کی آب حیات وہ کتاب ہے جس نے پہلی مرتبہ اردو والوں کو اردو شاعری کی کہانی اردو میں سنائی ان کو خراجِ عقیدت ان کے سب سے بڑے ناقد مولانا حکیم عبدالحیؒ نے گلِ رعنا میں اور ان کے اس یگانہ کمالی کا جس طرح اعتراف کیا ہے اس پر اضافہ مشکل ہے۔

" سب سے بہتر اور عمدہ تصنیف اُن کی آبِ حیات ہے جو اردو زبان اور ریختہ شعر کی تاریخ میں پہلی کتاب اور اردو انشاپردازی کا بہترین کارنامہ ہے۔ عبارت کی بے ساختگی اور برجستگی اس میں شاعرانہ تخیل، استعاروں کی دلفریبی کے ساتھ ایسی چیز ہے جس پر غزلوں کے سیکڑوں دیوان قربان کر دینے کے قابل ہیں۔

حضرت مولانا نے گلِ رعنا لکھنے کی ضرورت یہ لکھی ہے کہ کوئی کتاب اپنے فن اور موضوع کی آخری کتاب نہیں قرار دی جا سکتی۔ کسی کے نقش کو نقشِ دوام اور تحقیق کو حرفِ آخر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ آب حیات اس سے مستثنا نہیں ہے۔ آزاد کا مزاج ایک ادیب کی طرح تخیل پسند تھا۔ ایک مؤرخ کی طرح حقیقت پسند نہیں، وہ کمیاں جو مولانا نے آب حیات میں گنائی ہیں ان میں پہلی یہ ہے کہ بہت سے قابل قدر شعراء کو انھوں نے اپنی کتاب میں جگہ نہیں دی اور بہت سے معمولی شعرا ان کی کتاب میں جگہ پائے ہوتے ہیں یہاں حضرت مولانا نے بہت سے نام گنائے ہیں جو اس کی مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ بڑے شعراء میں بھی یہ تفریق روا رکھی۔ مرثیہ گویانِ اردو کے کلام کی دل کھول کر داد دی ہے۔ اور نعت گویوں جیسے محسن کاکوروی کو نظر انداز کیا ہے۔ اُن کے فیصلے داخلی (SUBJECTIVE) تھے دوسری بات یہ کہ آبِ حیات میں بے حد تاریخی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ نکات الشعراء کے متعلق جو آزاد نے لکھا ہے اس میں کوئی بات صحیح نہ تھی۔ کئی مثالوں میں سب سے اہم یہ ہے آزاد نے لکھا ہے کہ میر نے ولی دکنی کے متعلق لکھا ہے " وے شاعریست از شیطان مشہور تر" واقعہ میں میر نے لکھا ہے " از کمال شہرت احتیاج نہ دارد"۔ میر کی بد دماغی کے متعلق جو کچھ لکھا سید انشاء کے آخری زمانہ کا جو حال لکھا وہ سب اُن کے دماغ کی تخلیق تھی۔ واقعہ سے اُس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ تیسری بات یہ کہ ان کے مذہبی جذبات یا ذاتی تعلقات نے ان کے فیصلوں کے غیر جانبداری پر بہت اثر ڈالا ہے۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کے ساتھ جو بے انصافی انھوں نے کی اور مومن کو انھوں نے جس طرح نظر انداز کیا وہ انتہائی محلِ نظر ہے۔ اسی طرح مصحفی اور انشاء کے تقابل میں بے حد بے انصافی کی۔ مصنفِ گلِ رعنا نے کیا بہترین بات لکھی ہے سید انشاء کی ہنگامہ خیزیاں بزم آرائیاں اور بذلہ سنجیاں ان کے ساتھ گئیں۔ اور ان کے کلام کا بیشتر حصہ بھی اپنے ساتھ لے گئیں مصحفی کا کلام باقی ہے اور اس کی آب و تاب بڑھتی جا رہی ہے۔

غالبؔ کے تذکرہ میں انھوں نے بے ضرورت ایسے لطیفے لکھے جن سے ان کے اثنا عشری رجحان اور صحابہ کرام پر طنز کا اظہار ہوتا ہے اس کے مقابلے میں استاد ذوق کا مذہب بیان کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔

اسی طرح بہادر شاہ ظفر کے سارے دیوانوں کو استاد ذوق کی جھولی میں ڈال دیا ہے۔ اسی طرح نواب الٰہی بخش معروف کا کلام بھی استاد ذوق کا کارنامہ بتایا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے معنف گلِ رعنا کے متعلق یہ صحیح لکھا ہے۔

جو لوگ مولانا مرحوم سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے انھیں ممکن ہے اس کا علم ہو۔ ورنہ عام طور پر لوگ اس سے لاعلم تھے کہ مولانا مرحوم اردو زبان و ادب کا ایسا اچھا ذوق رکھتے تھے ایسا خیال کچھ بے جا بھی نہ تھا، کیوں کہ مولوی صاحبان نے عام طور پر اردو زبان کی طرف سے غفلت برتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادبی ذوق مولانا کو اپنے والد ماجد سے "دراثت" میں ملا ہے جو اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے اور جن کا حال اور کمال کا نمونہ انھوں نے کتاب کے آخر میں دیا ہے۔

یہ حقیر مضمون نگار اس بات کی تائید کرتا ہے۔ اور لکھتا ہے کہ ہمارے حضرت مولانا کو یہ ادبی ذوق اپنے والد سے ملا ہے تحقیق اور ریسرچ کا علمِ پدر تو انھیں اُن کی وراثت کا جائز حقدار بناتی ہے۔

اب اس شعر پر اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

دامانِ نگہ تنگ وگلِ حسن تو بسیار
گلچیں بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

لہو الحدیث

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ" ایسا معلوم ہوتا ہے صرف نام لینا رہ گیا۔ وی۔ ڈی او، اور ٹی۔ وی کا قرآن کیونکہ عربی میں اترا ہے۔ اس میں انگریزی کا لفظ کیسے آتا۔ یہ بات عقل کے خلاف ہوئی لیکن صاف قرآن کا اعجاز معلوم ہوتا ہے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے جو کتاب اتری اس میں ٹی وی اور وی ڈی او کا ذکر ہے۔ اس لئے فرمایا گیا ہے "مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ" لہو الحدیث کے معنیٰ ہیں باتوں کا کھیل۔

یہ وی ڈی او۔ یہ ریکارڈ، سب لہو الحدیث ہے، آج سے چودہ سو برس پہلے اس وقت اللہ کی کتاب نے کہدیا، جب یہ سب چیزیں ایجاد کیا ہوتیں، کسی نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ اور کسی کے تصور میں بھی نہیں آتا تھا۔ اس وقت کہدیا کہ بہت سے لوگ ہیں کہ لہو الحدیث خریدتے ہیں۔

(حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ)

نذرانۂ عقیدت

● ڈاکٹر کیف رضوی

کانپ جاتا ہے قلم روتی ہے میری تحریر
بو الحسن عالی نسب شارح علم التفسیر

جامعہ ندوہ کے ریکٹر تھے بہ حسن تقدیر
عازم خلد بریں ہوگئے باصد توقیر

سارے عالم میں تھے مشہور مفکر بن کر
نظر افروز جو صورت تھی دل آرا تصویر

موجزن ان کے خیالات میں طوفان ادب
حامل نقد نظر ان کے نقوش تحریر

عرش پیما تھی تخیل کی چمن آرائی
کیوں مہ و مہر نہ ہوں فکر کی موجوں میں اسیر

عالم دین تھے معروف تو بے مثل ادیب
ان کی تحریر حقائق کی مرقع تفسیر

خوگر علم و عمل پیکر تسلیم و رضا
ہوگئی وسعت کونین بھی ان کی جاگیر

طرز تحریر میں اک شان دل آویزی تھی
حسن تاثیر سے کرتے تھے دل کو تسخیر

ان کے لمعات سے آئینہ گیتی پُر نور
ان کے اوصاف سے مسحور صغیر اور کبیر

ناز کرتے ہیں اسی ذات پہ اب علم و ادب
ایک تریاق تھا ان میں سے تو اک تھا اکسیر

ان کے چہرے سے صفات ملکوتی ظاہر
ان کے جلوؤں میں جمال احدی کی تنویر

ہر قدم منزل وحدت کی حدوں تک محدود
ہر نظر زلف شریعت کے کرشموں میں اسیر

عبد و معبود کے رشتے سے بخوبی واقف
نہ فرائض نہ عبادات خدا میں تاخیر

ان کی فرقت کا تصور بھی گراں تھا اے کیفؔ
کیوں نہ ہو ان کی جدائی سے زمانہ دل گیر

لوح الور تاریخ وفات

● مولانا محمد عثمان معروفی

۱۹۹۹ء
نحمد الولی الماجد العظیم ونصلی علی النبی الکریم

۱۹۹۹ء
جبیب جہاں ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ ☆ بحر مودت ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ
۱۹۹۹ء ۱۹۹۹ء

بہشت پناہ اہل غرباء ● دلدار نیک ذات ● منزل شناس صاحب تصانیف کثیرہ
۱۹۹۹ء ۱۴۲۰ھ ۱۹۹۹ء

رحمہ اللہ الواحد العظیم ● برد مضجعہ العلی المعید ● نور مرقدہ الرقیب العظیم
۱۴۲۰ھ ۱۴۲۰ھ ۱۹۹۹ء

اعوذ باللہ الہادی الرحمٰن من الشیطٰن الرجیم ● بسم اللہ الباسط المتین الرحمٰن الرحیم
۱۹۹۹ء ۱۴۲۰ھ

قال الحسیب سقاهم ربهم شرابا طهورا ● قال العلی الجامع فی عیشۃ الراضیۃ
۱۴۲۰ھ ۱۴۲۰ھ

قال المعز الحلیم سلام علیکم ادخلوا الجنۃ ● واللہ الحسیب موت العالم موت العالم
۱۴۲۰ھ ۱۴۲۰ھ

ان اللہ الحق الحکیم یرفع العلم یرفع العلماء
۱۴۲۰ھ

قبر خدا دوست ہادی پاک ● بر خاک پاک او عزیز ابر سلامتی بشو
۱۴۲۰ھ ۱۹۹۹ء

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

بحیثیت ادیب اور ناقد

سلمان علی خاں لکھنوی، سابق انفارمیشن آفیسر گورنر اترپردیش

تاریخ شاہد ہے کہ سرزمین ہند جب اسلام کی نعمت عظمیٰ سے بہرہ مند ہوئی تو لاتعداد علماء و فضلاء اور صوفیاء نے اپنی خداداد صلاحیت اور جولانیٔ طبع سے بندگان خدا کو وقتاً فوقتاً قرآن و حدیث، زہد و تقویٰ، خیر و شر اور علم و عمل کے رموز و نکات اور فضائل و برکات سے روشناس کیا اور اس کے ساتھ ہی اپنے ذوق طبع سے شعر و ادب کی دشوار گذار اور سنگلاخ وادی میں بھی قدم رکھا، اور اپنی غیر معمولی شعری و ادبی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اس کی ایسی آبیاری کی کہ وہ گلزار بن گئی۔ تاریخ ادب اردو کا اگر بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو اس وادیٔ ادب میں علماء کی کیا کیا صورتیں پنہاں نظر آئیں گی کہ اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ دراصل شاہ میران جی، ان کے فرزند شاہ برہان الدین اور ان کے پوتے شاہ امین الدین اعلیٰ سے لے کر مرزا مظہر جان جاناںؒ، خواجہ میر دردؔ، امیر احمد امیرؔ، مولانا الطاف حسین حالیؔ، مولوی اسمٰعیل میرٹھی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہرؔ، مولانا ابوالکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا غلام رسول مہرؔ، مولانا امتیاز علی عرشیؔ، مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جیسے بے شمار اکابرین نے اپنی گراں مایہ ادبی و شعری تخلیقات سے شعر و ادب کے خزینہ میں ایسا بیش بہا اضافہ کیا جس سے نو واردانِ ادب ہمیشہ تحریک حاصل کرتے رہیں گے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی متنوع اور گوناگوں شخصیت ایک انجمن کا مرتبہ رکھتی ہے۔ جنہوں نے بیک وقت شہرۂ آفاق عالم دین، مایہ ناز مفکر و مبلغ، ممتاز مفسر و محدث، معروف مؤرخ و محقق، مشہور سیرت نگار و سوانح نویس، وسیع القلب درویش و مصلح قوم، مقبول پاسبان ملت و میر کارواں، بلند پایہ مبصر و ناقد اور صاحب طرز انشاء پرداز ادیب کی حیثیت سے جو شہرت و نیک نامی اور سربلندی حاصل کی وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوگی۔

حضرت مولانا علی میاںؒ کو اردو اور عربی زبان و ادب پر یکساں عبور حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی تحریر و تقریر میں علمیت اور ادبیت کے ساتھ ہی صداقت و طہارت، فضیلت و حکمت، رفعت و وسعت، فصاحت و بلاغت، اور دعوت و عزیمت بدرجہ اتم کارفرما نظر آتی ہے۔ حضرت مولانا نے اپنے علمی، ادبی، تاریخی اور تحقیقی کارناموں سے صرف برصغیر ہند و پاک ہی نہیں بلکہ تمام دنیائے علم و ادب کے اہل ذوق کو اپنی طرف متوجہ کیا اور لوہا منوایا۔ اس کا صرف ایک ہی سبب تھا کہ حضرت مولاناؒ نے خود کو ایک خانہ تک محدود نہیں رکھا بلکہ اپنی وسعت نظری، فکر انگیزی، فراخدلی، انسان دوستی، بلند طلبی اور عالی حوصلگی سے علم و ادب کی تمام تحریکات سے استفادہ کیا اور اپنا ایک الگ، منفرد اور مخصوص نقطۂ نظر پیش کیا جو تمام تر احیائے اسلام اور ملک و ملت کی اصلاح اور فلاح سے عبارت تھا۔ حضرت مولانا کو اردو کے ساتھ ہی عربی ادب پر بھی زبردست ملکہ حاصل تھا۔

حضرت مولانا علی میاںؒ نے زمانہ طالب علمی میں ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ ۱۹۳۰ء کی بات ہے کہ حضرت مولانا نے اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلیؒ کی ہدایت پر ۱۶ سال کی عمر میں ماہنامہ "توحید" امرتسر میں شائع شدہ مولوی محی الدین منصوری کے مضمون "ہندوستان کا مجاہد اعظم یا مجدد اعظم" کا عربی میں ترجمہ کیا جو نہ صرف مصر کے علامہ سید رشید رضا نے اپنے رسالہ "المنار" میں شائع کیا بلکہ انھوں نے حضرت مولانا کو لکھا کہ "اگر صاحب مقالہ چاہیں تو میں اس کو الگ رسالہ کی شکل میں طبع کرا سکتا ہوں"۔ چنانچہ یہ مضمون بعد میں رسالہ کی شکل میں شائع ہوا۔ حضرت مولانا اپنی اس پہلی تخلیق کے بارے میں خود رقمطراز ہیں:-

"اس سے بڑھ کر ایک ہندی نو عمر طالب علم کا کیا اعزاز ہو سکتا تھا کہ اس کا رسالہ علامہ سید رشید رضا مصر سے شائع کریں۔ تھوڑے عرصہ میں "ترجمۃ الامام السید احمد بن عرفان الشہید" کے عنوان سے وہ رسالہ چھپ کر آگیا اور میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ میری عمر اس وقت سولہ سال کی رہی ہوگی۔ یہ میری پہلی تصنیف ہے جو نہ صرف ہندوستان بلکہ مصر سے شائع ہوئی"۔

(کاروان زندگی اول ص ۱۱۸)

اس طرح حضرت مولانا نے علم و ادب کی دنیا میں جب قدم رکھا تو اپنے غیر معمولی تبحر علمی،

فکر انگیزی، اولوالعزمی اور شرافت نفسی سے مسلسل آگے ہی بڑھتے رہے۔ اور کبھی مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا اور آپ کا دائرۂ اثر وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ حضرت مولانا کی نثر پختہ اور پر اثر ہے۔ جسے پڑھ کر دل میں شگفتگی اور شیرینی کا احساس ہوتا ہے اور نثر میں شاعری کا گمان ہوتا ہے چھوٹے چھوٹے پیسا جملوں سے حسن بیان میں زبردست رعنائی اور دلکشی پیدا ہو گئی۔ نثر میں شعری حسن کا جہاں تک تعلق ہے، عربی زبان وادب کے مشہور و معروف مفکر شیخ علی طنطاوی نے حضرت مولانا کی تصنیف "الطریق الی المدینۃ" کے مقدمہ میں جس کا اردو ترجمہ "کاروان مدینہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، واضح الفاظ میں اعتراف کیا ہے:-

"ادب کی طرف سے میرا اعتماد اٹھنے لگا تھا۔ چونکہ ادیبوں میں وہ آسمانی نغمہ عرصہ سے نظر نہیں آتا جس کی لے میں شریف رضی (عہد عباسی کا نامور ہاشمی شاعر) کے وقت سے لے کر عبدالرحیم برعی تک شعراء گاتے رہے۔ جب میں نے آپ کی کتاب پڑھی تو یہ کھویا ہوا نغمہ پھر مجھے مل گیا۔ یہ نغمہ مجھے آپ کی اس نثر میں ملا جو حقیقتاً شاعری ہے لیکن بے ردیف اور قافیہ کی شاعری۔ برادرم ابوالحسن! آپ کا صد ہزار شکریہ کہ آپ نے دوبارہ میرے اندر اپنی ذات اور اپنے ادب پر اعتماد بحال کر دیا۔"

(کاروان مدینہ ص۱۱)

حضرت مولانا علی میاںؒ کی اسی تصنیف "کاروان مدینہ" سے ان کی دیدہ زیب اور دلکش نثر کا ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے جس سے ان کی نثر نگاری کی رعنائیت اور نغمیت کا پتہ چلتا ہے۔

"انسانیت کا جسم تر و تازہ تھا مگر دل نڈھال دماغ تھکا ہوا۔ ضمیر بے حس و مردہ، نبض ڈوب رہی تھی، اور آنکھیں پتھرانے والی تھیں۔ ایمان و یقین کی دولت سے عرصہ ہوا انسانیت محروم ہو چکی تھی .... بادشاہ دوسروں کے خون پہ پلتے تھے اور بستیاں اجاڑ کر بستے تھے۔ ان کے کتے موج کرتے تھے اور انسان دانہ دانہ کو ترستے۔ زندگی کا معیار اتنا بلند ہو گیا تھا کہ جینا دوبھر تھا۔ جو اس معیار پر پورا نہ اترے وہ جانور سمجھا جاتا تھا۔ دنیا کی اصلاح انسانوں کے بس سے باہر تھی۔ پانی سر سے اونچا ہو گیا تھا۔ معاملہ ایک ملک کی آزادی اور ایک قوم کی ترقی کا نہ تھا۔ معاملہ پوری انسانیت کی موت و زندگی کا تھا۔ سوال کسی ایک خرابی کا نہ تھا۔ انسانیت کا بدن داغ داغ تھا۔ دامن تار تار۔ اصلاح کے لئے جو لوگ آگے بڑھے وہ یہ کہہ کر پیچھے ہٹ گئے۔ ع

تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

فلسفی اور حکیم، شاعر اور ادیب کوئی اس میدان کا مرد نہ نکلا۔ سب اس وبا کے شکار تھے۔ مریض مریض کا علاج کس طرح کرے؟ اس دنیا کے مالک کو اپنے گھر کا یہ نقشہ پسند نہ تھا۔ آخر کار اس نے عرب کی آزاد اور سادہ قوم میں جو فطرت سے قریب تھی۔ ایک پیغمبر بھیجا کہ پیغمبر کے سوا اب اس بگڑی دنیا کو کوئی بنا نہیں سکتا تھا۔ اس پیغمبر کا نام نامی محمد بن عبداللہ ہے۔"

مولانا نے بعثت محمدیؐ سے قبل عرب میں جہل و ظلم کے سبب معاشرت کی جو ابتر اور دگرگوں حالت تھی اس کی جس انداز میں منظر کشی کی ہے، وہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔ حضرت مولانا نے اپنی بیدار مغزی اور اعلیٰ بصیرت سے عربی اور اردو ادب میں جہاں ایک طرف انسانی زندگی سے متعلق اہم موضوعات پر اظہار خیال کیا تو دوسری طرف اپنی سحر بیانی سے نثر میں ایک نیا آہنگ، نیا بانکپن اور نکھار پیدا کیا۔ حضرت مولانا کی نثر کی یہی وہ خوبی ہے جس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مشہور و مقبول شامی نژاد عالم دین شیخ محمد المجذوب نے اپنی تصنیف "علماء ومفکرون عرفتھم" میں لکھا ہے:-

"شیخ ندوی کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی ادبی تحریر میں ایک سحر ہے، ایک ایسا جادو ہے جو عموماً دوسرے مصنفین کی تحریروں میں نہیں ملتا۔"

حضرت مولانا علی میاںؒ نے زبان وادب کی ترویج و ترقی کے لئے جب جنوری ۱۹۸۵ء میں "رابطہ ادب اسلامی" کے قیام کا اعلان کیا۔ اور اس کے ایک سال بعد جنوری ۱۹۸۶ء میں رابطہ کی پہلی کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہوئی تو اس میں ادب اسلامی کی بنیادیں مضبوط کرنے، ادب اسلامی کے فن تنقید کے ضوابط مرتب کرنے، جدید ادبی فنون یعنی حکایتی اقسام ادب اور ادبی سوانح عمریوں کے بارے میں اسلامی اصول طے کرنے، ادب اسلامی کی تاریخ از سر نو مرتب کرنے، اسلامی ادبا کے شاہکار نمونے جمع کرنے، ادب اطفال کی تیاری پر توجہ دینے، ادب اسلامی کی حیثیت کو تسلیم کرانے اور دنیا کے اسلامی ادیبوں کے درمیان خوشگوار رابطہ قائم کرنے، بامقصد ادب کی تخلیق کی راہ ہموار کرنے اور اسلامی ادبا کے مادی و معنوی حقوق کا تحفظ اور دفاع کرنے نیز ان کے تخلیقی ادب کی اشاعت کا بندوبست کرنے کے ساتھ ہی رابطہ کا یہ اعلیٰ نصب العین

بھی طے کر دیا کہ رابطہ کی یہ کوشش ہو گی کہ ادب خیر کا ذریعہ اور تعمیر کا وسیلہ بنے اور شر کا ذریعہ اور تخریب کا وسیلہ نہ بنے۔ اسلامی شعر و ادب کے فروغ کے لئے حضرت مولانا نے نہ صرف تمام ادبی تحریکوں کا غائر مطالعہ کیا بلکہ ان کی خامیوں اور کمیوں کی نشاندہی بھی کی۔ کلاسیکی، رومانی، مارکسی، ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت تمام تحریکوں کا مطالعہ کرنے کے بعد حضرت مولانا نے ادب کے بارے میں اپنا حتمی نقطۂ نگاہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

"ادب، ادب ہے خواہ وہ کسی بھی مذہبی انسان کی زبان سے نکلے، کسی پیغمبر کی زبان سے ادا ہو۔ کسی آسمانی صحیفہ میں ہو۔ اس کی شرط یہ ہے کہ بات اس انداز سے کہی جائے کہ دل پر اثر ہو۔ سمجھنے والا مطمئن ہو کہ میں نے بات اچھی طرح کہہ دی۔ سننے والا اس سے لطف اٹھائے اور اسے قبول کرے۔"

اور یہ بھی ممکن ہوگا جب زبان میں کشش ہو۔ جاذبیت ہو اور وسعت ہو۔ اس کے ساتھ ہی زبان اتنی آسان، عام فہم اور سلیس ہو کہ قاری آسانی سے سمجھ بھی سکے۔ اور دل کی بات دل میں بیٹھ سکے۔ حضرت مولانا علی میاں نے لندن کے شہر لیڈس میں واقع لیڈس یونیورسٹی میں ۲۶ رجون ۱۹۶۹ء کو منعقدہ طلباء کے ایک جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے مسلم قائدین میں گرمیٔ گفتار اور ایمانی قوت کی کمی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"دل کی زبان سے وہ بالکل ناآشنا ہیں، وہ ان (عوام) سے اس زبان میں بات نہیں کر سکتے جو سیدھی ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر جائے، جو ان کے دل کے ساز کو چھیڑ دے۔ جو ان کو دیوانہ اور مجنوں بنا دے۔ جو ان کو ہتھیلی پر سر رکھ کر میدان میں لے آئے۔ ایمان کی زبان، قرآن کی زبان، صحابہ کی زبان۔ جب تک کوئی شخص کسی کی زبان نہ جانے وہ اس سے کیسے بات کر سکتا ہے۔ میں اگر یہاں کے انگریزی فضلاء سے بات کرنا چاہوں اور مجھے انگریزی پر قدرت نہ ہو اور وہ میری زبان نہ سمجھتے ہوں تو "زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم" کا منظر ہوگا۔"

(مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں ص ۱۳۸)

حضرت مولانا علی میاں صرف تحریر کے ہی نہیں تقریر کے بھی غازی تھے۔ جب وہ تقریر کرتے تھے تو لگتا تھا کہ جیسے الفاظ کا ایک بحر بیکراں دماغ سے نکل کر زبان پر آنے کے لئے بے قرار و بے تاب ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں اپنی بات ایسے پر اثر انداز میں کہہ دیتے تھے کہ وہ لوگوں کو بھلی لگتی تھی۔ اور دلوں میں بیٹھ جاتی تھی۔ حضرت مولانا نے لکھنؤ میں ۲۱ دسمبر ۱۹۶۹ء کو منعقدہ ایک تبلیغی اجتماع میں جو تقریر کی تھی، اس کے درج ذیل اقتباس میں سلاست روانی اور ادبیت کار فرما نظر آتی ہے:۔

"آج غیر مذہبی انسان، غیر مذہبی انسان سے لڑ رہا ہے، آج غرض سے غرض لڑ رہی ہے۔ آج ہوس ہوس سے ٹکرا رہی ہے، آج شیطان سے شیطان ٹکرا رہا ہے، آج مال سے مال ٹکرا رہا ہے، آج اقتدار سے اقتدار لڑ رہا ہے، آج حکومت سے حکومت لڑ رہی ہے، آج پارٹی سے پارٹی لڑ رہی ہے، ہماری لڑائی اغراض کی ہے۔۔۔۔ کبھی مخلص مخلص سے نہیں لڑ سکتا، کبھی روحانیت روحانیت سے نہیں لڑ سکتی۔ ہمیشہ جھوٹ جھوٹ سے لڑتا ہے۔ ہمیشہ نفاق نفاق سے لڑتا ہے۔ ہمیشہ باطل باطل سے لڑتا ہے۔ ہمیشہ اغراض اغراض سے لڑتے ہیں۔ سارا فساد دنیا میں اغراض کا ہے۔۔۔۔۔ مذہب کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔"

(مغرب سے صاف صاف باتیں ۸۲-۱۸۱)

اور پھر جب کبھی تقریر میں اصلاحی پہلو غالب آجاتا تھا تو حضرت مولانا علی میاں کا لہجہ قدرے درشت ہو جاتا اور خطاب ناصحانہ شکل اختیار کر لیتا تھا۔ مثال کے طور پر ملت کی بے راہ روی اور شریعت سے سرد مہری جب ان سے برداشت نہیں ہوتی تو وہ برجستہ کہہ اٹھتے ہیں:۔

"ارے صاحب! یہ امت مرحومہ، یہ اشرف الامم کس طرح ذلیل اور کیسی خوار ہے، ہر جگہ پٹ رہی ہے، اور یہ نہیں دیکھتے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ آپ اپنی زندگی میں کون سی تبدیلی لائے۔ اتنے دنوں سے وعظ ہو رہے ہیں، تبلیغی جماعت کام کر رہی ہے، ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ نہ شادی بیاہ کے رسم و رواج میں کوئی فرق ہے، بیس برس پہلے اور دس برس پہلے جو طرز زندگی تھا وہی آج بھی ہے، جو نماز کے پابند نہیں وہ نماز کے پابند نہیں، جو پینے پلانے کا عادی تھا وہ پینے پلانے کا عادی ہے، جو مال میں، حقوق العباد میں، معاملات میں دیانتداری کو ضروری نہیں سمجھتا وہ اب بھی ضروری نہیں سمجھتا، جو ہاتھ لگ جائے وہ اپنا مال۔"

(پندرہ روزہ تعمیر حیات، ۱۰ اگست ۱۹۹۶ء)

ان اقتباسات کا ادبی اور فنی نقطۂ نگاہ سے مطالعہ کیا جائے تو ان میں ادبیت کے ساتھ ساتھ نظم کا رنگ و آہنگ صاف نظر آئے گا۔

"ادب دراصل انسانی زندگی اور تہذیب کا آئینہ دار، ترجمان اور نقاد ہوتا ہے جو انسان میں سماجی اور اخلاقی قدروں کو سمجھنے اور برتنے کا شعور پیدا کرتا ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ زمانہ کے تغیر کے ساتھ ہی ادبی رجحانات اور میلانات میں بھی تبدل رونما ہوتا رہا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب ادب برائے ادب یا فن برائے فن کا دور دورہ تھا لیکن رومانی اور جمالیاتی تحریک جب ادبا اور شعرا کو فرسودہ نظر آئی تو ترقی پسند تحریک نے عروج پایا اور اشتراکیت کو اس درجہ تقدم حاصل ہوا کہ مذہبیت کو رجعت پرستی قرار دے کر اسے یکسر مسترد کر دینے کی تحریک چل پڑی، اور پھر اس تحریک نے بھی جس کا آغاز ۱۹۳۶ء میں ہوا تھا ۱۹۴۷ء تک پہونچتے پہونچتے دم توڑ دیا۔ حالانکہ ترقی پسند ادیبوں نے رجعت پرستی پر اور ترقی پسندی کے تفاوت کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے اعلان نامہ میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ "وہ ادب جو ہم کو سست اور بے کار بناتا ہے رجعت پسند ہے اور وہ ادب، جو تنقید کی قوت پیدا کرتا ہے، جو عقل کی روشنی میں ہمارے رسم و رواج کو جانچتا ہے جو تنظیم اور عمل میں ہماری مدد کرتا ہے، ترقی پسند ہے۔"

(اردو ادب کے رجحانات پر ایک نظر، ڈاکٹر عبدالعلیم ص۱۹)

یہ وہ تحریک تھی جس کی ہم عصر ادیبوں اور تنقید نگاروں نے کھل کر مخالفت بھی کی تھی۔ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے بھی اس تحریک کو مسترد کرتے ہوئے اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا:۔

"اس دور میں یہ شرط لگا دی گئی کہ جب تک آدمی ترقی پسندی کی بات نہ کرتا ہو، جب تک قدیم چیز کا مذاق نہ اڑاتا ہو، جب تک مذہبی صحیفوں پر بھی کوئی چھینٹا نہ ڈال دیتا ہو اس وقت تک وہ ادب نہیں..... میں صاف کہتا ہوں اور دبستانِ ادب کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ ادب کی سب سے پہلی زیارت جو نصیب ہوئی وہ آسمانی صحیفوں میں نصیب ہوئی، ادب تھا کہاں؟ لیکن خدا نے انسانوں کو سمجھانے کے لئے اپنے پیغمبروں کو بھیجا اور ان کو زبان دی اور ان پر معانی کے ساتھ الفاظ وارد کئے تو معلوم ہوا کہ ادب اسے کہتے ہیں۔ پھر قرآن مجید نے آکر تو اس پر ہمیشہ کے لئے مہر لگا دی۔"

دراصل قرآن مجید کے علوم و معارف، رموز و نکات، افہام و تفہیم اور تشریح و تفسیر کوئی آسان کام نہیں ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو جس زبان میں اتارا اسے "عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ" سے موسوم کیا یعنی "بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ" بتایا۔ اس میں اللہ تعالیٰ کا خود ارشاد ہے:

"وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ"

(سورہ ابراہیم۔۴)

اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی کی قوم کی زبان میں، تاکہ وہ انھیں سمجھا سکے۔

حضرت مولانا علی میاںؒ نے اس آیت کی تشریح و توضیح کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

"اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ نے صرف قابلِ فہم زبان دے کر انھیں بھیجا بلکہ یہ ہے کہ انھیں فصاحت و بلاغت کے ساتھ بھیجا۔ قرآن میں "لسان" کا مفہوم بھی ہے کہ وہ زبان جس میں بچہ بولتا ہے، خیر قادر الکلام آدمی بھی بات کر لیتا ہے وہ مراد نہیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

أنا أعربكم، أنا قرشيٌّ استرضعت في بني سعد بن بكر۔

(سیرت ابن ہشام جلد ۱ ص۱۶۶ بروایت ابن اسحاق)

میں تم میں سب سے زیادہ فصیح ہوں، میں قریشی ہوں اور میں نے بنی سعد بن بکر میں پرورش پائی ہے۔"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ادب کی قدر و قیمت واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"ان من البيان لسحرًا وان من الشعر لحكمة۔"

(ترمذی و ابوداؤد عن ابن عباسؓ)

بعض کلام سحر اور بعض اشعار حکمت ہوتے ہیں۔

اسی طرح حضرت مولاناؒ نے فاسد و سقیم عامیانہ اور تخریبی ادب کے بارے میں قرآن کی روشنی میں یہ حتمی فیصلہ بھی گوش گذار کر دیا۔

"قرآن نے اپنے معجزانہ انداز میں فاسد و سقیم اور تخریبی ادب کو "زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا" (ملمع کاری اور فریب) کے بلیغ اور معنی خیز الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ ہم سطحیت کے عہد میں جی رہے ہیں، ہمارا سابقہ زیادہ تر سطحی ادب سے ہے۔ مگر

ہماری اور عصرِ حاضر کی اور خاص طور سے عالمِ عربی کی بڑی ضرورت صالح، اور مقصدی ادب ہے، جو قوت و زندگی سے بھرپور ہو، اور جو بلند و آسمان ہو، اور عالمگیر اسلامی و انسانی پیغام کا حامل و علمبردار ہو۔" (نقوشِ اقبال ص۳۳-۳۴)

مقصدی ادب کا جہاں تک تعلق ہے اس کے لئے بلند فکر، ادبی ذوق، حکمت و معنویت، جذبۂ صادق، زودطبع اور عالی حوصلگی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی تخلیق ادب میں یقین و محبت اور حبِ صادق بھی لازمی ہے کیونکہ بقول مولانا علی میاںؒ "زندگی اگر محبت و یقین کے جذبہ سے خالی ہے تو پھر وہ زندگی زندگی نہیں بلکہ موت ہے، اور پھر ایسی زندگی کیا؟ جس میں طبیعتیں مردہ و افسردہ ہوں، نظم و نثر کے سرچشمے خشک ہوں اور زندگی کے شعلے بجھ چکے ہوں، ایسی حالت میں یقینِ کامل اور حبِ صادق ہی حیاتِ انسانی میں جلا پیدا کرتا ہے اور انسانی زندگی رنگ و نور سے معمور ہو جاتی ہے۔ پھر شستہ، پُرسوز و پُردرد، روح نواز اور جلا بخش کلام سننے میں آتے ہیں۔ خارقِ عادت شجاعت و قوت دیکھنے میں آتی ہے اور علم و ادب کے نقوش بھی زندۂ جاوید بن جاتے ہیں، یہاں تک کہ یہی محبت اگر پانی، مٹی اور اینٹ، پتھر میں داخل ہو جائے تو اس کو بھی زندہ جاوید بنا دیتی ہے۔ ہمارے سامنے اس کی روشن مثال مسجد قرطبہ، قصر زہرا اور تاج محل ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ محبت و یقین کے بغیر ادب و فن مردہ و افسردہ و نا تمام ہیں۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر
(نقوشِ اقبال ص۵۹)

یہ ایک حقیقت ہے کہ جو بات صداقت اور حقائق پر مبنی ہوتی ہے اس میں جذب و انجذاب کی تاثیر بھی بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے۔ خواہ وہ کسی ناصح کی نصیحت ہو یا کسی مقرر کی تقریر، کسی مدبر کی تحریر ہو یا کسی داعی کی دعوت، اگر اس میں صداقت اور حقیقت کا عنصر کارفرما رہتا ہے تو وہ ایسا اثر کرتا ہے کہ لوگوں کے دلوں کو موہ کر ان کی دنیا ہی بدل دیتا ہے اور وہ تخریب سے اپنا دامن بچا کر تعمیر کو ہی اپنی زندگی کا مقصد بنا لیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں حضرت مولانا علی میاں ندوی نے ادب کے بارے میں اپنا یہ مطمحِ نظر پیش کیا:۔

"حقیقی اور فطری ادب بن ہی نہیں سکتا جب تک کہ اس کے اندر مذہبی حقائق پر کچھ ایمان نہ ہو، اور دل کے اندر کچھ درد نہ ہو۔ ادب کی بڑی خاصیت اور قوت یہ ہے کہ وہ رجحانات و میلانات اور عمل، طرزِ فکر، اخلاق اور انقلاب کے محرکات پیدا کرتا ہے، اس لئے وہ بہت مفید بھی ہو سکتا ہے۔ اور بہت مضر بھی، وہ بڑی تعمیری طاقت بھی ہے اور تخریبی قوت بھی، اسی لئے اس کو کسی حال میں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو تعمیر کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے، اور تخریب کے لئے بھی، اور دونوں کے مظاہر ہر دور میں دیکھنے میں آ سکتے ہیں۔ وہ معاشرہ کی تخلیق بھی کر سکتا ہے اور حکومتوں کی تعمیر اور تاسیس بھی۔ اس لئے اس کی سخت ضرورت ہے کہ اس کو (کتابۃً اور خطابۃً شعراً و نثراً) صحیح رخ پر لگایا جائے اور اس کے تخریب، انتشارِ خیال اور لذت اندوزی اور نفس پروری کا ذریعہ بننے کے بجائے اسی کو خیر پسندی، اصلاح و تقویٰ، ضبطِ نفس اور صحیح رہنمائی کا آلہ اور ہتھیار بنایا جائے۔"

حضرت مولانا علی میاں نے ایک بلند پایہ ادیب، ایک ممتاز نقاد، محقق اور مبصر کی حیثیت سے بھی دنیائے ادب میں اپنی ایک مخصوص پہچان بنالی تھی۔ حضرت مولانا نے اپنے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ کی تصنیف "گل رعنا" کے چھٹے ایڈیشن میں بے حد اہم پیش لفظ لکھ کر جو ادبی کارنامہ انجام دیا ہے وہ قابلِ صد ستائش ہے، یہ پیش لفظ دراصل حضرت مولانا کا تحریر کردہ وہ مضمون ہے جو پہلے شائع ہو چکا تھا۔ اور اس میں مولانا محمد حسین آزادؔ کی تصنیف "آبِ حیات" کی ان کوتاہیوں اور اس کے متعدد بیانات، روایات اور حوالوں کی تاریخی و دستاویزی صحت و صداقت ثابت نہ ہونے سے متعلق ایسے تاریخی ثبوت پیش کئے گئے تھے کہ جن کا ریاضی کے نتائج کی طرح انکار ممکن نہیں۔

مولانا محمد حسین آزادؔ کی ادبی خصوصیات اور سخن شناسی اور لطافتِ ذوق کا اعتراف کرتے ہوئے حضرت مولانا علی میاں نے ان کی بعض کوتاہیوں کی نشاندہی اپنے مقالہ میں درج ذیل الفاظ میں کی ہے:۔

"آبِ حیات میں متعدد تاریخی فروگذاشتیں پائی جاتی ہیں اور بعض ایسے بیانات ہیں جن کی تصدیق ان کتابوں سے نہیں ہوتی جن کا حوالہ دیا گیا ہے اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ آزادؔ نے ان کے بارے میں سنی سنائی روایات پر یا اپنے حافظہ پر اعتماد کیا اور کتاب کی تصنیف کے وقت اصل مآخذ کی طرف رجوع کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی، یا ان کتابوں کے کسی نوشتہ اور نقطہ کو اپنے گہربار قلم اور قوت متخیلہ سے بڑھا چڑھا کر کہیں سے

کہیں پہونچا دیا۔ وہ زمانہ کتابوں کی کیابی کا تھا اس لئے کوئی حیرت واستعجاب کی بات نہیں کہ اردو کے بعض بنیادی تذکرے ان کی نظر سے نہ گذرے ہوں مثلاً یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی ہے کہ میر تقی میرؔ کا تذکرہ نکات الشعراء ان کی نظر سے نہیں گذرا اور اس کے لئے "آب حیات" میں داخلی شہادتیں موجود ہیں صرف نکات الشعراء ہی نہیں، اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد کی نظر سے مصحفی کا تذکرہ بھی نہیں گذرا یا کم سے کم "آب حیات" کی تصنیف کے وقت وہ پیش نظر نہیں تھا۔

متعدد مقامات پر ان کے مذہبی جذبات یا ذاتی تعلقات غیر جانبدارانہ تاریخ نویسی کے تقاضوں پر غالب آگئے ہیں۔ اس طرح "آب حیات" اپنے مصنف کے دور تک بھی اردو شاعری کے تمام عہدوں کے باکمال شعراء کے پورے تذکروں پر حاوی نہ تھی اور بہت سے ایسے شعراء واساتذہ نظر انداز ہوگئے جو نظر انداز ہونے کے قابل نہ تھے۔"

(تفصیل کے لئے دیکھیں "گل رعنا" حکیم سید عبدالحی، چھٹا ایڈیشن ص۳۱تا۳۱)

یہ اقتباس اگرچہ قدرے طویل ہے تاہم اس سے حضرت مولانا علی میاں کی تاریخی، تحقیقی اور ادبی صلاحیت، اپنے تمام تر محاسن کے ساتھ ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ حضرت مولانا نے اپنے اسی مقالہ میں ادبی مزاج اور تاریخی مزاج کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا:۔

"ادبی مزاج اور تاریخی مزاج میں ایک طرح کا بعد اور ادبی تقاضوں اور تاریخی تقاضوں میں بعض اوقات تعارض پایا جاتا ہے، ادب تخیل پسند ہوتا ہے اور تاریخ حقیقت پسند، ادب اپنی پرواز کے لئے آزاد اور بے قید فضا چاہتا ہے، تاریخ اپنے سفر کے لئے ایک محدود اور ہموار راستہ، ادب تشبیہ واستعارہ اور تخیل سے آب ورنگ پیدا کرتا ہے اور تاریخ حوالوں، واقعات اور قدیم تحریروں کی پابندی سے گراں بار ہوتی ہے۔" (گل رعنا ص۱)

حضرت مولانا علی میاںؒ کا سب سے بڑا کارنامہ اقبالیات پر ان کی گراں مایہ عربی تصنیف "روائع اقبال" ہے جس کا اردو ترجمہ "نقوش اقبال" کے عنوان سے مشہور ادیب ومحقق مولانا شمس تبریز خاں نے کیا ہے اور ترجمہ کے فنی محاسن کا پورا حق ادا کیا ہے۔ حضرت مولانا کی اس تصنیف سے صرف دنیائے عرب میں ہی نہیں بلکہ برصغیر ہند وپاک کے ادبی حلقوں میں بھی انھیں زبردست قدر ومنزلت اور شہرت ونیک نامی حاصل ہوئی۔ علامہ اقبالؔ حضرت مولانا کے سب سے پسندیدہ شاعر تھے، اور ان سے انسیت اور وارفتگی کا یہ عالم تھا کہ سولہ سال کی عمر میں ہی اقبالؔ کی نظم "چاند" کا عربی میں ترجمہ کیا اور جون ۱۹۲۹ء میں لاہور میں ان سے ملاقات کے دوران انھیں جب دکھایا تو وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ اس کے بعد ۲۲ جون ۱۹۳۴ء کو علامہ اقبالؔ سے حضرت مولانا کی دوسری ملاقات ہوئی اور ان کے افکار وخیالات کو جاننے کا موقع ملا، جس سے انھیں محسوس ہوا کہ ان کے اور علامہ اقبالؔ کے خیالات میں بڑی یکسانیت ہے۔ اس سلسلہ میں موصوف کا یہ اعتراف قابل ذکر ہے:۔

"میری نشوونما اس عہد میں ہوئی جب اقبالؔ کا فن شہرت کے بام عروج پر پہونچ چکا تھا۔ سب سے بڑی چیز جو مجھے آپ کے فن کی طرف لے گئی وہ بلند حوصلگی، محبت اور ایمان ہے جس کا حسین امتزاج ان کے شعر اور پیغام میں ملتا ہے اور جس کا ان کے معاصرین میں کہیں پتہ نہیں لگتا۔ میں بھی اپنی طبیعت اور فطرت میں انہی تینوں کا دخل پاتا ہوں، میں ہر اس ادب اور پیغام کی طرف بے اختیارانہ بڑھتا ہوں جو بلند نظری، عالی حوصلگی اور احیاء اسلام کی دعوت دیتا اور تسخیر کائنات اور تعمیر انفس وآفاق کے لئے ابھارتا ہے۔ میری پسند اور توجہ کا مرکز وہ اس لئے ہیں کہ وہ بلند نظری، محبت اور ایمان کے شاعر ہیں، ایک عقیدہ، دعوت اور پیغام رکھتے ہیں اور مغرب کی مادی تہذیب کے سب سے بڑے ناقد اور باغی ہیں۔ وہ اسلام کی عظمت رفتہ اور مسلمانوں کے اقبال گذشتہ کے لئے سب سے زیادہ فکرمند، تنگ نظر قومیت ووطنیت کے سب سے بڑے مخالف اور انسانیت واسلامیت کے عظیم داعی تھے۔"

حضرت مولانا علی میاں علامہ اقبال کے معترف بھی تھے اور بے باک ناقد بھی تھے۔ تبھی حضرت مولانا نے انتہائی صاف گوئی سے ان کے بارے میں اپنے ان خیالات کا بھی اظہار کر دیا تھا:۔

"میں اقبالؔ کو کوئی معصوم ومقدس ہستی اور کوئی دینی پیشوا اور امام مجتہد نہیں سمجھتا اور نہ میں ان کے کلام سے استناد اور مدح سرائی میں حد افراط کو پہونچا ہوا ہوں، جیسا کہ ان کے غالی معتقدین کا شیوہ ہے...... اقبالؔ کے یہاں ملائی

عقیدہ و فلسفہ کی ایسی تعبیریں بھی ملتی ہیں جن سے اختلاف کرنا مشکل ہے۔ میں بعض پرجوش نوجوانوں کی طرح اس کا بھی قائل نہیں کہ اسلام کو ان سے بہتر کسی نے سمجھا ہی نہیں اور اس کے علوم و حقائق تک ان کے سوا کوئی پہنچا ہی نہیں..... ان کی ناقد شخصیت میں ایسے کمزور پہلو بھی ہیں جو ان کے علم و فن سے میل نہیں کھاتے اور جنہیں دور کرنے کا موقع انھیں نہیں ملا۔"

(نقوش اقبال ص ۴۳۔۴۲)

بہر حال روائع اقبال نے جب روح اقبال کا اردو جامہ پہنا تو علامہ اقبال کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:۔

"جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی فکرِ اقبال سے متعلق عربی مقالات یعنی "روائع اقبال" کی بیروت و دمشق میں اشاعت کے بارے میں میں نے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اب "نقوش اقبال" کی صورت میں خود مصنف کی نظرثانی اور رضامندی کے بعد اس کتاب کا اردو ترجمہ میری نظر سے گذرا..... آپ نے فکر اقبال کے مختلف پہلوؤں کو ایسے انداز میں پیش کیا ہے، جیسے انھیں اقبال محسوس کرتے یا چاہتے تھے۔ علامہ کی بڑی خواہش تھی کہ ان کا پیغام عربوں تک پہونچے۔ مگر عربی زبان میں عربوں کو پیغام اقبال سے روشناس کرانے کا امتیاز ایک ہندی مسلمان یعنی سید صاحب کے حصہ میں مقدر تھا۔"

حضرت مولانا علی میاں کی تصنیف "نقوش اقبال" کی اہمیت و افادیت کا اندازہ اس تصنیف میں شامل ممتاز و معروف ادیب اور ناقد پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مقدمہ کے اس اقتباس سے بخوبی ہو جاتا ہے:۔

"عربی زبان و ادب، نیز تحریر و تقریر میں موصوف (حضرت مولانا علی میاں) کو جو غیر معمولی درک ہے اور عالم اسلام کے دینی و ثقافتی مسائل پر جیسا عبور ہے اس کے سبب سے موصوف کے فرمودات کو ہندوستان ہی نہیں، باہر کے ممالک اسلامیہ میں جو وزن اور رفعت حاصل ہے، وہ موجودہ ہندوستان کے شاید ہی کسی عالم دین کے حصہ میں آئی ہو۔ اسی بنا پر سید صاحب کو ملت کا سفیر کبیر بننے کا حق پہونچتا ہے۔

میرا خیال ہے، مولانا پہلے عالم دین ہیں جنہوں نے موجودہ صدی کی اردو شاعری کے سب سے بڑے نمائندہ اور عظیم شاعر اقبال کی شاعری اور شخصیت کا مطالعہ غیر معمولی شوق اور بصیرت سے کیا ہے، ورنہ بیشتر علماء ہر جدید کو بالعموم مشتبہ ورنہ بڑی احتیاط سے دیکھنے کی طرف مائل رہے ہیں... سید صاحب کے ایک منفرد اور روشن خیال عالم دین اور شعر و ادب کے مبصر ہونے کی حیثیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ موصوف نے اقبال کی تائید و ترجمانی جس خوبی سے کی ہے اس سے میرے ایک دیرینہ خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ اقبال کا کلام ہمارے لئے اس صدی کا علم کلام ہے جو ایک نا معلوم اور طویل مدت تک تازہ کار رہے گا۔"

(نقوش اقبال ص۱۶)

حضرت مولانا علی میاں نے "نقوش اقبال" میں فکر اقبال کو کس خوبی اور خوش اسلوبی سے واضح کیا ہے اس تصنیف کے درج ذیل اقتباس سے اس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے:۔

"اقبال اپنی امید کوشی، آرزومندی اور رجائیت کے پیش نظر یہ توقع ظاہر کرتے ہیں کہ سیاسی صدمات اور مصائب اور حوادث و آلام نے اگرچہ عالم اسلامی کو گھیر لیا ہے، لیکن اس سے وہ بیدار بھی ہو گیا ہے اور اس میں نئی زندگی اور تازگی کے آثار پیدا ہو چکے ہیں..... یہ آثار ایسے ہیں کہ مسلمانوں کو شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی اور ان کی عظمت رفتہ ملنے والی ہے ؎

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی

اقبال کہتے ہیں کہ ان کی فطرت سیمابی اور ان کی طبیعت سراپا بے تابی ہے۔ وہ اگر آج اس کروٹ ہیں تو کل بیداری کی بھی کروٹ بدلیں گے ؎

جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیر سیمابی

ان کی نگاہ میں سرشک چشم مسلم صرف آنسو نہیں بلکہ ابر نیساں ہے جس سے دریائے خلیل سے لعل و گہر پیدا اور سیراب ہوتے ہیں۔ مسلمان ان کی نظر میں خدائے لم یزل کا دست قدرت اور زبان ہے اور ستارہ بھی اس کے کارواں کی گرد راہ ہیں۔ وہ چونکہ خدا کا آخری پیغام ہے اس لئے جاوداں اور ازل و ابد پر محیط ہے اور اس کی فطرت،

مکنات زندگی کی امین اور وہ اشیا کا پاسبان ہے اسلام اور زندگی ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں اس لئے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ بھی نوشتۂ تقدیر ہے ہے

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

اقبال مایوس کن مشاہدات اور تجربات کے باوجود ملت اسلامیہ سے کبھی ناامید نہیں ہوئے بلکہ اس کی صلاحیتوں اور اہلیتوں کے پیش نظر ہی کہتے رہے ہے

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

حضرت مولانا نے علامہ اقبال کے اہل عقیدہ اور شعری محاسن کی وضاحت کرتے ہوئے آگے لکھا ہے:۔

"اقبال کا یہ عقیدہ ہے کہ ادب میں اس وقت تک جان نہیں پڑتی جب تک کہ وہ اپنی زندگی اور توانائی دھڑکتے دل کی گہرائیوں سے نہیں حاصل کرتا اور خونِ جگر سے سیراب نہیں ہوتا۔ وہ ایک شعر میں اس وسیع مضمون کو ادا کر دیتے ہیں ہے

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

(نقوش اقبال ص۵۶)

اسی شعر کے سیاق و سباق میں یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ حضرت مولانا علی میاں ندوی علامہ اقبال کے علاوہ جگر مرادآبادی کے بھی زبردست مداح تھے، اور ان کی شاعری کو فنی اعتبار سے بلند اور برتر سمجھتے تھے۔ اس ضمن میں جگر مرادآبادی کے بارے میں حضرت مولانا کے درج ذیل تاثرات کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ حضرت مولانا جگر کو "خاتم المتغزلین" مانتے تھے:۔

"اردو میں جدیدیت کی تحریک سے کچھ پہلے جن سربرآوردہ غزل گو شعرا نے اردو غزل کو ایک نیا رنگ و آہنگ بخشا اور تعبیری رخ عطا کیا، ان میں اصغر وفانی کے بعد مولانا حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، شفیق جونپوری اور روش صدیقی بہت ممتاز ہیں۔ مگر خاتم المتغزلین جگر نے غزل کو جو نئی معنویت اور نئی جہت عطا کی، اس کا جواب نہیں۔ انھوں نے غزل کو جس طرح حقیقت و مجاز، زہد و رندی، مستی و ہشیاری، جنون و حکمت اور بے خودی و خود نگری کا آئینہ دار بنایا۔ وہ لافانی حیثیت رکھتا ہے۔

جگر صاحب کے بعد جن لوگوں نے یہ رنگ سخن اپنایا اور اسے ترقی دی، ان میں روش صدیقی، تسکین قریشی، عارف عباسی، فاروق بانسپوری، سید صدیق حسن اور حبیب احمد صدیقی کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ ان شعرا نے غزل کو رفعت و طہارت، پاکیزگی و برگزیدگی، سنجیدگی اور شائستگی کا جامہ پہنایا اور مجاز کے ساتھ حقیقت کے جلوے دکھائے۔ غم جاناں کے پہلو میں غم دوراں کو جگہ دی اور روایتی انداز سے الگ رہ کر نئے حالات و حادثات کی طرف بھی اشارے کئے۔"

(شمیم: شمیم جے پوری۔ مقدمہ از مولانا علی میاں ص۵)

جگر مرادآبادی اور تسکین قریشی کے رنگ و آہنگ میں غزل گوئی کو اپنا سرمایۂ افتخار سمجھنے والے شمیم جے پوری کا شعر و ادب میں اپنا ایک مقام ہے۔ حضرت مولانا علی میاں نے شمیم جے پوری کے شعری مجموعہ "شمیم" کے اپنے مقدمہ میں ان کے شعری محاسن کو اجاگر کرتے ہوئے لکھا ہے

"آج کل جگر اور تسکین کے رنگ میں غزل کہنے والوں میں شمیم صاحب کو پہلا مقام دینا ہوگا۔ وہ اب اردو کی تحری روایت کے وارث و امین اور ان محترم شعراء کے جانشین ہیں..... یہ جگر اور جگر اسکول کے شعراء کی شریفانہ شاعرانہ روایت کا تتمہ و ضمیمہ اور اس کی توسیع و تکمیل ہیں۔

شمیم صاحب کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی سادگی و صفائی، روانی و بے تکلفی، شستگی و شگفتگی ہے۔ اس میں عموماً مشکل الفاظ اور دشوار ترکیبوں سے بچا گیا ہے اور آسان عام فہم اور مروجہ شعری پیرایۂ بیان اختیار کیا گیا..... وہ غزل کی زبان اور اس کے لہجے کے رمز آشنا اور نکتہ شناس ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کے کلام میں نغمگی و شیرینی، دلکشی و رعنائی، سلاست و حلاوت ایک متوازن آہنگ اور ایک مترنم کیفیت کا احساس ہوتا ہے، اور ذوق و وجدان لذت یاب ہوتے ہیں۔"

(شمیم: شمیم جے پوری۔ مقدمہ مولانا علی میاں ص۵)

حضرت مولانا علی میاں ندوی نے غزل اور دیگر اصناف سخن کے مقابلہ میں نعت گوئی کو ہمیشہ ترجیح دی ہے، اور ناقدین سے یہ شکوہ بھی کیا ہے کہ ہمارے تنقید نگاروں نے اس کی طرف بہت کم توجہ دی ہے، جبکہ اس سے کم اہمیت کے اصناف سخن پر بہت کام ہوا۔ ان کو خوب داد دی گئی۔ لیکن اس فن کا حق ادا نہیں کیا گیا۔ حضرت مولانا نے نعت گوئی کو سب سے زیادہ مؤثر

جامع اور اعلیٰ صنفِ سخن قرار دیتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے:۔

"فارسی اور اردو شاعری کا مطالعہ عام ڈگر سے ہٹ کر انصاف اور حقیقت پسندی کے ساتھ کیا جائے تو شاید سب سے زیادہ طاقتور، سب سے زیادہ بھرپور صنفِ سخن "نعت" قرار پائے گی۔ تنوع اور مقدار و معیار کے اعتبار سے نمایاں اور ممتاز یہ صنفِ سخن اردو اور فارسی کی معروف روایتی ہیئتوں میں سے کسی ایک ہیئت و شکل کی پابند نہیں، بلکہ قصیدہ، مثنوی، مسدس، مخمس، قطعہ، غزل اور شاعری کی جدید ہیئتوں میں بھی قوت و تاثیر اور فنی خوبیوں سے بھرپور نعتیہ نمونوں کی کمی نہیں۔ نعت نگاری کا محرک دراصل محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مقدس اور قوی جذبہ ہوا کرتا ہے اور عشق کی آنچ میں تپ کر دل کی گہرائیوں سے نکلنے والا نالہ "لے" کا پابند نہیں ہوا کرتا۔ موضوع کے اس تقدس، جذبہ کے خلوص، محبت کی قوت، آتش شوق کی آنچ اور شعراء کی قدرت کلام اور فنی چابکدستیوں نے اس فن کو بام عروج پر پہنچایا۔"

(اردو شاعری میں نعت گوئی۔ شاہ رشاد عثمانی۔ مقدمہ مولانا علی میاں ندویؒ ص ۔)

جیسا کہ راقم الحروف نے اس مقالہ کی ابتدا میں قدیم و جدید دور کے بعض ایسے علماء و فضلاء کا ذکر کیا ہے، جو ادیب یا شاعر بھی تھے۔ اس سلسلہ کو کچھ اور آگے بڑھایا جائے تو ہمیں مولانا محمد احمد پھولپوریؒ اور مولانا قاری سید صدیق احمد باندویؒ جیسے متعدد علماء کے نام نامی اسم گرامی بھی نظر آتے ہیں، جو ممتاز و منفرد عالم دین ہونے کے ساتھ ہی شاعر بھی تھے، مولانا علی میاںؒ نے سراج الدین سراج، مظہر جان جاناں، خواجہ میر درد، حسرت، فانی، اصغر اور جگر کی صوفیانہ اور عشقیہ شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے مولانا محمد احمد پھولپوریؒ کے مجموعہ کلام "عرفان محبت" کے اپنے مقدمہ میں اضافہ کے طور پر اپنے تاثرات کا ان الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے:۔

"حضرت (مولانا محمد احمد پھولپوریؒ) کی دو خصوصیتوں سے ضرور واقفیت ہے اور ان کے چشم دید مشاہدہ کا شرف حاصل ہوا۔ ایک انتہائی سادگی و تواضع، شفقت بزرگانہ، بلکہ محبت پدرانہ و مربیانہ دوسرے بلند پایہ عارفانہ کلام اور حضرت جگر مرادآبادی کے اس شعر کا مشاہدہ اور چشم دید نظارہ ؎

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضان محبت عام سہی، عرفان محبت عام نہیں

حضرت کے یہاں عرفانِ محبت کا ہی نظارہ دیکھا۔ حضرت کے دیوان کا نام بھی کسی عارف نے صحیح طور پر "عرفان محبت" رکھا ہے .... ان کا کلام عشق و مستی سے بھرپور اور معرفت و محبت کا "شراب طہور" نظر آتا ہے۔ ان کے کلام میں عشق و محبت کا مضمون اور گرمی و سرمستی اتنی نظر آتی ہے کہ ان کے دیوان کا نام صحیح معنیٰ میں "عرفان محبت" ہی ہو سکتا ہے...... اردو کے بعض اساتذہ و شعراء کے اشعار نیز ہندی دوہوں پر مولانا کے بعض ترمیمی و اصلاحی شعر بھی ہیں جو لطف سے خالی نہیں۔ غرض اس مجموعہ کلام کو پڑھ کر اچھے اچھے حاضر باشوں کو بھی مولانا ہی کی زبان میں کہنا پڑتا ہے ؎

احمد تجھے نہ جانا نہ سمجھا تمام عمر
گو ساتھ جا رہے ہیں ترے آ رہے ہیں ہم"

(از مولانا محمد احمد صاحبؒ مشاہدات و تاثرات — مصنف مولانا شمس الحق ندوی ص۱۴۰تا۲۰۱)

یہ کس قدر حیرت و استعجاب کی بات ہے کہ برصغیر ہند و پاک کے ادبی حلقہ میں حضرت مولانا علی میاں ندوی کو ان کی تصنیف "روائع اقبال" (نقوش اقبال) کے سبب ایک ادیب اور ناقد کی حیثیت سے وہ قدر و منزلت حاصل نہ ہو سکی، جو مولانا محمد حسین آزاد کو "آب حیات"، مولانا الطاف حسین حالی کو "مقدمہ شعر و شاعری" اور مولانا شبلی نعمانی کو "شعر العجم" کے سبب حاصل ہوئی۔ اسی طرح مولانا سید سلیمان ندوی کو بھی ایک ادیب کی حیثیت سے وہ عزت و شہرت نہ ملی جس کے وہ بہر حال مستحق تھے۔ ادیب و ناقد علماء کے معاملہ میں یہ ایک ایسی نامناسب بے اعتنائی اور بے توجہی ہے جس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ماہنامہ "نیا دور لکھنؤ" کے فاضل مدیر شاہنواز قریشی نے "نیا دور" کے مارچ ۲۰۱۲ء کے شمارہ میں "اپنی بات" اداریہ میں بالکل درست اور برمحل تجزیہ کیا ہے:۔

"نامور علمائے دین کی مذہبی شخصیت کے علاوہ ادبی شخصیت بھی مسلم ہے۔ لیکن ان کی نگارشات کو محض مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے، جب کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی تحریروں کا ادبی تجزیہ بھی کیا جائے۔ یوپی اتر پردیش اکاڈمی کے ایک سمینار میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے عزت مآب جسٹس حیدر عباس رضا صاحب نے کہا تھا:۔ سید سلیمان ندویؒ نے معرکۃ الآرا کتاب "سیرت النبیؐ" لکھی۔ "سیرت النبیؐ"

کی ادبی حیثیت مسلم ہے لیکن اس جانب کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ جسٹس رضا صاحب نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی نگارشات کا ادبی تجزیہ کرنے کی ضرورت پر زور دیا" اور کہا کہ جہاں تک حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کی ادبی اہمیت اور ادبی حسن کا تعلق ہے اس کے سبھی معترف نظر آتے ہیں۔ اردو میں جدید ادب کے سب سے بڑے علمبردار ماہنامہ "شب خون" نے مولانا کی ادبی حیثیت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے۔ وہ اردو کے صاحب طرز نثر نگار بھی تھے، کلاسیکی اردو، فارسی ادب سے ان کی شناسائی صرف چند مشہور ناموں تک محدود نہ تھی۔ "نقوش اقبال" لکھ کر انہوں نے جدید ادب کی تنقید میں بھی ایک مقام حاصل کرلیا تھا۔ اردو شعر و ادب کے ارتقاء اور تاریخ دونوں پر مولانا کی گہری نظر تھی"۔

المختصر حضرت مولانا کی ادبی، تحقیقی اور تنقیدی حیثیت مسلم ہے۔ ان کی علمی و دینی خصوصیات کو اجاگر کرنے پر خوب سے خوب تر توجہ دی گئی۔ لیکن افسوس کہ ان کی ادبی و فنی صلاحیت کا تجزیہ کرنے پر جو خاطر خواہ توجہ دی جانا چاہئے تھی نہیں دی گئی۔ ان کی شخصیت اور ادبی خدمات کے موضوع پر بہر حال تحقیقی کام کرنے کا تقاضا شدت سے محسوس کیا جارہا ہے۔

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی
اگر بیزار ہو اپنی کرن سے

عالمِ ربانی کی یاد میں

کاملؔ جالی

حمدِ خدائے پاک سے کرتے ہیں ابتداء / کرتے ہیں اس کے بعد شہِ دیں کی ہم ثنا
جس وقت لائے اپنے تصور میں اس کو ہم / چلنے سے پہلے رو دیا قرطاس پہ قلم
بائیس ماہ رمضان مبارک جمعہ کا دن / بعدِ زوال پورا ہوا با صفا کا دن
قرآن پڑھتے پڑھتے وہ خاموش ہوگیا / رحمت کے جا کے سائے میں روپوش ہوگیا
گونجی خبر یہ ہوگیا ہر سمت پُرملال / سید ابوالحسن علی ندویؒ کا انتقال
تاریکیوں میں غرق ہوا ہیں یہ جہاں / صد حیف آج ہوگئی گل شمعِ ضوفشاں
عرب و عجم کی آج زمیں سوگوار ہے / شمس و قمر اداس فلک اشکبار ہے
تکیہ کی روح رونقِ ندوہ چلا گیا / ہمراہ اپنے لے کے اجالا چلا گیا
حاصل تھا اس کو علم و فراست میں وہ کمال / اس دور میں نظیر نہ جس کی کوئی مثال
علم و ادب میں تھا اسے حاصل جہاں کمال / اس دور میں وہیں تھا مؤرخ بھی بے مثال
ملت کے اتحاد میں کوشاں تھا صبح و شام / انسانیت کا دے گیا دنیا کو وہ پیام
اہلِ زبان اہلِ قلم صاحبِ نظر / دانائے رازِ راہِ طریقت سے باخبر
مسکیں نواز اور سلاطیں کا ہم نشیں / رفعت میں وہ فلک تھا تواضع میں تھا زمیں
روشن وہ اک چراغ تھا بیتِ بتولؓ کا / حسنی نسب تھا عالی چہیتا رسولؐ کا
شبنم کی طرح نرم تھا اپنوں پہ تھا نثار / باطل کے حق میں رہتا تھا ہر وقت شعلہ بار
موڑا نہ اپنا رخ کسی طاقت کے سامنے / سر خم ہوا نہ اس کا حکومت کے سامنے
جنتی گیا ہے اپنی تصانیف چھوڑ کر / رشتہ خدا سے اس میں گیا ہے وہ جوڑ کر
خدمت میں جاتا مصلحِ امت کی بار بار / آتا تھا اس کے قلبِ حزیں کو جہاں قرار
کرتا تھا دل سے حضرتِ احمدؒ کا احترام / کرتا تھا آ کے صابری منزل میں وہ قیام
حضرت بھی تکیہ ندوہ کا کرتے رہے سفر / دراصل باہمی یہ محبت کا تھا اثر
اللہ پاک دونوں ہی کا فیض بے بہا / ہم سب کو اپنے فضل و کرم سے کرے عطا
تکیہ کلاں میں دفن وہ ہوتا ہے خوش نصیب / پہلو میں یعنی شاہ علم اللہؒ کے قریب
تکیہ میں اک نمازِ جنازہ پڑھی گئی / حرمین میں بھی دوسری اس کی ادا ہوئی
اپنا بنا کے حضرتِ رابع کو جانشیں / رخصت ہوا جہاں سے وہ فردوس کا مکیں
اللہ پاک حضرتِ رابع کا مرتبہ / صبح و مسا بلند کرے دل سے ہے دعا
دریائے فیض آپ کا ہر سمت ہو رواں / سیراب ان کے فیض سے ہوتا ہے جہاں
صبرِ جمیل کر عطا پسماندگان کو / اجرِ عظیم کر عطا اس خاندان کو

خلدِ بریں میں اعلیٰ جگہ اس کو کر عطا
کرلے قبول اے خدا کاملؔ کی یہ دعا

ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے

حضرت مولانا کی محبت ووارفتگی

پروفیسر محمد اجتبا ندوی سابق صدر شعبہ عربی الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

دیارِ حبیبؐ، شہرِ آرزو، مرکزِ تمنا، منبعِ نور، چشمۂ رحمت، گہوارۂ علم و عرفان، حکمت و دانش، مخزنِ فیوض، اخلاص و وفا، صدق و صفا، جہدِ دعوت و صلاح و فلاح، انقلاب آفریں دار الہجرۃ، اور دلآویز و دلنواز، مردم گر و انسان ساز مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت، اس میں قیام، اس سے محبت، اس سے عشق، اس سے تعلق، اس سے وابستگی و شیفتگی، اس کے محبوبؐ پاک دل، پاکباز و محترم مکین، رہبرِ انسانیت، پیغمبرِ اخلاق، خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و پیغام کے لئے ایثار و قربانی، جاں نثاری و سرفروشی، دل سوزی و درد و تڑپ، بے قراری و بے چینی، بے آرامی و بے خوابی، اشک ریزی و گریہ و زاری، مخدوم معظم و مرشدِ جلیل حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا نمایاں وصف اور امتیازی شناخت تھی۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ جس نیک سیرت خانوادہ کے چشم و چراغ تھے اس میں تسلسل کے ساتھ پیغام محمدیؐ اور دعوت ابراہیمی کے لئے جذبہ و حوصلہ، جوش و محبت، اور حضور و سرور کی کیفیت جاری و ساری رہی، آنکھ کھولتے ہی سیرت رسولؐ، دعوت نبویؐ اور سنت مطہرہ پر عمل اور اس کا تذکرہ سنا اور دیکھا اور وہی عشق و محبت اور جذب و مستی، رگ و پے میں سما گئی، اور ہمہ وقت دل میں نور اور آنکھوں میں سرور اسی ذات گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار و فیوض سے جلوہ گر رہتا تھا، یہی نہیں بلکہ تعلیم و تربیت کا آغاز بھی قرآن مجید کے بعد سیرت نبویؐ ہی سے ہوا، اپنی محسن کتاب "رحمۃ للعالمین" کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"میرے برادر معظم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جو میرے والد کی وفات کے بعد اس وقت سے میری تعلیم و تربیت کے ذمہ دار رہے جب میری عمر نو سال کی تھی) اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ اس کم سنی اور نوعمری میں کن کتابوں کا مطالعہ میرے لئے مفید ہوگا اور کتابوں کے انتخاب میں توفیق الٰہی برابر ان کا ساتھ دیتی، چنانچہ انھوں نے مجھے ایک کتاب "سیرت خیر البشر" پڑھنے کے لئے دی، ان کی بڑی خواہش تھی کہ میں سیرت کی کتابوں کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کروں، ان کا عقیدہ تھا کہ کردار کی تعمیر، عقیدہ کی پختگی، اخلاق کی بالیدگی اور ایمان کی تخم ریزی و پرورش کے لئے سیرت سے زیادہ مؤثر کوئی چیز نہیں، اسی لئے شروع ہی سے سیرت کی کتابوں سے مجھے ایک خاص لگاؤ اور ان کے مطالعہ اور حصول کا جذبہ پیدا ہوگیا"

(کاروان مدینہ ص ۲۰-۱۹)

حضرت رحمۃ اللہ علیہ جس کتاب کا احسان کبھی بھول نہ سکے اور جو ان کی سیرت و کردار کے لئے سنگ میل اور روشنی کا مینار ثابت ہوئی وہ مولانا قاضی سلیمان منصور پوریؒ کی کتاب "رحمۃ للعالمین" تھی، فہرست کتب میں اس کا نام دیکھ کر منگانے کا آرڈر دیدیا، کم عمری میں رقم اور قیمت پر نظر نہیں جاتی، ڈاکیہ کتاب لے کر تکیہ کلاں آیا تو اس کا V.P. چھڑانے کے لئے پیسے نہیں تھے، والدہ معظمہ کو بیٹے کی اس کا علم نہ تھا، رقم پاس نہ ہونے کی وجہ سے کتاب لینے سے معذرت کردی، کوئی مددگار اور سفارشی بھی نہ تھا، لیکن بچہ کی ایک سفارش کو "ممتا" کبھی رد نہیں کرسکتی اور وہ ہے معصوم آنسوؤں کی سفارش، چنانچہ والدہ معظمہ کا دل بھر آیا، انکار آنسوؤں میں ڈھل گیا، کتاب بچہ کے ہاتھ میں تھی، یہی وہ آنسو اور گریہ و بکا تھا جس نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے والہانہ عشق اور ان کی دعوت و پیغام سے سرشار کردیا، کتاب کیا تھی اور اس کی تاثیر و دلپذیری کیسی تھی مولانا کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

"اب میں نے کتاب پڑھنا شروع کیا، اور کتاب نے میرے دل کو ہلا کر رکھ دیا، لیکن یہ کوئی تند و تیز ناگوار اور پریشان کن تحریک نہ تھی، یہ بہت نرم گداز اور روح پرور و جاں سوز تحریک تھی، میرا دل خوشی سے اس طرح جھوم اٹھا جیسے بادِ بہاری سے کوئی شاخ گل جھوم اٹھے اور پھولوں کے بوجھ سے لٹک جائے"

(کاروان مدینہ ۲۱-۲۰)

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب سے اپنی ہم آہنگی اور لطف و لذت اور روحانی کیف و مسرت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"یہ روح کی لذت ہے، کیا بچے روح نہیں رکھتے اور ان کو روحانی لذت کا احساس نہیں ہوتا؟ نہیں، بلکہ معصوم بچے بڑوں سے زیادہ لطیف روح کے مالک ہیں اور زیادہ صحیح شعور رکھتے ہیں، خواہ وہ اس کو بیان نہ کر سکیں۔" (ص۔۲۱)

اس سرور انگیز اور وجد آفریں کتاب میں سادہ دل اور معصوم بچے نے مکی و مدنی زندگی کے ایمان افروز واقعات پڑھے تو دل محبت و عشق سے لبریز ہوگیا اور جب ہجرت کے موقع پر ناقۂ نبوی قبا سے یثرب کی جانب روانہ ہوئی تو شہر کا ہر باشندہ اور ہر فرد اس محبوب مہمان کی میزبانی کا شرف حاصل کرنے کے لئے چشم براہ و فرش راہ بن گیا لیکن یہ عز و شرف حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو ملنا تھا، مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"میں اس عزت پر ابو ایوب انصاری رض کی مسرت کو پڑھ سکتا تھا جو تقدیر نے ان کے دروازے تک پہونچا دی تھی اور دیکھ سکتا تھا کہ وہ کس مسرت و گرمجوشی کے ساتھ آپ کی ضیافت کر رہے ہیں۔

میں نے ایسا محسوس کیا جیسے میرا دل مجھے چھوڑ کر اب ناقۂ نبوی کے ساتھ ساتھ ہے اور اسی کی ہم رکابی میں مدینہ پہونچا ہے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کہ یہ دلکش سماں میں اپنی ان آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، فاتحین و سلاطین اور تاریخ کے نامور قائدین کے فاتحانہ داخلے جاہ و حشم کے مظاہرے، اور چوب داروں کے نعرے مجھے اس وقت بالکل ہیچ اور ناقابل ذکر معلوم ہونے لگے، کسی انسان سے کسی انسان کی محبت و وفاداری کا یہ منظر میرے دل میں اور میرے حافظہ پر ہمیشہ کے لئے نقش ہوگیا۔" (ص۔۲۳)

کتاب "رحمۃ للعالمین" کی اثر آفرینی ہی تھی کہ محبت کے تمام مخفی سوتے ابل پڑے اور وہ معصوم دل محبت کی لذت سے آشنا ہوا جس نے اس بچہ کو ایک عظیم داعی، عالمگیر شخصیت، نامور مفکر، جلیل القدر عالم، ممتاز مصنف، دانشمند مربی اور روحانی و ربانی عارف و مصلح بنادیا، جس کی مثال صدیوں میں ملا کرتی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے واقعات، صحابہ کرامؓ کی گرویدگی، فریفتگی، ایثار و قربانی فدائیت و جاں نثاری، اتباع و فرمانبرداری، دعوت کے فروغ کے لئے منافست اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جذبہ و ولولہ، اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جد و جہد اور اس کی راہ میں جان، جان آفریں کے سپرد کر دینے کی آرزو، تمنا اور خواہش، کتاب نے ان کی جس مؤثر و سحر انگیز انداز سے تصویر کشی اور پیکر تراشی کی ہے اس نے آئندہ زندگی کو متحرک و فعال بنادیا، جس کی وجہ سے کتاب و صاحب کتاب کے لئے ہمیشہ سراپا شکر و سپاس رہے، فرماتے ہیں:

"اس کتاب اور صاحب کتاب کا میں دل سے شکر گذار ہوں اس لئے کہ اس نے میری محبت کے پرسکون ساز کو چھیڑ دیا اور اس بات کا بھی شکر گذار ہوں کہ اس نے اس ابھرتی ہوئی متحرک اور زندہ و بیدار محبت کا رخ اس شخصیت کی طرف پھیر دیا جس سے زیادہ محبت کا کوئی اور حقدار نہیں، جو اس کائنات میں حسن و احسان اور جمال و کمال کا سب سے بڑا پیکر ہے، اور جس سے زیادہ صورت و سیرت اور کمال ظاہر و باطن کا دلکش انسانی نمونہ خالق و مالک اور قادر مطلق نے کوئی اور نہیں بنایا (صلی اللہ علیہ وسلم)

(کاروان مدینہ ص ۲۵)

آخر میں بڑے درد کے ساتھ فرماتے ہیں اور مجسم احسان بن کر دست بدعا ہیں:

"اس امت کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ اس نے دل سے اپنا رشتہ توڑ لیا ہے، اور محبت کی لذت سے محروم ہے، اقبال نے بالکل صحیح کہا ہے:

شبے پیش خدا بگریستم زار
مسلماناں چرا زارند و خوارند
ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم
دلے دارند و محبوبے ندارند

خدا کی سلامتی ہو آپ پر اے سلمان! مجھے آپ کی کتاب سے دو ایسی نعمتیں حاصل ہوئیں کہ اسلام کے بعد ان سے بڑی کوئی اور نعمت نہیں، ایک محبت کی نعمت، دوسرے اس کے صحیح محل اور مصرف کی نعمت، اور واقعی یہ نعمت کتنی بڑی ہے!!" (ص ۲۶)

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے انھیں دونوں نعمتوں کی پرنور و ضیاپاش فضاؤں میں دعوت و اصلاح، فکر و تربیت کے میدان میں رہنمائی و سرپرستی فرمائی اور نبوی ورثہ کے بقاء و تحفظ اور اس کے فروغ و ارتقاء کے لئے بیش بہا کارنامے انجام دیئے، جو رہتی دنیا تک روشنی و رہنمائی کا فریضہ ادا کرتے رہیں گے۔

حضرت رحمہ اللہ کی تقریر و تحریر میں یہی والہانہ محبت اور سوز و عشق کی گرمی نمایاں رہتی تھی، اور ان کی دعوت و پیغام کا محور یہی محبت و اتباع سنت تھی، شمائل و سیرت کی کتابیں زیر مطالعہ رہتیں اور قوم و امت اور نئی نسل کو اس جانب متوجہ فرماتے اور اس کی کمی پر افسوس

وحسرت کا اظہار فرماتے، اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں :-

"یہ وہ سرچشمہ محبت ہے، جس سے سب سے زیادہ محروم ہمارا جدید تعلیم یافتہ اور مغرب زدہ طبقہ ہے، اور اس محرومی کا نتیجہ یہ ہے کہ آج اس کی روح سب سے زیادہ بے سرور وکیف ہے اس کے مادیت کی دلفریبیوں کے اندر مقابلہ کی طاقت سب سے کم ہے، وہ ملت کے دوسرے طبقوں سے زیادہ بے اثر وبے وزن ہے، اس کی زندگی سب سے زیادہ بے مکدر وبے لطف اور اس کی کوششیں سب سے زیادہ بے مقصد اور رائیگاں ہیں۔" (ص ۲۵)

حضرت مولانا رحمۃ اللہ نے ان تمام شخصیتوں اور مفکرین وصالحین سے انس وقرب محسوس کیا جنہیں حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نعمت حاصل ہوئی، جن میں ڈاکٹر محمد اقبالؔ بھی تھے جن کی فکری ہم آہنگی، بلند حوصلگی، محبت وایمان کے باوصف ان کے عشق رسولؐ اور ان کے کیف وسرور اور تڑپ ودلسوزی نے بہت زیادہ متاثر بھی کیا اور قریب بھی کیا اور اسی جذبے نے دوسرے تقاضوں کے ساتھ "نقوش اقبال" جیسی شاہکار کتاب رقم کرائی جو ادب کا شہ پارہ بھی ہے اور عشق وسرور اور جذب ومستی کا آئینہ بھی، فرماتے ہیں :-

"ڈاکٹر محمد اقبالؔ کی پوری زندگی عشق رسولؐ اور یاد مدینہ سے معمور تھی ان کا زندہ جاوید کلام ان دونوں کے تذکرے سے بھرا ہوا ہے لیکن آخری ایام میں یہ پیمانۂ عشق اس طرح لبریز ہوا کہ مدینہ کا نام آتے ہی اشکِ محبت بے ساختہ جاری ہو جاتے ..... وہ اپنے اس عزم کے باوجود بقعۂ مدینۃ الرسول میں حاضر نہ ہو سکے لیکن اپنے مشتاق اور بے تاب دل نیز اپنی قوت تخیل اور زور کلام کے ساتھ انھوں نے حجاز کی وجد انگیز فضاؤں میں بار بار پرواز کی اور ان کا طائر فکر ہمیشہ اسی آشیانہ یا آستانہ پر منڈلاتا رہا۔"

(نقوش اقبالؔ ص ۲۴۰)

حضرت مولانا رحمۃ اللہ نے بچپن ہی سے مکہ مدینہ، شعائر حرم، مقدس مقامات کے نام سنے، ان سے متعلق جذب وشوق، وہاں پہونچنے اور وہاں کی جاذب کشش اور وہاں ہی پیوند خاک ہو جانے کے جانفزا نغمے سنتے رہے، سن شعور تک یہ فرق نہ کر سکے کہ مکہ اور مدینہ دو الگ الگ محبوب شہروں کے نام ہیں، سیرت وتاریخ کے مطالعہ کے بعد نہ صرف شناخت ہوئی بلکہ ان کی اہمیت اور دنیا کی تاریخ بدلنے اور قوموں کی قسمت وتقدیر بنانے میں ان دونوں مقدس شہروں کے کردار ورول کا علم ہوا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۴۶ء سے قبل تک حجاز وعالم عرب کا سفر نہ کر سکے مگر اس کی تاریخ، علم وادب، فلسفہ وفکر، جدید رجحانات اور نئی تبدیلیوں اور حرمین شریفین کے کوائف، ارض وسماء اور گلی کوچوں سے اس طرح واقف ہو چکے تھے کہ گویا وہ وہاں ہی رہے بسے ہوں، لیکن مدینہ منورہ ومکہ مکرمہ سے محبت وانس اور اس کے مکینوں سے والہانہ تعلق ایسا تھا کہ پہلے سفر حج کے موقع پر مدینہ منورہ کی حاضری کے وقت دل بے چین اور قلب بے قرار ہو گیا اور بے اختیار قلم کو ذوق وشوق اور حضور وسرور کے پر لگ گئے، سنئے اور سر دھنئے :-

"نظر اٹھا کر دیکھئے یہ دونوں پہاڑوں کی قطاریں ہیں، کیا عجب ہے کہ ناقۂ نبوی اسی راستہ سے گذری ہو، یہ فضا کی دلکشی، یہ ہوا کی دلآویزی اسی وجہ سے ہے :-

ألا ان وادی الجزع اضحی ترابه
من المسك نورا داعواده رندا
وما ذاك الا ان هندا عشية
تمست وجرت فی جوانبه بردا

بیجئے مسجد آگئی، اب بئر علی (ذو الحلیفہ) کی باری ہے،

منزل دوست چوں شود نزدیک
آتشِ شوق تیز تر گردد

درود شریف زبان پر جاری ہے، دل وفور شوق سے امڈ رہا ہے، عرب ڈرائیور حیران ہے کہ یہ عجمی کیا پڑھتا ہے اور کیوں روتا ہے؟ کبھی عربی میں گنگناتا ہے، کبھی دوسری زبانوں میں شعر پڑھتا ہے، بھینی بھینی ہوا ہے اور ہلکی ہلکی چاندنی، جس قدر مدینہ قریب ہوتا جا رہا ہے، ہوا کی خنکی، پانی کی خیرینی اور ٹھنڈک لیکن دل کی گرمی بڑھتی جا رہی ہے، سنئے کوئی کہہ رہا ہے ؎

بادِ صبا جو آج بہت مشکبار ہے
شاید ہوا کے رخ پہ کھلی زلف یار ہے

....

وہ ایک بار ادھر سے گئے مگر اب تک
ہوائے رحمت پروردگار آتی ہے

....

عجب کیا گر مہ وپرویں مرے نخچیر ہو جائیں
کہ بر فتراک صاحب دولتی بستم سرِ خود را

....

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا!

....

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

....

داغِ غلامیت کرد رتبۂ خسرو بلند
میر ولایت شود، بندہ کہ سلطان خرید

....

محمد عربی کابروئے ہر دوسرا ست
کسے کہ خاک درش نیست خاک برسراد

قافلہ مدینہ طیبہ میں داخل ہورہا ہے جبل احد پر نظر پڑتے ہی رفقا سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں: "بسم اللہ اتریئے، وہ دیکھیے جبل احد نظر آرہا ہے، ذلک جبل یحبنا ونحبہ وہ سوادِ مدینہ کے درخت نظر آئے، کیا یہ وہی درخت ہیں جن کے متعلق شہید ی مرحوم نے کہا تھا:

تمنا ہے درختوں پہ ترے روضہ کے جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقید کا

وہ گنبد خضرا نظر آیا، دل کو سنبھالئے اور قدم اٹھائیے، یہ لیجئے مدینہ میں داخل ہوئے، مسجد نبوی کی دیوار کے نیچے نیچے باب مجیدی سے گذرتے ہوئے باب جبریل پر جا کر رکے، حاضری کے شکرانے میں کچھ صدقہ کیا اور اندر داخل ہوئے، پہلے محراب نبوی میں جاکر دوگانہ ادا کیا، گنہگار آنکھوں کو جگر کے پانی سے غسل دیا، وضو کرایا، پھر بارگاہ نبوی پر حاضر ہوئے اور صلوٰۃ وسلام پیش کیا۔"

(کاروان مدینہ ۴۳-۳۱)

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ذات نبوی سے محبت، وارفتگی اور والہانہ تعلق، اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم وہدایت کے خطوط کے مطابق تھا، توحید الٰہی کو ہمیشہ اور ہر آن پیش نظر رکھا، اور اپنی تمام تصنیفات اور سیرت سے متعلق نگارشات میں اس اصول توحید اور مقام رسالت کو بیان بھی فرمایا اور لحاظ بھی رکھا، اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت مولانا کو جس مقام بلند سے نوازا تھا، اس کی برکت سے انھیں حرمین شریفین کی بار بار حاضری نصیب ہوئی، وہ رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے بانی رکن تھے، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے بھی بانی رکن تھے، اس کے اجتماعات میں تقریباً ہر سال جانا ہوتا، مدینہ یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کے طور سے خطاب فرمایا، مکہ مکرمہ کے سیمیناروں اور کانفرنسوں میں بھی شرکت کی، کلید کعبہ کا شرف بھی حاصل کیا، اور اپنے اعزاز وتکریم کے جلسوں میں بھی میر مجلس رہے، مگر رب کعبہ اور سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آداب واحترام اور تعظیم وتکریم میں سنت مطہرہ کا پاس ولحاظ رکھا، ایک بار مکہ مکرمہ کے فضائل بیان کرتے کرتے یکدم سے چونک پڑے اور فرمایا: عالم انسانی پر تو سب سے بڑا احسان مکہ ہی کے مبارک ہونہار فرزند محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے جو بھی ترقی وکامرانی، شادمانی وکامیابی ہے وہ سب ہی تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا فیض ہے:

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
وہ سب پود انھیں کی لگائی ہوئی ہے

ہمیشہ ہی زبان مبارک توحید کے نغموں اور نعتیہ نظموں سے تر رہتی تھی، بارہا طواف کعبہ اور روضہ اطہر پر سلام پیش کرتے وقت رفاقت کا شرف حاصل ہوا، ایک بار درود وسلام پیش کرکے محراب نبوی سے متصل واپسی ہوئی، ایک شامی بزرگ نے مجھے مخاطب کرکے فرمایا کہ حضرت مولانا جس وقت سلام کے لئے حاضر ہورہے تھے تو میں نے عجب والہانہ انداز اور شوق وذوق دیکھا، مجھے یاد نہیں کہ کسی اور میں یہ کیف وحال محسوس کیا ہو، ۱۹۸۵ء میں میرا قیام مدینہ منورہ میں تھا، اطلاع ملی کہ حضرت رحمہ اللہ ہفتہ عشرہ قیام کے لئے مدینہ طیبہ آرہے ہیں، اس وقت باب السلام کے علاوہ کسی باب کی جانب سے کار مسجد نبوی تک نہیں جاسکتی تھی اور باب السلام تک پہونچنے کے لئے اجازت نامہ کی ضرورت تھی، حضرت مولانا کے پیروں کی معذوری کے پیش نظر میں نے اجازت نامہ حاصل کرلیا اور پورے دوران قیام پنجوقتہ نمازمیں بستان نور ولی سے باب السلام لانے لے جانے کی اور ساتھ بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی، اس دوران مسجد نبوی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جس والہانہ محبت، تعلق، ذوق وشوق، سرور وکیف، رقت وگریہ، دعوت دین، امت مسلمہ اور انسانیت کی ہدایت وفلاح کے لئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی دعاؤں، آنسوؤں، اور گنگناتے ہوئے الفاظ وکلمات میں درد، تڑپ، تضرع وابتہال، گریہ وزاری دیکھی اور محسوس کی مجھ جیسے بے مایہ وبے بضاعت اور سراپا معاصی کے لئے بیان کرنا ممکن نہیں، حضرت والا عرب وعجم کی تجدد پسندی اور مغرب زدہ نوجوانوں کے حال پر کف افسوس ملتے ہوئے فرماتے تھے کہ یہ دور وعصر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور ان کے پیغام سے وابستگی کے بغیر ترقی نہیں کرسکتا، اور نہ کوئی تحریک کوئی جماعت حب رسول اور ذات نبوی سے تعلق ووارفتگی کے بغیر کامیاب ہو سکتی ہے، خاص طور سے عربوں کی اس محبت اور اپنے اسلامی ورثہ سے بے نیازی پر پُرزور الفاظ میں تنبیہ

کرتے اور توجہ دلاتے تھے، ان کی کتاب "نبی رحمت" کا آخری باب "وما ارسلناك الا رحمة للعالمین" چھ پہلوؤں کی شکل میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات و کارناموں پر مشتمل ہے جس میں آپ نے سیرت کا عطر کشید کیا ہے، اسی طرح پندرہویں صدی ہجری، حقیقت اور تاریخ کے آئینہ میں" کے دس پہلوؤں میں محبت و اخلاص اور دعوت و پیغام کا خلاصہ پیش کر دیا ہے جو امت اور ہی نسل کے لئے مشعل راہ ہے۔

حضرت مولانا نے عالم عربی کی زبوں حالی پر نظر ڈالتے ہوئے اپنی پہلی معرکۃ الآراء تاریخ ساز کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" میں یہ عنوان قائم فرمایا تھا: محمد رسول اللہ عالم عربی کی روح ہیں۔ تحریر فرماتے ہیں:

"ایک مسلمان عالم عربی کو جس نظر سے دیکھتا ہے، اس میں اور ایک یورپین کی نظر میں زمین و آسمان کا فرق ہے، بلکہ خود ایک دین پرست عرب، عالم عربی کو جس نگاہ سے دیکھتا ہے وہ ایک مسلمان کی نگاہ سے بالکل مختلف ہے، مسلمان عالم عربی کو اس حیثیت سے دیکھتا ہے کہ وہ اسلام کا گہوارہ ہے، انسانیت کی پناہ گاہ ہے، عالمی قیادت کا مرکز ہے، روشنی کا مینار ہے، اس کا عقیدہ ہے کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم عالم عربی کی جان، اس کے عزت و افتخار کا عنوان، اور اس کا سنگ بنیاد ہیں، اگر اس سے محمد رسول اللہ کو جدا کر دیا جائے تو اپنے تمام قوت کے ذخیروں اور دولت کے چشموں کے باوجود اس کی حیثیت ایک بے جان لاشہ اور ایک نقش بے رنگ سے زیادہ نہ ہوگی، محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات ہے جن کی وجہ سے عالم عربی عالم وجود میں آیا" (ص ۴۳) بقول علامہ اقبال مرحوم

نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمد عربی سے ہے عالم عربی

اس کی ایک مثال اور پیش ہے:

"زمانے کی رت بدل گئی، انسان کیا بدلا، جہاں بدل گیا، زمین و آسمان بدل گئے، یہ سارا انقلاب اسی پیغمبر کی کوشش اور تعلیم کا نتیجہ ہے، آدم کی اولاد پر آدم کے کسی فرزند کا اتنا احسان نہیں، جیسا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا کے انسانوں پر ہے اگر اس دنیا سے وہ سب لے لیا جائے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو عطا کیا ہے تو انسانی تہذیب ہزاروں برس پیچھے چلی جائے گی اور اس کو اپنی زندگی کی عزیز ترین چیزوں سے محروم ہونا پڑے گا"

(کاروان مدینہ ص ۳۰)

سرکار دو عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ شیدائی، ان کے پیغام کا عاشق، ان کی دعوت کا وفادار حامل، اور ان کی سنت کا متبع داعی، جس کی زبان مبارک اس شعر کا ورد کرتی رہتی تھی ؎

صبا یہ جا کے تو کہیو مرے سلام کے بعد
کہ تیرے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

اب اپنے مولیٰ کے حضور میں حاضر ہو چکا ہے اور کیا عجب کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنی محبت و عقیدت، اخلاص و وفا، اتباع سنت اور خدمت دین اور درود و سلام کی اپنی سوغات پیش کر چکا ہو۔

اللھما اغفرلہ وارحمہ

ہند کا وہ رہنمائے مہرباں

جگن ناتھ آزاد

پھر سکون محفل ہند و ستاں کھویا گیا
ایک محبوب نگاہ این و آں کھویا گیا
دندناتی آئی یوں گلزار میں بادِ خزاں
مہر و الفت کا مہکتا گلستاں کھویا گیا
حضرت سید علی ندوی صداقت کا امیں
سایہ دار عظمت ہندوستاں کھویا گیا
کاروان روحانیت کا جس کے پیچھے تھا رواں
آج وہ اپنا امیر کارواں کھویا گیا
وہ کہ جس سے ہند و مسلم کو یکساں پیار تھا
ہند کا وہ رہنمائے مہرباں کھویا گیا
دیر والو! دیر کا جاتا رہا سچا حبیب
اے حرم والو! حرم کا پاسباں کھویا گیا
جو محبت میں، مروت میں، مودت میں رہا
زندگی بھر صورت روح رواں کھویا گیا
ہو گیا گم مجلس اخلاص تیرا رازدار
محفل تقدیس تیرا رازداں کھویا گیا
گو حقیقت ہے مگر دل کو یقیں آتا نہیں
ظلمتوں میں اک شرار جاوداں کھویا گیا

مسئلہ کا حل

اگر اس ملک کے مسلمان یہ فیصلہ کریں کہ ان کو اپنی نسلوں کے مستقبل کا تحفظ اور ان کی تعلیم کے مسئلہ کا حل ہر مسئلہ، ہر مفاد، ہر سہولت، ہر عزت، ہر خوشحالی اور ہر کامیابی سے زیادہ عزیز ہے تو یہ مسئلہ ایک دن میں حل ہو سکتا ہے۔

(حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رح اور عصری مسائل

۶/۱۳
۱۳۸۱/۷/۵

تحریر: مولانا سید محمد واضح رشید ندوی صدر شعبہ عربی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ـــ ترجمہ: ـ خالد فیصل ندوی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمہ اللہ کی زندگی کو محققین نے حضرت کی زندگی میں ان کے اعزاز میں منعقد استقبالی اور تعارفی جلسوں میں ان کی کتابوں کے رسم اجرا اور ان کے تعارف کے دوران، اور ان کی وفات حسرت آیات کے بعد تعزیتی جلسوں میں پیش کردہ مقالات اور تقاریر کے دوران، حضرت کی تعلیم و تربیت، ان کی علمی قابلیت و لیاقت، ان کی فکرسازی کے عوامل و محرکات، جماعتوں تحریکوں اور علمی اداروں میں ان کی شمولیت و شرکت، مختلف علمی و عالمی اداروں کی طرف سے انعامات سے ان کی سرفرازی، اور ان کی اور ان کی کتابوں کی مقبولیت و افادیت جیسے بیش بہا اوصاف کی روشنی میں پیش کیا ہے، بلاشبہ یہ صفات و کمالات کسی بھی شخصیت کی سیرت و ترجمانی کے بنیادی عناصر ہیں، اور یہی تفصیلات سیرت نگاروں اور محققین کا عام طور پر مرجع و مرکز رہتی ہیں اور یہی طریقہ کسی بھی ہمہ گیر و ہمہ جہت شخصیت کے سیرت نگاری و ترجمانی کا معروف و مشہور طریقہ ہے۔

حضرت مولانا رحمہ اللہ کے محبین نے مذکورہ طریقہ پر ہی حضرت کے سلسلہ میں اپنے مقالات اور مضامین میں خامہ فرسائی کی ہے، چنانچہ قاری کو ان سارے مقالات و مضامین میں یکسانیت اور بعض جگہ تکرار کا احساس ہوتا ہے، حضرت کے بعض متعلقین اور بعض سیرت نگاروں نے حضرت کی شخصیت اور ان کی خصوصیات و امتیازات کے اسباب و عوامل کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، اور حضرت کی سارے عالم میں غیر معمولی مقبولیت اور وسیع اور متنوع علمی خدمات اور مختلف تحریکات میں شمولیت اور امتیازی کردار ادا کرنے اور ان میں کامیابی حاصل کرنے کے اسباب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، یہ بات اس لئے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ حضرت رح کا زمانہ بڑے بڑے داعیوں، غیر معمولی صلاحیت کے حامل قائدوں، جید و جلیل القدر علماء اور مفکرین سے خالی نہ تھا، بلکہ یہ عہد ایسی بلند پایہ شخصیات سے معمور تھا، جنہوں نے تاریخ ساز کارنامے انجام دیئے اور اس عصر پر گہرے نقوش چھوڑے۔

حقیقت میں تعلیم و تربیت، معاصرین کے ساتھ سلوک اور زندگی کے مختلف مراحل اور معاشرہ کے مختلف افراد اور جماعتوں کے ساتھ مناسب رویہ زندگی کے کسی بھی شعبہ کی عظیم شخصیات کے لئے کامیابی اور ناکامی کا اہم عنصر ہے اور یہی چیز بین محققین کے نزدیک موضوع بحث اور مرکز تحقیق ہوتی ہیں۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ بعض انسانوں میں بہت سی ایسی خداداد صلاحیتیں ہوتی ہیں جو انسانوں کو علمی قابلیت کے حصول اور ایسے نظریات و تصورات کے انتخاب پر آمادہ کرتی ہیں، جو اس کے علمی معیار سے بلند اور اس کے معاصرین کی پہونچ سے بالاتر ہوتے ہیں، نیز یہی نظریات و تصورات اپنے حاملین کو بھی عظمت اور قبول عام کا درجہ عطا کرتے ہیں۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس ماحول کی تصویرکشی کی ہے، جس میں انھوں نے آنکھ کھولی، پروان چڑھے اور تحصیل علم میں ہمہ تن مصروف رہے، اس کا تذکرہ اپنی کتاب "کاروان زندگی" میں بڑے اہتمام کے ساتھ فرمایا ہے، نیز ان شخصیات کا ذکر جمیل بھی کیا ہے، جن سے حضرت نے استفادہ کیا، یا جن سے ملاقات ہوئی، اور ان سے تبادلہ خیال کیا، اور ان تحریکوں اور جماعتوں کا بھی ذکر کیا ہے، جن سے آپ وابستہ ہوئے، لیکن بعد میں ان سے علاحدگی اختیار کر لی، یا ان سے جزوی وابستگی رکھی حضرت مولانا رحمہ اللہ کی شخصیت و سیرت کا سنجیدہ قاری ان کے کمالات اور ان کی شخصیت سازی کے حقیقی اسباب و عناصر کا متلاشی ان کی اس امتیازی خصوصیت کا ادراک کر سکتا ہے، جس کی وجہ سے حضرت کی شخصیت اپنے تمام معاصرین میں ایک ممتاز و منفرد مقام رکھتی ہے، اور اسے یہ یقین کامل ہو جائے گا کہ وہ حقیقی و مرکزی صفت، جو حضرت مولانا رحمہ اللہ کی زندگی کے تمام مراحل میں بہت نمایاں ہے، وہ حضرت رحمہ اللہ کا تمام معاملات اور مشکلات میں فراست ایمانی سے کام لینا ہے، یہ فراست ایمانی بسا اوقات حضرت مولانا رحمہ اللہ کو ایسے خیالات و نظریات کے اختیار کرنے پر آمادہ کرتی تھی، جو ان کی نرم طبیعت کے مخالف اور دوسرے قائدین کے تصور کے برعکس ہوتے تھے، یہ حقیقت تسلیم شدہ ہے

کہ ان میں نرم مزاجی، کشادہ قلبی، علم و بردباری، دوسروں کا پاس و لحاظ، تواضع و انکساری، اور اپنے بڑوں کی رائے کا احترام حد سے زیادہ موجود تھا، لیکن انسانیت اور امت مسلمہ کو درپیش مسائل اور آزمائش کے وقت وہ اپنے موقف پر بالکل غیر لچکدار رویہ اختیار فرماتے اور اس کے سلسلہ میں شمشیر براں بن جاتے کہ دوسرے مفکرین کے نظریات نہ ان کو منزل کرتے اور نہ ہی ان کی ہمت پست کرتے چنانچہ بغیر کسی ادنیٰ سی مدافعت کے وہ اپنی رائے پر قائم رہتے اس قسم کے واقعات ان کی حیات مستعار میں بارہا پیش آئے، عام قائدین اور دانشوروں نے ابتدائی مرحلہ میں ان کی بعض آراء سے شدید اختلاف کیا، اور ان کی پرزور مخالفت اور ان کے موقف کی تردید کی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی سیرت کا طالب علم، ان کے بے لچک رویہ اور ان کی بے مثال جرأت و استقامت کا اعتراف کرے گا، حضرت مولانا رحمہ اللہ بادشاہوں اور سربراہان حکومت کے سامنے اپنے موقف و نظریہ سے نہ ہندوستان میں، اور نہ ہی بیرون ہند ذرا بھی پیچھے ہٹے، انھوں نے جس بات کو حق سمجھا اس کو حق ہی کہتے رہے اور اسی پر ثابت قدم رہے، کچھ عرصہ کے بعد ان کی رائے کی تصویب کی گئی، اور حالات نے اس کی صداقت کی توثیق کی، پہلی مثال مصطفیٰ کمال اتاترک سے متعلق ہے، حضرت مولانا رحمہ اللہ نے ترکی سے واپسی کے بعد یہ موقف اختیار فرمایا کہ مصطفیٰ کمال، غازی اسلام کے بجائے انگریزوں کا آلہ کار، اسلام کا دشمن اور مسلمانوں کا سخت مخالف شخص تھا، اس دور کے علماء اور مسلمان قائدین نے اس کو اسلام کا غازی اور انگریزی استعمار سے نبرد آزمائی کا ہیرو قرار دیا تھا، اور حضرتؒ کی رائے پر ان علماء و قائدین نے سخت برافروختگی کا اظہار کیا، اور بعض قریبی حلقوں کے علماء نے پرچوں میں حضرت کے مطبوعہ مقالات پر سخت تنقید کی، لیکن حضرت مولاناؒ اپنی رائے پر آخری وقت تک قائم رہے، اپنے موقف میں کوئی تبدیلی آنے نہیں دی، بعد میں یہ بات ثابت ہوگئی کہ حضرتؒ کا موقف ہی درست تھا، معاہدہ "لوزان" کی افتاد سے لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں، حضرت مولانا کی مصطفیٰ کمال کے بارے میں رائے اور اس کے دلائل، حضرت کی معرکۃ الآراء تصنیف "مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" اور ان کی خود نوشت سوانح حیات "کاروان زندگی" میں محفوظ ہے، بعد میں مصطفیٰ کمال کے بارے میں کئی تحقیقی کتابیں شائع ہوئیں، جن میں ان کے آلہ کار ثابت ہونے کی تفصیلات ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد بعض لیڈروں نے ہندوستانی تہذیب کے اختیار کرنے اور ہندوستانی سورماؤں کی تقدیس و تعظیم کا آوازہ بلند کیا اور اس سے مسلمانوں میں اسلامی اسپرٹ کی بیخ کنی اور اسلامی تہذیب و تمدن سے دوری و بے اعتنائی کا خطرہ پیدا ہوگیا، تو حضرت مولانا رحمہ اللہ نے اس کا ادراک کیا، خصوصاً تقسیم ہند کے بعد اس کی خطرناکی کا زیادہ احساس فرمایا، کیونکہ تقسیم ہند کی وجہ سے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد پاکستان منتقل ہو چکی تھی، فرقہ وارانہ فسادات نے مسلمانوں کے حوصلے پست کر دیئے تھے، دوسری طرف ارتداد کی ایک لہر اٹھ رہی تھی، ہندوستان کے بعض علاقوں میں "شدھی تحریک" کا زور تھا چنانچہ حضرت مولانا رحمہ اللہ اس خطرۂ عظیم سے نبرد آزمائی کے لئے پوری قوت کے ساتھ آگے بڑھے، اور اس تحریک کے لیڈروں پرشوتم داس ٹنڈن اور سمپورنانند کے نام خطوط لکھے، اور مسلمانوں کے تشخص کے استحکام و بقاء، اتباع شریعت کی ترغیب، اور مسلمانوں کے مذہبی مقامات کی حفاظت کے لئے پمفلٹس اور کتابچے تحریر کئے۔

حضرت مولانا رحمہ اللہ نے آزادی ہند کے بعد فکری کجی، اخلاقی بگاڑ، زوال انسانیت اور عروج، مادیت کا مقابلہ حکمت و فراست اور دور بینی سے کیا اور بڑے مؤثر انداز سے مسلمانوں اور برادران وطن کو مخاطب کیا، اور منفی تبدیلیوں کی پرزور مذمت کی، یہاں ان کی تقریر کے بعض جملے نقل کئے جا رہے ہیں، انھوں نے پراچین تہذیب و تمدن کے احیاء کی دعوت پر سخت نکیر کرتے ہوئے فرمایا کہ:

✓ "آج ہر جگہ اور ہر قوم میں پرانی تہذیب و تمدن کے احیاء کا رجحان عام ہو رہا ہے بعض لوگ دو ہزار سال قبل کی تہذیب کو زندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو کچھ دیگر لوگ چار ہزار برس قبل مسیح کی تہذیب کی واپسی کی سعی لاحاصل کر رہے ہیں، یہ نعرہ بڑے شد و مد کے ساتھ ان ملکوں میں بلند کیا جا رہا ہے، جہاں استعماری قوتوں سے حال ہی میں آزادی ملی ہے، اسی طرح آج قومی اور نسلی عصبیتوں کا زور ہے، اور اس منفی عصبیت کے بیماروں کا خیال خام یہ ہے کہ ان کی تہذیب اور ان کی نسل، دوسروں سے افضل و برتر ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا رحمہ اللہ وطنی، لسانی اور تہذیبی نعرے بازیوں کے سخت مخالف اور ناقد تھے، اس رجحان کو انسانیت

کے لئے خطرۂ عظیم تصور کرتے تھے، خواہ یہ نعرہ کسی اسلامی ملک یا کسی غیر اسلامی ملک میں بلند کیا جائے، کیونکہ یہ نعرہ نوع انسانی کے مختلف طبقات کے درمیان عداوت کی خلیج حائل کرنے والا تھا، جب یہ نعرہ اسلامی ملکوں میں بلند کیا گیا تو حضرت مولانا رحمہ اللہ نے پوری شدت کے ساتھ اس کی مذمت کی اور اس کے تدارک کے لئے سینہ سپر ہو گئے، اس کی تردید میں کتابچے، پمفلٹس اور کتابیں تصنیف فرمائیں، جلسوں اور اجتماعات میں موثر تقریریں کیں، نسلی، تعصبی اور لسانی عصبیتوں کے خطرہ سے دنیا کو آگاہ فرمایا، انسان کئی خانوں اور گروپوں میں منقسم تھے اور خون کی ارزانی ہی ارزانی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان کی بدولت انسان آپس میں محبت کرنے والے بھائی بن گئے۔

✓ زبان و ثقافت کی بنیاد پر تقسیم و تفریق، قومی مسائل و مشکلات کا حل بادر کیا جاتا ہے لیکن حضرت مولانا رحمہ اللہ اس کو انسانیت اور قومیت کے لئے خطرہ تصور کرتے تھے، قومیت کی دعوت، عرب ملکوں میں بغاوتوں اور انقلابات کے بعد عام ہوئی، اس دعوت کے علمبردار یورپی ملکوں کے تعلیم یافتہ مسیحی عرب نوجوان تھے ان لیڈروں میں میشیل عفلق سب سے زیادہ پیش پیش تھے، یہ دعوت، مصر، شام اور عراق میں خوب پھلی پھولی تو حضرت مولانا رحمہ اللہ نے ایک پمفلٹ "عالم عربی کے لئے سب سے بڑا خطرہ" کے عنوان سے تحریر فرمایا جس میں قومیت عربیہ کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:۔

"غیر مسلم مفکرین نے اس فلسفۂ قومیت کو جس چابک دستی اور ذہانت سے مرتب کیا ہے، اور اس میں جس طرح علمی (سائنٹفک) انداز فکر پیدا کیا گیا، اور اس میں ایک عرب تعلیم یافتہ نوجوان کے لئے (جو احساس برتری کے نشہ سے سرشار ہے) جو کشش پائی جاتی ہے، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے ہوگا جو میشیل عفلق کی کتاب "فی سبیل البعث" سے اخذ کئے گئے ہیں، جس کو اس تحریک دعوت کا صحیفہ کہنا صحیح ہوگا۔

"اسلام کو نقاب اور غالب ہونے میں جو اتنی تاخیر ہوئی، وہ در اصل اس وجہ سے تھی کہ عرب اپنی ذاتی کوشش اور جد وجہد اور دنیا کے باہمی تجربات کی روشنی میں محرومی و مہجوری کی بہت سی آزمائشوں اور امید و بیم کی کشاکش سے نکل کر حقیقت تک پہونچ جائیں، یعنی ایمان خود ان کے اندر سے پیدا ہو، جس کی بنیاد ذاتی تجربہ ہو، اور وہ زندگی کی گہرائیوں سے وابستہ حقیقی ایمان بن سکے، اس لحاظ سے اسلام ایک عربی تحریک تھا اور اس کے معنی عربیت کی تجدید و تکمیل۔ اس لئے" وہ معنی جس کو اس اہم ترقی اور تغیر کے اس اہم تاریخی دور میں اسلام واضح کر رہا ہے یہ ہے کہ ساری قومیں عربوں کی طاقت بڑھانے اور ان کو ترقی دینے پر صرف کی جائیں اور ساری قومیں عرب قومیت کے دائرہ کے اندر محصور ہوں۔"

حضرت مولانا رحمہ اللہ اس حقیقت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ صدر صدام حسین کا تعلق شروع سے مشہور قوم پرست عرب تحریک "البعث العربی" سے رہا ہے، جس کے صدر شامی عیسائی پروفیسر میشیل عفلق تھے، جنہوں نے زندگی کے آخری ایام احترام و اعتماد کے ساتھ عراق ہی میں گذارے، موت سے پہلے ان کے اسلام قبول کرنے کی روایت غالباً سیاسی مصلحت سے مشہور کی گئی ورنہ وہ مسیحی ان کو نصرانیت کی خدمت کا تصدیق نامہ دے چکا تھا) بقول ایک عرب فاضل کے کہ "وہ انتقال کے بعد مسلمان ہوئے"۔

اس تحریک کا آغاز ۱۹۴۳ء سے ہوا اور ۱۹۴۷ء میں وہ ارتقاء اور عروج کے مرحلہ پر پہونچی، اس تحریک کا بنیادی مقصد اور فلسفہ یہ ہے کہ "عرب بذات خود ایک وحدت (اکائی) ہیں، ان کے درمیان جو دینی، اعتقادی، ثقافتی اور سیاسی امتیازات ہیں، وہ سب مصنوعی اور عارضی ہیں، جو عرب احساس قومیت کی بیداری کے بعد خود بخود زائل ہو جائیں گے، اس تحریک و جماعت کا نعرہ اور دستور العمل ہے کہ عرب ایک مستقل واحد امت ہیں جو ایک دائمی پیغام رکھتے ہیں۔"

یہ تحریک عربوں کو قبل اسلام دور (جاہلیت عربیہ) کی طرف لے جانا چاہتی ہے، جب ان کے پاس نیا دین آیا تھا اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت وہ آخری پیغام ربانی اور اس کی شریعت سے روشناس ہوئے تھے، یہ تحریک دور جاہلیت کے سورماؤں کو اپنا ہیرو سمجھتی ہے، جن کا عربی کی جاہلی شاعری اور تاریخ میں عظمت کے ساتھ نام آیا ہے، اور وہ ان پر فخر کرنے اور ان کے نام کو زندہ رکھنے کی تلقین کرتی ہے، اس کے ارکان نے اسلام سے مستغنی ہو کر اپنی زندگی کے لئے ایک نیا اصول اور فلسفۂ حیات وضع کیا ہے جو آزاد قومیت عربیہ اور سیاسی و مادی اغراض سے میل کھاتا ہے، چنانچہ حضرت مولانا رحمہ اللہ شام جیسے شاندار اسلامی تاریخ رکھنے والے ملک میں "بعث پارٹی" کی حکومت کے زیر سایہ بعثی فلسفہ کے اثرات و افادات کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

✓ "بے تکلف مسجدیں گرائی گئیں، اہل دین اور اہل علم کو ملک چھوڑ کر باہر جانا پڑا، اور

اسلام پسند تحریکوں اور جماعتوں پر پابندی عائد کی گئی، نیز عراقی حملہ کے بعد کویت میں بھی اس پارٹی کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں اور اسی کا خطرہ ہر اس ملک میں ہے، جو خدانخواستہ اس کے زیر اقتدار ہو جائے۔"

حضرت مولانا اس تحریک پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:-

"ان سب قومی تحریکوں کے مقابلہ میں کسی عرب قوم کی قوم پرستی کی تحریک زیادہ خطرناک اور زیادہ سنگین نتائج کی حامل اس لئے ہے کہ وہ ان کو قدیم جاہلیت کے احترام اور اپنے آباء و اجداد کی تعظیم و تکریم کی طرف لے جا سکتی ہے، باکم سے کم اس کی نفرت اور حقارت کو کم کر سکتی ہے، جس کو قرآن مجید نے کفر کے ایک معیاری دور کے طور پر پیش کیا ہے اور جس کی قباحت اور اس کے ساتھ نفرت کو مختلف طریقوں سے ابھارا ہے۔"

حضرت مولانا رحمہ اللہ نے قومیت عربیہ کے فتنہ کو اس کے آثار نمایاں ہونے سے پہلے ہی، محض اپنی ایمانی فراست کے ذریعہ محسوس کر لیا، اور اس کو عالم عربی کے لئے سب سے بڑا خطرہ سمجھا، کیونکہ قومیت انسان کو تقسیم کرتی ہے، عصبیتوں کو جنم دیتی ہے اور مختلف طبقات اور گروہوں کے درمیان عداوت و دشمنی کا بیج بوتی ہے اور تقسیم در تقسیم کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل پڑتا ہے، چنانچہ ادھر ماضی قریب میں دنیا میں قومیت کی بنیاد پر کئی سلطنتیں وجود میں آئیں، فی الواقع یہ تحریک تمام انسانیت کے لئے خطرناک ہے، یورپ میں گرجا کے غلبہ والی جابرانہ حکومت اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف رد عمل کی صورت میں اس رجحان کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

دین و اخلاق کے متوازی نظریہ قومیت کے خطرہ کے خلاف حضرت مولانا رحمہ اللہ کا یہ مذکورہ موقف ابتدا ہی میں خطرہ کا احساس و ادراک کر لینے کی صلاحیت کا ثبوت ہے، ابتدائی مرحلہ میں دیگر علماء اور زعماء اور مفکرین اس خطرہ کو نہ بھانپ سکے اور نہ ہی حضرت کے موقف کی تائید کر سکے لیکن جب پانی سر سے اونچا ہو گیا، اور حالات بد سے بدتر ہو گئے، نظریۂ قومیت کے برے آثار ظاہر ہونے لگے، دنیا نے اس الحادی نظریہ کی تباہیاں اور بربادیاں بچشم خود دیکھ لیں، اور نظریہ قومیت کے زیر اثر ممالک میں عرصہ دراز کے بعد اس کے خلاف آوازیں اٹھنے لگیں تب علماء قائدین اور مفکرین نے، حضرت مولانا رحمہ اللہ کے موقف کی تائید کی، ان کی دور بینی کے قائل ہوئے اور اس تحریک کے خلاف حضرت کے اقدام کو سراہا اور داد تحسین پیش کی۔

حضرت مولانا رحمہ اللہ نے اپنی ایمانی فراست کی بدولت صدر صدام حسین، جمال عبدالناصر اور کمال اتاترک کے خلاف اپنے نظریہ و موقف کی طرح ہی کرنل معمر قذافی کی حکمرانی کے خلاف بھی رائے قائم کی لیکن اس مرتبہ بھی مسلم زعماء اور اہل فکر کرنل قذافی کی نام نہاد اصلاحات کی مسموم (زہریلی) لہروں کو محسوس نہ کر سکے، اور ان لوگوں نے اس کو سامراج کا دشمن، اسلام کا ہیرو اور اسلام اور مسلمانوں کا نجات دہندہ تصور کیا، لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ عوام و خواص کی رائے تبدیل ہوتی گئی اور بالآخر یہ لوگ حضرت مولانا رحمہ اللہ کے موقف کی درستگی، اور ان کی فراست ایمانی کے قائل ہوئے، حضرت مولانا تحریر فرماتے ہیں:-

"حقیقت یہ ہے کہ کرنل معمر قذافی کی فکر میں انقلابیت کا شروع سے غلبہ رہا انھوں نے جو اقدامات کئے وہ انقلاب کی روح سے متاثر تھے، جمال عبدالناصر کے انتقال کے بعد سے خاص طور پر ان کو عالم عربی میں خلا محسوس ہوا، جس کو پُر کرنے کے لئے انھوں نے صرف اپنے کو اہل پایا اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے وہ برابر کوشاں رہے، نیز اس نے ابتدا ہی سے یہ اندازہ لگا لیا کہ یہ عہد اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا عہد ہے، اس لئے اس شروع سے اپنے کو اس نشأۃ ثانیہ کا قائد تصور کر لیا، لیکن انقلابی ذہن، تربیت و تعلیم کی کمی، مغربی افکار کے اثر سے، جن کے سایہ میں ان کی پرورش ہوئی تھی، لیبیا کی دولت اور اس کی سیاسی، جغرافیائی اور اقتصادی اہمیت کے باعث اور حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کی وجہ سے اس نے یہ تصور قائم کر لیا کہ وہ اسلام جو کتاب و سنت سے ماخوذ ہے، اس انقلابی عہد کا ساتھ نہیں دے سکتا، اس لئے اس نے اسلام کو اپنے انقلابی ذہن کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کی تاکہ اس سے وہ ایسے اسلام کا ایڈیشن تیار کر لے، جو اس عہد کے پورے مغربی نظام کے ساتھ چل سکتا ہو۔"

اسی طرح سے مغربی تمدن کے سلسلہ میں حضرت مولانا رحمہ اللہ کا موقف منفرد اور جداگانہ تھا، ان کا موقف دیگر علماء کرام اور مفکرین عظام کے نظریہ سے یکسر مختلف تھا، حضرت مولانا رحمہ اللہ کا موقف بحث و تحقیق کا موقف تھا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ مغربی تمدن کی ہر قابل قبول چیز کو قبول کر لیا جائے جو اسلامی ممالک اور معاشرہ کے لئے مفید اور اس کے عقیدہ و نظریہ سے ہم آہنگ ہو لیکن اسلام کی روح اور اس کی تعلیمات کی منافی چیز سے

قطعی کنارہ کشی اختیار کی جائے، حضرت مولانا رحمہ اللہ نے مغربی تہذیب کے سلسلہ میں میانہ روی کی دعوت دی ہے چنانچہ حضرت رحمہ اللہ اپنی شہرہ آفاق تصنیف "مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" میں مغربی تہذیب پر محققانہ نظر ڈالنے اور اس کے نتائج پر گفتگو کرنے کے بعد رقم طراز ہیں :-

"اسلامی شخصیت اور ملت مسلمہ کے وجود کے لئے مغربی تمدن کے خطرناک ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زندگی کی سہولتوں سے استفادہ اور مغرب کی دریافت کردہ سائنس اور ٹکنالوجی، ایجادات و تفریح و سہولت کے وسائل کو مطلق حرام کہہ دیا جائے، اور یہ دروازہ بالکل بند کر دیا جائے، اسلام ہمیشہ سے وسیع ذہن کا مالک اور ہر صالح اور مفید شئے سے استفادہ کرنے کے سلسلہ میں فراخدل اور کشادہ چشم رہا ہے اور رہے گا، لیکن اس معاملہ میں مغربی تمدن کا مفہوم آلات و ایجادات اور زندگی کے مفید تجربات سے استفادہ سے زیادہ وسیع معنوں پر مشتمل ہے اور وہ افکار و اقدار اور مفاہیم و مطالب بھی اس میں شامل ہیں، جن پر مغربی تہذیب کی بنیاد ہے، پوری زندگی کو مغربی رنگ اور تمدنی منصوبہ بندی کا تابع کرنا اسی طرز حیات کو اپنانا، جو اسلامی معیار طہارت و نظافت اور اعتدال و میانہ روی کی روح سے بے گانہ ہے، آداب شریعت اور سنت نبوی پر عمل کی راہ میں بھی رکاوٹ بن جاتا ہے، اور اسلامی زندگی سے بھی بہت دور کر دیتا ہے۔"

حضرت مولانا رحمہ اللہ بعض واقعات اور مسائل کے سلسلہ میں بہت ہی واضح اور سخت موقف اختیار فرمایا کرتے تھے کہ اس کی شدت اور اہمیت کا اندازہ ان کے ان قریبی لوگوں کو بھی نہیں ہو پاتا تھا، جو ان کے افکار و خیالات اور تصورات کے ہم خیال اور ان کے پروردہ تھے، ان سبھوں کا خیال ہوتا تھا کہ معتدل موقف اور مسئلہ میں غور و فکر اور انتظار و مہلت ہی مناسب اور بہتر ہے، سخت موقف، ان کے اور ان کے ماتحت چلنے والے اداروں کے مصالح کے ناموافق اور منفی نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہوگا، چنانچہ "وندے ماترم" کے سلسلہ میں ان کا موقف، ان کے شدید تر موقفوں میں سے ایک ہے، جب موجودہ حکومت نے بت پرستانہ گیت اور سرسوتی کے مجسمے کے سامنے سرنگوں ہونے پر اصرار کیا تو حضرت مولانا رحمہ اللہ نے سرکاری اسکولوں سے مسلمان بچوں کے نکال لینے کی ہدایت جاری فرمائی۔

بعض لیڈروں نے اس مسئلہ میں ان کے سخت موقف پر دھمکی آمیز بیانات جاری کئے اور بعضوں نے ان کو "غدار وطن" قرار دے کر ان کی جلاوطنی کا مطالبہ کر ڈالا، نیز بعض شدت پسند عناصر نے ان کے پتلے نذر آتش کئے اور رات کی تاریکی میں ان کی رہائش گاہ پر شب خون مارا، دوسری طرف بعض مسلم لیڈران نے اس معاملہ کی اہمیت کو کم کرنے کی اپنی سی کوشش کی اور اسے معاملہ کو معمولی اور بے ضرر ثابت کرنے کے لئے اپنے بیانات جاری کئے، لیکن حضرت مولانا رحمہ اللہ کے پائے ثبات میں ذرہ برابر بھی جنبش نہ ہوئی بلکہ اپنے موقف سے ایک انچ بھی نازل نہ فرمایا حالانکہ حضرت مولانا رحمہ اللہ ان دنوں شدید مرض کی وجہ سے بہت ہی نحیف اور کمزور ہو گئے تھے، گفتگو میں دشواری محسوس کرتے تھے، لیکن صحافیوں کے سامنے اپنے موقف کو پوری قوت و طاقت کے ساتھ واضح کیا اور دوٹوک انداز میں فرمایا کہ مسلمان اس معاملہ کو ہرگز ہرگز قبول نہیں کریں گے، بالآخر حضرت مولاناؒ کو اس معاملہ میں بڑی کامیابی ملی اور حکومت نے اپنے رویہ میں تبدیلی کر لی، وزیر اعظم نے وضاحت کی اور وزیر داخلہ نے پارلیمنٹ میں صراحت کی کہ یہ فانون اجباری نہیں ہے، نیز صوبائی وزیر تعلیم برخاست کر دیئے گئے آخر کار صوبائی حکومت نے اس حکم کو واپس لے لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا نے اپنی ایمانی فراست سے اس بات کا صحیح و برمحل اندازہ کر لیا تھا کہ اگر اس معاملہ میں نرمی برتی گئی تو مسلمانوں کی اگلی نسل بت پرستانہ عقائد و خیالات کی حامل ہوگی اور ہندوستان میں اس طرح اندلس کی تاریخ دہرائی جائے گی، اس کامیابی پر مسلمانوں کے اندر اپنے دین اسلام، اور اس کی تعلیمات و احکام کے سلسلہ میں خود اعتمادی پیدا ہوئی، اور پوری دنیا میں حضرت مولانا کا وقار دوبالا ہو گیا اور ان کی دور بینی اور دور اندیشی کے چرچے ہوئے۔

اس قسم کے تعلیمی خطروں سے مسلمانوں کی حفاظت کے مقصد سے حضرت مولانا رحمہ اللہ نے دینی تعلیمی کونسل کی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا اور عرصہ دراز تک اس کے روح رواں رہے، اپنی عمر کے اخیر میں اس بات پر بہت ہی زیادہ زور دیا کرتے تھے کہ چھوٹے چھوٹے گاؤں دیہات اور قصبوں میں مکاتب کا جال پھیلایا جائے بلاشبہ یہ مکاتب بڑے بڑے مدارس و جامعات سے زیادہ مفید اور مؤثر ثابت ہوں گے۔

تحریک "پیام انسانیت" کا قیام، حضرت رحمہ اللہ کی ایمانی فراست کا جیتا جاگتا ثبوت ہے، حالانکہ بعض مسلم قائدین نے اپنے اس اندیشہ کا اظہار کیا کہ یہ تحریک وحدت ادیان کا اسٹیج ثابت

ہو سکتی ہے اور اسلام کی دعوت کے عمل وحرکت میں رکاوٹ پیدا کر سکتی ہے، لیکن یہ حقیقت اب تسلیم شدہ ہے کہ یہ تحریک، انسانی سلوک وکردار کی اصلاح اور تمام ادیان کے متفق علیہ امور ومعاملات میں اخلاقی اقدار وقیم کی پاسداری کا بہترین اسٹیج ثابت ہوتی ہے، نیز یہ تحریک، مادیت، حب مال، حب جاہ اور مصلحت کوشی کی دلدادہ سوسائٹی کی اصلاحی ضرورت اور موجودہ زمانہ کی پکار ہے، یہی وجہ ہے کہ اس تحریک نے سارے ادیان وملل کی طرف سے داد تحسین حاصل کی ہے، ان انسانی اغراض ومقاصد کے علاوہ یہ تحریک مسلم اور غیر مسلم کے درمیان حائل خلیج کو پاٹنے میں بڑی سودمند ثابت ہوئی ہے، نیز ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھنے کا موقع فراہم کرتی ہے تاکہ اسلام اور مسلمانوں کے مخالف ودشمن تحریکات نے ان کے سلسلہ میں جو شکوک وشبہات جنم دیئے ہیں، اس کا قلع قمع کیا جاسکے، نیز یہ تحریک اسلام کی صاف ستھری تاریخ پیش کرنے کا اور اسلامی تعلیمات کی صحیح تصویر کشی کرنے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوئی، فی الواقع مستشرقین اور ان کے چالاک تلامذہ نے اسلامی تاریخ کو مسخ کرکے پیش کیا ہے اور یوں اسلام اور مسلمانوں کو پوری دنیا میں بدنام کرنے کے لئے تاریخ نویسی کو اپنا آلہ بنایا ہے، لیکن اس تحریک کو اس سلسلہ میں بڑی کامیابیاں حاصل ہوئیں چنانچہ بعض غیر مسلم قائدین اور دانشوروں نے اس حقیقت کا برملا اظہار کیا کہ اس تحریک سے پہلے یہ لوگ اس سے بالکل ناواقف تھے کہ مسلمانوں کے دل بھی انسانیت اور وطن کا درد ومحبت رکھتے ہیں، ان کو تو صرف یہی معلوم تھا کہ مسلمان صرف تیر وتبر اور شمشیر وخنجر کے رسیا ہیں۔

حضرت مولانا رحمہ اللہ نے اس تحریک کے ایک اہم اجتماع کو خطاب فرمایا تھا ہم نیچے اس تقریر کا اہم اقتباس نقل کر رہے ہیں:۔

"کسی بھی معاشرہ کا بگاڑ اور اخلاقی اصول سے نظر اندازی، حرص وطمع بڑھی ہوئی مال کی محبت، ظلم وزیادتی، ناجائز قبضہ اور برائیوں کا اثر اس میں ملوث افراد ہی تک محدود نہیں رہتا، بلکہ اس کے اثرات پورے معاشرہ میں پھیل جاتے ہیں، اور ہر وہ معاشرہ جو ان جرائم پیشہ افراد کو نظر انداز کرتا ہے وہ خود ان جرائم میں مبتلا ہو جاتا ہے، ہمیں تاریخ میں بہت سی ایسی تہذیبیں اور ثقافتیں نظر آتی ہیں، جو عرصہ دراز تک ترقی کے بام عروج پر متمکن تھیں، لیکن جب اس میں اخلاقی انتشار عام ہوا، حرص وہوس اور مال کی بڑھی ہوئی محبت نے غلبہ پایا، انسانی ناموس وعزت کو پامال کیا جانے لگا، اور لوگ اپنی نفسانی خواہشات اور ذاتی اغراض کو پورا کرنے میں لگ گئے، دین ومذہب کی تعلیمات اور اخلاقی قدروں کو پس پشت ڈال دیا گیا، اور ان کی تحقیر وتضحیک کا معاملہ شروع ہو گیا، تو یہ ترقی یافتہ تہذیبیں برباد اور نیست ونابود ہو گئیں، مثلاً روم ٹھیک اس وقت اپنی برائیوں کی آگ میں جل رہا تھا، جب وہاں کے فلاسفہ، ادباء وشعراء اپنی بحث ونظر، تحقیق وتخلیق میں ہمہ تن مصروف ومنہمک تھے، اور نئی نئی تحقیقات، انکشافات وایجادات اور علمی کارناموں کا انبار لگا کر معاشرہ کو مسحور ومبہوت کر رہے تھے، لیکن چونکہ اندر سے معاشرہ کو گھن لگ چکا تھا، بگاڑ اور فساد گھروں سے نکل کر بازاروں اور سڑکوں تک پھیل چکا تھا، چھوٹے بڑے ہر طرح کے گھرانے اس میں ملوث تھے، مختلف طبقات آپس میں برسرپیکار تھے، ہر شخص بربادی، ظلم وزیادتی کے دہانہ پر کھڑا تھا انہیں وجوہات کی بنا پر جب آتشیں آندھی چلی تو اپنی فتوحات، تعمیرات، تہذیب اور معیار معیشت میں غیر معمولی ترقی کے باوجود (جو ضرب المثل کی حد تک پہونچ گئی تھی) روم اپنا اثر اس سے بچ نہ سکا اور نہ اس کا دفاع ہی کر سکا۔"

یہ حقیقت ہے کہ اس تحریک نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان حائل خلیج کو پاٹنے اور ان کے مابین میل ملاپ پیدا کرنے کا اپنا مقصد اصلی پورا کر لیا اور ایک ہی پلیٹ فارم پر ان کے مخالف ومعاند لوگ جمع ہوئے اور ان لوگوں نے حضرت مولانا رحمہ اللہ کی گفتگو، تقریر اور تحریر سننے اور پڑھنے کے بعد اس بات کا اعتراف کیا کہ یہ تحریک واقعۃً اس زمانہ کی ضرورت و پکار ہے، نیز مسلمانوں کے سلسلہ میں ان کا تصور تبدیل ہوا، اور مسلمانوں کے مسائل کے سلسلہ میں ان کے موقف ورویہ میں تبدیلی بھی آئی بلکہ بعض لوگوں نے مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے کے لئے اپنی خدمات پیش کیں اور مسلمانوں کی حمایت اور مدافعت کرنے والے بن گئے، نیز یہ لوگ فرقہ وارانہ فسادات کے علاقوں کا دورہ کرنے اور ریلیف اور ہنگامی امداد کے کاموں میں شریک و پیش پیش رہے، یہ حقیقت بھی قابل ذکر ہے کہ تحریک "پیام انسانیت" کے اجتماعات بعض جگہوں پر فتنوں کی سرکوبی اور مسلمانوں کے خلاف پائی جانے والی عصبیتوں کی بیخ کنی میں بڑے ممد ومعاون ثابت ہوئی ہیں۔

تحریک پیام انسانیت کے اغراض ومقاصد سے ناآشنائی اور اس تحریک کے کارکنان و احباب

کی نیتوں اور اخلاص سے عدم واقفیت کی بنا پر دعوت اسلامی کے بعض سرگرم فعال اور مخلص علمائے کرام نے اس تحریک میں پرجوش شرکت نہیں کی اور بعضوں نے تو اس تحریک کے سلسلہ میں حضرت مولانا رحمہ اللہ سے گفتگو بھی کی لیکن حضرت نے اس سلسلہ کی اپنی جد وجہد، آخری عمر تک، برابر جاری رکھی، اور اس تحریک کے کارکنان کی ہمت افزائی فرماتے رہے اور ان کی مساعی جمیلہ میں برابر ان کا ساتھ دیتے رہے اور اس کے تمام مؤقر اجتماعات میں شرکت فرماتے رہے۔

یہ حقیقت بھی روز روشن کی طرح بالکل ظاہر و باہر ہے کہ حضرت مولانا رحمہ اللہ مسلمانوں کے سامنے اپنی تقریر، تحریر اور گفتگو کے دوران اس بات پر زور دیتے رہے کہ مسلمانان ہند اپنے وطن کی تعمیر و ترقی کے کاموں میں بھرپور حصہ لیں، اور اپنی سوسائٹی سے پسماندگی اور پستی، کشمکش و معرکہ آرائی اور جہالت و نادانی کے اسباب و عوامل کا خاتمہ کریں اور مسلمانان ہند کی مساعی جمیلہ اس ملک کے لئے باعث خیر و برکت ثابت ہوں، ان کی تقریر کا مرکزی موضوع قرآن مجید کی یہ آیت کریمہ "یَا اَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا" ہوا کرتا تھا، حضرت مولانا رحمہ اللہ فرقان کی یہ تشریح فرماتے کہ مسلمانوں کی زندگی، غیروں کے مقابلہ میں زندگی کے تمام شعبہ جات میں ممتاز و نمایاں ہو، اور صدق و صفا، امانت و دیانت، اخلاص و للہیت، جد و جہد، مواساۃ و غمخواری، مساوات و برابری اور ایثار و قربانی سے متصف رہے تاکہ مسلمانان ہند ان صفات و امتیازات کی بدولت برادران وطن کی محبت و الفت اور اعتماد کے حق دار بن سکیں وہ ان کو باعث برکت سمجھیں، اس ملک کے لئے ان کو وبال اور مصیبت نہ تصور کریں۔

زہے وہ سرزمیں وہ شاہ علم اللہ رحؒ کا تکیہ

صوفی عبدالرب صاحب

خوشا وہ بقعۂ نور اولیاء اللہ رحؒ کا تکیہ
وہ تکیہ ہے کواکب اور مہر و ماہ کا تکیہ
وہاں زیر زمیں انوار کے صدہا خزینے ہیں
معطر ذکر حق سے جس کی صدیوں سے فضائیں ہیں
مقابر سے جہاں مسموع اب تک وہ صدائیں ہیں
سراپا نور ہے یہ خانوادہ علم و عرفاں کا
زبانِ ملتِ اسلامیہ ہے انتقال ان کا
بدن سے روح یوں نکلی چمن سے جیسے بو نکلے
ذرا سی آئی ہچکی، یا کلی چٹکی، مہک نکلی
ادھر شوقِ لقا سے مست ہو کر دم نکلتا تھا
ادھر گہوارۂ رحمت میں طفل جاں مچلتا تھا
سہانی رات گہری نیند میں جب ڈوب جاتی ہے
ہوا جب جاگ کر یا حق کا نغمہ گنگناتی ہے

زہے وہ سرزمیں وہ شاہ علم اللہ رحؒ کا تکیہ
وہ قبرستان ہے مردانِ حق آگاہ کا تکیہ
وہاں مسجد سے تا دریا بڑے پُر نور زینے ہیں
مہکتی جس کی انفاس عنبر سے ہوائیں ہیں
کہ جن میں کچھ تلاوت کچھ انابت کچھ دعائیں ہیں
اسی سے سلسلہ ہے سید احمد رحؒ شیر یزداں کا
نہ بھولے گا بھلائے زندگی بھر کیف و حال ان کا
نہیں عارف کے منہ سے جس طرح لاتقنطوا نکلے
بدن سے روح نکلی، برق کوندی یا چمک نکلی،
ادھر جام مئے ذکر و دعا کا دور چلتا تھا
ادھر فوارۂ پاس نفس پیہم ابلتا تھا۔
فضائے مسجد تکیہ کی مستی رنگ لاتی ہے
تو اس قبہ سے پیہم ذکر کی آواز آتی ہے

صدائے ذکر ہے مسموع کوئی راز ہے ہمدم
یہاں ہر قبر میں زندہ شہید ناز ہے ہمدم

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی زندگی کے یہ چند ایسے پہلو ہیں، جن میں موصوف دوسرے داعیوں، عالموں اور مفکروں سے ممتاز و منفرد ہیں، نیز حضرت رحؒ کے یہ خیالات و نظریات، ان کی ایمانی فراست، مسائل کی تہہ تک بلا تاخیر پہونچ جانے کی صلاحیت، اور حرکت و عمل کے اسباب و نتائج کے صحیح ادراک و احساس کے مرہون منت ہیں، ان کی دور بینی و دروں بینی کا نتیجہ ہیں، بلاشبہ ان آرا و نظریات کی اہمیت و افادیت حضرت مولانا کے دیگر علمی و عملی کارناموں سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔

یہ حضرت مولانا مرحوم کی فراست و ذہانت، ان کی دور اندیشی، جرأت ایمانی بے نفسی و خداترسی اور اخلاص و للہیت کی چند جھلکیاں ہیں، یوں تو ان کی مثالی زندگی اس قسم کے سبق آموز واقعات سے پر ہیں، انھوں نے غور و فکر کا اپنا ایک الگ راستہ اپنایا، اور جہاد زندگانی میں یقین محکم، عمل پیہم اور بے لوث محبت کے ذریعہ دل و دماغ کے دونوں جہاں مسخر کر لئے تھے۔

بڑا لاابالی سا زندگی کا ان کا راستہ بغیر
بطرز فنا کی سی اڑی ہوئی سماں بکھیرتی ہی ہے

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رح

ایک جامع اور متوازن شخصیت

سید جعفر مسعود حسنی ندوی مدیر بانگ درا لکھنؤ

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ عوام کے دلوں کی دھڑکن تھے تو خواص کی عزت و آبرو، وہ دونوں کے تھے اور دونوں ان کے اپنے، دونوں نے اپنے اس محبوب کی جدائی پر جہاں خون کے آنسو بہائے وہیں عقیدت کے پھول بھی برسائے۔

عوامی سطح پر تعزیتی جلسوں کا سلسلہ تھا تو علم و تحقیق کے متوالوں نے اپنی انجمن سجائی، محنت ان کو بھی کچھ زیادہ نہیں کرنی پڑی، ایک موتی تلاش کرنے، دس موتی ان کی گود میں آگرتے۔ خود بھی موتیوں سے مالا مال ہوئے اور آبدار موتیوں کا تحفہ دے کر اپنے سامعین کے لئے بھی روشنی کا سامان کر گئے۔

اس کے بعد باری آئی اخبار و رسائل اور ان کے خصوصی شماروں کی، عوام کا تو کہنا ہی کیا صاف دل، صاف طبیعت، نہ دل میں کھوٹ نہ طبیعت میں کدورت، عقیدت تھی، عقیدت کا اظہار کیا۔ خوبیاں دیکھیں، دل سے سراہا، کارناموں پر نظر پڑی تو صدق دل سے اعتراف کیا۔

خواص نے بھی فراخدلی کا مظاہرہ کیا اور گروہی عصبیت، مسلکی منافرت اور نظریاتی کشمکش سے بالاتر ہو کر حضرت مولانا کی خدمات کو سراہتے ہوئے ان کی وفات کو عالم اسلام کے لئے ایسا حادثہ قرار دیا جو صدیوں میں ایک ہی آدھ بار پیش آتا ہے۔

عقیدت کے اظہار، خدمات کے اعتراف اور قدر کے ان جذبات و احساسات کے ساتھ ساتھ بعض مضامین میں، ایک مخصوص طرز فکر رکھنے اور ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھنے کی وجہ سے اور مسلکی ذہن رکھنے کی وجہ سے جو اس دور کے طرز تحقیق کی ایک خصوصیت بھی ہے، ایسے تبصرے بھی شامل ہو گئے جن سے حضرت مولانا کے بعض اقدامات اور نظریات کے بارے میں ذہنوں میں سوالات اور شبہات پیدا ہو سکتے ہیں۔ بعض تذکرہ نگاروں کو حضرت مولانا کی زندگی کا پورا مطالعہ کرنے اور ان کی شخصیت کے بنیادی عناصر کو قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کا موقع بھی نہیں ملا، یا انھوں نے صرف ایک زاویہ سے حضرت مولانا کی زندگی کو دیکھنے اور ایک ہی زاویہ سے ان کی شخصیت کا تعارف کرانے کی کوشش کی۔ حالانکہ حضرت مولانا کی اصل خصوصیت جامعیت اور توازن ہے۔ جیسا کہ پروفیسر خورشید احمد نائب امیر جماعت اسلامی پاکستان نے اپنے تاثراتی مضمون میں اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"میں جب بیسویں صدی کی اسلامی فکر کی قوس و قزح پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے ان کا فکر و اسلوب ایک ایسا گلدستہ معلوم ہوتا ہے جس میں اس دور کے کئی اہم مفکرین اور داعیوں کے متفرق پہلوؤں کا اجتماع نظر آتا ہے، ان کے یہاں علامہ اقبال کا سوز و گداز، مولانا مودودی کی عقلیت اور تصور دین کی جامعیت، علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کا ذوق تاریخ اور مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمد الیاس، مولانا عبدالقادر رائے پوری، مولانا محمد زکریا کی روحانیت کا امتزاج نظر آتا ہے۔ علی میاں کے یہاں یہ سب ایک دوسرے کے ناقض نہیں، ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے ہیں اور یہی وہ نکتہ ہے جسے ناقدین علم و فن نے نظر انداز کر دیا ہے۔

ان کا اصل میدان تاریخ اور دعوت ہے، سیرت اور انسان سازی ہے، روح کی بیداری اور امت کی ترقی کے لئے اسلاف کے نمونہ کا احیاء ہے، ان کے یہاں خانقاہ

> ان کا اصل میدان تاریخ اور دعوت ہے، سیرت اور انسان سازی ہے، روح کی بیداری اور امت کی ترقی کے لئے اسلاف کے نمونہ کا احیاء ہے، ان کے یہاں خانقاہ اور جہاد، تزکیہ اور انقلاب دونوں دھارے ساتھ ساتھ رواں نظر آتے ہیں، کبھی وہ ایک کو نمایاں کرتے ہیں اور کبھی دوسرے کو۔"
>
> (پروفیسر خورشید احمد)

اور جہاد، تزکیہ اور انقلاب دونوں دھارے ساتھ ساتھ رواں نظر آتے ہیں، کبھی وہ ۔۔ کو نمایاں کرتے ہیں اور کبھی دوسرے کو"۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ جہاں ایک طرف علم و فضل، زہد و ورع، فقر و استغنا، اور حکمت و دانائی کی بیش بہا دولت سے مالا مال تھے وہیں دوسری طرف ان کی رگوں میں امام المجاہدین سید احمد شہید کا خون بھی اپنی پوری حرارت اور قوت کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ اگرچہ آپ کو کبھی تیر چلانے، تلوار اٹھانے اور نیزہ مارنے کی ضرورت پیش نہیں آئی لیکن لادینیت، اباحیت، مغربیت، قومی عصبیت، نسلی عصبیت، لسانی عصبیت اور جاہلی عصبیت کے خلاف آپ نے قلم و کاغذ، علم و فکر اور تقریر و تحریر سے وہ کام لیا جو سید احمد شہید اور ان کے رفقاء نے تیغ و سناں سے لیا تھا، حضرت مولانا جذبہ جہاد کے نہ صرف یہ کہ داعی تھے بلکہ میدان جہاد کے ایک جانباز سپاہی تھے اور جہاد کی افضل ترین راہ پر گامزن تھے۔ مصر کے صدر جمال عبدالناصر ہوں، یا انورالسادات، ذوالفقار علی بھٹو ہوں یا آیت اللہ خمینی، اندرا گاندھی ہوں یا راجیو گاندھی، صدام حسین ہوں یا فہد بن عبدالعزیز۔

مسئلہ نسبندی کا ہو یا الفقہ مطلقہ کا، عرب قومیت کا ہو یا کویت پر عراق کی یلغار کا، وندے ماترم کا ہو یا خاک وطن کی تقدیس کا، یکساں سول کوڈ کا ہو یا چار شادیوں پر پابندی کا، قومی دھارے میں شمولیت کا ہو یا اسلامی تشخص سے دست برداری کا۔ ہر موقع پر قارئین یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ حضرت مولانا اپنی تحریروں اور تقریروں کے پس منظر میں صرف ایک عالم دین ہی نہیں، ایک مفسر اور مؤرخ ہی نہیں، ایک داعی اور ایک مصلح ہی نہیں بلکہ ایک جانباز سپاہی، اولوالعزم مجاہد اور عزیمت و استقامت کا کوہ گراں دکھائی دیتے ہیں۔ وہ جہاں ایک طرف طاغوتی طاقتوں، جابر حکومتوں اور مغرور و خود سر حکمرانوں کو للکارتے نظر آتے ہیں وہیں دوسری طرف اسلامی تحریکوں، مسلم تنظیموں اور دعوتی حلقوں کی غلط روش، غلط رجحان اور غلط طریقۂ فکر پر پوری جرأت و بے باکی کے ساتھ نکیر کرتے دکھائی دیتے رہیں۔ نہ انھیں حکومت وقت کا ڈر حق گوئی سے باز رکھتا ہے اور نہ ہی اپنے عوام کی ناراضگی ان کی زبان پکڑتی ہے، جہاد کا اتنا وسیع میدان جو حضرت مولانا کے حصہ میں آیا، اور جہاد کے اتنے کثیر مواقع جو حضرت مولانا کو ملتے رہے

> "نرسمہا راؤ جی! سب سے بڑی سیاست خلوص کی سیاست ہے" اٹل بہاری باجپئی سے ایک ملاقات کے دوران صراحت کے ساتھ فرمایا کہ "اٹل جی! خدا کے یہاں سیاست نہیں چلتی"۔

اور اس کے جو نتائج برآمد ہوئے وہ کم ہی کسی کے حصہ میں آئے ہوں گے۔

حضرت مولانا کے نزدیک جہاد صرف تیغ و سناں کے استعمال کا نام نہیں، تیغ و سناں کا وقت متعین اور اس کا دائرہ مقرر ہے اور اس کے اپنے کچھ اصول و ضوابط ہیں۔ جہاد اپنے اندر بڑی عمومیت رکھتا ہے۔ اس کا میدان بڑا وسیع اور اس کی شکلیں مختلف ہیں، اور وقت، حالات اور ماحول کے اعتبار سے وہ شکلیں بدلتی رہتی ہیں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی سیاسی میدان کے آدمی نہ تھے اور نہ ان کے یہاں سیاسی چالوں، سیاسی حربوں اور سیاسی ہتھکنڈوں کی کوئی اہمیت و وقعت تھی۔ وہ خلوص کو کامیابی کی کنجی سمجھتے تھے اور ایمانی فراست کو کامیابی کی ضمانت، چنانچہ انھوں نے ایک مرتبہ سابق کانگریسی وزیر اعظم پی، وی، نرسمہا راؤ کو ان کی سیاسی قلابازیوں پر تنبیہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "نرسمہا راؤ جی! سب سے بڑی سیاست خلوص کی سیاست ہے"۔ اٹل بہاری باجپئی سے ایک ملاقات کے دوران صراحت کے ساتھ فرمایا کہ "اٹل جی! خدا کے یہاں سیاست نہیں چلتی خلوص سے چلتا ہے، خلوص کے ساتھ کام کیجئے کامیابی قدم چومے گی۔ ترقی کی راہیں کھلیں گی۔ اور فتح و کامرانی آپ کے قدم سے قدم ملا کر چلے گی"۔ حضرت مولانا خلوص کی طاقت کو سمجھتے تھے۔ مومن تھے، فراست ایمانی کی دولت سے مالا مال تھے، آنے والے خطرہ کو پہلے سے ہی بھانپ لیا کرتے تھے اور خلوص کی طاقت پر یقین، خدا کی ذات پر اعتماد اور دعاؤں کی اثر انگیزی پر بھروسہ کرتے ہوئے میدان عمل میں نکل آتے تھے اور کامیابی کے مراحل اس طرح طے کرتے جاتے تھے کہ بڑے سے بڑا سیاسی مدبر بھی ششدر رہ جاتا تھا اور خلوص کے ہاتھوں سیاست کی شکست تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

بعض کا خیال ہے کہ حضرت مولانا نے دعوت اسلامی کے سلسلہ میں کچھ زیادہ ہی احتیاط اور نرم روی سے کام لیا اور اس سلسلہ میں جو جارحانہ رخ اختیار کرنا چاہئے تھا وہ نہیں کیا۔

اسطرح کا تصور کرنے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہندوستان کے حالات کا شاید کبھی جائزہ نہیں لیا اور اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ ہندوستان میں دین کی اشاعت جارحانہ انداز سے نہیں بلکہ فقیرانہ انداز سے ہوئی ہے۔ صوفیائے کرام کی پاکیزہ، پُر اثر اور دل آویز شخصیتوں نے نمونہ بن کر دلوں کو موہ لیا اور اپنے طرز عمل، طور طریق، محبت و شفقت، ہمدردی و غمگساری اور ایثار و قربانی سے اسلام کا ایسا اعلیٰ نمونہ پیش کیا کہ ہزاروں نہیں لاکھوں کو اسلام کی عظمت کا معترف ہونا پڑا۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور امیر المومنین سید احمد شہیدؒ کی انفرادی کوششوں کے نتیجہ میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد سامنے رکھئے اور پھر اس کا موازنہ اس تعداد سے کیجئے جو اسلامی تحریکوں کی اجتماعی کوشش سے اسلام کی طرف مائل ہوئی ہے تو صورتحال واضح ہو کر سامنے آجائے گی۔

> خواجہ معین الدین چشتیؒ، شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور امیر المومنین سید احمد شہیدؒ کی انفرادی کوششوں کے نتیجہ میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد سامنے رکھئے اور پھر اس کا موازنہ اس تعداد سے کیجئے...... جو اسلامی تحریکوں کی اجتماعی کوشش سے اسلام کی طرف مائل ہوئی ہے تو صورت حال واضح ہو کر سامنے آجائے گی۔

حضرت مولانا نے مسلکی، نظریاتی اور گروہی اختلافات سے بلند ہو کر ہندوستان کی صورت حال کا مشاہدہ کیا، زندگی کی لازوال قدروں کو ہمیشہ اپنی نگاہوں کے سامنے رکھا اور ایک ایسے ملک میں جو مختلف مذہبوں، مختلف تہذیبوں، مختلف ثقافتوں اور مختلف قوموں کی آماجگاہ ہونے کی وجہ سے دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے، جینے کا سلیقہ اور رہنے کے آداب بتائے۔

.... آپ کا کہنا تھا کہ اس ملک میں دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ مخالفانہ نہیں مصالحانہ زندگی گزارنے کی کوشش کی جانی چاہئے اور اس انداز سے کی جانی چاہئے کہ یہ مصالحت و مفاہمت ہمارے عقائد پر اثر انداز نہ ہو، تاکہ ایک دوسرے کے قریب آئیں، ایک دوسرے کے مذہب کو سمجھنے اور ایک دوسرے کی خصوصیات سے واقف ہونے کا موقع مل سکے۔ اور یہ روش دعوت میں حائل نہیں بلکہ مفید ثابت ہوگی اور اسلام کی اشاعت کے لئے فضا کو ہموار کرے گی۔

حضرت مولانا کا خیال تھا کہ غیر مسلم اکثریت کے افراد کو متوجہ کرنے اور ان کے ذہن و ضمیر تک پہونچنے کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ یہ کہ زندگی کے مشترک مسائل کا تذکرہ کیا جائے، انسانیت اور اخلاق کی باتیں کی جائیں اور انسان کو درپیش مسائل و مشکلات کے حل کی نشاندہی کی جائے۔ اور یہی وہ طریقہ ہے جو ان کو اسلام کا مطالعہ کرنے، مسلمانوں کو سمجھنے اور ان کو ان کا صحیح مقام دینے پر آمادہ کر سکتا ہے۔

حضرت مولانا کا یہ خیال کتنا حقیقت کے قریب تھا اور حضرت مولانا اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب تھے۔ اس کا اندازہ ان دو واقعات سے لگایا جاسکتا ہے۔

۱۔ گوہاٹی یونیورسٹی (آسام) میں انگریزی کے پروفیسر ڈاکٹر تاراچرن رستوگی بس پر ایک سفر کر رہے تھے، راستے میں سموسے خریدے، کاغذ کے جس لفافے میں وہ سموسے تھے حسن اتفاق وہ پیام انسانیت کا حلف نامہ تھا جو شاید ردی میں بکنے کی وجہ سے تھیلی کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ رستوگی صاحب نے وہ حلف نامہ پڑھا اور اس سے متاثر ہوئے اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کو خط لکھ کر اپنے تاثر کا اظہار کیا۔

حضرت مولانا نے ان کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے پیام انسانیت کی اپنی تقریروں کا ایک مجموعہ (ہندی میں) ان کو ارسال کر دیا۔ ان تقاریر سے وہ مزید متاثر ہوئے اور خاموشی کے ساتھ حضرت مولانا سے ملنے کے لئے ندوہ آگئے۔ دو چار دن حضرت مولانا کے ساتھ ایک اجنبی مہمان کی حیثیت سے رہے، حضرت مولانا کو قریب سے دیکھا، سمجھا اور پرکھا اور آسام روانہ ہو گئے۔ آسام پہونچ کر انہوں نے حضرت مولانا کو لکھا:

"آپ کی تقریروں سے میں اسلام کے ان پہلوؤں سے واقف ہوا جواب تک میری نگاہوں سے اوجھل تھے، پھر میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان پہلوؤں کو عملی شکل میں دیکھا اور تحریروں سے زیادہ آپ کی زندگی سے متاثر ہوا۔ اور اب میرے پاس اسلام قبول کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں۔"

اس کے بعد تاراچرن رستوگی نہ صرف یہ کہ خود

مسلمان ہوئے بلکہ ان کی بیوی، لڑکا اور بہو بھی مسلمان ہو گئے۔

یہاں ان کے ساتھ پیش آنے ایک حادثہ کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا جس سے ہم مسلمانوں کے دعوتی جذبہ کا اندازہ لگا یا جاسکتا ہے۔

ابھی چند سال قبل مکان کی چھت گر جانے کی وجہ سے رستوگی صاحب کے لڑکے اور بہو کا انتقال ہو گیا، تدفین کے لئے جب انھوں نے قبرستان میں جگہ لینی چاہی تو وہاں کے مسلمانوں نے ان کو جگہ دینے سے انکار کر دیا، بالآخر ان کو اپنے لڑکے اور بہو کو گھر کے آنگن میں دفن کرنا پڑا۔

۲۔ صوبہ بہار کے ایک شہر سیوان میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی تقریر کر کے ابھی بیٹھ ہی رہے تھے ایک سن رسیدہ ہندو اسٹیج پر WONDERFUL W. ONDERFUL کے الفاظ کہتے ہوئے آگے بڑھے اور مائک پر آکر کہا کہ میں نے اپنی زندگی میں دو تقریریں سنی ہیں جن سے سب سے زیادہ متاثر ہوا ہوں، ایک مسٹر C.R. DASS کی تقریر اور ایک آج مولانا صاحب کی اور میں صاف کہتا ہوں کہ محمد صاحب خدا کے سچے پیغمبر ہیں۔ مولانا صاحب آپ صرف مسلمانوں ہی کے نہیں ہم بھی آپ پر اپنا حق سمجھتے ہیں۔

حضرت مولانا کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ افہام و تفہیم کے ہی راستہ سے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی جائے اور ایسی صورت حال ہرگز پیدا ہونے دی جائے جس سے یہاں کے اکثریتی فرقہ کے جذبات بھڑکنے کا اندیشہ ہو اور ان کے حریف بن کر سامنے آجانے کا خطرہ ہو، کیونکہ ایسی صورتحال پیدا ہو جانے پر مسلمانوں کو دو حریفوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایک حکومت، دوسرے اکثریتی فرقہ، ان دونوں سے بیک وقت مقابلہ کرنا مسلمانوں کے لئے آسان نہ ہوگا۔ چنانچہ جذباتی تقریروں، اشتعال انگیز نعروں اور گرم اور بھڑکیلے بیانات سے بچنا چاہئے اور عوام کو سڑکوں پر لے آنے اور بھیڑ اکٹھا کرنے سے احتراز کرنا چاہئے، کیونکہ اس طرح کی تقاریر اور نعرے اور ہزاروں اور لاکھوں مسلمانوں کا اجتماع عام ہندو کے ذہن میں اندیشے پیدا کرنے لگتا ہے اور مسلمانوں کے سلسلہ میں ان کی حساسیت بڑھ جاتی ہے اور مسئلہ بجائے بننے کے بگڑ جاتا ہے۔ جیسا کہ ماضی کے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے۔

> آپ کی تقریروں سے میں اسلام کے ان پہلوؤں سے واقف ہوا جو اب تک میری نگاہوں سے اوجھل تھے، پھر میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان پہلوؤں کو عملی شکل میں دیکھا اور تحریروں سے زیادہ آپ کی زندگی سے متاثر ہوا۔ اور اب میرے پاس اسلام قبول کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں اس کے بعد تارا چرن رستوگی نے صرف یہ کہ خود مسلمان ہوئے بلکہ ان کی بیوی، لڑکا اور بہو بھی مسلمان ہو گئے۔

آج سے تقریباً ۲۲ سال قبل ۱۹۷۸ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور کل ہند مسلم مجلس مشاورت کے اراکین کے استقبالیہ جلسے میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے جو تقریر فرمائی تھی اور اس میں جس موقف کو اختیار کرنے کی تلقین کی تھی، ۲۲ سال گزر جانے کے بعد بھی اسی موقف کو اپنانے پر زور دیتے رہے۔ آج زمانہ اس موقف کی افادیت تسلیم کرے یا نہ کرے آئندہ دس بیس سال میں اس موقف کی افادیت محسوس کرتے ہوئے اس کو ضرور اپنانا پڑے گا، لیکن شاید وقت.....

حضرت مولانا نے اس تقریر میں قائدین ملت سے بڑے دردمندانہ انداز میں اور خلوص کے ساتھ فرمایا تھا کہ "مسلمان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ ایک نعرہ میں دبو نہ ہو جاتا ہے، اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے، وہ نعرہ کیوں لگایا جائے جس سے مسلمان پر جنون کا دورہ پڑے اور وہ اپنا توازن کھو بیٹھے۔ نعروں کا زمانہ گیا، میں صفائی کے ساتھ کہتا ہوں کہ آپ تعمیری کام کرنے والوں کو دس برس کی مہلت دے دیجئے اور قوم کو اشتعال، جذباتیت اور سیاسی ہنگامہ آرائی کے دھارے میں نہ بہائیے، افراد کو خیرات دی جاتی ہے۔ میں قوم کے لئے، ملت کے لئے آپ سے خیرات مانگتا ہوں کہ آپ دس برس کی مہلت دے دیجئے، تاکہ ہمارے غیر مسلم بھائی اور ملک کی اکثریت کا ذہنی توازن نارمل ہو جائے، ان میں معقول بات سننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے اور مسلمانوں کا ذہن بھی طوفانی دریا کی مانند نہ ہو جائے کہ جس میں ہمارے ادارے بہہ جائیں

> افراد کو خیرات دی جاتی ہے، میں قوم کے لئے، ملت کے لئے آپ سے خیرات مانگتا ہوں کہ آپ دس برس کی مہلت دے دیجئے، تاکہ ہمارے غیر مسلم بھائی اور ملک کی اکثریت کا ذہنی توازن نارمل ہو جائے، ان میں معقول بات سننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

اور صدیوں کا اثاثہ ملیامیٹ ہو جائے۔"

حضرت مولانا کا مزاج تحریکی تھا اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی تحریک سے وابستہ رہے۔ جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کی، لیکن بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر اس سے کنارہ کش ہو گئے، تبلیغی جماعت سے وابستہ ہوئے اور عرب دنیا میں اس کے تعارف کا ذریعہ بنے، مسلم مشاورت کی داغ بیل ڈالنے میں نمایاں کردار ادا کیا، دینی تعلیمی کونسل کی بنیاد ڈالی اور اس کے پیغام کو عام کرنے کے لئے گاؤں گاؤں اور شہر شہر دورے کئے، مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر منتخب ہوئے اور اپنی حکمت عملی سے اس کو وہ وقار بخشا کہ حکومت بھی اس کے آگے جھکنے پر مجبور ہوئی اور وہ اعتبار دیا کہ ہر حلقہ اور ہر طبقہ کا مسلمان اس کے فیصلہ کو اپنا فیصلہ قرار دینے لگا، تحریک ندوۃ العلماء کے لئے تو گویا آپ کی ساری صلاحیتیں اور ساری توانائیاں وقف تھیں اور شاید ہی آپ کی زندگی میں کوئی لمحہ ایسا آیا ہو کہ آپ کا دل تحریک ندوۃ العلماء سے غافل ہوا ہو۔ تحریک پیام انسانیت ان مذکورہ بالا تحریکات سے مختلف ایک تحریک تھی جو حضرت مولانا کی بصیرت اور فراست کا ایک کھلا ثبوت تھی۔ اور ہندوستان جیسے کثیر المذاہب ملک میں دوسری تمام تحریکات سے زیادہ مفید ثابت ہو سکتی تھی، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ ہندوستان کی وہ واحد تحریک تھی جس کی افادیت تو سب کو تسلیم تھی لیکن اس کے مشن کو عام کرنے، اس کے پروگرام کو آگے بڑھانے اور اس کو منظم اور مربوط شکل میں سامنے لانے سے کسی کو دلچسپی نہ تھی۔ اس لحاظ سے یہ ہندوستان کی سب سے مظلوم تحریک کہی جا سکتی ہے جو حضرت مولانا کی حیات تک مظلوم ہی رہی۔ اور سوائے ان چند حقیقی انسانوں کے جن کے پاس پُرنم آنکھ، دردمند دل اور محبت کا سرمایہ تھا، کوئی بھی اخلاص، سنجیدگی اور مستقل مزاجی کے ساتھ اس کام کے لئے آگے نہیں آیا۔

حضرت مولانا تحریکی مزاج رکھتے تھے اور زبانی نہیں عملی طور پر تحریکات سے وابستہ رہتے تھے، لیکن ان تحریکات کو مقصد نہیں مقصد کے حصول کا ذریعہ سمجھتے تھے اور تحریک ہی نہیں تعمیری خطوط پر ان کی راہ متعین کرتے تھے۔ وہ تحریک میں جمود کے قائل نہیں تھے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ وہ صورتحال کی تبدیلی دیکھ کر طریقہ کار کی تبدیلی کی دعوت دیا کرتے تھے۔

> مولانا محمد یوسف صاحب امیر جماعت اسلامی ہند یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، میں نے ہندوستان میں مسلم مجلس مشاورت کے پلیٹ فارم پر بھی یہ بات کہی تھی، اس وقت بھی اس پر ایمان رکھتا تھا اور اب بھی ایمان رکھتا ہوں کہ اگر ملت کے مفاد کا تقاضا ہو کہ حرف غلط کی طرح جماعتوں کو مٹا دیا جائے تو میرے اخلاص کا تقاضا ہوگا کہ سب سے پہلے میں اسے قبول کر لوں۔

حضرت مولانا تحریکات کی ضرورت محسوس کرتے تھے اور اس کی افادیت تسلیم کرتے تھے، لیکن اسی وقت تک جب تک وہ تحریکات مقصد کو پورا کرتی ہوں، لیکن اگر ان تحریکات کی وجہ سے مقصد پر آنچ آنے لگتی اور تعمیر کے بجائے تخریب کا پہلو سامنے آنے لگتا تو ان تحریکات سے کنارہ کشی اختیار کرنے میں ذرا بھی تأمل سے کام نہیں لیتے تھے۔

حضرت مولانا کا خیال تھا کہ جس طرح تحریک کا ایک مزاج ہوتا ہے اسی طرح ملک کا بھی اپنا ایک مزاج ہوتا ہے اور وہ تحریک جس میں اس ملک کے مزاج کی رعایت نہ ہو زیادہ مؤثر اور کارگر نہیں ہو سکتی، بلکہ بسا اوقات مفید ثابت ہونے کے بجائے مضر اور مہلک ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا کسی تحریک کو چلانے سے پہلے اس ملک کے حالات، ماحول اور سوچ و فکر کا جائزہ لینا اور اس کی رعایت کرتے ہوئے اس تحریک کے خدوخال تیار کرنا ضروری ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی "ایک ملت" کے تصور پر بختہ ایمان رکھتے تھے، فرقہ واریت اور گروہی عصبیت کو وہ اجتماعیت اور وحدت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیتے تھے۔ اسلام کے آفاقی اور ہمہ گیر پیغام کو وہ مسلکی اور جماعتی دائروں میں مقید کرنے کے خلاف ہمیشہ آواز اٹھاتے رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اسلام کے فروغ کے لئے قائم کردہ جماعتیں اور تنظیمیں اگر ملت کے اجتماعی مفاد سے ٹکرانے لگیں تو ان جماعتوں، تحریکوں اور تنظیموں کو حرف غلط کی طرح مٹا دینا چاہئے۔

وہ کہتے ہیں:-

"ایک قربانی آپ کو اس ملک میں یہ دینی ہے کہ ملت کے مفاد کو اپنے مفاد پر، جماعت کے مفاد پر، برادریوں کے مفاد پر اور یہاں تک کہ عرض کرتا ہوں کہ ملت کی ضرورت کا جو عنوان اور راستہ ہم نے تجویز کیا ہے اس پر بھی آپ ملت کے مفاد کو مقدم رکھیں۔ اس لئے کہ جماعتیں ملت کے لئے ہیں، ملت جماعتوں کے لئے نہیں۔"

مولانا محمد یوسف صاحب..

باقی صـ ۱۴۰ پر

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رح کی شخصیت

تعلیم و مطالعہ اور تصنیفات کے آئینے میں

مولانا نذر الحفیظ ندوی ازہری۔ استاذ ادب دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جس طرح اشعار اور کتابوں کے انتخاب سے پسند کرنے والے کی سیرت و کردار، ذوق و نفسیات اور عقلی سطح کا اندازہ ہوتا ہے اسی طرح کسی مصنف کی علمی و فکری اور تحقیقی کاوشوں کے علمی و دعوتی فوائد کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ اس کی علمی و ادبی ترقی و استعداد میں کن کتابوں اور شخصیتوں نے بنیادی کردار ادا کیا ہے اسلیے کہ زیر مطالعہ کتابوں کی نوعیت، معیار، مطالعہ کی کیفیت، استفادہ کی صلاحیت، نیز ان موضوعات سے ذوق و مناسبت کا عکس تصنیفات پر لازمی طور سے پڑتا ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی سیرت کی تشکیل و تعمیر، کردار کی پختگی، علمی و ادبی استعداد کی نشو و نما اور بنیادی علوم میں ملکہ و رسوخ میں جہاں خاندانی خصوصیات اور گھریلو ماحول نے فیصلہ کن رول ادا کیا وہیں مشفق مربیوں نے حکیمانہ تربیت اور مناسب وقت پر مناسب کتابوں کے مطالعہ کی رہنمائی نے آگے کی طرف قدم بڑھانے میں مدد دی، اس طرح خوب سے خوب تر اور زیبا سے زیبا تر کی طرف مولانا کا سفر آخر تک جاری رہا۔ یہ تربیت ہی کا اثر تھا کہ بجز قرآن مجید کے کسی ایک کتاب سے (خواہ وہ کتنے ہی شاندار اور پُر جلال علمی اصطلاحات میں ہو) ان کی سیری نہیں ہوئی۔ مولانا کی جہد مسلسل کا اندازہ ان کے اس پسندیدہ شعر سے کیا جاسکتا ہے جو وہ اکثر گنگنایا کرتے تھے۔

نشانِ منزلِ جاناں ملے ملے نہ ملے
مزے کی چیز ہے یہ ذوقِ جستجو میرا

یا یہ شعر:

جز ذوقِ طلب، جز شوقِ سفر، کچھ اور ہمیں منظور نہیں
اے عشق بتا اب کیا ہوگا کہتے ہیں کہ منزل دور نہیں

یہ ذوقِ جستجو اور جہد مسلسل ان کی زندگی کا رفیق رہا۔ اِدھر والذین جاھدوا فینا پر عمل اُدھر لنھدینھم سبلنا کی بشارت، یہی اندازہ ان کی روحانی ترقی کے بارے میں کیا جا سکتا ہے۔[۱]

مولانا نے جس کتاب کو پڑھا اور عام طور پر وہ اپنے موضوع پر منتخب ہوا کرتی تھی اس کو پوری طرح ہضم کر لیا۔ مثالی کتابوں کی تقلید اور نقل میں سیکڑوں صفحات لکھ ڈالے پھر جب تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوئے تو اس ذوقِ جستجو اور طلب کی بدولت ایک مقالہ یا چند صفحات کا مضمون یا ایک خیال پوری کتاب کی صورت اختیار کر جاتا۔ لیکن بحث و تحقیق کا معیار، زبان کی شیرینی اور شگفتگی، الفاظ کے انتخاب میں تُمپر بحر کی سطح کسی طرح بھی متاثر نہ ہوتی اس میں جہاں نزہۃ الخواطر کے بار بار مطالعہ کو دخل تھا وہیں مایہ ناز استاذ شیخ خلیل عرب اور ہلالی جیسے نادرۂ روزگار اساتذہ کے ہاتھوں ادبی ذوق کے پروان چڑھنے کا بھی حصہ ہے۔ مولانا حیدر حسن خاں جیسے محدث جلیل کے طرزِ تحقیق سے مولانا نے اپنے تصنیفی کاموں میں فائدہ اٹھایا۔ فرماتے تھے کہ جس کو داعی اور مصنف بننا ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کچھ عرصہ تک تدریس کا مشغلہ اختیار کرے، اس سے علمی استعداد میں پختگی، مطالعہ میں وسعت اور محنت کی عادت ہوتی ہے اور کلموا الناس علی قدر عقولھم کا تجربہ ہوتا ہے جو دعوتی کام کے لئے ضروری ہے۔

مولانا نے اپنے جلیل القدر استاذ مولانا حیدر حسن خاں کے طرزِ تدریس و تحقیق کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک بڑی بنیادی بات کی طرف اشارہ کیا ہے: "بعض اوقات مسائل کی تحقیق کے سلسلہ میں قرآن و حدیث کے ایسے الفاظ آجاتے تھے جن کا مفہوم متعین کرنے میں اہل زبان مختلف الخیال ہیں۔ ایسے مواقع پر علمائے معانی و بیان اور ائمہ لغت کی اہم تصانیف کھلتیں، کلام عرب سے استشہاد ہوتا، الفاظ کی حیثیت اور مختلف زمانوں میں ان کے استعمال کی تاریخ پر نظر ڈالی جاتی اور بڑی کد و کاوش کے بعد رائے قائم کی جاتی"[۲]

مولانا کے فکر کی تشکیل میں سیرت نبوی، تاریخ و تذکرے، سوانح حیات اور ادبی کتابوں نے بنیادی کردار ادا کیا ہے فتوح الشام کے منظوم ترجمہ صمصام الاسلام اور مسدس حالی نے دینی ثقافت کے پودے

کو علمی وجد باتی طور پر بالیدگی عطا کی اور عام معلومات و استعداد میں اضافہ ہوا، منفی طور پر مولانا کے دل میں عیسائیوں کے خلاف ایک ایسا حریفانہ جذبہ اور عناد پیدا ہوا جس پر کسی ملک کے مقامی حالات و مسائل کبھی غالب نہ آسکے۔ قاضی سلیمان منصور پوری رح کی وجد آفریں کتاب رحمۃ للعالمین نے اس محبت (محبت رسول) سے آشنا کیا جس کے بغیر یہ زندگی خاک اور سارا عالم خس و خاشاک ہے۔ آگے چل کر مولانا سید سلیمان ندوی رح کی کتاب خطبات مدراس نے مولانا کو سب سے زیادہ متاثر کیا اور حدیث و سیرت کے نئے نئے پہلو سامنے آئے اور اس عہد انقلاب میں اہل علم اور تعلیم یافتہ غیر مسلموں کے سامنے حدیث و سیرت پیش کرنے کی راہ معلوم ہوئی ـــہ

عربی کی عبارت صحیح پڑھنے اور صرف و نحو کے ضروری مسائل کے جزو دماغ بن جانے میں مولانا سید طلحہ حسنی کا خاص درجہ تھا، ان سے جہاں اور بہت سے علمی فوائد حاصل ہوئے وہاں ذہنی تربیت ہوئی اور تاریخی شعور بیدار ہوا۔ ثقافت میں تنوع اور وسعت پیدا ہوئی ـــہ

دوسرا بنیادی فائدہ ان کی صحبت سے یہ ہوا کہ سلف کی عظمت، متقدمین کے مراتب سے واقفیت اور ائمہ اہل سنت و محدثین کی محبت و عقیدت پیدا ہوئی، تفاسیر و احادیث اور سیر و تراجم کی کتابوں کی اہمیت علمی و فنی خصوصیت اور فرق مراتب معلوم ہوئے ـــہ

مولانا نے سب سے پہلے عربی زبان سیکھی اس کے بعد ان ادباء کی کتابوں کو ہضم اور ان کے رنگ میں لکھنے کی کوشش کی جو صاحب طرز ادیب اور مستقل مکتب فکر رکھتے تھے۔ ابن المقفع، جاحظ، عبدالقاہر جرجانی، بحتری، متنبی کے علاوہ حماسہ، نہج البلاغہ (حصہ مکاتیب) کو مثالی سمجھ کر ان سے بھرپور استفادہ کیا۔

ہلالی صاحب کے ذریعہ عربی زبان و ادب کے بہت سے مبادی و بدیہیات اور زبان کی تعلیم کے بہت سے حقائق و اصول سے براہ راست واقفیت ہوئی۔ ان سے سلف جیسی احتیاط، علمی تورع، اہل لغت جیسا اتقان، علمائے نحو جیسی پختگی اور اہل زبان جیسی شیریں نوائی و خوش گفتاری سیکھی، ان کی صحبت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ادب خیالات کے اظہار کا بلند اور فنی اور ترقی یافتہ ذریعہ ہے جو تمدن و تخیل کی ترقی سے پیدا ہوتا ہے اور اس کی قبل از وقت تعلیم ضیاع وقت ہے۔ دوسری حقیقت یہ معلوم ہوئی کہ زبان کو بغیر ترجمہ کی مدد کے پڑھانا چاہیے، حریری، متنبی اور حماسہ عربی ادب کی اعلیٰ کتابیں ہیں، جنھیں زبان کی تعلیم کے بعد عربی ادب کی تکمیل کرنیوالے فضلا کو پڑھنا چاہیے ـــہ

دینی عناصر کی تخم ریزی بچپن میں ہو چکی تھی، گھر کے دینی ماحول نے ان کو پروان چڑھایا آغاز شباب میں اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی، پھوپھا سید طلحہ حسنی اور اپنے استاذ شیخ خلیل عرب کی رہنمائی و نگرانی میں جن کتابوں کا مطالعہ اور ان کے اثرات قبول کئے ان میں سورۂ زمر کے ذریعہ توحید کا درس تھا جس کو شیخ خلیل عرب نے بڑے ذوق و شوق سے پڑھا اور دل و دماغ میں توحید خالص کا نقش، نقش دوام بن گیا، کتاب التوحید بھی انھوں نے بڑے جوش و جذبہ سے پڑھائی۔ ابوالنصر مروزی کی موثر و طاقتور کتاب قیام اللیل ابن القیم کی زاد المعاد۔ الجواب الکافی، ابن تیمیہ کی تفسیر سورۃ النور جیسی کتابوں نے نوجوانی میں بہترین نگران و اتالیق اور اخلاقی محتسب و ناصح کا کام کیا۔

خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات فوائد الفواد، شاہ غلام علی کی درّ المعارف۔ مجدد الف ثانی اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات کے مطالعہ سے مولانا کے قلب نے گرمی اور نرمی محسوس کی۔ درد و محبت، سوز و گداز سے بھرے ہوئے واقعات اور درد و محبت میں ڈوبے ہوئے اشعار اور فقرے دل پر نقش ہوئے۔ امام غزالی کی احیاء العلوم کے مطالعہ نے دل پر بجلی کا سا اثر کیا، مگر یہ مطالعہ جاری نہ رہ سکا۔ اس میں ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کی بصیرت کو دخل تھا۔ جن کے نزدیک اس کے مطالعہ کے شغف سے بعض غیر معتدل رجحانات کے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس حکیمانہ تربیت کا اثر تھا کہ فلسفہ التصوف و اخلاق کے نکات و مباحث نے جو متاخرین صوفیا کی کتابوں میں بکثرت ملتے ہیں، مولانا کو کبھی متاثر نہیں کیا۔ وہ افراط و تفریط سے الگ اعتدال کی راہ پر ہمیشہ گامزن رہے ـــہ

مجدد الف ثانی اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات کے مطالعہ سے علم کلام کا ایک نیا عالم سامنے آیا۔ مکتوبات مجددی کے آخر میں سنت و بدعت کے بارے میں مجددانہ کلمات و تحقیقات سے مولانا کو بڑا شرح صدر اور انکے ایمان و یقین میں اضافہ ہوا۔ نیز دور اکبری و جہاں گیری میں دین کی نصرت و حمایت کے سلسلہ میں مکتوبات نے دینی حمیت و غیرت کو بیدار کیا۔ اور دین کی حرارت پیدا کی ـــہ اسی طرح شاہ ولی اللہ دہلوی کی بے نظیر کتاب حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفا کے بالاستیعاب مطالعہ سے شاہ صاحب کی باریک بینی

کا اثر قائم ہوا۔ علمی و اصولی مباحث اور متکلمانہ و فلسفہ آمیز کتابوں کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہوئی۔ الفوز الکبیر کے مطالعہ نے ذہن کی بہت سی گرہیں کھول دیں۔ شاہ صاحب کی شخصیت اور تحقیقات سے مولانا جتنے متفق اور متاثر ہوئے اس کی بنا پر انھوں نے اپنی فکری اور علمی نسبت شاہ صاحب ہی کی طرف کی ہے، اسلئے کہ انھیں ہی پورے تعلیمی و فکری نسب اور شجرہ کو مولانا ختم سمجھتے تھے۔

مولانا نے درسی اور متداول اور بعض غیر متداول ضخیم تفسیریں لفظ بہ لفظ دیکھیں، لیکن ان کو اصل فائدہ متن قرآن کے سادہ اور بار بار پڑھنے سے ہوا۔ نیز قرآن مجید سے بہرہ ور ہونے کے لئے مولانا کی نگاہ میں دو چیزیں سب سے زیادہ مفید ثابت ہوئی ہیں

ایک علوم نبوت اور مزاج نبوت سے مناسبت رکھنے والے ایسے اشخاص کی صحبت و معاشرت اور جن کی زندگی کان خلقہ القرآن کا پرتو ہو۔

دوسری چیز یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جن راستوں پر چلے ان پر چلنے سے قرآن مجید کھلتا ہے؎ مولانا کے نزدیک ہر وہ چیز جو علوم نبوت کے چشمہ سے نہ آئی ہو، مشتبہ اور الفاظ کا طلسم معلوم ہوتا ہے، تسکین صرف وحی و نبوت کے راستہ سے آئے ہوئے علم سے ہوتی ہے، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا تک پہونچایا اور جو وحی کی زبان میں قرآن مجید اور عربی زبان میں حدیث میں محفوظ ہے۔

حضرت سید احمد شہید کے ملفوظات کے مجموعے صراط مستقیم کے مطالعہ کا یہ فیض ہوا کہ علوم نبوت سے وحشت اور اجنبیت جو وضعی و صناعی علوم و تصنیفات سے پیدا ہوتی ہے۔ دور ہوئی اور اس کی تمیز ہوئی کہ علمی اصطلاحات اور زمانہ کی زبان کے بغیر بھی علوم و حقائق ادا کیے جاسکتے ہیں اور کتابوں کے راستہ کے علاوہ اور بھی راستے ہیں جن سے وہ علوم آتے ہیں جو کتابوں کے صفحات میں مقید نہیں کیے جاسکتے ہیں، ایسا بھی ممکن ہے کہ مغز ہو چھلکے نہ ہوں، معانی ہوں زیادہ الفاظ نہ ہوں، متن ہو حواشی نہ ہوں۔

نصاب و نظام تعلیم و تربیت کے متعلق اصلاحی و تجدیدی خیالات کا تخم مولانا کے دماغ پر شیخ خلیل عرب اور شیخ ہلال کی مجالس میں پڑا۔ دار العلوم ندوۃ العلماء کے ماحول اور لٹریچر نے اس کا نشو و نما کیا۔ ندوۃ العلماء کا تخیل اور دین و دنیا کی ہم آمیزی اور علماء اور اہل دین کی قیادت کی ضرورت و اہمیت کا احساس مولانا حبیب الرحمن شروانی کے اس خطبۂ صدارت سے وضاحت و قوت کے ساتھ مولانا کو ہوا۔ جو ندوۃ العلماء کے اجلاس ۱۹۲۶ء میں پڑھا گیا۔ پھر مزید مطالعہ سے مولانا کا یقین اور اطمینان بڑھتا گیا۔ یہ دونوں چیزیں ان کے علمی عقائد اور نظریات کا جزو بن گئیں؎

مغربی تہذیب و نظام سے مولانا کو نفرت اصل میں ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر عبد العلی اور پھوپھا سید طلحہ حسنی کی صحبتوں اور مجلسوں سے پیدا ہوئی۔ اس نفرت کو جو زیادہ تر قلبی تھا مولانا دریابادی کے رسالہ سچ اور صدق کے پرچوں نے مستحکم اور دماغی بنا دیا، لیکن مغربی تہذیب کی تاریخ کو سمجھنے اور لادینیت و مادیت کے ارتقاء کی اس منزل کی توجیہ میں ڈریپر کی کتاب معرکۂ مذہب و سائنس اور لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ نے بڑی مدد دی۔ ان دونوں کتابوں سے بڑا مواد ملا، جن سے اپنے مضامین اور استدلال میں مولانا نے بڑا کام لیا۔ اسی طرح مغربی تہذیب کے مزاج اور اس کے حقیقی نقائص اسلامی تہذیب سے اس کے بنیادی اور اصولی تضاد اور دونوں کے اتحاد کے عدم امکان کے متعلق سب سے زیادہ واضح اور پر مغز چیز محمد اسد کی کتاب اسلام ایٹ دی کراس روڈ کے مطالعہ سے معلوم ہوئی؎

درس و تدریس کا دور

طالب علمی کے مرحلے کے بعد ہی تدریس و تعلیم سے وابستگی ہوگئی۔ اس دور میں علمی ترقی کے ساتھ روحانی تزکیہ کے مراحل سے گذرے؎۱۲ جو مضامین زیر تدریس تھے ان میں تفسیر، حدیث اور ادب و تاریخ کے مضامین تھے۔ مولانا نے اپنے فطری مزاج اور طبعی خصوصیات کی بنا پر لگے بندھے طریقہ پر تعلیم دینے کے بجائے ایسا طریقہ اختیار کیا جس میں قدم قدم پر سخت محنت و جانفشانی اور تیاری کرنی پڑتی تھی۔ قرآنی مضامین کی تیاری میں گذشتہ اقوام کی تاریخ عقائد، تہذیب، ان کے اخلاقی امراض انسانی سوسائٹی پر ان کے اثرات اور قرآن کی روشنی میں قوموں کے عروج و زوال کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس میں گبن کی تاریخ زوال روما اور دوسرے مغربی مورخین کی کتابوں کا براہ راست مطالعہ کیا۔ سورۂ کہف سے شغف اور عشق نے مغربی مادیت اور اس کے پورے نظام فکر کو سمجھنے میں نہ صرف شاہ کلید عطا کی، بلکہ اس سورہ کی روح اور اسپرٹ نے مغربی کوکھ سے جنم لینے والے فتنوں، لادینی تحریکات اور اس کے علمبرداروں کی فکری سازشوں کو بے نقاب کرنے اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے مولانا کو تیار بھی کیا۔

۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۹ء تک کا یہ دور مولانا کی زندگی میں سخت ترین علمی تیاری اور شدید ترین محنت دیک سوئی کا ہے۔ اس

مدت میں مولانا نے طلبہ پر غیر معمولی محنت کی اور انکے سامنے کلیجہ نکال کر رکھ دیا۔ لیکن اپنے مخصوص مزاج (خوب سے خوب تر کی تلاش اور ذوق جستجو) کی بنا پر یہ فضا بھی شاہیں صفت مولانا علی میاں کو تنگ دکھائی دینے لگی۔ انھیں محسوس ہوا کہ طلبہ پر جتنی محنت کی جاتی ہے اس کے تناسب سے نتائج سامنے نہیں آرہے ہیں، اس لیے کہ تعمیر سے زیادہ تخریبی عناصر طلبہ کی آنکھوں اور کانوں کے راستے دل و دماغ میں بہت تیزی سے جگہ بنا لیتے ہیں، دوسرا احساس یہ بھی تھا کہ صالح تحریک و دعوت اور طلبہ کی صحیح خارجی مشغولیت کے بغیر پند و موعظت اور تعلیمی و تربیتی کوششیں نقش بر آب ثابت ہوتی ہیں۔ ان دو احساسات کے علاوہ جو اندرونی عملی تجربوں پر مبنی تھے۔ ہندوستان کی فضا سیاسی تحریکوں (مسلم لیگ۔ خاکسار اور کانگرس) کی بنا پر پورے برصغیر میں ایک نئے ہمہ گیر انقلاب کے آثار کھلی آنکھوں نظر آنے لگے تھے، جو تہذیب و اخلاقیات، عقائد مذہبی تصورات و اقدار اور تمدن و معاشرت سب پر اثر انداز ہونے والا تھا، بلکہ ان سب کا نیا سانچہ تیار کرنے والا تھا۔

وسیع مطالعہ اور فکر و عمل کے میدان میں

۱۹۳۷ء سے مولانا کا مطالعہ بھی تفسیر و حدیث اور تاریخ و ادب کے دائرے سے باہر نکل آیا تھا۔ انھوں نے اس عرصہ میں ڈاکٹر احمد امین، امیر شکیب ارسلان، عبد الرحمان کواکبی کی تصنیفات کے علاوہ عالم عربی کے رسائل خصوصاً الفتح کے ولولہ انگیز مضامین پڑھے جنھوں نے فکر و نظر میں وسعت پیدا کی اور ہندوستان سے نکل کر عالم اسلام اور اس کے مسائل و تحریکات سے دلچسپی لینے کا سامان پیدا کیا۔ اسی کے ساتھ مولانا نے ہندوستان کی جنگ آزادی اور سیاسی تحریکات کا مطالعہ شروع شروع کر دیا اس سلسلہ میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے رسالہ ترجمان القرآن، مولانا آزاد کے الہلال کے ولولہ انگیز مضامین علامہ اقبال کی حیات بخش شاعری اور مولانا محمد علی جوہر کی پر جوش تقریروں کو پڑھا۔ تحریک خلافت اور سب سے بڑھ کر مغرب کی اسلام دشمنی اور اسلام کے خلاف مغربی طاقتوں کی صف آرائی نے مسلمانوں میں اپنی ذات و ملت کا شعور پیدا کر دیا تھا جس کو اقبال غیرت مند اور حساس انسانوں کو بے چین و مضطرب کر دیا۔ اس سلسلہ میں مولانا کے پاس جو تاثراتی خطوط آئے انھوں نے ان کو محدود تدریسی ماحول سے نکال کر وسیع دعوتی میدان میں لا کھڑا کیا۔ اپنے ہم خیال دوستوں کے ساتھ مولانا نے دینی و دعوتی مراکز کا دورہ کیا، ان شخصیات سے بھی ملے جو دعوتی سرگرمیوں میں مصروف تھے مولانا محمد الیاس کے نفس گرم نے ایمان و احتساب کی ایسی روح پھونک دی جو مولانا کی زندگی میں نئے موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا عبد القادر رائے پوری کی حقیقت پسندی، فنائیت روشن ضمیری، سیاسی فہم و فراست، روشن دماغی دینی و دینوی جامعیت، کریمانہ اخلاق اور بزرگانہ شفقت نے خاص طور سے متاثر کیا۔ انھوں نے مولانا کی علمی و ادبی صلاحیتوں اور اصل جوہر کو پہچانا، ان کی قدر و حوصلہ افزائی کی، اور ترغیب دی کہ وہ ان خداداد صلاحیتوں کو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا اسلام کی قیادت پر از سر نو اعتماد بحال کرنے کے لیے استعمال کریں۔ اس وقت کا یہی تجدیدی کام ہے اور یہی روحانی ترقی کا زینہ ہے۔

پہلا دعوتی رسالہ

۱۹۴۲ء میں ہندوستان چھوڑو تحریک کی قیادت کانگرس کر رہی تھی، یہاں کے برادر وطن اس سلسلہ میں قربانیاں دے رہے تھے مسلمان محض تماشائی بنے ہوئے تھے، حالانکہ ہندوستان کی سلطنت انگریزوں نے مسلمانوں سے چھینی تھی۔ وہی انگریزوں کی آمد سے پہلے اس ملک میں قائدانہ مقام رکھتے تھے۔ انھیں کو برطانوی اقتدار اور غلبہ سے اس وقت سب سے بڑا خطرہ لاحق تھا۔ انھیں

مغربی طاقتوں نے خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کیا تھا۔ اور تمام عرب سلطنتوں کو اپنا غلام و دست نگر بنالیا تھا۔ اس لیے ان کے اصل حریف و رقیب مسلمان تھے اور انھیں کو اصل میدان میں آنا تھا، اور تائیدانہ کردار ادا کرنا چاہیے تھا، کہ قومیں اور ملتیں دلیری و جاں بازی، قربانی و خطر پسندی اور قائدانہ کردار ادا کرنے ہی سے عزت و سرفرازی حاصل کرتی ہیں۔

اس صورت حال کو سامنے رکھ کر مولانا نے دعوتان تنافستان (دو حریف اور نبرد آزما دعوتیں) کے نام سے عربی میں ایک مضمون نئے انداز اور اچھوتے اسلوب میں لکھا۔ اس میں مولانا نے ادبی دائرہ سے نکل کر حالات حاضرہ اور مسلمانوں کے تعلق سے لکھا اور عرب میں پہلی مرتبہ دعوتی روح اور اسلامی فکر نمایاں ہوا تھا۔ اس مقالہ میں مولانا نے جاہلیت اور اسلام کے فرق کو واضح کرنے کے بعد ثابت کیا کہ اس دور میں یورپ مشرق میں جاہلیت کا علمبردار ہے اس کے مقابلہ میں مسلمان اسلام کے حامل و امین اور داعی و نقیب ہیں، اس لئے چاہیئے تو یہ تھا کہ مغربی طاقتوں اور خاص طور پر برطانیہ کے مقابلے میں مسلمان بھی میدان میں آئیں کہ مغربی و برطانوی اقتدار سے سب سے زیادہ انھیں کو نقصان پہونچا ہے۔ اور ایک معین و مثبت دین رکھنے کی وجہ سے آئندہ بھی انھیں کو سب سے بڑا خطرہ لاحق ہے لیکن افسوس ہے کہ صورتحال اس کے برعکس ہے اور وہ اس جنگ آزادی میں خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔

اس رسالہ کے بعد مولانا کے قلم کا رخ عربی میں دعوتی مضامین و رسائل لکھنے اور عربوں کو مخاطب بنانے کی طرف ہو گیا۔

ہم طرز جنوں اور بھی ایجاد کریں گے

مولانا کی تعلیم و تربیت جس انداز میں ہوئی تھی، ان کی سیرت سازی اور ذہنی تشکیل جس طرز پر ہوئی تھی اس کو ہم توفیق الٰہی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں (جیسا کہ خود مولانا بھی اکثر فرماتے تھے) ظاہری طور پر اس میں نصاب کی جدت اور ہر فن کو الگ الگ اس کے ماہرین سے حاصل کرنے اور مناسب وقت پر صحیح علمی ادبی اور دینی رہنمائی مطالعہ کی کتابوں کے انتخاب اور ان سے استفادہ کی صلاحیت اور دوسروں تک دین پہونچانے کی حرص، اور اپنی دعوت کو پیش کرنے میں حسن ترتیب اور حسن بیان کی رعایت کو دخل ہے۔ چنانچہ مولانا نے جتنے رسائل، مضامین اور کتابیں لکھیں ان سب میں دعوت کی طاقت، دینی جذبے کا اظہار اور زور قلم، زبان کی حلاوت و سلاست پائی جاتی ہے۔ عربی اور اردو کی تحریروں میں انھوں نے خود اپنی روش نکالی، کسی کی تقلید اور پیروی انھوں نے نہیں کی۔ ان کے تمام مضامین اور کتابوں میں خود اعتمادی، جوش دروں اور حرارت ایمانی کے ساتھ استدلال کی قوت، قلم کی متانت اور زبان کی حلاوت بھی ہے داعی کی بلند سطح کا خیال ہمیشہ اور ہر جگہ انھوں نے رکھا ہے۔

تصنیفات کے اسباب و محرکات

مولانا کی تحریروں، تقریروں اور گفتگو سے جو بنیادی تاثر ہوتا ہے وہ یہ کہ ان سب تصنیفات اور تقریروں کا سرچشمہ کثرت عبادت و انابت و دعا، قرآن مجید میں عمیق تدبر، سیرت نبوی کا عاشقانہ مطالعہ اور مخلصانہ تتبع اور اجتباء اور ہدایت ربانی ہے۔ نہ کہ محض ذہانت، مطالعہ، وسعت علم اور کسی خاص فلسفہ اور تحریک یا صورت حال کے ردعمل میں یہ کتابیں وجود میں آئی ہیں۔

مولانا کی تصنیفات کے پس منظر اور محرکات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام کتابوں، رسائل اور تقریروں کا محرک اندرونی داعیہ اور جذبہ تھا۔ یعنی وقت کے دینی تقاضوں کی تکمیل اس میں رضائے الٰہی کے حصول کا جذبہ، اسی لئے وہ سب سے پہلے نیت کا استحضار و تجدید کرتے۔ استخارے کی نمازوں اور دعاؤں کا خاص اہتمام فرماتے۔ پھر جب شرح صدر ہو جاتا تو اپنا سارا وقت اور اپنی تمام تر صلاحیتیں اسی کے لیے وقف کر دیتے ہوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے اسی موضوع میں سانس لیتے، اسی مضمون کا خیال دل و دماغ اور تمام اعصاب پر چھا جاتا۔ اس کے علاوہ کسی اور موضوع پر سوچنا مشکل ہو جاتا۔

مطالعہ اور تصنیف کی کیفیت

مولانا شروع ہی سے مطالعہ کے حریص تھے، فرماتے تھے کہ خانوادگی کتب خانہ کے بار بار الٹنے پلٹنے سے مطالعہ کا ذوق بڑھا، والد صاحب کی کتاب یاد ایام، گل رعنا اتنی بار پڑھی کہ حفظ ہو گئی۔ رحمۃ للعالمین جب ہاتھ آئی تو بڑے استغراق اور پورے انہماک کے ساتھ کتاب پڑھی، اور اس میں ایسا ڈوب گیا کہ کسی اور چیز کا ہوش نہیں رہا۔ والدہ صاحبہ کھانا کھلانے بیٹھتیں تو لالٹین کی روشنی میں کھانا کھاتے ہوئے کتاب بھی پڑھا جاتا تھا۔ بس ٹرین اور ہوائی جہاز میں بھی یہ مطالعہ جاری رہتا، بعض کتابوں مثلاً فجر الاسلام کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ رائے بریلی کے ڈاک خانہ میں رجسٹری کے انتظار میں ختم کی۔ مطالعہ کا یہ انہماک اردو، عربی اور انگریزی کتابوں سے فائدہ اٹھانے میں بڑا معاون تھا، السیرۃ النبویہ کی تالیف کے

کے وقت اپنے ایک خادم کو قاہرہ خط لکھا کہ ہم نے ۱۹۴۷ء میں مکہ معظمہ کے دوران قیام اسرائیل ونفنسون کی کتاب تاریخ الیہود فی بلاد العرب کا مطالعہ کیا تھا، دار الکتب المصریہ سے یہ کتاب نکال کر فلاں صفحہ سے فلاں صفحہ تک نقل کر کے بھیج دیں[14]

یہی کیفیت تصنیف کے وقت دل و دماغ پر طاری ہو جایا کرتی تھی جیسا کہ اپنی ایمانی کتاب ارکان اربعہ کی تالیف کے اسباب و محرکات بیان کرنے کے بعد کاروان زندگی میں تحریر فرماتے ہیں:

سیتاپور کے زمانہ قیام ۱۹۶۵ء[15] کے دن ایک طرح موت وحیات کی کشمکش کے دن تھے تصنیف وتالیف کا مشغلہ تو الگ، میں اپنے عزیز رفیقوں سے پوچھتا تھا کیا وہ دن پھر آئیں گے کہ میں معمول کے مطابق دن گزاروں گا آزادی سے چلوں پھروں گا، اور دوستوں عزیزوں کی مجلس میں شرکت کروں گا۔ لیکن اس امید و بیم کی حالت میں بھی شدت سے اس کا تقاضہ پیدا ہوا کہ یہاں سے چھٹی پلتے ہی اسلام کے عملی ارکان اربعہ پر مکمل کتاب تصنیف کرنے کی کوشش کروں، یہ خیال قلب و ذہن پر ایسا غالب ہوا کہ اس کو ہسپتال کا بیمار وسوگوار ماحول اور آنکھ کی بار بار کی تکلیف بھی ہٹا نہ سکی[16] کتاب کی تالیف کے محرکات کا ذکر کر کے تحریر فرماتے ہیں

۱۹ر فروری ۱۹۶۶ء کو اسپتال سے واپسی ہوئی تھی، کچھ دن ضروری آرام اور ایک دو سفر کے بعد ۸ر اپریل ۱۹۶۶ء ۱۶ر ذی الحجہ ۱۳۸۵ھ سے اللہ کا نام لے کر اس کام کا آغاز کر دیا گیا۔ گرمیاں شروع ہو چکی تھیں اور آنکھ کی کیفیت کے لحاظ سے گرمی میں زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی[17] میں نے حضرت شاہ علم اللہ اور سید احمد شہید کی بابرکت مسجد میں جانب مغرب عقبی حصہ میں بیٹھ کر لکھوانے کا کام شروع کیا۔ عزیزی مولوی نثار الحق ندوی لکھتے تھے، میں بولتا تھا، کتاب کو اصلاً عربی میں لکھنا تھا۔

طرز تصنیف و تحقیق

اپنے طرز تصنیف کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: پہلے میں نے مواد جمع کیا۔ مثلاً نماز کے لئے پہلے ایک بار پورے قرآن مجید پر نظر ڈالی[18] متعین آیات نوٹ کرائیں۔ حدیث کے لیے جمع الفوائد ومجمع الزوائد کے ان ابواب پر نظر ڈالی جو ان ارکان کے فضائل، مقاصد وفوائد کے متعلق تھیں۔ اور ان کو نوٹ کیا، پھر خصوصیت کے ساتھ امام غزالی حافظ ابن قیم، اور شاہ ولی اللہ نے اپنی تالیفات احیاء العلوم، زاد المعاد اور حجۃ اللہ البالغۃ وغیرہ میں اس پر جو کچھ لکھا ہے اور جو خاص نکتے ان کی تحریروں میں آئے ہیں ان کو قلمبند کیا۔ پھر ان کو سامنے رکھ کر لکھوانا شروع کیا۔ گرمی کی شدت شروع ہونے تک[19] یہ سلسلہ جاری رہتا ذہن ودماغ پر کتاب کا موضوع اس طرح طاری ہو گیا کہ دوسرے اوقات میں بھی وہ ساتھ نہیں چھوڑتا تھا۔ یہ عرصہ سے میری زندگی کی ہر اہم تصنیف کا خاصہ بن گیا ہے اس کے خلاف کرنا عام حالات میں اب ممکن نہیں رہا ہے۔ یہ ایک طرح کا تصنیفی اعتکاف ہوتا ہے جس سے نکلنا اس وقت ہوتا ہے جب کتاب کی آمد تحت ہلال عید بن کر نمودار ہوتی ہے (کاروان زندگی ج دوم ص[18])

بینائی کی اس کمزوری کے باوجود نزہۃ الخواطر جلد ہشتم اور الھند فی العہد الاسلامی کی تکمیل فرمائی۔ جو بڑا پتہ ماری اور بقول مولانا کے ہفت خواں سر کرنے کے برابر تھا۔ صورت یہ تھی کہ نزہۃ الخواطر جلد ہشتم کی تالیف کے درمیان ہی والد ماجد کا انتقال ہو گیا۔ جگہ جگہ خلا تھے۔ بہت سی شخصیتیں زندہ تھیں۔ جو بعد میں مشہور ہوئیں۔ مصنف نے ان کے ابتدائی حالات لکھ کر چھوڑ دیے تھے۔ اس سے زیادہ دشواری مولانا یہ محسوس کر رہے تھے کہ: والد مرحوم کے قلم سے قلم ملانا سخت دشوار معلوم ہوتا تھا کہ ان کی تحریر میں ایسا ایجاز، سلاست اور حلاوت اور ایک دقیق النظر مصنف وناقد کا احساس ذمہ داری اور فرض شناسی پائی جاتی ہے کہ میں ان کے طرز پر دو سطریں لکھنا بھی مشکل سمجھتا تھا۔ میں ان تراجم وسوانح کی تکمیل کے سلسلہ میں چند سطریں لکھنے کے مقابلہ میں کسی کے متعلق پورا مضمون لکھ دینا آسان سمجھتا تھا کہ اس میں قلم آزاد ہوتا ہے۔ پھر ان ناقص معلومات کو جمع کرنا اور سنین وفات معلوم کرنا خود ایک ہفت خواں سر کرنا تھا۔ ادھر اپنی حالت یہ تھی کہ براہ راست مطالعہ کرنے سے قاصر تھا۔ (ج ۲ ص[23])

اس سے زیادہ دشواری والد ماجد کی دوسری کتاب الھند فی العہد الاسلامی کی تکمیل میں پیش آئی، اس لیے کہ اس پر کئی بار دیمک نے حملہ کر کے کتاب کو زبردست نقصان پہونچا دیا تھا لیکن یہ ہفت خواں بھی گیس جلا کر راتوں کو اور سفروں کے درمیان طے کیا گیا۔

اس کتاب الھند فی العہد الاسلامی کے مقدمہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں.....

مضمون گرفت میں نہیں آ رہا تھا اور یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کہانی کو کہاں سے شروع کیا جائے کہ اچانک مضمون ذہن میں آ گیا۔ ابھی چند سطریں لکھوائی تھیں، عزیزی مولوی نذر الحفیظ ندوی لکھ رہے تھے کہ زخمی آنکھ میں ٹینشن ہوا۔

ایسا درد ہوا کہ میں دوا ڈلوا کر لیٹنے پر مجبور ہوا میں نے لکھوانا بند کر دیا۔ مگر دماغ نے کام کرنا بند نہیں کیا۔ ذہن میں مقدمہ کا مضمون مچل رہا تھا اور ضد کر رہا تھا کہ اس کو اسی وقت حوالۂ قرطاس کیا جائے۔ لیکن لکھوانے کا وقت گذر گیا تھا دوسرے دن کا انتظار کرنا ضروری تھا۔ مجھے وہ تکلیف ابھی تک یاد ہے کہ ذہن کی چکی چل گئی تھی مگر اس سے کام لینے کا موقع نہ تھا۔ اس کی قیمت اعصاب کو ادا کرنی پڑی۔ میں نے کھیتوں میں ٹہل کر دماغ کو سکون پہونچانے کی کوشش کی۔ جوں توں کر کے دن کٹا۔ رات گذری، اگلے دن اس مضمون کو مکمل کیا[٢٠]۔

جب صحت اچھی تھی، تو خود ہی لکھتے تھے، اس وقت بھی لکھنے میں یہی کیفیت ہوتی تھی، مثلاً قصص النبیین کے بعض حصے اور اردو اور عربی کے بعض مضامین و رسالے ٹرینوں پر، تھرڈ کلاس ڈبے میں، کبھی ٹرین کے دروازے کے پاس کبھی بس اسٹینڈ پر بس کے انتظار میں، ہوائی جہاز پر مضامین لکھے۔ اور اس انہماک سے لکھا جیسے مطالعہ و تصنیف میں انہماک ہوتا تھا۔

جوانی کے دور میں جو مطالعہ کیا تھا اس نے بنیاد کا کام دیا۔ نئی تصنیفات و تحقیقات اہم علمی و تحقیقی رسائل برابر دیکھتے رہتے۔ عالم عربی اور یورپ کے سفروں میں نئی کتابوں اور وہاں کے علمی مراکز اور لائبریریوں سے استفادہ فرماتے انگریزی کے اہم انسائیکلو پیڈیا کا بالاستیعاب مطالعہ کر چکے تھے۔ اپنی کتابوں میں علمی حوالوں کا اہتمام کرتے، صفحات، جلد، اڈیشن اور سن طباعت حتیٰ کہ اگر کسی سے کوئی نکتہ یا خیال لیتے تو اس کا بھی حوالہ دیتے۔ ترمیم و اضافہ برابر کرتے رہتے۔ تبصروں اور تنقید کا خیر مقدم کرتے۔ علمی مشوروں کو کشادہ قلبی سے قبول کرتے۔ ترمیم کر بنوا کر پھر دیکھتے۔ انڈکس (اشاریہ) مرتب کرنے کا بڑا اہتمام تھا۔ الفاظ کے صحیح املا کا غیر معمولی خیال فرماتے، ہمیشہ اول درجہ کے ماخذ اور جدید ترین اڈیشن کا حوالہ دیتے۔ تحریر میں وقف، کاما، سوالیہ نشان اور قوسین کا اہتمام کرتے۔

معنوی محاسن

مولانا اپنے کو قرآن کا طالب علم کہتے تھے، چنانچہ ان کی تمام تحریریں اس کے اسلوب میں لکھی گئی ہیں۔ یعنی اثبات مفصل اور نفی مجمل، علمی اور اصولی انداز میں[٢١]۔

مثلاً اس بات کو غلط ثابت کرنا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ میں اصلاح و تجدید اور انقلاب حال کی کوشش مسلسل اور غیر منقطع طور پر نہیں پائی جاتی، بلکہ اس میں بڑے طویل طویل خلا ایں جو صدیوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ کئی کئی سو برسوں کے بعد کچھ شخصیتیں ابھرتی رہی ہیں۔ جنھوں نے حالات سے کش مکش کی اور جو فکری اور عملی لحاظ سے کوئی ممتاز مقام رکھتی ہیں ورنہ عام طور پر متوسط درجہ کے لوگ نظر آتے ہیں۔ فکری اور عملی حیثیت سے عہد انحطاط کی عام سطح سے بلند نہیں تھے اور جن کے علمی اور عملی کارناموں میں کوئی جدت اور ندرت نہیں پائی جاتی۔ صرف گنی چنی شخصیتیں (جنکی تعداد ۶، ۸ سے زیادہ نہیں) اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔

مولانا نے اس خیال کو سرسری نظر سے نہیں دیکھا بلکہ اس کے سنگین نتائج پر نظر کی کہ اگر یہ خیال جدید تعلیم یافتہ کے دل و دماغ میں بیٹھ جاتا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسلام کے اندر ہر دور میں انسانوں کی قیادت کی صلاحیت نہیں، اور وہ ایک ایسا درخت ہے جس نے زیادہ پھل نہیں دیئے۔ مولانا نے اس منفی خیال کی تردید کے لیے نہ تو کسی کی ذات کو نشانہ بنایا اور نہ ہی تحقیر و تنقیص کا اسلوب اختیار کیا، بلکہ اس خیال کو غلط ثابت کرنے کے لئے انھوں نے اسلام کی تیرہ سو برس کی تاریخ میں اصلاح و انقلاب حال کی کوششوں کے تسلسل کو مستند تاریخ کے حوالوں سے ثابت کیا اور ان ممتاز شخصیتوں اور تحریکوں کی نشاندہی کی جنھوں نے اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق دین کے احیا اور تجدید اور اسلام اور مسلمانوں کے کام میں حصہ لیا۔ مولانا نے اس سلسلے میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھا ہے۔

١۔ کسی دعوت یا شخصیت کے حالات و مقاصد معلوم کرنے کے لیے عموماً خود اس کی تصنیفات، تحریروں اور اقوال سے مدد لی۔ اگر اس میں خلا رہ گیا تو اس کے رفقا، و تلامذہ اور معاصرین کی تصنیفات و بیانات کو ترجیح دی، آخری صورت میں مستند ماخذ پر اعتماد کیا۔

٢۔ شخصیتوں کی سیرت اور تذکرہ میں ان کے گرد و پیش اس زمانہ کی علمی و فکری سطح اور کام کے میدان کی وسعتوں کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے تاکہ ان شخصیتوں کی صحیح عظمت اور ان کی کامیابی کی مقدار کا تعین ہو سکے اور اس دور اور ماحول کی کامیابی کے امکانات کا صحیح اندازہ کر کے ان کو تاریخ میں صحیح مقام دیا جا سکے۔ کسی شخصیت کو اس کے ماحول سے نکال کر اپنے ماحول میں لا کر اپنے زمانہ کے پیمانوں اور تقاضوں اور اپنے ذاتی تقاضوں اور خواہشات کے معیار سے جانچنا پھر اس معیار کے لحاظ سے اس کی کوتاہیوں اور فرو گذاشتوں کو نمایاں کرنا ظاہری نگاہ میں ایک بڑا تنقیدی کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔ ہر عظیم سے عظیم شخص دوسرے زمانے اور ماحول کے لحاظ سے اور مورخ کے رجحانات اور خیالات کے پیمانہ سے سخت

ناکام ثابت کی جاسکتی ہے اور نہ صرف اسلامی تاریخ بلکہ انسانی تاریخ کی بھی کوئی شخصیت کامل اور معیاری قرار نہیں دی جاسکتی۔

۳۔ کسی صاحب دعوت یا مصنف اور مفکر کی کتابوں کے زیادہ سے زیادہ مختلف اقتباسات دیئے ہیں تاکہ قارئین مختلف شخصیتوں کے بارے میں محسوس کرسکیں کہ ان کو اطمینان کے ساتھ دیدہ و شنید کا موقع ملا ہے اور کچھ دیر ان کی صحبتوں میں گزارا ہے۔

۴۔ تاریخی شخصیتوں کے صرف علمی کمالات تحقیقات اور تصنیفات کے اقتباسات پر اکتفا نہ کرکے ان کی زندگی کے باطنی پہلو، تعلق مع اللہ اور اخلاقی خصوصیات کو بھی نمایاں کیا ہے کہ یہ متقدمین اہل دعوت اور اہل فکر کی مشترک خصوصیت ہے کہ وہ اپنے علمی کمالات اور علمی انہماک کے ساتھ عبادت و انابت الی اللہ کا ذوق خاص رکھتے تھے اور ان کی کامیابی و مقبولیت میں اس کو خاص دخل ہے۔

۵۔ کسی شخصیت کے تعارف کے سلسلہ میں صرف اس کے فضائل و کمالات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اگر اس کے مخالف و محتاط معاصرین یا صاحب نظر متاخرین نے اس پر یا اس کی تصنیفات و افکار پر تنقید کی ہے تو اس کا بھی تذکرہ کر دیا ہے اور اگر اس کا جواب دیا گیا ہے اور اس کی طرف سے دفاع کیا گیا ہے تو اس کو بھی پیش کر دیا ہے۔ لیکن تاریخ کو ناقدانہ تالیف ثابت کرنے کے لیے جو ضرورت تنقید نقل کرنے کا اہتمام نہیں کیا ہے۔

اس طرح مولانا نے اس کثرت سے مثالیں دی ہیں کہ آدمی کہاں تک ان کی تردید کرے گا اس طرح اس کام کی تکمیل سے نہ صرف اصلاح و دعوت کی تاریخ مرتب ہوگئی، بلکہ ضمناً مسلمانوں کی فکری و علمی انحطاط اور ارتقا کی تاریخ بھی وجود میں آگئی۔

عالم اسلام پر مغرب کے تسلط سے انسانی دنیا کا جو عمومی خسارہ ہوا خاص طور سے مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ جس طرح اس شک آفریں تہذیب سے متاثر ہوکر ذہنی، تہذیبی اور اعتقادی ارتداد میں مبتلا ہوا اس کی دست درجہاں گیری اتنی بڑھی کہ خود دین اسلام کے بنیادی عقائد پر دبیز پردہ ڈالا جانے لگا اور اسلامی تاریخ سے لے کر قرآن و حدیث، سیرت نبوی، عقائد و عبادات کی تفہیم و تشریح میں بڑی بے باکی و بے تکلفی سے عصر حاضر کے فلسفوں، اقتصادی و سیاسی مکاتب خیال اور ان کی مدد و اصطلاحات و تعبیرات کا سہارا لیا جانے لگا، اسکی وجہ سے اس کا قومی اندیشہ پیدا ہوگیا کہ اس مخصوص طرز فکر سے متاثر ہونے والے کہیں خدانخواستہ دین کے ان بنیادی ارکان کی اصل حقیقت و اصل طاقت ہی سے محروم نہ ہو جائیں، اور ان مقاصد ہی سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں جن کے لیے ان ارکان کی تشریع عمل میں آئی ہے۔ جدید مادی اور عصری تفسیر کے دائرہ اثر میں آکر ایمان اور احتساب کا مفہوم بھی ہمارے ذہنوں اور دلوں سے نکل جائے اور مادی طرز فکر، عبادت اور اخلاق کی روح پر غالب آجائے۔ یہی اندازِ فکر سیرت نبوی کو پیش کرنے میں اختیار کیا جانے لگا۔ بعض لوگوں نے سماجی و سیاسی مصلحین کے طرز پر آنحضرت کی سیرت پیش کرنے کی کوشش کی۔ کبھی حضور کی تصویر پیش کرنے کے بجائے شعوری یا لاشعوری طور پر خود اپنی تصویر کھینچ دی۔ بعض نے سیرت نبوی کو صرف عربوں کی محدود جاہلیت کے روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی اور یہ دکھایا کہ چودہ سو سال پہلے اسلام نے اچھا کام کیا تھا۔ اس نے لڑکیوں کو زندہ درگور ہونے سے بچالیا۔ بت پرستی ختم کردی۔ لیکن آج جدید سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے۔ آج کے تقاضے دوسرے ہیں۔ بعض سیرت نگاروں نے انسائیکلو پیڈیائی انداز میں سیرت لکھی۔ مولانا نے اسلامی عبادات جیسے اہم موضوع پر قلم اٹھایا تو فکر اسلامی کی متجددانہ کارنامہ انجام دیا۔ پہلی بار تقابلی مطالعہ دوسرے مذاہب کے نظام عبادت کا کیا۔ ایسے معروضی انداز میں کہ پڑھنے والا بغیر کسی تلقین اور زور زبردستی کے کتاب کی مرکزی روح سے ہم آہنگ ہوتا چلا جاتا ہے۔ انھوں نے اچھوتے اسلوب میں سیرت نبوی کو جب پیش کیا تو اسطرح کہ پوری دنیا پر نبوت محمدی کی عظمت اور تاثیر اور تمام انسانوں پر اس کے اثرات و احسانات کی جھلک آجائے۔ سیرت نبوی کے واقعات و اقدامات کو کثرت سے پیش کرکے ان سے وہ تعلیمی و تربیتی نتائج نکالے ہیں جن کی روشنی میں انسانی معاشرہ کے بگاڑ کو دور کیا جاسکتا ہے اور بلا تکلف ارکان اربعہ اور نبی رحمت کو غیر مسلموں کو دیا جاسکتا ہے۔ مولانا نے ادب تاریخ تذکرے، علم کلام، عبادات، معاملات، سیرت و سوانح پر جتنی تحریر اور تقریریں کی ہیں ان کے بنیادی مقاصد مندرجہ ذیل ہیں۔

جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا اعتماد اسلام کی قیادت اور اس کی تعلیمات کی ابدی صداقتوں پر از سر نو بحال ہو۔

غیر مسلم اسلام سے مانوس اور مسلمانوں سے قریب ہوں۔

مسلمانوں کے اندر جو معاشرتی خرابیاں عقائد و اخلاق کی خرابیاں ہیں دور ہوں اور مادہ پرستی

اور مغربی تہذیب و تمدن پر فریفتگی کم بلکہ ختم ہو کر اسلامی معاشرہ کی خوبیاں پیدا ہوں۔

قرآن سے ذاتی تعلق پیدا ہو، سیرت نبوی سے شغف ہو، سنت سے محبت و تعلق ہو، توحید خالص کا عقیدہ راسخ ہو جائے۔ اسلامی عبادات سے زندہ تعلق ہو، اور انکے اثرات انفرادی و اجتماعی زندگی پر نمایاں۔ اسلاف کرام، ائمہ مجتہدین، مجددین اور حقانی و ربانی علما کی داعیانہ کوششوں کی قدر اور شکر کا احساس ہو۔

مسلمان جہاں بھی رہیں شان امتیاز لے سے رہیں۔ اپنے تشخص کی حفاظت کریں اور غیر اسلامی اثرات سے اپنے کو محفوظ کریں۔

لہ جیسا کہ خود ان کی عبارت سے اندازہ ہوتا ہے جو انھوں نے اپنی مایہ ناز کتاب ارکان اربعہ میں لکھی ہے۔ "نماز کوئی ایسا ذہنی سانچہ یا چوب خشک کی طرح کوئی جامد اور محدود چیز نہیں جس میں سب یکساں ہوں اور ہر نمازی ایک سطح پر رہنے کے لیے مجبور اور اس سے آگے بڑھنے سے قاصر ہو، وہ درا صل ایک بہت بڑا اور وسیع و عریض میدان ہے جہاں نمازی ایک حال سے دوسرے حال تک اور عروج سے کمال تک اور کمال سے ان منزلوں تک پہنچتا ہے جو اس کے تصور و خیال سے بھی ماورا ہیں۔ اس میں لوگوں کا مرتبہ و مقام ایک دوسرے سے بہت مختلف اور جدا ہے۔ اور سب کی سطح الگ ہے۔ غفلت اور جہالت والی نماز استحضار و تفقہ والی نماز کا مقابلہ کیسے کرسکتی ہے پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ آج کی نماز کل والی نماز سے یا چند ماہ اور چند سال پیشتر والی نماز سے مشابہ ہو اور نمازی ہمیشہ ایک ہی معیار کی نماز پڑھتا رہے (ص ١١٨)

لہ لیکن بہت سے مصنفین (جو لکھے زیادہ پڑھے کم ہوتے ہیں) اپنی تصنیفات کو شاندار الفاظ اور پر جلال علمی اصطلاحات کا پلندہ بنادیتے ہیں، اور ذاتی پسند و ترجیح کو پوری امت بلکہ اجماع کے خلاف مسلط کرنا چاہتے ہیں ایکے لیے دور از کار تاویلات کا سہارا اور بسا اوقات صدیوں کی اسلامی تاریخ پر (جس کا انھوں نے گہرائی سے مطالعہ نہیں کیا) پانی پھیر دیتے ہیں۔

لہ مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو۔ کاروان مدینہ نبی رحمت، دور الحدیث فی تکوین المناخ الاسلامی، سیرت نبوی دعاؤں کے آئینے میں۔

لہ عالم عرب کے چوٹی کے ادیب و ناقد شیخ علی الطنطاوی، ممتاز عالم ڈاکٹر قرضاوی نے مولانا کے محاسن و کمالات میں ان کے تاریخی حسن اور شعور کی پختگی اور ثقافت کے تنوع اور وسعت کی خاص طور سے داد دی ہے۔

ڤہ مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو۔ تاریخ دعوت عزیمت۔

لہ مولانا کی تمام تصنیفات میں سلف جیسی احتیاط علمی ورع۔ اہل لغت جیسا اتقان، علمائے نحو جیسی پختگی اور اہل زبان جیسی شیرینی موجود ہے۔

لہ فرماتے تھے کہ اعتدال کی راہ پر چلنا سب سے مشکل کام ہے۔ اس لیے کہ اس میں جلد شہرت اور مقبولیت حاصل نہیں ہوتی۔ نفس کو بھی تسکین نہیں ہوتی۔ گرم اور تیز گفتگو، خون کا بحر احمر جاری کرنے اور سروں کا قطب مینار قائم کرنے جیسی تعبیرات کی لوگ خوب داد دیتے ہیں۔ لیکن کثرت استعمال سے ان کی گرمی بہت جلد ختم ہو جاتی ہے اور انکے منفی اثرات ناقابل تلافی ہوتے ہیں۔

لہ حضرت مجدد الف ثانی کی عبقریت اور ان کے اسلوب دعوت کے مولانا بڑے قائل تھے۔ فرماتے تھے کہ آج کل کے عہد میں یہی اسلوب دعوت مناسب اور نتائج کے اعتبار سے مضمون ہے چنانچہ مسلم و غیر مسلم سربراہان حکومت اور امرا و وزرا کو جو خطوط لکھے اور ان سے ملاقاتوں میں جو باتیں کیں ان سب میں اسی مجددی کردار اسلوب کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔

لله اس کے لیے ملاحظہ ہو: مطالعہ قرآن کے اصول و مبادی، قرآنی افادات۔ ارکان اربعہ۔ مرکز ایمان و مادیت، دعوت و تبلیغ کے معجزانہ اسلوب، کے فکر انگیز مباحث و مضامین وغیرہ

لله نحو التربیة الاسلامیة الحرة میں مولانا نے تمام مسلم حکومتوں کو دعوت دی ہے کہ وہ عقائد کے تزلزل، ذہنی انتشار، اخلاقی انارکی، نہ ختم ہونے والی ذہنی کشمکش، حکومتوں اور عوام کے درمیان مسلسل نبرد آزمائی سے اگر نکلنا چاہتی ہیں تو انھیں مغربی ملکوں سے درآمد کیے ہوئے نظام تعلیم و تربیت کے بجائے آزاد اسلامی نظام تعلیم و تربیت کو اختیار کرنا ہوگا۔

لله ان کے علاوہ گبن کی کتاب زوال روما۔ ہونڈنگ کی تاریخ فلسفہ جدید اور بعض اہم جرمن کی کتاب پڑھی۔

لله مولانا احمد علی لاہوری سے بیعت کی اور انکی نگرانی میں روحانی مدارج طے کیے۔ مولانا عبدالقادر رائے پوری نے چاروں سلسلوں میں اجازت دی۔ مولانا کا ذہنی سانچہ چونکہ پہلے سے بنا ہوا تھا اس لیے ان کو کسی ذہنی ہجرت کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

لله اخوان کی تحریک کے متعلق لٹریچر ۱۹۴۷ء کے بعد آئے۔

لله جو کتاب ۱۹۴۲ء میں پڑھی تھی اس کی تمام تفصیلات ان کو یاد تھیں اور ۱۹۷۸ء میں

اس سے فائدہ اٹھایا۔ انگریزی زبان کی تحصیل میں زبردست انہماک پر دالد صاحب نے متنبہ بھی فرمایا۔ لیکن اس کا بنیادی فائدہ یہ ہوا کہ انگریزی کے بنیادی ماخذ پر نظر پڑ گئی۔ مجموعی طور پر انگریزی کے جن ماخذ کا مولانا نے اپنی کتابوں میں حوالہ دیا ہے ان کی تعداد دو سو کے قریب ہے۔

۱۵ آنکھ کے علاج کے سلسلے میں کئی ماہ ہسپتال میں قیام رہا تھا۔

۱۶ دائیں آنکھ میں آپریشن کی خرابی سے تکلیف رہا کرتی تھی۔ اکثر ایسا ٹینشن ہوجایا کرتا کہ ساری رات جاگ کر گزارتے تھے۔ اس حال میں بھی تیمارداروں سے تراویح میں قرآن شریف سنا کرتے۔ دن میں اردو عربی کتابیں سنا کرتے چند ماہ کے قیام میں آٹھ ہزار سے زائد صفحات کو پڑھوا کر سنا۔

۱۷ ۲۲ جون ۱۹۶۶ء کو دینی تعلیمی کونسل کے زیر اہتمام میرٹھ میں ایک جلسہ تھا بسوں کے ذریعہ کئی جگہ سخت لو اور گرمی میں سفر ہوا۔ کئی کئی گھنٹے بس کے انتظار میں شدید گرمی میں وقت گزارنا پڑا۔ ۲۲ جون کی شب میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرکے آرام کیا۔ صبح اٹھے تو معلوم ہوا کہ آنکھ کی روشنی جاتی رہی۔ اناللہ (کاروان زندگی حصہ اول ص ۱۱۴)

۱۸ اکیس پارہ تک ترتیب سے یاد کرکے کئی بار تراویح سنا چکے تھے۔ ۲۶ تا ۳۰ بھی یاد تھے جب تک صحت نے ساتھ دیا حفظ کیے ہوئے پارے روزانہ کسی کو سناتے تھے۔

۱۹ اس زمانہ میں تکیہ پر بجلی نہیں آئی تھی۔

۲۰ یہ واقعہ تکیہ پر پیش آیا۔ ان دنوں کھیتوں میں گندم کی فصل لگی ہوئی تھی۔ یہ مقدمہ ۲۳ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

۲۱ امام ابن تیمیہ کے حوالے سے یہ بات فرماتے تھے۔ چند سال قبل ایک صاحب نے زر کثیر صرف کرکے اپنے ایک شاگرد سے عربی میں ایک ضخیم کتاب حضرت مولانا کے خلاف لکھوائی۔ پھر بڑے اہتمام سے ایک قاصد کے ذریعہ وہ کتاب بھیجی۔ جب وہ کتاب مولانا کو دی گئی تو کتاب دیکھ کر فرمایا کہ اگر آپ ہمارے خلاف دس مزید جلدیں اس طرح کی لکھ دیں گے جب بھی آپ کو اس کا جواب نہیں ملے گا۔ پھر امام ابن تیمیہ کا حوالہ دیا کہ اصل چیز مثبت اور تعمیری کام ہے۔ حضرت مولانا کا اپنے بارے میں ہمیشہ یہی معاملہ رہا اپنے خلاف کسی تنقید کا تذکرہ تک نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی ناقد کا نام لیتا تو اس کو بھی روک دیتے۔ اگر کوئی جواب دینے کا ارادہ کرتا تو اس کو بھی منع فرما دیتے۔

تاریخ وفات

قمر سنبھلی

جناب شیخ ندوی دارِ فانی سے ہوئے رخصت
سفینہ آہ ملت کا ہوا ہے آج بے ساحل
قمر کے غم سے بوجھل ذہن کو تاریخ کی تھی فکر
ندا غیب سے آئی "محمد خلد میں داخل"
۱۴۲۰ھ
اک سرپرست محسنِ ملت کو کھو کے آج
ہے ان کے غم میں عالمِ اسلام نوحہ خواں
سالِ وفات ملتا ہے یوں بھی کبھی قمر
ٹکراتی ہیں صدائیں سماعت سے ناگہاں
اہلِ جناں پکار اٹھے "روزہ" کے ساتھ ہیں
۲۱۸
"داخل ہوئے بہشت میں حسن دم علی میاں"

۲۱۸ + ۱۷۸۱ = ۱۹۹۹ء

نازشِ قوم و وطن

محمد امین بھیلونی

زینتِ ارضِ وطن جاتا رہا   پاسبانِ علم و فن جاتا رہا
کانپتا ہے دل، لرزتا ہے قلم   کیسے لکھوں بوالحسن جاتا رہا
جس کے دم سے محفلیں تھیں تابناک   اف! جہاں سے وہ رتن جاتا رہا
قوم کی حرماں نصیبی آہ آہ!   مردِ جانبازِ وطن جاتا رہا
مندمل کرتا رہا جو زخمِ قوم   وہ مسیحائے زمن جاتا رہا
قصرِ باطل میں جلا کر شمعِ حق   دہر سے باطل شکن جاتا رہا
فخر اب کس پر کریں اہلِ جہاں   شیر دل، شیریں سخن جاتا رہا
تھا دل و جاں سے فدا جس پر جہاں   اُف! وہ محبوبِ زمن جاتا رہا
اہلِ محفل کو رُلا کر زار زار   آہ! میرا انجمن جاتا رہا
کیوں نہ روئے اشکِ خوں چشمِ بشر   نازشِ قوم و وطن جاتا رہا

چل بسا دنیا سے انسان عظیم
ہوگیا ملت کا نقصانِ عظیم

تبرکاتِ ماجدی

مفسّرِ قرآن حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادی رحمۃ اللہ علیہ

کا

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ارشاد گرامیؒ

علی میاں مرحوم نہیں ـــــ، ماشاء اللہ زندہ سلامت ہیں اور خدا کرے خدمت دین و ملت کیلئے مدتوں اس خاکدان کو زندہ و سرسبز رکھیں۔ سن میں مجھ سے کہیں چھوٹے ہیں لیکن علم و فضل میں سنجیدگی، فکر میں اخلاص میں اخلاق و تقویٰ میں، عبادت میں، ریاضت میں، خشیت و طاعت میں میرے بڑوں میں شامل ہونے کے قابل، رائے بریلی کے سید زادے خاندان کے اور لوگوں سے بھی واقف ہوں۔ باپ اور بھائی کا کیا کہنا' دونوں نورٌ علیٰ نور۔ پاک صاف، طاہر مطہر مٹی (جو تیمم کے قابل ہو) سے بنے ہوئے دوسرے اعزہ بھی اپنی جگہ قابلِ قدر اور قابل فخر ان تاروں کے جھرمٹ میں آفتاب۔ ندوہ اور دیوبند ماشاء اللہ دونوں کے اکابر سے علم دین حاصل کیا اور اپنے خاندان کے بزرگوں سے اور (انہی میں مائیں اور دادیاں بھی شامل ہیں) اخلاق و روحانیت کا سبق لیا۔ ذکاوتؔ و فطانت کے پتلے پہلے سے تھے 'چندے آفتاب چندے ماہتاب بن کر رہے، انگریزی بھی بقدر ضرورت تحصیل کرلی اور عربی ادب و انشاء میں تو ہندوستان اور عالمِ اسلام میں نام پیدا کردیا ہے، خود اردو شعر و ادب کا اعلیٰ مذاق رکھتے ہوئے، شامی و مصری صحافت پر بھی سیر حاصل نظر کرلی، تقریر و حکایت میں ملکہ روانی تحریر سے بھی زیادہ، میری طرح کاہل و جامد نہیں۔ ندوہ جیسے بڑے دارالعلوم کا انتظام بھی کرتے ہیں اور سارے ہندوستان کا دورہ الگ، ابھی یہاں، ابھی وہاں اور مقالات و تصانیف ہیں کہ ساتھ ہی ساتھ کھٹا کھٹ نکلی چلی آرہی ہیں اردو اور عربی کے علاوہ انگریزی میں بھی بلکہ ترکی میں بھی کسی حد تک، زندگی قابلِ داد بھی، قابلِ رشک بھی، خود مجھے اپنے معاملہ میں "بخل" یا تواضع بے جا کی شکایت البتہ ہے ایک بار نہیں شاید دو ایک بار، اور اشارۃً کنایۃً نہیں، منہ پھوڑ کر پوچھا۔ حضرت! شاندار مصطلحات تصوف کا مفہوم کچھ تو ہم نیاز مندوں پر کھولئے اور "تنازل ستہ" کے چہرے سے نقاب ذرا سا سرکائیے، توجہ باطل سے قلب کو گرمائیے" کچھ جواب نہ ملا، تجاہل سا کرکے ٹال گئے۔ ایسا تجاہل جو دانستہ تغافل سے کم نہیں، اتنے کام مختلف قسم کے اپنے سر لے رکھے ہیں کہ کوئی ان کی مفصل فہرست ہی بنالے تو یہی ایک کمال ہے۔

مختصر یہ کہ سیاسیات ملی اور کلام، تاریخ امت اور سوانح، اکابر، اسرار شریعت پر تو خاص کام کرچکے ہیں۔

میں اپنے وصیت نامہ میں لکھے جاتا ہوں کہ میرے وقت موعود کے آجانے پر پہلے تلاش انہی کی کی جائے اور اگر یہ مل جائیں تو نماز جنازہ پڑھانے کے لئے حق دار نمبر اول یہی ہیں۔

دنیا انہیں مولانا ابوالحسن علی ندوی کہہ کر پکارتی ہے۔ ہم لوگوں کی زبان پر خالی 'علی میاں' ہیں، عزیزوں سے بڑھ کر عزیز۔

حضرت مولانا کا ندوۃ العلماء سے تعلق

مولانا عبداللہ عباس ندوی

یکم اگست ۱۹۳۴ء سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ایک مدرس کی حیثیت سے کام شروع کیا اور ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء کو آپ کی وفات ہوئی، اس طرح مکمل ۶۵ سال آپ ندوہ سے متعلق اور ندوہ آپ سے وابستہ رہا، اس عرصہ میں آپ نے ایک استاذ کی حیثیت سے تعلیم وتدریس کی خدمت انجام دی، نائب معتمد تعلیم کے فرائض انجام دیئے، معتمد تعلیم کا منصب سنبھالا اور ناظم کی حیثیت سے پوری مجلس ندوۃ العلماء کی ذمہ داریاں اٹھائیں اور زندگی کے آخری سانس تک آپ اس کے ناظم رہے۔ ابتدا میں آپ کا تعارف ندوۃ العلماء کے ایک تعلیم یافتہ اور ندوی الفکر عالم دین، مفسر اور ادیب کی حیثیت سے ہوا لیکن بعد میں وہ زمانہ بھی دنیا نے دیکھا کہ ندوہ آپ کے ذریعہ پہچانا جانے لگا، اور عالم اسلام کے علمی نقشہ پر ندوہ ابھر کر لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنا۔ اور آپ کے دم سے جو نورانی فضا اور دینی ماحول بنا تھا اس کی چاندنی سے آج بھی ندوہ کا ذرہ ذرہ تاباں اور اس ابر کرم سے یہاں کا پتہ پتہ شاداب ہے.... "شاداب تر باد"!

آپ نے ندوہ میں تدریسی خدمت اس وقت سے شروع کی جب مولانا عبدالرحمٰن کاشغری ندوی دارالعلوم سے جدا ہو کر مدرسہ عالیہ کلکتہ کی خدمت پر مامور ہوئے۔ مولانا کاشغری تفسیر وادب کی کتابیں پڑھایا کرتے تھے، یہی کتابیں حضرت مولانا کے سپرد کی گئیں، اور یہ خدا ساز بات تھی۔ یہی دو موضوع آپ کے اختصاصی مضمون تھے۔ تفسیر آپ نے ندوہ کے علاوہ حضرت مولانا احمد علی لاہوری سے پڑھی تھی، لیکن زمانہ تدریس میں آپ کو پورے تفسیری سرمایہ کو لفظاً لفظاً پڑھنا پڑا۔ تفسیر کبیر امام رازی، کشاف للزمخشری روح المعانی للآلوسی کے علاوہ متاخرین میں حافظ ابن کثیر سے لے کر معاصر مفسرین کی تحریری خدمات کی ورق گردانی کرنا پڑی، لیکن خاندانی ذوق نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے انداز تفسیر کو سب پر غالب رکھا، یہاں تک کہ آپ کے مرشد واستاذ حضرت لاہوری کا ذوق وانداز تفسیر یعنی نظام ربط آیات اور سورتوں کی معنوی ترتیب اور ہر سورہ کا ایک مستقل عنوان قائم کرنا اور اس کو مرکزی مضمون قرار دینا حضرت مولانا کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہوا۔ اگرچہ اس فن کو حضرت مولانا نے وقت کے سب سے بڑے صاحب فن (مولانا لاہوریؒ) سے حاصل کیا تھا اور ان کے تمام درسی شرائط اور جزئیات کو اس طرح پورا کیا تھا کہ وہ حضرت لاہوری کے ان تمام شاگردوں میں ممتاز تھے۔ جو آپ کے شریک درس رہے تھے۔ (تفصیلات کاروان زندگی (ج ۱) اور میر کارواں دونوں میں موجود ہیں)۔

جہاں تک ادب کی تدریس کا تعلق ہے ہندستان میں اسلامی ادب کی پرورش آپ کے گھرانہ میں ہوئی، دادا صاحب مؤرخ ومصنف، والد اردو ادب کے مستند مؤرخ، والدہ مناجات البنات کی شاعرہ، بہن بہنوئی حدیث نبوی کے ادبی گوشوں پر روشنی ڈالنے والے خود آپ کے استاذ مولانا خلیل عرب دین وادب کے عاشق، شیخ تقی الدین ہلالی عرب دنیا میں صف اول کے صاحب قلم اور ادیب، لہٰذا یہ کہنا کہ ادب آپ کے خمیر میں داخل تھا اور قرآن کریم کی تفسیر وتلاوت نے زبان شناسی کو مزاج وافتاد کا جزو بنا دیا تھا، کوئی مبالغہ نہیں ہے۔

جب آپ نے تدریس شروع کی اس وقت آپ کی عمر ۲۰ سال سے دو چار مہینے آگے ہوگی، لیکن تفسیر وادب کے دونوں میدانوں میں بزرگ سال، کہنہ مشق اور تجربہ کار مربی ومدرس کی طرح نمایاں ہوئے۔ اگرچہ تدریس کی مدت بہت طویل نہیں ہے، حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ سے روحانی وابستگی کے بعد آپ دعوت وتبلیغ میں منہمک ہوگئے اور نو سال تدریسی خدمت کے بعد پہلے تو ایک سال کی چھٹی لی، پھر ۱۹۴۵ء میں استعفیٰ دے دیا لیکن اس نو سال کی مدت میں اللہ تعالیٰ نے آپ سے وہ کام لیے جو کوئی اگر نوے سال کی مدت میں انجام دیتا تو بھی نیک نام اور کامیاب کہا جاتا۔

اس عرصہ میں آپ نے مختارات لکھی، قصص النبیین کے چار حصے مرتب فرمائے، پانچواں حصہ جو سیرت نبوی میں ہے وہ بعد میں اضافہ فرمایا۔ القراءۃ الراشدۃ کا سلسلہ تین جلدوں میں مکمل کیا، اس طرح آپ نے نثر عربی کا پورا نصاب تیار کر دیا "مختارات" کی تالیف .... عربی نصاب تعلیم میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے

اندر ایک انفرادیت ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اس کو کسی قدر وضاحت سے پیش کیا جائے۔

عربی نثر کے ادبی حیثیت سے ممتاز ٹکڑوں کا مجموعہ جو ادب آموزی کے لئے منتخب کرکے یکجا کیا گیا ہو۔ اس کو "مختارات" کا نام دیا گیا ہے، اس طرح کے مجموعات ہر زبان میں تیار ہوئے ہیں اور عرب ممالک میں تو ماہرین فن کی ایک کمیٹی تقریباً ہر سال ایسے مجموعے نکالتی رہتی ہے، یوں بھی عربی مزاج انتخاب و اختیار کو پسند کرتا ہے، مختارات البارودی حماسۃ ابی تمام، حماسۃ البحتری، مجموعۃ من النظم والنثر، المطالعۃ العربیۃ۔ اور اس طرح کی درجنوں کتابیں ہماری لائبریریوں میں دستیاب ہیں، لہٰذا صرف ادبی ٹکڑوں کا یکجا کر دینا کوئی بے مثال کام نہیں ہے۔

یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ عربی نثری انتخاب میں لوگوں نے دینی عنصر کا لحاظ نہیں رکھا ہے واقعہ یہ ہے کہ سعودی عرب تو سعودی عرب ہے جو حرمین شریفین کا امین ہے، مصر اور یمن میں جو نثری انتخاب کے مجموعات شائع ہوئے ہیں، ان میں قرآن کریم کی آیات، احادیث شریفہ کے اقتباس دیئے جاتے ہیں، مملکت سعودیہ عربیہ میں تو کئی رکوع قرآن شریف کے اور متعدد احادیث نیز حکمت و دانائی کے اقوال نقل کئے جاتے ہیں۔ اور حکومت کی تعلیمی سیاست بھی یہی ہے کہ دین سے طلبہ کو مانوس رکھا جائے۔

لہٰذا یہ کہنا کہ مختارات کی قدر اس لئے ہوئی کہ اس میں اسلامی فکر غالب ہے کلیتہً صحیح نہیں ہے۔ ایک طرف یہ حقیقت ہے جو اوپر کی سطروں میں بیان کی گئی، دوسری طرف یہ واقعہ ہے کہ ان ماہرین فن نے جنہوں نے خود اس طرح کے مختارات مرتب کئے ہیں انھوں نے مختارات کو اہمیت دی کہ ثانویہ کے مطالعہ کے لئے اس کو منتخب کیا، مصر و شام میں اہل علم و ادب نے اس کی قدر دانی کی۔

بات صرف یہ ہے کہ جن لوگوں نے ادبی مقطوعات کا انتخاب کیا ان کے پیش نظر زبان کے ساتھ دین و اخلاق کا سبق بھی دینا تھا، انھوں نے صرف ان مقطوعات کو چنا جن پر "ادب" کی مہر لگی تھی، اور جن کے لکھنے والے ادیب کہے جاتے تھے جیسے نثر میں المبرد، علی القالی، عبد الحمید الکاتب، القاضی الفاضل، جاحظ، حریری بدیع الزمان اور ان کے معاصرین و اتباع، لیکن کسی نے یہ نہیں دیکھا کہ قرآن و حدیث سے زیادہ کوئی عبارت ادب عالیہ کا نمونہ نہیں ہو سکتی احادیث میں بھی چند حکمت و ایجاز کے نمونے جوامع الکلم ہی نہیں بلکہ طول طویل روایتیں بھی ادب عالیہ کے نمونے ہیں، مثلاً ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور صحابی رسول حضرت کعب بن مالک کی بیان کردہ داستانیں بھی اعلیٰ ادبی مقام رکھتی ہیں۔ اور دراصل زبان ان ہی حضرات کی گفتگوؤں، بیانات اور تقریروں سے مرتب ہوئی ہے، صرف و نحو کے قواعد انہی کی بولی سے مرتب کئے گئے ہیں، اسی طرح خلفائے راشدین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، عمر فاروق رض، عثمان غنی رض، علی مرتضیٰ رض کی تقریریں بھی ادبیت و جامعیت کا نمونہ ہیں۔ جن سے زبان آموزی کا کام لیا جا سکتا ہے۔ مصنف نے دوسرے درجہ پر ان مقطوعات کو بھی لیا ہے جو ادب کے نام سے مشہور ہیں، اور جن کے اسالیب بیان کو جاننا ایک طالب علم کے لئے ضروری ہے۔

ایک ادبی کتاب پر تبصرہ کرنے اور رائے دینے کا حق ایک ادیب ہی کو پہونچتا ہے مختارات کو عربی زبان کا مستند و معروف صاحب قلم جس کی نظر میں قدیم و جدید ادبی سرمایہ موجود ہے جس نے رطب و یابس سب پڑھا اور پڑھایا ہے، کیا کہتا ہے اس نے کس نظر سے مختارات کو دیکھا، میری مراد علامہ سید علی طنطاوی سے ہے جو تسلیم شدہ ناقد اور صاحب اسلوب ادیب ہیں، انھوں نے لکھا ہے:

" اگر کسی ادیب کے ذوق کا اندازہ اس کی پسند سے کیا جا سکتا ہے تو ہمارے قارئین کے علم میں یہ بات لانا کافی ہوگا کہ ابھی تھوڑے عرصہ کی بات ہے کہ ادبی منتخبات کے متعدد مجموعوں کا ہم لوگوں نے جائزہ لیا تاکہ ان میں سے کسی ایک مجموعہ کا شام (سوریہ) کے مدارس شرعیہ کے ثانوی درجات کے لئے انتخاب کریں، اس کمیٹی کے تمام افراد نے ان مجموعات کی چھان بین شروع کی اور واضح رہے کہ اس کمیٹی کے تمام ہی افراد ادبا ہیں، تلاش و جستجو اور بحث و تفتیش کے بعد ہم سب نے متفقہ طور پر ان تمام منتخبات میں سے ایک مجموعہ منتخب نثر عربی کا پسند کیا وہ ہے "مختارات مرتبہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی"۔

بہت دنوں سے میری آرزو تھی کہ ہم لوگ (یعنی اساتذۂ ادب عربی) اپنے شاگردوں کو اس تنگ و تاریک قید خانہ سے نجات دلائیں جس میں ہم نے ان کو بند رکھا ہے، ان کو آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع دیں، ان کو دن کی روشنی دکھائیں، ہم اپنے منتخب مضامین میں جاحظ کے مقطوعہ "وصف الکتاب" سے ان کو نکالیں جس میں ایک معنیٰ کے متعدد ہم معنیٰ الفاظ (مرادفات) کے سوا کچھ نہیں رکھا ہے، ان کو ابن العمید کے لفظی کرتب اور الصاحب (ابن العباد) کے گیجڑ دلا اور القاضی الفاضل کے گھروندوں سے

نکالیں، جن کو پڑھ کر طلبہ ادب سے متنفر ہو جاتے ہیں، اور ہم ادب سے ان کو مانوس کرنے کے بجائے بیزار کرتے ہیں، ہم نے بارہا کہا کہ ابوحیان التوحیدی جاحظ سے زیادہ تحریر پر قدرت رکھتا ہے، اگرچہ جاحظ کے پاس سنی سنائی باتوں کا زیادہ ذخیرہ ہے، اور علمی طور پر فائق ہے۔ اسی طرح حسن بصری ان دونوں سے زیادہ بلیغ تھے، اور ابن السماک حسن بصریؒ سے بھی زیادہ بلیغ تھے۔(۱)

امام غزالی نے جو الاحیا، (احیاء علوم الدین) میں اور ابن خلدون نے مقدمہ میں جو کچھ لکھ دیا ہے ابن جوزی نے (صید الخاطر) میں جو لکھا ہے ابن ہشام نے جو سیرت میں لکھا ہے، امام شافعی نے جو الأم (کتاب الأم) میں لکھا ہے اور سرخسی نے "مبسوط" میں جو لکھا ہے (یعنی جو زبان استعمال کی ہے اور خوب صورت پیرایہ بیان اختیار کیا ہے) وہ طالب علم کو ادب سکھانے کے لئے کہیں زیادہ بہتر اور اولیٰ ہے بہ نسبت ابن عباد کی حماقتوں کے مطالعہ سے اور حریری اور ابن اثیر کے تعمیر کردہ لفظی گھروندوں سے۔

میں نے اس موضوع پر بارہا لکھا ہے لیکن کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا، نتیجہ یہ کہ میں ادب کی تعلیم سے مایوس ہو گیا تھا مگر مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب مجھے مل گئی تو دیکھا کہ انھوں نے ادبی کتابوں کو چھانا اور پھٹکا ہے، اس کے خس و خاشاک کو الگ کیا ہے اور اس کے اندر سے زر خالص نکال کر اپنی کتاب میں محفوظ کر دیا ہے۔"

یہ کتاب ۱۹۳۹ء میں لکھی گئی تھی، راقم نے مؤلف ہی سے یہ کتاب سبقاً سبقاً اس وقت پڑھی جب یہ قلمی تھی، پھر ۱۹۴۱ء میں پہلی بار طبع ہو کر آئی، طباعت کی سہولت تو نہ تھی، مگر جن صاحب نے کتابت کی انھوں نے ٹائپ کے حروف سے اپنے حروف ملا دیئے تھے، یہ کتاب ندوہ کے درجہ پنجم میں داخل تھی اور مدارس کی "جلالت شان" بھلا کیوں اس کتاب کی طرف متوجہ ہوتی، جو ایک نوجوان کی لکھی ہوئی تھی، اور وہ بھی ندوہ سے، مدرسائی عصبیت جس کا مزاج یہ ہے "ترابنا أحسن من تیجانهم" میرے یہاں کی خاک ان کے زر و جواہر سے اور مرصع تاج سے بہتر ہے، ہاں پنجاب یونیورسٹی نے اور اس کے بعد دوسری یونیورسٹیز نے اپنے نصاب میں اس کو جگہ دی، اس کتاب کا عروج اس وقت ہوا جب یہ کتاب چھپ کر عرب ممالک میں گئی وہاں کے دانشوروں، جن کو حقیقی معنوں میں دانشور کہا جا سکتا ہے، سید علی طنطاوی، ڈاکٹر احمد الشرباصی (استاذ جامعہ ازہر) اور اسی قدر و قامت کے ماہرین ادب اہل زبان نے اس کو دیکھا، جیسا کہ سید علی طنطاوی کی تقریظ سے معلوم ہوا کہ کسی ایک فرد نے نہیں، بلکہ ادبا، اہل قلم، اور اہل زبان کی لجنہ (کمیٹی) نے جانچ کر تمام منتخبات پر اس کو ترجیح دی۔

اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن جب کویت سے ۱۴۰۶ھ میں شائع ہوا تو اس پر مولانا نے ایک مبسوط مقدمہ لکھا، جس میں تفصیل کے ساتھ پورے ادبی سرمایہ کا محاکمہ کیا ہے اور احادیث نبویہ کی ادبی خصوصیات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے کاروان زندگی میں اس کی طباعت کے مراحل کا ذکر ہے۔

مختارات نے ایک سنگ میل کا درجہ حاصل کیا ہے، یہی بنیاد بنا ہے، ادب اسلامی کی تحریک کا کہ ادب صرف نظم و نثر کے ان مجموعات میں محصور نہیں ہے جن پر ادب کا ٹھپہ لگا ہے، یا جو ادب کے نام پر لکھی گئی ہیں، ادب کا نمونہ وہ تحریریں نہیں ہیں جن کے لکھنے والے ایک بات کو بیان کرنے کے لئے سیدھے ست قلم نہیں چلاتے بلکہ ترچھے اور آڑے کھینچا کرتے ہیں، وہ قلم جو امرؤ القیس کے گھوڑے کی طرح۔ مکر مفر مُقبل مُدبر معًا (۲) چلتا ہو یا جس میں غریب الفاظ اور نامانوس محاورات کا بے جا اور بلا وجہ استعمال طالب علم کے سر سے اس طرح گذرتا ہو کہ کجلمود صخر حطه السیلُ من عل (۳)

ادب اپنے مقصد کو بھرپور مقتضائے حال کے مطابق اچھے الفاظ، طبعی و بے ساختہ ترکیبوں سے ادا ہونے والی بات کو کہتے ہیں، قرآن کریم احادیث نبویہ سے بڑھ کر ادب کہیں نہیں مل سکتا۔

ادب اسلامی کی عالمی تحریک کا سنگ بنیاد اسی کتاب نے رکھا اور الجزائر مراکش سے لے کر خلیج تک ادباء علماء نے آکر اس کو خراج تحسین ادا کیا

مختارات کے بعد مولانا نے "القراءۃ الراشدۃ" اور "قصص النبیین" لکھی، تصنیف کے اسباب اور اس کی فنی خصوصیات پر مولانا نے اگرچہ بہت تواضع اور احتیاط کے ساتھ جو تحریر فرمایا ہے عام کو یہاں نقل کرتا ہوں۔

"مجھے کئی سال درجہ میں اور درجہ کے باہر مصر کی وزارت تعلیم کی مرتب کردہ ریڈروں کے سلسلہ القراءۃ الرشیدۃ کے اول، دوم سوم حصوں کے پڑھانے کا اتفاق ہوا۔ کتاب زبان کی صحت، اصول تعلیم، بچوں کی نفسیات و سن و سال اور معلومات عامہ کے لحاظ سے ہر طرح کامیاب ہے دینی روح اور اخلاقی تعلیمات سے بھی خالی نہیں، لیکن وہ اصلاً مصر کے بچوں (جن میں ایک تعداد عیسائی اور قبطی بچوں کی بھی ہوتی ہے) کے لئے ترتیب دی گئی ہے۔ پھر اس پر قدرۃً اور ضرورۃً مقامی اور ملکی چھاپ بھی ہے بکثرت اسباق قاہرہ کے گرد و نواح کے

مقامات، آثار قدیمہ، مصری شخصیتوں سے متعلق ہیں، مثلاً مقامات میں "جزیرۃ الروضۃ، الأہرام، القناطیر الخیریۃ" حوار بین مصر والاسکندریۃ، مقامی تہواروں اور جشنوں میں سے "عید وفاء النیل" شخصیتوں میں سے محمد علی پاشا پر مستقل مضمون ہے، سب سے بڑھ کر یہ کہ مصر کا قومی ترانہ بھی موجود ہے، جس میں مصر کی عظمت کے گیت گائے گئے ہیں، اور اس کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں، مدارس عربیہ کے مسلمان ہندوستانی بچوں کے لئے اس ترانے کو گانے میں کیا معنویت اور کشش ہو سکتی ہے؟ اسی طرح "عید وفاء النیل" جس میں مصر کے عیسائی بڑی دلچسپی لیتے ہیں، ہندوستان کے حالات سے کیا مطابقت رکھتی ہے؟

رفتہ رفتہ یہ خیال دل میں گدگدی لینے لگا کہ کیوں نہ اس کی جگہ لینے کے لئے عربی ریڈروں کا ایک نیا سلسلہ مرتب کیا جائے، بھائی صاحب کی موجودگی، سید صاحب کی شفقت اور اس وقت کے مہتمم دار العلوم مولانا عمران خاں صاحب کے منصب اہتمام میں ہونے کی وجہ سے اس کا پورا اطمینان تھا کہ اگر یہ سلسلہ مرتب ہو گیا تو اس کے داخل نصاب ہونے میں کوئی دقت نہ ہوگی، چنانچہ بنام خدا کام شروع کر دیا، غالباً ۱۹۴۰ء کے آس پاس اس کا سلسلہ شروع ہوا اور دو سال کے عرصہ میں اس کے تینوں حصے مرتب ہو گئے، کتاب میں اس کا التزام کیا گیا کہ حتی الامکان کوئی سبق دینی موعظت سے خالی نہ ہو، اور آخر میں اس کا کوئی اخلاقی و دینی نتیجہ نکلتا ہو یا کسی دینی تعلیم یا آداب کی طرف رہبری ہوتی ہو لیکن اس طرح کہ طالب علم کو محسوس نہ ہو کہ کوئی چیز اوپر سے یا باہر سے لائی جا رہی ہے، یا اس کو کوئی خارجی انجکشن دیا جا رہا ہے، نمونہ کے طور پر حصہ دوم میں "کسرۃ من الخبز" (روٹی کا ایک ٹکڑا) "تاریخ القمیص" (کرتے کی کہانی)، "ماذا تحب ان تکون" (تم کیا بننا چاہتے ہو؟) "کن أحد السبعۃ" (سات میں سے ایک بنو!) ملاحظہ فرمایا جائے۔ معلومات عامہ میں سے "العین" الاسد، الجمل، القاطرۃ، جسم النبات، الباخرۃ" وغیرہ کے اسباق۔ تاریخی واقعات میں سے "الحنین الی الشہادۃ" رسالۃ الی رسول اللّٰہ، فی بیت أبی أیوب الانصاری" وغیرہ کے اسباق۔ شخصیتوں میں سے "الخلیفۃ عمر بن عبد العزیز، الامام مالک، السلطان محمود الغزنوی، شیر شاہ السوری، السلطان مظفر حلیم، اورنگ زیب عالمگیر اور علماء اسلام میں سے امام غزالی، ابن تیمیہ، ملا نظام الدین فرنگی محلی، اور حضرت شاہ عبد العزیز صاحب کو لیا گیا، تعلیم گاہوں میں سے جامع ازہر، دار العلوم دیوبند، مظاہر العلوم اور ندوہ کو لیا گیا۔ پھر ایک طرف قطب مینار کی زبان سے "المنارۃ تتحدث" کے عنوان سے ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ دلچسپ انداز میں سنائی گئی ہے۔ جس میں ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا نچوڑ اور سیکڑوں صفحات کا خلاصہ آگیا ہے، "من النجوم إلی الارض" کے عنوان سے تاریخ اسلام کی وہ جھلکیاں دکھائی گئی ہیں، جو ایک ستارہ کی بلندی سے دیکھنے والے کو نظر آتی ہیں، یہ سلسلہ لکھنؤ میں چھپنے کے بعد پہلے دار العلوم ندوۃ العلماء میں پھر ان مدارس میں جنہوں نے اس کا نصاب اختیار کیا ہے داخل ہو گیا، اور پاکستان میں بھی چھپ کر وہاں کے مدارس میں مقبول ہوا۔

لیکن مصنف اپنی جس خدمت اور توفیق الٰہی پر سب سے زیادہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے، اور اپنے لئے اس کو ذریعہ مغفرت اور ذخیرۂ آخرت تصور کر سکتا ہے، وہ "قصص النبیین" کا مقبول سلسلہ ہے، اوپر گذر چکا ہے کہ دار العلوم میں کامل کیلانی کی کتاب "حکایات للأطفال" کا سلسلہ داخل تھا۔ اور وہ اس وقت تمام ممالک عربیہ میں حد درجہ مقبول ہو رہا تھا۔ مجھے اس کے پڑھانے سے بھی واسطہ پڑا، مجھے بھی اس کا خالص سیکولر (SECULER) ہونا، جانوروں کے قصوں اور تصاویر کی بھرمار کھٹکتی تھی، لیکن مخدوم و محترم مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی نے (جن کی دینی غیرت اور حساسیت طبقۂ علماء کے لئے باعث غیرت تھی) خاص طور پر اس پر متوجہ فرمایا۔ انھوں نے میرے نام ایک مکتوب میں جو ۴ جون ۱۹۴۲ء کا لکھا ہوا ہے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"حال میں ندوہ کی ایک ابتدائی درسی کتاب محض اتفاق سے نظر پڑ گئی بڑا ہی دل دکھا، تصویروں کی وہ بھرمار کہ شاید عبارت بھی اتنی نہ ہو سرورق سے لے کر آخر تک جاندار مخلوق کی تصاویر سے رنگین، اللہ و رسول کا شروع سے آخر تک نام نہیں، لغو قصے، قدیم جن و پری کے طرز کے حیرت ہو گئی کہ یہ کتاب اور سید صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے

زمانے میں؟ خط دونوں صاحبوں کو لکھ دیا "چو کفر از کعبہ برخیزد" مصری کتابیں تعلیمی نقطۂ نظر سے بھی ہرگز ندوی طلباء کے لئے مفید نہیں ہو سکتیں"۔

یہ کام جو غالباً ۱۳۴۳-۴۴ھ کے درمیان شروع ہوا اور اس کا سلسلہ سفر و حضر میں دہلی پر، کسی سڑک کے کنارے سواری کے انتظار میں لاہور، سوہاوہ (۴) اور نظام الدین کے قیام میں نقل و حرکت اور انتشار کی حالت میں بھی جاری رہا، خدا کی توفیق سے مکمل ہوا۔ اس کو شروع کرنے کے بعد ایسا ہوا کہ خدا نے اس کو میرے لئے ایسا آسان کر دیا ہے کہ قلم برداشتہ بلا تکلف اس طرح لکھتا تھا جیسے باتیں کر رہا ہوں، اس میں تین باتوں کا التزام کیا گیا۔

۱۔ الفاظ کا ذخیرہ (VOCABULARY) کم سے کم ہو لیکن اعادہ اور تکرار سے اس کو ذہن میں نقش کر دیا جائے۔

۲۔ یہ کتاب قرآن کی زبان میں لکھی جائے، اور آیات قرآنی جگہ جگہ نگینہ کی طرح جڑ دی جائیں،

۳۔ اسلام کے بنیادی عقائد (توحید و رسالت، معاد) کی تلقین و تعلیم ضمناً ہو جائے۔

۴۔ قصوں کو پھیلا کر لکھا جائے، اور ان میں ایسی راہنمائی کا سامان ہو کہ بچوں کے دلوں میں کفر و شرک کی نفرت، ایمان و توحید کی محبت اور انبیاء علیہم السلام کی عظمت راسخ ہو جائے۔ اور یہ سب غیر شعوری طریقہ پر۔

اس نکتہ پر کہ اس میں بچوں کے لئے عقائد کو درست کرنے اور ان کے ذہن کو بنانے کا سامان ہے سب سے پہلے مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کی نظر گئی انھوں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا "اس کتاب کے ذریعہ بچوں کا علم کلام تیار ہو گیا۔" مولانا مسعود عالم صاحب مرحوم نے اپنے مقدمہ میں لکھا کہ "اس کتاب میں زبان اور دین کو اس طرح ایک دوسرے سے پیوست کر دیا ہے، جیسے گوشت اور ناخن" مولانا عبد الماجد صاحب نے اس کتاب کی ایسی قدر دانی کی کہ ان کا یہ تقاضا اور اصرار ہوا کہ میں سارے کام چھوڑ کر اس سلسلہ کو مکمل کر دوں، لیکن کتاب کے تیسرے حصے پر جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مخصوص ہے یہ سلسلہ رک گیا۔ معلوم ہوا کہ مولانا نے اپنی صاحبزادیوں کو باقاعدہ یہ کتاب پڑھائی۔

کتاب کا دوسرا ایڈیشن جب مصر میں چھپا تو میری خواہش ہوئی، سید قطب بھی اس پر مقدمہ لکھیں.... انھوں نے مقدمہ لکھا اور اس میں دل کھول کر کتاب کی داد دی انھوں نے یہاں تک لکھا کہ!

"میں نے کثرت سے وہ کتابیں پڑھی ہیں، جو بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں، اور جن میں انبیاء کرام کے حکایات و قصص بھی شامل ہیں، خود اس سلسلۂ کتب کی ترتیب میں میں نے شرکت کی ہے، جو "القصص الدینی للأطفال" کے نام سے مصر میں مرتب ہوا اور جس کے لئے مواد قرآن مجید سے اخذ کیا گیا تھا۔ لیکن میں تکلف اور خوشامد کے بغیر اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ "قصص النبیین للأطفال" کے مصنف کا کام (جس کا ایک نمونہ حضرت موسیٰ کے قصہ میں نظر آتا ہے) ہمارے وضع کئے ہوئے سلسلہ سے زیادہ کامیاب اور مکمل ہے۔ اس لئے کہ اس میں ایسی لطیف راہنمائیاں، قصے کے مقاصد پر روشنی ڈالنے والی تشریحات اور بین السطور میں ایسے اشارات آگئے ہیں، جو بیش قیمت ایمانی حقائق کی نقاب کشائی کرتے ہیں" (۵)

یہ کتاب مصر کے بعد بیروت کے مشہور مرکز اشاعت "مؤسسة الرسالة" کی طرف سے ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوئی اور سعودی عرب کے بہت سے ابتدائی مدارس کے نصاب درس میں داخل ہو گئی۔ ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے مدارس اور اسکولوں اور کالجوں کے عربی کے نصاب میں بھی داخل ہو گئی۔ اگر مصنف کو اپنی کسی کتاب کے داخل نصاب نہ ہونے پر استعجاب اور دوستانہ شکوہ ہو سکتا ہے تو اس کتاب پر کہ وہ ادب آموزی اور دینی تلقین کا بیک وقت کام کرتی ہے، لیکن جماعتی اور مدرسی عصبیت بڑے بڑے حقائق پر پردہ ڈال دیتی ہے، تجربے سے معلوم ہوا کہ اس بارے میں جدید تعلیمی ادارے اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ زیادہ فراخ دل اور وسیع النظر واقع ہوا ہے۔

باوجود مولانا عبد الماجد صاحب جیسے بزرگ کے تقاضے اور کتاب کے قدر دانوں کی خواہش و فرمائش کے تقریباً تیس پینتیس سال کی مدت گذر گئی اور تیسرے حصے کے بعد چوتھے حصے کے لکھنے اور بقیہ اولوالعزم پیغمبروں کے حالات بالخصوص خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ (جس کی عربی میں بچوں کے ذخیرۂ کتب میں سخت کمی محسوس کی جاتی تھی) سعادت نہیں ہوئی کہ اچانک ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء کے رمضان میں اس کا جوش اٹھا اور میں نے ان چند پیغمبروں پر (اللہ کا درود وسلام ہو ان پر) لکھنا شروع کیا جو حضرت موسیٰ کے بعد مبعوث ہوئے، شروع میں مجھے بچوں کی زبان کی اس سطح پر اترنے میں کسی قدر دشوار محسوس ہوئی۔ جو "قصص النبیین للأطفال" کے لئے اختیار کی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ زبان لکھنا بھول گیا ہوں، مگر تھوڑی کوشش

بعد قلم میں روانی پیدا ہو گئی، اور چوتھے حصے کی تالیف کی توفیق ہو گئی جس کو حضرت شعیب سے شروع کر کے حضرت عیسیٰ پر مکمل کر دیا گیا۔ اب صرف مسک الختام کی باری تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی بھی توفیق دے دی اور ذی القعدہ ۱۳۹۶ھ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں سیرت خاتم النبیین پر اس سلسلہ کا حسن خاتمہ ہوا۔ اور وہ دونوں حصے بھی "مؤسسة الرسالة" (بیروت) میں چھپ کر مقبول عام و خاص ہوئے۔ اس اجمال کی تفصیل و توسیع میری کتاب "السیرة النبویة" سے ہو گئی جو حال میں دار الشروق جدہ کی طرف سے چھپ کر سعودی عرب اور بعض دوسرے ممالک کے کلیات اور جامعات کے نصاب میں داخل ہو گئی ہے اور حال میں اس کا چوتھا ایڈیشن بڑی آب و تاب سے شائع ہوا ہے۔ دراصل قصص النبیین کے سلسلہ کی یہی چھوٹی کتاب اس بڑی کتاب کا محرک اور باعث بنی۔

صفحات بالا سے معلوم ہو چکا ہے کہ میری تدریسی زندگی کا آغاز درس قرآن سے ہوا ۱۳۵۴ھ کے بعد سے دار العلوم کے اہم اسباق قرآن میرے ذمہ ہوئے تھے اسی دوران میں (غالباً ۴۰-۱۹۳۹ء کے درمیان) مجھے احساس ہوا کہ طلبا مطالعۂ قرآن اور اس سے صحیح استفادہ کرنے کے بہت سے مقدمات اور اصول و مبادی سے ناآشنا ہوتے ہیں، اور اس ناواقفیت کی وجہ سے وہ صحیح طور پر مطالب و تعلیمات قرآنی، قرآن کے پیغام اور اس کی روح اور اس کے اعجاز سے بیگانہ رہتے ہیں، یا ان کی واقفیت ابتدائی اور عامیانہ ہوتی ہے، اپنے عملی تجربہ اور کئی سال تک درس قرآن کی خدمت انجام دینے کے بعد طبیعت پر اس کا تقاضہ پیدا ہوا کہ میں ادب کے تفسیری درجوں کے طلبا کے لئے کچھ ایسے مضامین تیار کر دوں جو تدبر فی القرآن کے لئے معاون اور اس کی عظمت و اعجاز کے سمجھنے میں مددگار ثابت ہوں۔ چنانچہ ۳۹-۱۹۳۸ء میں ایک سلسلۂ مضامین لکھوانا شروع کیا جس کے حسب ذیل عنوانات تھے۔

۱۔ قرآن کا تعارف خود قرآن کی زبان سے۔ ۲۔ قرآن شریف سے استفادہ کے شرائط اور اس کے موانع۔ ۳۔ اعجاز القرآن۔ ۴۔ قرآن مجید کا مرکزی مضمون۔ ۵۔ قرآن مجید کی پیشگوئیاں، خاص طور پر غلبۂ روم کی پیشگوئی۔ ۶۔ بنیادی عقائد توحید، رسالت، معاد اور ارکان اربعہ پر بھی لکھوانا شروع کیا لیکن وہ نامکمل رہا۔ (۲۹)

طلبا یہ مضامین لکھ لیتے تھے، بعد میں رسالہ الندوہ میں جو ۱۹۴۰ء سے جاری ہو گیا تھا۔ وہ بالاقساط شائع ہوئے اور پسند کئے گئے، عرصہ تک ان مضامین کو جمع کرنے اور شائع کرنے کی طرف سے توجہ نہیں ہوئی۔ ان کا مجموعہ (جس میں بعض غیر مطبوعہ مضامین بھی تھے) گم شدہ سمجھ لیا گیا۔ اچانک ۱۹۸۱ء میں عزیز گرامی مولوی سید محمد طاہر مددگار ناظم ندوۃ العلماء کے یہاں، جو دار العلوم کے طالب علم رہ چکے تھے، اس کا مسودہ مل گیا میں نے اس پر نظر ثانی کی اور چند اہم مضامین "قرآن مجید اور قدیم آسمانی صحیفے علم و تاریخ کے میزان میں" "تلاوت و تدبر قرآن کے چند نمونے" "ایک تجربہ ایک مشورہ" کا اضافہ کیا اور اس کو نور چشم مولوی سید محمد حمزہ ندوی فرزند خواہر زادہ عزیز مولوی سید محمد ثانی مرحوم نے مجھ سے لے کر "مطالعۂ قرآن کے اصول و مبادی" کے نام سے مکتبہ اسلام ۲۷، گوئن روڈ کی طرف سے شائع کر دیا۔ اس کتاب میں دوسرے مضامین کے علاوہ غلبۂ روم کی پیشگوئی اور جن ناقابل قیاس حالات میں اس کا تحقق ہوا کے موضوع پر اتنا مواد جمع کر دیا گیا ہے، جو ابھی تک کسی اور کتاب میں نظر سے نہیں گذرا، یہ کتاب قرآن مجید سے اشتغال رکھنے والوں کے لئے چشم کشا اور بصیرت افروز بن گئی اور مدارس عربیہ میں داخل نصاب کرنے کے قابل ہے۔

۱۹۴۹ء میں جمعیۃ علماء ہند کا سالانہ اجلاس حضرت مولانا مدنی قدس سرہ کی صدارت میں لکھنؤ میں منعقد ہوا، حضرت ڈاکٹر سید عبد العلی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مدنی کے تعلق سے اس اجلاس کے صدر استقبالیہ تھے اس موقع پر حضرت مولانا نے عربی نصاب تعلیم کے مختلف ادوار کو جدولوں (چارٹس) کی شکل میں مرتب فرمایا۔ اور ہندوستان کی پوری علمی تاریخ ان نقشوں میں آ گئی ایک فہرست ان علماء کی تھی جو حدیث نبوی میں رسوخ رکھتے تھے اور محدث کی حیثیت سے معروف ہوئے اسی طرح ہندوستان کے نامور مدرسین، فقہاء، علماء منطق و فلسفہ، علماء علم ہیئت و افلاک سبھوں کے اسماء مع تاریخ وفات لکھے اور ان کی مشہور کتابوں یا قصائد کے عنوان کے ساتھ مرتب فرمائی تھی، نصاب تعلیم کس زمانہ میں کیا رہا اور معیار فضیلت کس طرح بدلتا رہا۔

ان میں ہندوستان کے متعدد نقشے بھی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کن مقامات پر مشہور مدرسے تھے، خانقاہیں تھیں، یہ علمی نمائش دار العلوم کے عباسیہ ہال میں آویزاں کی گئی اور کانفرنس کے شرکاء میں جو اصحاب علم تھے، انھوں نے آکر دیکھا، حضرت مولاناؒ کا ایک اہم علمی کارنامہ ہے۔ (آئندہ صفحات میں ان نقشوں کو نقل کیا جا رہا ہے)۔

۱۹۴۶ء میں نائب معتمد تعلیم مقرر ہوئے، اس وقت آپ کی شہرت ملک میں پھیل چکی تھی، اور جیسا کہ اوپر گذرا، اسی زمانہ میں "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" کا اردو ترجمہ شائع ہوا پھر اصل عربی زبان میں قاہرہ کے "لجنة التالیف والترجمة

والنشر" سے شائع ہوا۔ حضرت سید صاحب (علامہ سید سلیمان ندویؒ) کی وفات کے بعد ۱۹۵۵ء میں آپ کو معتمد تعلیم منتخب کیا گیا، آپ کی تالیفات کا سلسلہ جاری رہا، دارالعلوم کے اساتذہ کی تربیت، ان کے درجوں میں جاکر اسباق کو دیکھنا ان سے مشورے اور رائیں حاصل کرکے نصاب میں حسب ضرورت تبدیلیاں ہوتی رہیں، اسی زمانہ میں آپ حجاز کے دوسرے سفر سے واپس تشریف لائے، اور آپ کے عزیز ترین معتمد علیہ مولانا معین اللہ صاحب اندوری مرحوم نے شعبۂ تعمیر و ترقی کا کام اپنے ہاتھ میں لیا، اور مولانا کے سفر و حضر میں شریک رہنے لگے۔ مولانا معین اللہ صاحب کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی صلاحیتیں دی تھیں، حضرت مولانا کے ـــ ناظم منتخب ہونے کے بعد آئینی طور پر تو نہیں مگر عملاً ندوہ کی انتظامی خدمت موصوف نے سنبھال لی، عمارتوں کی تعمیر، مسجد میں پنکھوں کا نظم، سڑکوں کی تعمیر، اساتذہ کے لئے کوارٹرس بنانا، بجلی کے مستحکم پول بنانا، یہ سب مولانا معین اللہ صاحب کے کارنامے ہیں، حضرت مولانا کے ـــ ناظم ہونے کے بعد مالی اور انتظامی خدمت کا کام مولانا معین اللہ صاحب نے اپنے ذمہ لیا اور بحسن و خوبی انجام دیا، حضرت مولانا کی مقبولیت عند اللہ اور عند الناس سے ندوہ کو فیض پہونچانے کا کام انہی کا حصہ تھا، حضرت ڈاکٹر سید عبدالعلی رحمۃ اللہ علیہ پر جب سے امراض کے حملے شروع ہوئے اس وقت سے عملاً نظامت حضرت مولاناؒ کے ذمہ تھی، اور آپ کی ہدایت کی روشنی میں مولانا معین اللہ صاحبؒ ان کے قوت بازو اور معتمد علیہ تھے۔ طلبہ کی تعداد بڑھنا شروع ہوئی، رحمانیہ ہاسٹل بنا، پھر سلیمانیہ دار الاقامہ تعمیر ہوا، شبلی دار الاقامہ کے متصل بمنزلہ دار الاقامہ بنا، پھر رفتہ رفتہ تمام عمارتیں بننے لگیں، اور دیکھتے دیکھتے ندوہ کے در و بام میں زندگی کے نئے آثار نمایاں ہوگئے۔

حضرت مولانا کے دور نظامت میں ندوہ ایک مدرسہ کے نام سے تو یقیناً پورے ملک میں مشہور تھا اور اپنی فکر کے لحاظ سے نمایاں تھا مگر طلبہ کی تعداد بہت کم تھی، اس لئے کہ غیر مستطیع طلبہ کے لئے وظائف کا انتظام نہیں تھا اور پورے ملک کا دورہ کرکے چندے وصول کرنے والے سفرا نہیں تھے، حیدرآباد اور بعض ریاستوں کی معمولی امداد سے مدرسہ کے اخراجات چلتے تھے، اور یہ معلوم ہے کہ مدارس میں مستطیع بہت کم اور غیر مستطیع زیادہ ہوتے ہیں، کھاتے پیتے گھرانوں کے لڑکے اسکولوں اور کالجوں کا رخ کرتے ہیں، اور عام طور پر" باقی ہے ملّت بیضاء غرباء کے دم سے" ان کے لئے گنجائش یہاں کم تھی۔ میری طالب علمی کے زمانہ (۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۴ء) میں ۳۵ طلبہ کا وظیفہ تھا اور سو طالب علم اپنے کھانے کا خرچ خود ادا کرتے تھے، اس سے ایک فائدہ تو تھا کہ طلبہ میں ذہنی طور پر اونچ نیچ نہیں تھی اور کسی کو معلوم نہیں تھا کہ مستطیع کون ہے اور غیر مستطیع کون۔ دعوت دین کے لئے جو جرأتمندانہ احساس ہونا چاہئے وہ موجود تھا۔ مگر طلبہ کی اتنی مختصر تعداد مختلف قسم کی بدگمانی پیدا کرتی تھی۔ بعض حلقوں سے یہ آواز اٹھائی گئی کہ قوم نے ندوہ کے نصاب کو قبول نہیں کیا۔ اور قدیم درس نظامی جو اسلامی تاریخ کے عہد انحطاط میں مرتب کیا گیا تھا، وہی مطلوب و مقبول ہے۔ حالانکہ حقیقت صرف اتنی تھی کہ ندوہ کا دارالعلوم ابتدا سے اپنے ایک خاص نہج پر چلتا رہا، اور طلبہ کی تعداد صرف اس لئے کم تھی کہ عوامی چندہ حاصل کرنے کے لئے کوئی نقشۂ عمل نہیں تھا۔ نیز ایسی شخصیت جو دینی اور علمی اعتبار سے خاص و عام میں مقبول ہو نہیں تھی۔ اور جو تھے جن کے بارے میں پورے اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے وہ فن کے منتخب ترین علماء میں تھے۔ جیسے حضرت مولانا حیدر حسن خاںؒ مولانا شبلی فقیہ، مولانا محمد ناظم ندوی، مولانا عبدالسلام قدوائی سب اپنے اپنے فن کے یگانۂ روزگار افراد تھے۔ لیکن عوام سے ان کا واسطہ نہیں تھا۔ حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کو قدیم و جدید دونوں طبقوں کا اعتماد حاصل تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ندوی فکر کا نمونہ تھے۔ بانیانِ ندوہ نے جس صلاحیت کے افراد تیار کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، حضرت مولانا اسی کے داعی تھے۔ اور ندویت پر بغیر کسی بال برابر فرق کے علامہ سید سلیمان ندویؒ کی طرح نئی نسل کے داعی اور راہنما تھے، مولانا معین اللہ صاحبؒ مرحوم نے آپ کے نفوذ اور علمی و روحانی اثرات سے فائدہ اٹھاکر جب لوگوں کو دین کے لئے ندوہ کی طرف متوجہ کیا تو جوق در جوق طلبہ آنے لگے، اور ندوہ کی صلح آمیز فکر عام ہوئی، اور لوگوں نے اس کی دینی اہمیت کا اعتراف کیا اور اس کے دینی مقام کی عظمت کو سمجھا، جس کو سمجھانے کی ندوہ کی طرف سے کبھی کوشش نہیں کی گئی تھی، اور اس کے خلاف غلط پروپگنڈے بھی کئے گئے تھے، جن کی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔

بہر حال حضرت مولانا کے عہد نظامت میں ندوہ اپنی فکری اور علمی بنیاد پر قائم رہتے ہوئے عالم اسلام میں پوری طرح مقبول ہوا اور خود اس ملک کے اندر اہل انصاف اور صاحب ضمیر مسلمانوں نے خراج عقیدت پیش کیا۔ بعض لوگوں نے جو ناواقف ہیں اور ندوہ کی اصل فکر سے واقف نہیں تھے انھوں نے کچھ غلط باتیں بھی مشہور کرنا شروع کردیں مثلاً یہ کہ ندوہ دیوبند کے طرز پر ڈھالا جارہا ہے، حالانکہ ایک دن کے لئے بھی ندوہ نے کسی دوسرے مدرسہ کا نصاب تعلیم

یا طرز تعلیم اختیار نہیں کیا۔ اور نہ کسی غیر ندوی کتب فکر کی پیروی کی۔ گذشتہ برسوں میں ندوہ کو ایک "عربک کالج" مشہور کرنے کی کوشش شروع کی گئی تھی۔ جب اس تصور کو مٹایا گیا تو لوگوں نے دوسرے کنارہ پر اپنی مخالفت کا موقف اختیار کیا۔

حضرت مولانا کو اللہ تعالیٰ نے جو جامعیت اور عالم اسلام میں مقبولیت عطا فرمائی تھی آپ نے ندوی فکر کو صحیح معنوں میں متعارف کرایا۔ بلاشبہ حضرت مولانا نے بزرگانِ دین کی روحانیت سے ندوہ کو فیض پہونچایا اور ان کی دعاؤں کے اثرات ناقابلِ انکار ہیں، لیکن صرف روحانیت، خدا ترسی، خوف آخرت کی روح پیدا کرنے کی کوشش کی جس میں ایک حد تک کمی یا تشنگی تھی، لیکن جہاں تک فکری اور علمی استقلال کا تعلق ہے اور ندوہ کے بنیادی مقصد کا تعلق ہے اور نصاب تعلیم میں تبدیلی و ترقی کا تعلق ہے اس میں ایک حرف کی بھی تبدیلی نہیں ہوئی، بلکہ دوسرے اداروں نے کسی نہ کسی شکل میں ندوہ کے نصاب سے قریب آنے کی کوشش کی، یا نام بدل کر اسی ڈھانچہ کو اپنانے کی سعی کی۔ خلاصہ یہ کہ معترضین جو پہلے کے تھے یا جو بعد میں آئے دونوں کی باتیں حقیقت سے مختلف تھیں، صحیح بات وہ نقطۂ اعتدال اور توسط ہے جس کو حضرت مولانا نے اپنے دورِ نظامت میں پوری قوت کے ساتھ متعارف کرایا، پھیلایا اور بڑھایا اور دینی خدمات کا جو سلسلہ آپ کی ذات سے شروع ہوا وہ ایک صدقۂ جاریہ ہے جس کا اجر انشاء اللہ آپ کو ملتا رہے گا۔ حضرت مولانا اس حقیقت کو اپنی خود نوشت سوانح "کاروان زندگی" کے پہلے حصہ میں ذکر فرما چکے ہیں، مناسب ہوگا کہ یہ پوری تقریر یہاں نقل کر دی جائے۔

"دین و عقائد کے معاملہ میں ندوۃ العلماء کے مسلک کی بنیاد دین خالص پر ہے، جو ہر قسم کی آمیزش اور آلائش سے پاک، تاویل اور تحریف سے بلند، ملاوٹ اور تخریب کی دسترس سے دور، اور ہر اعتبار سے مکمل اور محفوظ ہے۔

دین کے فہم اور اس کی تشریح اور تعبیر میں اس کی بنیاد اسلام کے اولین اور صاف و شفاف سرچشموں سے استفادہ اور اس کی اصل کی طرف رجوع پر ہے۔

اعمال و اخلاق کے شعبہ میں دین کے جوہر و مغز کو اختیار کرنے، اس پر مضبوطی سے قائم رہنے، احکام شرعیہ پر عمل، حقیقتِ دین اور روحِ دین سے زیادہ قرب اور تقویٰ و صلاحِ باطن پر ہے۔

تصورِ تاریخ میں اس کی بنیاد اس پر ہے کہ اسلام کے ظہور اور عروج کا دورِ اول سب سے بہتر اور قابل احترام دور، اور وہ نسل جس نے آغوش نبوت اور درسگاہِ رسالت میں تربیت پائی، اور قرآن و ایمان کے مدرسہ سے تیار ہو کر نکلی، سب سے زیادہ مثالی اور قابل تقلید نسل ہے، اور ہماری سعادت و نجات اور فلاح و کامرانی اس بات پر منحصر ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اس سے استفادہ کریں، اور اس کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں۔

نظریۂ علم و فلسفۂ تعلیم میں اس کی اساس اس پر ہے کہ علم بذاتِ خود ایک اکائی ہے، جو قدیم و جدید، اور مشرق و مغرب کے خانوں میں تقسیم نہیں کی جا سکتی اگر اس کی کوئی تقسیم ممکن ہے، تو وہ تقسیم صحیح اور غلط، مفید اور مضر، اور ذرائع اور مقاصد کے اعتبار سے ہوگی، استفادہ اور افادہ اور ترک و قبول کے شعبہ میں اس کا عمل اس حکیمانہ نبوی تعلیم پر ہے کہ "حکمت مومن کا گمشدہ مال ہے، جہاں بھی وہ اس کو پائے وہ اس کا سب سے مستحق ہے" نیز قدیم حکیمانہ اصول "خذ ما صفا ودع ما کدر" پر (یعنی جو صاف و نظیف ہو اس کو لے لو، اور جو آلودہ و کثیف ہو اس کو چھوڑ دو۔)

اسلام کے دفاع اور عصر حاضر کی لادینی قوتوں کے مقابلہ میں اس کی اساس اس ارشاد ربانی پر ہے:۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ۔ (سورۃ الانفال۔ ۶۰)

ان کے مقابلہ کے لئے جتنی قوت تم سے ممکن ہو سکے تیار کرو۔

دعوت الی اللہ، اسلام کے محاسن و فضائل کی تشریح، اور ذہن و عقل کو اس کی حقانیت و صداقت پر مطمئن کرنے میں اس کا عمل اس حکیمانہ وصیت پر ہے کہ:۔

"کلموا الناس علیٰ قدر عقولهم أتریدون أن یکذب اللّٰه ورسولهٗ"۔ لوگوں سے ان کی عقلوں کا خیال رکھتے ہوئے گفتگو کرو، کیا تم چاہتے ہو کہ خدا اور رسول کو جھٹلا دیا جائے؟

عقائد و اصول میں وہ جمہور اہل سنت کے مسلک کی پابندی، اور سلف کے آراء و تحقیقات کے دائرہ میں محدود رہنا ضروری سمجھتا ہے، فروعی و فقہی مسائل کے بارے میں اس کا مسلک و اصول یہ ہے کہ حتی الامکان اختلافی مسائل کو چھیڑنے اور ہر ایسے طرز عمل سے احتراز کیا جائے جس سے باہمی منافرت

بڑھے اور امت کا شیرازہ منتشر ہو، سلف صالحین سے حسن ظن رکھا جائے، اور ان کے لئے عذر تلاش کیا جائے، اسلام کی مصلحت اجتماعی کو ہر مصلحت پر ترجیح دی جائے۔

مختصر! یہ کہ وہ حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ) کے علمی و فکری اور کلامی و فقہی مدرسۂ فکر سے زیادہ قریب اور ہم آہنگ ہے، اس لحاظ سے ندوۃ العلماء ایک محدود تعلیمی مرکز سے زیادہ ایک جامع اور کثیر المقاصد دبستان فکر اور مکتب خیال ہے۔

اس تحریک کے ساتھ جو ندوۃ العلماء کے دینی مسلک، اس کے نظریۂ علم و تاریخ اور طریق فکر سے متعلق ہے، اپنی ہی ایک تحریر کے اقتباس کا اضافہ کیا جاتا ہے جس سے اس ثقافت کی وسعت و تنوع کا اندازہ ہوتا ہے، جو بانیان ندوۃ العلماء کا شعار اور اس کے فضلاء کے لئے باعث افتخار ہے، یہ اقتباس راقم کے اس مقدمہ سے ماخوذ ہے جو نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمان خان شروانی (جو ندوۃ العلماء کے بانیوں اور فکری رہنماؤں میں سے تھے) کی سوانح حیات مرتبہ مولوی شمس تبریز خاں کے لئے لکھا گیا تھا، مسلمانوں نے ہندوستان میں پہونچ کر جس اسلامی ہندی تہذیب و ثقافت کو وجود بخشا تھا، اس کا تعارف کراتے ہوئے مقدمہ نگار نے لکھا تھا:۔

"اس تہذیب و ثقافت میں شکوہ بھی ہے، اور تواضع بھی، جلادت بھی ہے اور مروت بھی، گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی، صلابت بھی ہے اور رقت بھی، استقامت بھی ہے اور رواداری بھی، اس کی قلمرو میں علوم شریعت و حکمت بھی ہیں، اور ادب و شاعری بھی، فقر و درویشی بھی ہے، اور نفاست و ذوق لطیف بھی، اس کی دلچسپی کے میدان قلعے بھی ہیں، اور کتب خانے بھی، مدرسے بھی ہیں، اور خانقاہیں بھی، تحقیق و تصنیف کے حلقے بھی ہیں، اور مشاعرے بھی، اس میں فقاہت بھی ہے، اور ظرافت بھی، سخت جانی بھی ہے اور سبک روحی بھی، اس کے اظہار خیال اور اظہار کمال کا ذریعہ عربی بھی ہے، اور فارسی بھی، اردو بھی ہے، اور ہندی بھی۔"

۱؎ مشہور اصحاب قلم ادبا رفن کی کتابیں صدیوں سے پڑھائی جا رہی ہیں، ان کے متعلق یہ آراء شاید ان لوگوں کے لئے نامانوس معلوم ہوں گی، جو روایتی طور پر تقلیدی ادب کے رشناسا ہیں، لیکن یہ حقیقت ہے جس کی صداقت جاننے کے لئے کافی مطالعہ اور وسعت نظر اور صحت ذوق کی ضرورت ہے۔

۲؎ شاعر گھوڑے کی تعریف کرتا ہے کہ وہ حملہ کرتا ہے، بھاگتا ہے ایک ہی ساتھ آگے بھی بڑھتا ہے، اور پیچھے بھی مڑتا ہے۔

۳؎ ایک پتھر کی چٹان ہے جسے سیلاب نے اوپر سے گرادیا ہے۔

۴؎ سوہادہ ریاست پونچھ (کشمیر) میں بالائے کوہ، سادات کی ایک بستی ہے جہاں عزیز گرامی مولوی سید مظفر شاہ ندوی استاد دار العلوم کی دعوت پر ۱۳۶۴ھ میں جانا ہوا تھا اور حصہ سوم کا بڑا حصہ وہاں لکھا گیا۔

۵؎ مقدمہ قصص النبیین جزء ثالث مطبوعہ دار الکتاب العربی مصر ۱۳۶۷ھ۔

۶؎ وصیت حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔

(بقیہ) ۱۱

ایسا کہاں سے لاؤں

نقل کرتے ہوئے دعا گو ہیں :۔

"میں سمجھتا ہوں اس فقر کی دولت کو نہ صرف مولانا نے اپنا سرمایہ حیات سمجھا بلکہ ان کا خانوادہ بھی اسی شاہراہ پر چل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس حیثیت کو عزت و وقار کے ساتھ ہمیشہ قائم رکھے اور کبر و غرور سے محفوظ رکھے۔"

مولانا اکثر بڑے والہانہ انداز میں یہ اشعار گنگناتے ہوئے سنے جاتے تھے :

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم
دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامان موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

مولانا کی مثالی زندگی کا ہر لمحہ اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ انھوں نے اسیری شکم کے مقابلہ میں فقر کی دولت بیدار کو اپنا کر دل آزاد کی شہنشاہی حاصل کر لی تھی۔

۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء کے بعد سے ساری اسلامی دنیا زبان حال سے کہہ رہی ہے :

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

شاعر مشرق کے الفاظ میں ذرا سی ترمیم کے ساتھ ہر زبان پر یہ دعا ہے اور ہر دل سے صدائے آمین آرہی ہے :

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

زمانہ کا دامن :۔ زمانہ کا دامن پھیلتا اور سمٹتا رہتا ہے آج ہمیں پہلے سے کہیں زیادہ محنت تیاری اور سرمایۂ علم کی ضرورت ہے۔

(حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ)

بے مایہ ملت کی ایک مایۂ گرانمایہ سے محرومی

جناب مولانا محمد سالم قاسمی (مہتمم دار العلوم (وقف) دیوبند)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ صرف ایک عظیم شخصیت نہیں بلکہ بیسویں صدی کے نصف آخر کی تقریباً تمام تاریخ ساز شخصیات کی خصوصیات کو حق تعالیٰ نے ان کی ذات گرامی میں جمع فرما دیا تھا۔ اس لئے ان کی ذات گرامی کی دید اور ان کے کمالات سے مستفید خوش بخت طبقات اگر یہ فرمائیں کہ ہم نے عالم اسلام کے ہر دائرۂ فکر کی زہد و تقویٰ کے ساتھ اور معنویت و روحانیت کی حامل علمی، فکری، تربیتی، تعلیمی، تبلیغی، تصنیفی، تاریخی، ادبی، اداری، انتظامی، اجتماعی، سیاسی اور اخلاقی تمام عہد آفریں شخصیات کو دیکھا ہی نہیں بلکہ برتا بھی ہے تو ان کا یہ قول اہل فکر و نظر کی ہر کسوٹی پر اتنا کھرا اترے گا کہ اس میں کج فکری سے کھوٹ نکالنے کے شائقین انشاء اللہ کبھی کامیابی کا منہ نہیں دیکھ پائیں گے۔ اس لئے گذری ہوئی محسن ملت شخصیات پر ان کی موجودگی ملت کے لئے نہ صرف صبر و استقامت کا ذریعہ ہی بنی بلکہ ہمت و حوصلہ کی افزونی کا عظیم سبب بھی ثابت ہوئی۔

حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت و برگزیدگی پر یہ ایک ناقابل شکست حتمی دلیل ہے کہ بانی اور تاحیات سابق صدر مسلم پرسنل لا بورڈ، حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند) کی جامع الکمالات بین الاقوامی شخصیت کے بعد دینی مستقبل ملت کی محافظ ملک گیر تنظیم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت کے لئے حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ مکمل اتحاد فکر کے ساتھ ملت کے ہر مکتبہ فکر کے اہل فکر و نظر کا ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر انتخاب فرما لینا بذات خود حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت و برگزیدگی پر شاہد عدل ہے۔

حضرت مولانا کا علمی مقام

حضرت مولانا علی میاں علیہ الرحمہ فن تاریخ میں ایک معتبر و مستند مقام رکھنے کے باوجود علوم دینیہ میں فن تفسیر قرآن کریم، فن حدیث میں خاص طور سے مبتحرانہ علمی حیثیت کے بھی حامل تھے خاص طور سے فن تفسیر میں فطری مناسبت کی بناء پر عصر رواں کے غیر معمولی تمدنی اور تہذیبی ارتقاء اور سائنس کی حیرت ناک پیش رفت پر قرآن و حدیث سے تائیدی یا تردیدی نکات آفرینی کو مولانا کے دینی ذوق کی عظمتوں پر شاہد عدل بنا کر پیش کیا جا سکتا ہے اس کی بے شمار مثالوں میں سے صرف یہ ایک مثال ہی کافی ہے کہ حضرت مولاناؒ نے عصر حاضر کی اہم ترین اور غیر معمولی ایجادات کہ جن کا تصور بھی سو سال پہلے تک انسانی دماغوں میں نہیں تھا چہ جائیکہ چودہ سو سال پہلے ہوتا۔ لیکن حضرت مولانا اپنے غیر معمولی ذوق عربیت سے قرآن کریم کی آیت کریمہ:

"وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ"

اور کوئی انسان ایسا بھی ہے کہ جو اللہ سے غافل کرنے والی باتیں خریدتا ہے تاکہ اللہ کی راہ سے بے سمجھے دوسروں کو گمراہ کردے۔

يَشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ (باتیں خریدنے) کے لفظ سے ویڈیو اور ٹی۔ وی پر جو دل لگتا استشہاد فرمایا ہے وہ سو فیصد ان پر منطبق ہے۔ کیونکہ یہ دونوں چیزیں غافل کرنے والی بھی ہیں اور "باتیں" بھی ہیں اور لہو الحدیث کی انطباقی وسعتوں سے حضرت مولانا کی طرح عربیت کا ذوق سلیم و وسیع رکھنے والے ہی اس عجیب و غریب ہدایت آمیز نکتہ آفرینی سے حظ اندوز ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ یہاں لفظ کھیل استعمال نہیں فرمایا گیا جس میں ویڈیو اور ٹی وی داخل نہ ہوتے بلکہ باتوں کا کھیل فرمایا گیا ہے جو ہدایت پسند ذوق دینی کے حاملین کے نزدیک بلا خوف تردید ویڈیو اور ٹی۔ وی پر منطبق ہو جاتا ہے۔

فن تاریخ میں مولانا کا بنیادی امتیاز

انسان کی فطری رفتار ارتقاء تدریجی ہے اس لئے عام طور پر بعد میں آنے والی نسل کے لئے پچھلی نسلوں کی تاریخ ایک تہذیبی، تمدنی، معاشرتی، اجتماعی اور سیاسی درس کی حیثیت رکھتی ہے اسی درس سے اس کو ان دوائر حیات میں ترقی کی راہیں نظر آتی ہیں یہ ہی وہ لفظ فکر ہے جو قومی پیمانے پر تاریخ کو ایک اہم .... مقام عطا کرتا ہے۔

اسلام نے تاریخ کے اس عمومی اور

متعارف موضوع سے آگے بڑھ کر تاریخ کو مؤثر سرچشمہ قوت و تربیت قرار دے کر دعوت و تبلیغ کے خادم ہونے کا وہ موضوع دیا کہ جو انسانی قلب و دماغ کو انسانیت کامل کی راہنمائی عطا کرتا ہے۔

عام طور پر مسلم مؤرخین نے "دعوت و تبلیغ" کے انسانی قلب و دماغ کو متاثر و مطمئن کرنے کی عظیم صلاحیت کی روشنی میں تاریخ لکھنے کے بجائے مسلم اقتدار کی جغرافیائی توسیع اور جنگوں میں مسلم فوجوں کے بسا اوقات ناقابل یقین اور انتہائی مبالغہ آمیز واقعات کو اپنا موضوع تاریخ نویسی بنایا ہے جس کے بارے میں حسن ظن سے اگر کام لیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ مسلم فوجوں میں جوش و خروش کے ساتھ ہمت و حوصلہ کو بڑھانا ان کا مقصد تھا، نیز دور قدیم کے لحاظ سے یہ بھی بعید از قیاس نہیں ہے کہ اس مبالغہ آمیزی کا مقصد ارباب اقتدار کو خوش کر کے انعام و اکرام حاصل کرنا ہو، ان دونوں مقاصد کی صحت و سقم سے صرف نظر کرتے ہوئے یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہیں ہوگا کہ اس طرز تاریخ نویسی سے نہ صرف یہ کہ اسلام کی تاریخ ہی مرتب نہیں ہوئی بلکہ خود نفس تاریخ اسلام کو اس سے زبردست یہ نقصان پہونچا ہے کہ مخالفین کی نگاہوں میں اس تاریخ نے بذات خود اسلام کو محل تنقید بنا دیا۔

اس کے برخلاف حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ اسلام کا صحیح اور حقیقی موضوع اس مخلصانہ دعوت و تبلیغ کو قرار دیا جس سے خاص طور پر فطری تعلیمات اسلام کی اغیار پر غیر معمولی اور حیرت انگیز تاثیر پذیری اور نیک دل مسلم حکمرانوں کی اسلامی تعلیمات کے تحت انسانیت نوازی، سچے تاجروں اور پر اخلاص محنت کشوں کے دیانت و امانت پر مشتمل واقعات کے ذریعہ اقوام عالم تک اسلام کی مؤثر پیغام رسانی متوقع ہوتی ہے، اس طرز پر حضرت موصوف نے تاریخ اسلام کی قرار واقعی اور برمحل خدمت انجام دے کر مستقبل کے مؤرخین کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ قائم فرمایا۔ اسی بنیاد پر اس اہم تاریخی موضوع پر مولانا کے مقالات و خطبات کے علاوہ پانچ جلدوں میں شاہکار تصنیف "تاریخ دعوت و عزیمت" نے تاریخ اسلام کے حقیقت شناس مؤرخین و اہل علم و فضل سے زبردست خراج تحسین اسی لئے حاصل کیا ہے کہ بصیرت مند اور فقیہہ النفس ارباب علم نے درج ذیل جن تین بنیادی اصولوں کو اسلام سے نابلد قوموں اور ملکوں تک اسلام کی پیغام رسانی کے لئے اپنایا ہے وہ تینوں بنیادیں حضرت مولاناؒ کی اس عظیم تصنیف میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

۱۔ اول یہ کہ بلا امتیاز مذہب و ملت انسانیت کے احترام کو "ولقد کرمنا بنی آدم الخ" کی عمومی ہدایت قرآنی کے تحت ہر ہر مرحلہ پر ملحوظ رکھا ہے جس کے نتیجہ میں کسی ادنیٰ مخالفانہ شعور کے بغیر غیر مسلم قاری بھی پیغام رسانی کے اخلاص پر یقین کے ساتھ اس پیغام کا مدبرانہ مطالعہ کرتا ہے جس کی پُر تاثیری سے انکار ممکن نہیں۔

۲۔ دوسرے پڑوسی کے حقوق کو اسلام نے مسلم و غیر مسلم کے فرق کے بغیر "لازال جبریل یوصینی بالجار حتی ظننت انہ سیورثہ" (جبریل امین ہمیشہ سے پڑوسی کے حقوق کی ادائیگی پر اتنا مامور کرتے تھے کہ مجھے یہ گمان ہونے لگا کہ شاید پڑوسی کو میراث میں شریک بنا دیا جائے گا۔) کی وقیع و عظیم تعبیریں پیش فرما کر دنیا کے ہر ملک میں غیر مسلم پڑوسی اقوام کے لئے اسلام کی اخلاقی وسعتوں کو اس مختصر و جامع اور وقیع و عظیم تعبیر میں سمو دیا ہے پس اصحاب دعوت و عزیمت کی زندگی کے سراپا اخلاص، احوال و واقعات کی صورت میں اسلام کی یہ عملی وسعت و بیمہ گیری خاص طور پر غیر مسلموں کے لئے عظیم تحفۂ ہدایت بن جاتی ہے۔ حضرت مولانا نے اس کو اپنی تحریر میں ملحوظ رکھ کر صحیح معنیٰ میں تاریخ دعوت و عزیمت کا حق ادا فرمایا ہے۔

۳۔ تیسرے یہ کہ اسلامی معاشرتی رہنمائی کے تحت بلا امتیاز دین و مذہب عمومی پیمانے پر اخلاقی روابط کے قیام کے ذریعہ اسلام کے امن و صلح کے جمہوری مزاج پر انسان دوستی کا وہ مؤثر ترین عملی نمونہ پیش کرنا کہ جس کی انسانیت نوازی کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے۔

حضرت مولانا نے اصحاب دعوت و عزیمت کے ذکر جمیل کے ذیل میں اسلام کے اس انسان دوستی کے جمہوری مزاج کو بڑی جامعیت کے ساتھ پیش فرما کر آج کے ارباب دعوت و عزیمت کو ایک ناقابل فراموش وہ رہنمائی عطا فرمائی ہے کہ کسی نئے تجربے کے بغیر انہی اسلامی رہنما اصولوں کو اپنانا انشاء اللہ کامیابی کی ضمانت ثابت ہوگا۔

ان اصول موضوعہ کو حضرت ربعی بن عامرؓ کے اس سبق آموز مختصر واقعہ کی روشنی میں دیکھئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مولاناؒ نے اس کی تفصیل کو اپنا محور فکر و عمل قرار دیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت ربعی بن عامرؓ سے رستم ایرانی نے سوال کیا تھا کہ "ماالذی جاء بکم؟" (تم کس غرض سے (ہمارے پاس) آئے ہو؟) رستم نے یہ سوال اس یقین پر کیا تھا کہ حضرت ربعی بن عامرؓ یہ ہی کہیں گے کہ ہم غربت و افلاس سے تباہ حال ہیں اس لئے تم اپنے مال و دولت میں سے کچھ حصہ ہمیں بھی دو اور رستم کا خیال تھا کہ اس جواب پر ان کو کچھ مال و دولت میں سے حصہ دیدیا جائے گا تو ان کے جہاد سے بھی نجات مل جائے گی اور یہ سب ممنون و شکر گذار ہو کر واپس چلے جائیں گے۔

لیکن حضرت ربعی بن عامرؓ نے رستم کو جو جواب دیا، وہ جواب اسلام کی وہ مکمل اور جامع ترین ترجمانی ہے کہ اگر اس کو یہ کہا جائے کہ اس سے زیادہ اعلیٰ اور کامل ترین جواب کوئی ہو ہی نہیں سکتا تو یہ قطعاً مبالغہ نہیں ہوگا، حضرت ربعیؓ نے فرمایا:-

"اللہ ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادۃ العباد الی عبادۃ اللہ ومن ضیق الدنیا الی سعۃ الآخرۃ ومن جور الادیان الی عدل الاسلام"

ہمیں اللہ تعالیٰ نے اس لئے بھیجا ہے کہ جو بندوں کی غلامی سے نکل کر اللہ کی غلامی میں آنا چاہے (تو اسے ہم اللہ کی غلامی کا وہ راستہ بتائیں کہ جس پر ہزاروں آزادیاں قربان ہو سکتی ہیں) اور جو دنیا کی تنگیوں سے نکل کر آخرت کی وسعتوں کی طرف آنا چاہے اور جو دنیا کے ظلموں سے بچنا چاہے اسے اسلام کے عدل و انصاف کی راہ دکھانے کے لئے آئے ہیں۔

یعنی ہم تم پر رحم کھا کر آئے ہیں کہ تم دنیا کے پنجرے میں گرفتار ہو جو تمہیں دیدیا جاتا ہے تو کھا لیتے ہو، تم اپنے کاموں اور ضرورتوں میں اپنے غلاموں کے غلام ہو ہم تمہیں دنیا کی تنگیوں سے نکال کر آخرت کی وسعتوں میں لانے کے لئے آئے ہیں، ہم تمہیں غلامی سے نجات دلا کر آزادی سے ہمکنار کرنے کے لئے آئے ہیں بالفاظ دیگر ہم تم سے کچھ مانگنے نہیں آئے بلکہ تمہیں کچھ دینے کے لئے آئے ہیں۔ اس سراپا اخلاص جواب کی عظمت و اہمیت نے کبر و غرور کا سر جھکا دیا اور رستم دم بخود رہنے پر مجبور ہو گیا۔

یہ ہی وہ دعوت و عزیمت ہے کہ کل عالم انسانی کی اہم ترین ضرورت ہے اور عالم انسانی کو اس کا مخاطب اسلام کے سوا کوئی بنانے والا نہیں ہے۔

انسانیت کو باعظمت بنانے والے اسی خطاب مقدس کی مؤثر ترجمانی حضرت مولانا زندگی بھر کرتے رہے۔

مولانا کی زندگی کا اخلاقی رخ

علم اپنی عظمت کے باوجود اپنے کو پُرتاثیر بنانے میں مکارم اخلاق کا ضرورت مند ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں "انما بعثت معلماً" (میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں) "اوتیت علم الاولین والآخرین" (مجھے اگلے اور پچھلے (انبیاء) کے علوم عطا فرمائے گئے ہیں) فرما کر اپنے علم عظیم کو ظاہر فرمایا ہے وہیں اپنے کمال اخلاق کی رفعتوں کو "بعثت لاتمم مکارم الاخلاق" (میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں) کو اسی اہتمام سے ظاہر فرمایا کہ جس اہتمام سے علم کا اظہار فرمایا ہے جس سے علم کے ساتھ اخلاق کی عظمت اور مقصدیت بھی آشکار ہو جاتی ہے پس علم اور اخلاق نبوت کی وہ دو درانتیں ہیں کہ جن میں ایک کی تکمیل دوسرے کے بغیر نہیں ہوتی۔

حضرت مولانا مرحوم جہاں علم وسیع کے مالک تھے وہیں اخلاق رفیع سے بھی اللہ نے آپ کو حصہ وافر عطا فرمایا تھا اس لئے ہر وارد و صادر اپنے ساتھ حضرت مولانا کے اخلاقی تعامل کو دیکھ کر یہ سمجھنے پر مجبور ہوتا تھا کہ حضرت یوصف کو مجھ سے وہ خصوصی تعلق و ارتباط ہے کہ جو کسی دوسرے کو نصیب نہیں، اسی بلندیٔ اخلاق نے حضرت موصوف کے علم کو عظیم مقبولیت و پُرتاثیری بخشش دی تھی۔

راقم الحروف بھی اپنے ساتھ حضرت مولانا کے خصوصی اور غیر معمولی تعلق و تعامل کی بنیاد پر انہی اہل یقین میں سے ہے جس پر احقر کی ہر موقع پر حاضری و ملاقات میں حضرت کے ضعف پیری کے تحت کھڑے ہو کر معانقہ سے روکنے کی کوشش کو حضرت یہ فرما کر رد فرماتے کہ تمہارے ساتھ ناقابل انکار اور محسن ملت نسبت قاسمی قائم ہے اس کا احترام کھڑے ہونے اور معانقے کا متقاضی ہے اسے ترک کر کے میں اپنے ضمیر کی ملامت سے دوچار ہونا مطلق گوارہ نہیں کرتا۔

پھر اس عظیم اخلاق مندانہ تعامل کو ہر مرتبہ یہ تین باتیں ارشاد فرما کر مدلل فرماتے، پہلی یہ کہ میں بلاناغہ ہر روز حضرت الامام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس اللہ سرہ کے لئے ایصال ثواب کرتا ہوں، دوسری یہ کہ میرے والد ماجد نے علالت کی مکمل و مستند تاریخ پر مشتمل معرکۃ الآراء تصنیف "نزہۃ الخواطر" میں اپنی فراست ایمانی و علمی سے ہر عالم کے لئے ان کی شان کے مناسب القاب تحریر فرمائے ہیں۔ لیکن "الامام" کا لقب حضرت الامام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی (بانی دارالعلوم دیوبند) کے لئے بطور خاص استعمال فرمایا ہے۔

تیسری یہ کہ آپ کے دادا صاحب حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ اہتمام دارالعلوم میں میرے والد ماجد حضرت مولانا حکیم عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ دیوبند تشریف لے گئے اور اسٹیشن کے قریب کسی عام سرائے میں قیام فرمایا اس کی اطلاع جب آپ کے دادا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ہوئی تو کچھ اساتذہ کے ساتھ بذات خود اس سرائے میں تشریف لے گئے اور حضرت والد صاحب سے فرمایا کہ حضرت آپ ہم سب کے مخدوم ہیں یہاں قیام کے کیا معنی ہیں غریب خانہ آپ کا گھر ہے۔ دارالعلوم دیوبند آپ کی جگہ ہے، آپ کی تشریف آوری ہمارے لئے باعث راحت و سعادت ہے۔ یہ فرما کر غیر معمولی احترام کے ساتھ حضرت مولانا محمد احمد صاحب، حضرت والد صاحب کو اپنے مکان پر لے گئے اور غیر معمولی محبت و احترام کے ساتھ حضرت مہتمم صاحب

اور تمام اساتذہ کرام وغیرہم نے مہربانی فرمائی، یہ فرماکر حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ اکرم الخلق سے فرماتے کہ ہمارا آپ کے محترم گھرانے سے محبانہ و معتقدانہ تعلق نہایت با احترام و قدیم اور تاریخی ہے جس سے کسی وقت اور کسی حال میں بھی صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔

مولانا کی عظیم مثالی امتیازی صلاحیت

جس طرح دار العلوم دیوبند کو شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دور میمون میں ان کی مخلصانہ انتظامی صلاحیتوں نے ہندوستان گیر بنایا اور حکیم الاسلام حضرت اقدس مولانا محمد طیب صاحب کے دور مسعود میں ان کی عظیم صلاحیتوں نے دار العلوم دیوبند کو بلا شرکت غیرے بین الاقوامی بنایا ٹھیک اسی طرح حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد حضرت مولانا حکیم عبد الحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناظم ندوۃ العلماء نے دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کو ملک کے ارباب علم میں متعارف کرایا، حضرت والا کے برادر بزرگوار حضرت مولانا ڈاکٹر عبد العلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مبارک دور میں ملک کے بیشتر علمی حلقوں اور اداروں میں دار العلوم ندوۃ العلماء ایک باوقار درسگاہ کے طور پر پہچانا گیا، اور خود حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ مسعود میں دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ان کی اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں سے نہ صرف بین الاقوامی سطح پر غیر معمولی عظمت کے ساتھ متعارف ہی ہوا بلکہ عالم عرب اور دیگر ممالک کی مؤقر یونیورسٹیز نے دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کو علمی اور دینی اہمیت کے ساتھ تسلیم کرکے اس کی عظمتوں کو غیر معمولی بنادیا، ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کو یہ بین الاقوامی امتیاز بلا شرکت غیرے حضرت مولانا علی میاںؒ ہی کی ذات گرامی سے حاصل ہوا۔ حق تعالیٰ اس کی اس فضیلت و امتیاز کو ہمیشہ کے لئے برقراری عطا فرمائے۔ آمین۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی صدارت

ملت اسلامیہ ہندیہ کی تاریخ میں تمام مسلم مکاتب فکر کی یہ اولین و مؤقر تنظیم "آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ" کے عنوان سے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ (سابق مہتمم دار العلوم دیوبند) نے برفاقت و تعاون امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی رحمۃ اللہ علیہ پوری ملت اسلامیہ ہندیہ کی مکمل تائید کے ساتھ تحفظ شریعت اسلامیہ کے لئے قائم فرمائی، اور شریک بورڈ تمام مکاتب فکر کے ادنیٰ اختلاف کے بغیر حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہ .... تاحیات اس کے صدر رہے اور اس کی ورکنگ کمیٹی میں فعال و مؤثر رکن کی حیثیت سے حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ روز اول سے پورے انہماک کے ساتھ شریک رہے۔

جولائی ۱۹۸۳ء میں حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد حسب روایت سابق شریک بورڈ تمام مکاتب فکر کے ادنیٰ اختلاف کے بغیر محبوب ملت مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے صدر قرار دیئے گئے اور ان کی متفق علیہ اور مسلّم شخصیت کی موجودگی میں کسی دوسری شخصیت کی جانب کسی التفات کا چونکہ کوئی سوال و امکان ہی نہیں تھا اس لئے تاحیات بورڈ کی صدارت کے مقام عظمت پر فائز رہے اس تیرہ سالہ دور صدارت میں ملک میں فرقہ پرست پارٹیوں نے اسلام اور ملت اسلام کے برخلاف نت نئے فتنے اٹھائے، حتیٰ کہ خود حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی اور آپ کے مؤقر ادارے دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کو بھی غیر قانونی اور غیر اخلاقی حملوں کا ہدف بنانے میں کمی نہیں کی۔ لیکن حق تعالیٰ کی عطا فرمودہ ایمانی فراست و قوت سے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے پوری ملت اسلامیہ کو وہ ہمت و حوصلہ مرحمت فرمایا کہ تمام فتنے نہ صرف اپنی موت آپ مر ہی گئے بلکہ یقین ہے کہ اسلام و مسلم دشمنی کے اس دور میں ان بزرگوں کی دعاؤں اور عطا فرمودہ ایمانی قوت سے انشاء اللہ الاسلام یعلو ولا یعلیٰ (اسلام غالبیت کے لئے آیا ہے مغلوبیت کے لئے نہیں) نبوی فرمان کے مطابق اسلام بھی زندہ و تابندہ رہے گا اور ملت اسلام بھی عزت کے ساتھ باقی رہے گی۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے دور مسعود میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی آواز پوری دنیائے اسلام کے کانوں تک صرف پہونچی ہی نہیں بلکہ خود ان کے اپنے مسائل کے حل کے لئے باعث ہمت و حوصلہ ثابت ہوئی۔

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مفکر اسلامؒ کے سراپا خیر زمانوں میں الحمد للہ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کسی خلاف و اختلاف سے دوچار نہیں ہوا، توقع ہے کہ ان ہر دو بزرگوں کے سنجیدہ و متین ..... قیادت کو انشاء اللہ آئندہ اور ہمیشہ ملحوظ رکھ کر ان کی قیادت کو خراج تحسین پیش کیا جاتا رہے گا۔

حضرت مولاناؒ کا ادبی ذوق

حق تعالیٰ نے حضرت مولانا علی میاںؒ کو جس طرح بے شمار کمالات کے ساتھ "سخن دلپذیر" سے نوازا تھا اسی طرح اللہ نے انھیں "دل سخن پذیر" سے بھی حصہ وافر عطا فرمایا تھا، تحریر و تقریر میں

ادبی سخن پذیری مولانا کا ایک ایسا خصوصی امتیاز تھا کہ جو سامعین و مخاطبین کو مسحور بنائے رکھتا تھا پھر یہ امتیاز اپنی مادری زبان اردو ہی میں انھیں حاصل نہیں تھا بلکہ عربی زبان میں بھی وہ اہلِ زبان کی طرح
اسی امتیاز کے مالک تھے۔

اسی ادبی ذوقی لطافت کو حضرت مولانا اپنی عربی تصانیف کے ناموں میں خاص طور پر ملحوظ رکھ کر ان میں وہ عجیب و غریب دلکشی اور جاذبیت پیدا فرما دیتے تھے کہ کتاب کا نام دیکھ کر یا سن کر عربی مذاق ادب رکھنے والے عرب و غیر عرب کتاب کے مطالعے کے لئے بے چینی سے پرشوق بن جاتے تھے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مانعین زکوٰۃ کا فتنہ اسلامی مسلمہ معتقدات کے برخلاف ایک عظیم الحادی فتنہ بن کر ظاہر ہوا۔ لیکن صدیق اکبرؓ نے اول لحہ میں اس کے برخلاف جدال و قتال کے عزم صمیم کے ساتھ بروقت عمل سے ہمیشہ کے لئے اس فتنہ عظیم کو خاک بسر بنا کر رکھ دیا جبکہ فاروق اعظمؓ کو بھی اس کے برخلاف جدال و قتال کے بارے میں شرح صدر کچھ وقفے کے بعد ہوا۔

عصر رواں میں یورپ کا الحادی فتنہ، تمدنی رنگ میں خاص طور پر دولتمند عالم عرب کی نئی مسلم نسل کو غیر معمولی طور پر مرعوب و متاثر کر رہا ہے۔ عالم عرب میں اس جدید تمدنی فتنہ الحاد کی گہرائی و گیرائی کو مفکر اسلامؒ کے فکر عمیق و سلیم نے پہچان کر اس کی جانب وہ اصلاحی قدم ایک ایسے تحریری خطاب کے ذریعہ فرمایا کہ جس کے جاذب و دلکش عربی عنوان "ردۃ ولا ابا بکر لہا" میں نہ صرف اس فتنہ کی پوری تاریخ ہی کو سمو دیا بلکہ نئی نسل کے تربیت کنندگان کو تڑپا کر رکھ دیا اور عالم عرب میں حضرت مولانا کے اس مقالہ کے لاتعداد ایڈیشن شائع ہوئے اور شائع ہو رہے ہیں جس کی اثر پذیری سے بیشمار افراد اس تمدنی الحاد سے بچ کر ہدایت یاب ہوئے۔

حضرت مولاناؒ کا اجتماعی پرداز

عصر رواں میں وسائل نقل و حمل اور ذرائع علم و خبر اچھے اور برے کے امتیاز بغیر ہر قسم کے معتقدات افکار اور نظریات کو عالمگیر اشاعت کی وہ سہولتیں مہیا کر رہی ہیں کہ ماضی میں جن کو ایک مخصوص دائرے سے باہر کوئی جانتا بھی نہیں تھا ان افکار و نظریات کو جب ان وسائل اشاعت سے پھیلنے کا وسیع میدان ملا تو جہاں محدود تعداد میں ان میں اچھے اور اعلیٰ نظریات کو علمی اور فکری معیار پر رکھ کر قبول کرنے والے میسر آئے وہیں فاسد افکار و خیالات کو صحت و سقم کے معیاروں کو نہ جاننے والے بے علم یا کم علم طبقات کا وسیع و عظیم حلقہ ان کی مبتذل خواہشات کی تکمیل کرنے والا اور ان فاسد و غیر مدلل افکار و خیالات کو بدل و جان قبول کرنے والا بھی مل گیا۔

یہ دونوں طبقات چونکہ ملت کا جزو تھے اس لئے ان سے کسی بھی اعتبار سے جہاں صرف نظر کرنا ممکن نہیں تھا وہیں ان افکار فاسدہ کو بعینہ قبول کر لینا بھی ممکن نہیں تھا اس متضاد ملی ماحول میں جن دو اجزاء سے مرکب فراست ایمانی کی ضرورت ہوتی ہے اسی صاحب فراست ایمانی کو منصب قیادت راس آتا ہے۔ قائد کو اولین طبقے کی ہمنوائی و تائید صرف علمی وسعت اور دلائل و براہین کی قوت پر میسر آتی ہے۔ بخلاف ثانی الذکر کے کہ اس کی زبان بندی کا راستہ صرف قائد کی بلند اخلاقی میں پوشیدہ ہوتا ہے۔

وسعت علم اور اخلاقی بلندی کے ہر دو اوصاف حسنہ سے حق تعالیٰ نے حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کو حصہ وافر عطا فرما کر نوازا تھا۔

ان کی علمی دستوں سے عرب و عجم کے اہل علم کی تاثر پذیری آج الحمد للہ کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے جس پر مستقبل کی لامحدود مدت تک ان کی تصانیف سے ارباب علم کا استفادہ شاہد عدل رہے گا۔

حضرت مولانا نے اپنے دینی معتقدات علمی حقائق و نکات اور فکری نظریات سے شدید ترین اختلاف رکھنے والوں کو اپنی بلندیٔ اخلاق سے، اپنائیت کا وہ احساس و شعور عطا کیا کہ انھوں نے بھی حضرت مولانا کو کبھی ہدف اختلاف بنانے کی جرأت نہیں کی یا اسی علمی اور اخلاقی ہمہ گیری نے قیادت ملت کے اس منصب قبولیت و مقبولیت پر فائز فرمایا کہ جس کی عصر رواں میں ملت ضرورت مند تھی، اور ضرورت مند ہے۔

حضرت مولانا نے اپنے ان ہی علمی اور اخلاقی امتیازات و خصوصیات کی بدولت دین میں مبالغہ کرنے والے حاملین علم قدیم کو اور تمدن میں حدود سے تجاوز کرنے والے متجددین کو برّ صغیر میں نہیں بلکہ عالمی سطح پر اس راہ اعتدال سے قریب فرمایا کہ جو اسلام کا بلا شرکت غیرے طرۂ امتیاز ہے۔

حضرت مولانا کی پاکیزہ زندگی کا یہ وہ باب ہے کہ جس پر مستقبل کے مصنفین، مؤلفین اور مؤرخین ہمیشہ ان شاء اللہ قلم اٹھاتے رہیں گے۔ لیکن اس ناقابلِ اختتام رانہا داستان علمی پر جہاں ان کے قلم اعتراف عجز کے ساتھ رکنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس کی ترجمانی احقر راقم الحروف نے والد ماجد حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر دو شعروں میں کی تھی اسی حقیقت کا نقش ثانی و مکمل حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی ہے۔ اس لئے اسم گرامی کے فرق کے ساتھ میں اسی ترجمانی پر اپنے ان کلمات کو ختم کرتا ہوں ؎

رہبر منزل نما در رہبر منزل نگر
بوالحسن دانشور و دیوانہ فرزانہ گر
نوری خاکی اساس و خاکی نوری نہاد
خواجۂ بندہ نواز و بندۂ یزداں شناس

حق تعالیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات و حسنات اور طاعات و عبادات کو شرف قبول عطا فرما کر مغفرت کاملہ کے ساتھ اعلیٰ علیین میں مقام کریم عطا فرمائے۔

مفکر اسلام (رحمۃ اللہ علیہ) اپنی شخصیت کے آئینے میں

مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی الندوی (مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء)

مثالی انسان کی تعمیر میں اسلام کا کردار

یہ ایک ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ انسانی تاریخ کے کسی دور میں بھی مذہب اسلام کی طرح کوئی ایسا جامع نظریۂ حیات اور معتدل نظام زندگی وجود پذیر نہیں ہوا جس نے اپنی تمام تر توجہات کا مل انسان کی سیرت سازی اور اسے اخلاق کریمانہ کا مجسم پیکر بنانے پر مرکوز کیا ہو، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلی جو وحی نازل ہوئی اس میں خداوند تعالیٰ کے بابرکت نام سے حصول علم کی تلقین و ترغیب ہے، اسی لئے اسلام نے ہر چیز سے پہلے انسان کی توجہ اس علم کی طرف مبذول کرائی تاکہ وہ اپنے مرتبہ و مقام سے باخبر ہو کر آسمانی ہدایات کی روشنی میں اپنا سفر طے کرے، اور اپنی زندگی کا حقیقی ہدف متعین کر سکے، اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا میں آخری نظام حیات دے کر مبعوث فرمایا، یہ نظام اپنی آفاقیت و جامعیت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے، فطرت انسانی کے تمام تقاضوں کی تکمیل، اور انسانی زندگی کے جملہ مسائل کا بہترین حل اس میں موجود ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ"

اللہ کی دی ہوئی قابلیت کا اتباع کرو جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اللہ تعالیٰ کی اس پیدا کی ہوئی چیز کو جس پر اس نے تمام آدمیوں کو پیدا کیا ہے بدلنا نہ چاہئے بس سیدھا دین یہی ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (ترجمہ مولانا تھانویؒ)

تاریخ انسانی کا عظیم انقلاب

اسلام کی آمد سے تاریخ انسانیت میں ایسا عظیم الشان انقلاب رونما ہوا جس نے لوگوں کو خواہشات نفسانی کے کج راستوں سے ہٹا کر صراط مستقیم پر ڈال دیا، اور اس کے نتیجہ میں ایک ایسا صالح معاشرہ وجود میں آیا جس میں ایمان و یقین، سچائی و راست بازی، تقویٰ و طہارت اور کردار و عمل کے دلچسپ و دلکش مظاہر کی کارفرمائی رہی، وہ معاشرہ ایسے پاک طینت افراد پر مشتمل تھا جو بجا طور پر انسانیت کے لئے بہترین نمونہ تھے، ان کی اس افضلیت و برتری کی وجہ یہ تھی کہ ان کی ساخت و پرداخت شریعت اسلامیہ کی ہدایات کی روشنی میں کی گئی تھی اور یہ حقیقت ہے کہ اسلامی تربیت کی کرشمہ سازی اپنا جمال و جلال دکھائے بغیر نہیں رہتی، بلکہ اس کے زیر سایہ ایسے انسانوں کی سیرت کی تعمیر ہوتی ہے جو مستقبل میں امامت و قیادت کے منصب پر فائز ہوتے ہیں، وہ زندگی کے کسی موڑ پر بھی اعتدال و میانہ روی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے، وہ غلو و تقدیس سے پاک اور حق تلفی و ناانصافی سے کوسوں دور ہوتے ہیں، اخلاص و تعلق مع اللہ ان کی زندگی کا نمایاں جوہر اور حقیقی مقصد ہوتا ہے۔

۱۴۱۹ھ کی سب سے بڑی اسلامی شخصیت

عالم اسلام کے لئے یہ ایک بہت ہی خوش آئند موقع تھا، جب حکومت دبئی نے عالمی جائزہ القرآن کے جشن کے موقع پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کو ۱۴۱۹ھ کی عظیم اسلامی شخصیت قرار دیا اور آپ کو ایک وقیع ایوارڈ سے نوازا اور مشرق و مغرب کے تمام اسلامی حلقوں نے اس اقدام کا زبردست خیر مقدم کیا۔

اسلامی امتیازات و کمالات کا تاج زریں

یہاں یہ حقیقت بھی نظروں کے سامنے ہونی چاہئے کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نور اللہ مرقدہ کو اللہ تعالیٰ نے ایمان و یقین اور علم و حکمت کے جس گنجینۂ گراں مایہ سے نوازا تھا اور امتیازات و کمالات کا جو تاج زریں آپ کے سر پر رکھا تھا اس کی موجودگی میں پورے عالم اسلام میں آپ کو چھوڑ کر کوئی دوسرا شخص اس اعزاز کا اہل بھی نہ تھا، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ آپ کی ایمان افروز مثالی شخصیت اس ایوارڈ سے بالاتر تھی چنانچہ آپ نے اس موقع پر جب آپ کو اس اعزاز سے نوازا گیا بھرے مجمع میں اس عظیم قیمتی ایوارڈ کو دینی تعلیم کے حق میں تقسیم کرنے کا اعلان کر دیا، یہ دراصل آپ کی مثالی شخصیت کا سب سے بڑا ثبوت تھا جو آج کی انسانی دنیا میں مفقود ہے۔

دنیا کے بارے میں آپ کا موقف

حضرت مولانا کا یہ خیال تھا کہ یہ دنیا دار الاسباب

ہے، اس میں اصل مقصد تک رسائی حاصل کرنے کے لئے وسائل و ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں، اور ایک فرد مسلم آخرت کی فوز و فلاح کے لئے دنیاوی وسائل سے استفادہ کرتا ہے، چنانچہ آپ مرد مومن کے اصل مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"مومن کا دنیاوی موقف وہ ہے جس کی توضیح زبان نبوت نے بڑے اچھے ڈھنگ سے فرمائی ہے، اور ایسی لطافت و نزاکت اور دقیق تعیین کے ساتھ اس کو بیان فرمایا ہے کہ اس کے سامنے زبان و بیان اور لطافت و باریکی کے تمام طرز ادا ہیچ نظر آتے ہیں فرمایا "ان الدنیا خلقت لکم وانکم خلقتم للآخرۃ" (دنیا و آخرت کی تمام چیزیں تمہارے لئے مسخر کی گئی ہیں اور تم لوگ آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔) لہٰذا ایک مسلمان دنیا و آخرت کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ دنیا اور اس کے سارے وسائل و ذرائع کی حیثیت محض ایک وسیلہ کی ہے، مقصد و غایت اور حقیقی مطمح نظر تو بس آخرت کی زندگی ہے لہٰذا اسے مقصد کے حصول کے لئے اس مادی دنیا کے تمام وسائل سے حتی الامکان استفادہ کرنا چاہئے ایک دوسری حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی حقیقت کو یوں آشکارا کیا ہے" مالی و للدنیا، و ما انا و الدنیا إنما أنا کراکب استظل تحت شجرۃ ثم راح وترکھا" (مجھ کو دنیا سے کیا لینا دنیا میرا تعلق تو اس سے بس اتنا ہے جتنا ایک مسافر سوار کا کسی سایہ دار درخت سے ہوتا ہے کہ وہ اس کے نیچے سایہ حاصل کرتا ہے پھر اٹھ کر چل دیتا ہے")۔

کتاب و سنت کا نظریۂ حیات

مذکورہ بالا قرآنی نظریہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور آپ کی تعلیمات و ارشادات احساسات و رجحانات، اوراد و اذکار، ادعیہ و مناجات اور خلوت و جلوت کی زندگی میں مکمل طور پر ظاہر ہوا، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آغوش تربیت میں پرورش پانے والے صحابہ کرامؓ اور اس امت کے مومنین صالحین کی زندگیوں میں بھی یہ وصف پورے آب و تاب کے ساتھ پایا گیا، حتیٰ کہ وہ ان کی زندگی کا جزء لاینفک بن گیا اور اس نے ثابت شدہ تاریخی حقائق کا درجہ اختیار کر لیا جس میں بحث و مباحثہ اور کسی کلام کی کوئی ضرورت نہیں۔

اسلامی شخصیت اور اسلامی تہذیب

بلاشبہ اسلامی شخصیت کی تعمیر و ترقی سے اسلامی تہذیب کا عظیم محل تعمیر ہوتا ہے اور اسی کے ذریعہ خاکی صفت ظلوم و جہول انسان ملکوت اعلیٰ کی صف میں جا کھڑا ہوتا ہے، اور سماوات ملأ اعلیٰ سے بھی بازی لے جاتا ہے کیونکہ اس کی زندگی ایسے عظیم اخلاق و کردار سے عبارت ہوتی ہے جو اسے مطلوب مسلمان اور مثالی مومن کا درجہ عطا کرتے ہیں، حضرت مولانا نور اللہ مرقدہ اس عظیم پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

"یقیناً اسلامی شخصیت کی حفاظت اور دنیا میں امت اسلامیہ کے مرکز و قبلہ کی صیانت اور اسلام کے پیغام و مشن سے واقفیت اور اس کی اہمیت و افادیت پر یقین اور حیات بعد الممات پر مکمل اعتماد، اور زندگی کے اخلاقی و روحانی پہلوؤں پر تاکید ہی دراصل دو تہذیبوں کے درمیان خط فاصل کا نشان لگاتی ہے ایک تہذیب تو وہ ہے جس سے اسلام مکمل اتفاق کرتا ہے، اور اس کو پروان چڑھانے کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر ڈالتا ہے اور اس میں اسلامی شخصیت اور اختراعات و ایجادات کا ظہور ہوتا ہے، دوسری تہذیب وہ ہے جس سے اسلام اپنی مکمل برأت کا اعلان کرتا ہے، کیونکہ وہ مسلمانوں کے حق میں خسارہ و نقصان کا باعث ہے اور اس میں غلامی و بندگی کا رفرما ہے اور اس کی اتباع و تقلید، بندروں اور طوطوں کی تقلید سے کم نہیں"۔

حضرت مولانا کا منفرد نقطۂ نظر

اس کرۂ ارضی اور اس پر بسنے والے انسانوں کے متعلق حضرت مولانا کا نظریہ نہایت منفرد تھا، آپ کی شہرۂ آفاق تصنیف (ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین) (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر) نے فکر و نظر کی دنیا میں عظیم انقلاب برپا کیا اور اسلامی ادباء و مفکرین کو سوچنے کا ایک نیا طرز عطا کیا، جہاں تک میرا خیال ہے کہ اس کتاب کے منصۂ شہود پر آنے سے قبل ادباء و مفکرین کا زاویۂ فکر یہ نہیں تھا کہ مسلمانوں کے انحطاط سے مشرق و مغرب شمال و جنوب ہر خطہ میں عالم انسانیت کو عظیم خسارہ اور ناقابل تلافی نقصانات سے دوچار ہونا پڑا، لیکن حضرت مولاناؒ نے بڑی بیدار مغزی، کامل اعتماد و یقین اور مسکت دلائل و براہین سے اپنے موقف کی وضاحت کی، چنانچہ اس کتاب کے مقدمے میں معروف مصری فاضل عظیم مفکر و ادیب ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ رقمطراز ہیں:

"اس کتاب میں جو خیر و طاقت ہے اور ہمارے مسائل و مشکلات کا جو بہترین حل ہے بخدا میری دانست میں قدیم و جدید کسی کتاب میں نہیں ہے اس کا مصنف

اسلامی روح سے سرشار اور اپنے مقصد میں انتہائی مخلص ہے اس نے اپنی تمام طاقتوں کو دعوت الی اللہ کے لئے وقف کر دیا ہے۔"

اس موقع سے معروف صاحب علم وقلم عظیم اسلامی اسکالر، مشہور مفکر وداعی سید قطب کی تحریر بھی ملاحظہ فرمانے کے قابل ہے جو انھوں نے اس کتاب کے مقدمہ میں سپرد قرطاس فرمائی تھی لکھتے ہیں:۔

"اس کتاب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے اسلام کے اصول و کلیات کو ان کے وسیع دائرہ کے اندر، اور اسلام کی صحیح روح کے مطابق سمجھا ہے، اس بنا پر نہ صرف یہ کہ یہ کتاب دینی و اجتماعی تحقیق علمی کا نمونہ ہے بلکہ اس کا بھی نمونہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے تاریخ کو کس انداز سے مرتب کرنا چاہئے۔"

امت اسلامیہ کے فرزند ارجمند

حضرت مولانا نور اللہ مرقدہ اپنی ذات سے ایک انجمن، امت اسلامیہ کے عظیم و ہونہار فرزند ارجمند، اور عالم انسانیت کے لئے بہترین نمونہ اور ایک مثالی انسان تھے، آپ کی اسلامی شخصیت کے تعارف کے لئے کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں، بلکہ اس کے لئے یہی کافی ہے کہ آپ کی جملہ تصنیفات سے جن کی تعداد تقریباً دو سو سے زائد ہے پورا عالم باخبر ہے، حتیٰ کہ مسلم نوجوانوں کے اندر ان کتابوں کو جمع کرنے اور ان سے خالص اسلامی فکر کی غذا حاصل کرنے میں مقابلہ اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا جذبہ پایا جا رہا ہے، کیونکہ ان میں اسلامی فکر کا ایسا خلاصہ و نچوڑ پیش کیا گیا ہے جس کا تعلق زندگی کے ہر شعبہ اور ہر محاذ سے ہے ان میں ایسی طاقت و صلاحیت ہے جو اسلام اور اس کے نظام پر لوگوں کا اعتماد بحال کر سکتی ہے، اور مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی عظمت رفتہ اور اس کے سطوت و غلبہ کی بازیابی کے لئے ایمان و یقین کی چنگاری روشن کر سکتی ہے اور انھیں عالمی قیادت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھالنے اور عالم انسانیت کو جدید جاہلیت کے خود ساختہ نظریات حیات اور مادی تہذیبوں کے جہنم سے نکالنے پر آمادہ کر سکتی ہے، مولانا مرحوم کی اسلامی شخصیت کو آپ کی روشن فکر کائنات کے متعلق آپ کے بے مثال نظریۂ حیات اور مادی تہذیبوں کے متعلق آپ کی وسیع معلومات کے آئینہ میں دیکھا جا سکتا ہے، اس بنا پر مولانا بجا طور پر اس بات کے سب سے زیادہ حق دار تھے کہ آپ کی محبت میں اکرام و تعظیم اور ادب و احترام کے گلہائے عقیدت پیش کئے جاتے رہیں۔

آپ کا وجود ابر رحمت تھا

مفکر اسلام حضرت مولانا نور اللہ مرقدہ عالم اسلام کے لئے کسی ابر رحمت سے کم نہ تھے، آپ کا وجود مسلمانوں کے لئے بڑے خیر و برکت کا باعث تھا، آپ ان کے لئے سرچشمۂ ہدایت اور ایک مشفق مربی کا درجہ رکھتے تھے، امت مسلمہ کے مسائل و مشکلات سے بخوبی واقف تھے اس لئے ان میں دلچسپی لے کر ان کا بہترین حل پیش کرتے تھے اطراف عالم کے مسلمان آپ سے دعوت و تبلیغ کے میدان میں حکمت و موعظت کا سبق سیکھتے تھے، حالات چاہے جیسے بھی ہوں ہمیشہ اسلامی موقف پر جمے رہنے کی تلقین فرماتے تھے۔

اصل مقصد دعوت الی اللہ اور اس کے لئے عالم کی سیاحت

الغرض آپ ہر ممکن طریقے سے اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے میں سرگرم عمل تھے، آپ کے لئے اگر ایک طرف تالیف و تصنیف کی بے پناہ مشغولیت تھی تو دوسری طرف اسفار و ملاقات کا لامتناہی سلسلہ تھا، اعلاء کلمۃ اللہ آپ کی زندگی کا حقیقی ہدف اور اصل نصب العین تھا، چنانچہ آپ نے امت مسلمہ کی عظمت رفتہ کی بحالی، اسلامی تہذیب و تمدن کا پرچم پورے عالم میں لہرانے، دشمنان اسلام کے اعتراضات کا کافی و شافی جواب دینے، ان کے ناپاک عزائم اور ان کی سازشوں کا پردہ چاک کرنے کے لئے مصر و فلسطین کی خاک چھانی، امریکہ و یورپ کے شہروں اور وہاں کے تعلیم و تہذیب کے مراکز کی سیر کی، اسپین کے شکستہ در و دیوار کی عبرتناک داستانیں سنا کر مسلمانوں کی حمیت دینی اور ان کی غیرت کو للکارا، خلافت عثمانیہ کے زوال کے اسباب بیان کر کے ان کے ذہن و دماغ کو جھنجھوڑا، کتب تاریخ کے اوراق پارینہ کو کھنگالا اور اسلامی تہذیب کے ایک ایک پہلو کو روشن و بے غبار ثابت کر کے دم لیا۔

اس کا ثمرہ پورے عالم اسلام میں اسلامی بیداری کی شکل میں نمودار ہوا، مگر افسوس کہ آپ ایسے نازک وقت میں راہیٔ دار بقا ہوئے جب کہ امت کو آپ جیسے قائد و مجاہد کی اشد ضرورت تھی، آج عالم اسلام کو عموماً اور امت اسلامیہ ہندیہ کو خصوصاً مسائل و مشکلات کے ایک سیل رواں کا سامنا ہے، عربی مثل میں ذرا تغیر کے ساتھ کہنا کتنا بجا معلوم ہوتا ہے "قضایا ولا ابا حسن لہا"۔

آپ کا وصف امتیازی

مولانا مرحوم کا ایک امتیازی وصف یہ تھا کہ دنیا کے احوال و کوائف پر آپ گہری نظر رکھتے تھے، اسلام دشمن تنظیموں اور یہودی لابی کی زبردست سازشوں اور ان کی عظیم تیاریوں سے مکمل آگاہی

رکھتے تھے چنانچہ آپ امت مسلمہ کے ہر طبقہ کو اس خطرہ سے آگاہ کرتے تھے اور اس کے مقابلہ کے لئے انھیں بھرپور تیاریوں کی دعوت دیتے تھے، آپ نے امت مسلمہ کے ہر ہر طبقہ میں جہد مسلسل، سعی پیہم، عزم محکم، غیرت وحمیت اور اخلاص وللّٰہیت کی روح پھونک دی، اور اس طرح مسلسل لگن وتڑپ کے ساتھ اپنے فریضہ کی انجام دہی میں مشغول رہے۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا شمار امت کے عظیم داعیوں، اور اسلام کے ہونہار فرزندوں اور لائق سپوتوں میں ہوتا ہے، آپ اپنے آفاقی فکر، عالمگیر نظریہ اور اعتدال پسندانہ موقف کی وجہ سے علم وعمل، فکر ونظر، اور عقیدہ وایمان کے جلیل منصب پر فائز تھے، اخلاص وللّٰہیت، زہد واستغنار اور تعلق مع اللہ جیسے اعلیٰ اوصاف نے آپ کی زندگی میں مزید حسن ونکھار پیدا کر دیا تھا، اس لئے چشم فلک نے دیکھا کہ خدائے رحمان ورحیم نے آپ کو خلائق کے درمیان عام مقبولیت سے نوازا، اور ایک مثالی مؤمن اور آئیڈیل مسلم کا تاج آپ کے سر پر رکھا "ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ"۔ اقبال مرحوم نے سچ کہا تھا ؎

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

آپ کے کارناموں کا اعتراف

حضرت مولانا مرحوم کی جلیل القدر خدمات اور عظیم الشان کارناموں کو بہت سے اصحاب علم وارباب علم وقلم نے سراہا، اور انھیں اپنا موضوع سخن بنایا، لیکن صحیح یہ ہے کہ مستقبل میں بھی پورا عالم آپ کی ان خدمات کا اعتراف کرتا رہے گا، سعودی عرب کے سابق وزیر اطلاعات جناب ڈاکٹر محمد عبدہ یمانی نے اپنے تعزیتی مضمون میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"شیخ ندویؒ کی پوری زندگی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً ۸۰ سال کا طویل عرصہ آپ نے جہد مسلسل، سعی پیہم اور عالم اسلام ودیگر ممالک کے اسفار وسیاحت میں گذار دیا، حکمت وموعظت اور بصیرت کے ساتھ لوگوں تک اللہ عزوجل کا پیغام پہونچاتے رہے، خیر خواہی ونصیحت کے جذبہ سے سرشار ہو کر لوگوں کو اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہے اور علماء اسلام سے ہمیشہ تبادلۂ خیالات کرتے رہے، مشرق ومغرب، شمال وجنوب کے تمام مسلمانوں کے مسائل میں دلچسپی لے کر ان کا تعاون کرنا اسلامی وعربی ممالک کی زیارت کر کے مسلمانوں کے احوال وکوائف کا بنظر غائر جائزہ لیتے رہنا اور انھیں اتحاد واتفاق کی دعوت دینا الفت ومحبت کا سبق پڑھانا آپ کی امتیازی خصوصیات سے گہرا تعلق رکھتا ہے، نیز ارباب حل وعقد سے ملاقاتیں کر کے انھیں قرآنی ہدایات کی طرف برابر متوجہ کرتے رہنا ایک عظیم وصف تھا جس کی نظیر عصر حاضر کے داعیوں اور علماء میں نہیں ملتی، یہ بلند درجات اور یہ اوصاف آپ کو محض آپ کے اخلاص وللّٰہیت کی بنا پر حاصل ہوئے ہے

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار ورسن کہاں"۔

پیام انسانیت دعوت اسلامی کا ایک اہم پہلو

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ایمانی بصیرت اور روشن ضمیری سے اہل وطن کو اسلام سے قریب لانے اور ان تک اسلام کا پیغام پہونچانے کے لئے "پیام انسانیت" کے نام سے ایک دعوتی تحریک کی بنیاد ۱۹۵۱ء میں ڈالی تھی، اور اس کے حلقے کو حکمت وتدبر کے ساتھ برابر وسیع فرماتے رہے، ملک کے مختلف بڑے شہروں اور مرکزی مقامات پر اس کے جلسے کئے جاتے تھے اور اس میں غیر مسلم دانشوروں، اور تعلیم یافتہ طبقے کو خاص طور سے دعوت دی جاتی تھی اور عام جلسے کے علاوہ انھی حضرات کی ایک خصوصی نشست بھی رکھی جاتی تھی جس کو حضرت مولانا خود خطاب فرماتے تھے اور دعوت کی حکمت کو پیش نظر رکھ کر ان کو بغیر کسی صراحت کے اسلام کی اعلیٰ اخلاقیات کی طرف متوجہ فرماتے تھے جس کا بے حد گہرا اثر پورے مجمع پر پڑتا تھا اور لوگ حضرت والا کی وطن دوستی اور خدمت خلق اور انسانیت کے احترام کا جذبہ، جو ان کے اندر موجزن تھا، اس کا لوہا ماننے پر مجبور ہوتے تھے۔

ان کا خیال تھا کہ ہمارے ملک بلکہ تمام ممالک کے جملہ مسائل ومشکلات کا حل اسی بات میں مضمر ہے کہ ہم انسانیت کے اعلیٰ مقام کے سمجھنے کی کوشش کریں، اور انسان کی خدمت کے لئے اپنے دل میں زیادہ سے زیادہ گنجائش پیدا کریں اور عصبیت خواہ وہ کسی نوعیت کی ہو اس سے پرہیز کریں، مقصد یہ ہے کہ معاشرہ کے اندر اخلاقی حس بیدار ہو اور اخلاقیات کی حکمرانی زندگی کے ہر شعبہ پر قائم ہو، یہی در اصل حل ہے ان تمام مسائل ومشکلات کا جس سے آج کی انسانی سوسائٹی دوچار ہے اسی سے دلوں کے اندر جرائم سے نفرت پیدا ہو سکتی ہے اور کرپشن (CORRUPTION) جو تمام شعبہائے زندگی کے اندر پیدا ہو گیا ہے اس کی بیخ کنی ہو سکتی ہے۔

الحمد للہ حضرت مولاناؒ کی یہ تحریک قائم ہے اور مخلصین کے ہاتھوں اس کا کام جاری ہے اور مستقبل میں انشاء اللہ تعالیٰ یہ تحریک

دعوت و اصلاح کے میدان میں ایک عظیم کردار ادا کرے گی اور اس کی افادیت کا اندازہ صحیح طور پر کیا جا سکے گا۔

اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے بے چینی

رہا یہ کہ مفکر اسلام رحمۃ اللہ علیہ کتنے علمی ادبی اور دعوتی اداروں کے بانی اور روح رواں تھے تو اس کے بیان کے لئے ایک دفتر نہیں بلکہ بہت سی ضخیم جلدیں درکار ہوں گی، اور حضرت مولانا کے اعلیٰ فکری اور دعوتی مقام کو واضح کرنے کے گنجائش پیدا ہو سکے گی۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ ہمہ گیریت اور جامعیت، یہ بصیرت و فراست، اور حکمت و قابلیت، یہ روشن ضمیری اور رسوخ ایمانی اور علمی، یہ توفیق عمل اور دل سوزی، اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے بے چینی اور تڑپ، اور عام مقبولیت اور پذیرائی، محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جو کسی انسان کے بس کا کام نہیں ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

انسانیت

انسانیت کی ذات اس کائنات میں گوہر مقصود اور بیت الغزل کی حیثیت رکھتی ہے اور خلاق عالم کی نشانیوں میں سے سب سے بڑی نشانی ہے جسے اس نے بہترین صورت، مکمل سیرت اور عمدہ ترین ساخت عطا کی ہے۔

(حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

حضرت مولانا کی شہرہ آفاق کتاب
ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین
(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر)
کے
ناشرین اور ایڈیشن ایک نظر میں

نمبر شمار	ناشر کا نام	شہر	تعداد ایڈیشن	سنہ اشاعت
۱	لجنة التاليف والترجمة والنشر	القاهرة	ایک ایڈیشن	۱۹۵۰ء
۲	جماعة الازهر للتاليف والنشر	القاهرة	دوسرا ایڈیشن کل آٹھ ایڈیشن	۱۹۵۱ء ۱۹۵۱۔۱۹۵۸ء
۳	مكتبة دار العروبة	القاهرة	کل سات ایڈیشن	۱۹۵۹ء تا ۱۹۸۴ء
۴	مكتبة دار الكتاب العربي	القاهرة، بيروت	کل دس ایڈیشن	۱۹۵۱ء تا ۱۹۸۴ء
۵	دار القلم	الكويت	کل چودہ ایڈیشن	۱۹۷۳ء تا ۱۹۹۲ء
۶	دار المعارف	القاهرة	کل سات ایڈیشن	۱۹۶۹ء تا ۱۹۸۸ء
۷	مكتبة نزار المصطفى الباز	الرياض	ایک ایڈیشن	۱۹۹۷ء
۸	مطابع علي بن علي	الدوحة (قطر)	کل دس ایڈیشن	۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۴ء
۹	دار الجيل	بيروت	دو ایڈیشن	۱۹۹۰ء تا ۱۹۹۴ء
۱۰	مكتبة السنة للدار السلفية (پاکٹ سائز)	القاهرة	تین ایڈیشن	۱۹۹۰ء تا ۱۹۹۵ء
۱۱	مكتبة دار الإيمان	المنصورة (مصر)	ایک ایڈیشن	۱۹۹۵ء
۱۲	مجلس نشریات اسلام	کراچی	دو ایڈیشن	۱۹۸۵ء تا ۱۹۹۲ء
۱۳	مجلس تحقیقات و نشریات اسلام	لکھنؤ	ایک ایڈیشن	۱۹۹۴ء
۱۴	دار القلم (لصاحبها محمد علي دولة)	دمشق۔ جده	ایک ایڈیشن	۱۹۹۹ء
۱۵	دار ابن كثير	دمشق۔ بيروت	ایک ایڈیشن (کل ۱۶۹ ایڈیشن)	۱۹۹۹ء

اصل عربی زبان کے علاوہ مندرجہ ذیل زبانوں میں کتاب پڑھی جا رہی ہے۔ اردو: لکھنؤ، کراچی، ترکی: استنبول، فارسی: قم، (ایران) ملیشین: کوالالمپور و جاکرتا، بنگالی: ڈھاکہ، انگلش: لکھنؤ، فرنچ: پیرس، روسی: ماسکو
اردو میں دس، ترکی میں گیارہ اور ملیشین زبان میں آٹھ ایڈیشن نکلے ہیں۔

مدرسہ کا اصول:

خدا کا شکر ہے کہ ہوا کے رُخ پر چلنا مدرسہ کا اصول نہیں۔ اگر مدرسہ کا یہ اصول ہ
تو وہ کب کے انگریزی کے، عربی کے کالج بن چکے ہوتے، لیکن جو اس وقت
چند گنے چنے مدرسے باقی ہیں وہ اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ مدرسوں نے ہوا کے رُخ پر چلنے کو
قبول نہیں کیا۔

(حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رح)

سرمایۂ ملت کے پاسباں

مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ

۲۲ ر رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ مطابق ۳۱ ر دسمبر ۱۹۹۹ء بروز جمعہ عین نماز جمعہ کے وقت، روزہ کی حالت میں اور سورۂ یٰسین کی تلاوت کرتے ہوئے، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے صدرنشین، رابطہ عالم اسلامی کے تاسیسی رکن، مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کے رکن، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کے صدر، مجلس انتظامی ومجلس عاملہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے سربراہ، عربی اکیڈمی دمشق کے رکن، مجلس شوریٰ مدینہ یونیورسٹی کے رکن، مجلس عاملہ مؤتمر عالمی اسلامی بیروت کے رکن، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر، رابطہ الادب الاسلامی العالمیہ کے صدر، مجلس انتظامی اسلامک سینٹر جنیوا کے رکن، اور وزیٹنگ پروفیسر مدینہ یونیورسٹی، آکسفورڈ سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز، آکسفورڈ یونیورسٹی کے صدر، عربی اردو میں بیسیوں کتابوں کے مصنف، عربیت کے امام، عالم اسلام کی عظیم علمی وروحانی شخصیت اور عظیم مفکر واسکالر، اقلیم علم کے تاجدار اور سرمایۂ ملت کے پاسبان حضرت اقدس مولانا سید ابوالحسن علی ندوی قدس سرہ رحلت فرماگئے اور عازم آخرت ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان للہ ما اخذ ولہ ما اعطی وکل عندہ باجل مسمی۔

راقم الحروف نے کئی سال قبل "میرے حضرت کی چند حسین یادیں" کے عنوان سے ماہنامہ "اقرأ ڈائجسٹ" کے لئے لکھا تھا:

"حق تعالیٰ شانہ کے جو بے پایاں انعامات واحسانات اس ناکارہ کے شامل حال ہیں ان میں سے ایک عظیم انعام یہ ہے کہ اپنے مقبول ومحبوب بندوں کی محبت قلب میں ودیعت فرمائی اور ان سے ربط وتعلق نصیب فرمایا فالحمد للہ ولہ الشکر۔ ہمارے حضرت عارف باللہ ڈاکٹر عبدالحی عارفی نور اللہ مرقدہ یہ شعر کثرت سے پڑھا کرتے تھے:

گرچہ از نیکاں نیم لیکن بہ نیکاں بستہ ام
در ریاض آفرینش رشتۂ گلدستہ ام

چار بزرگوں کے ساتھ اس ناکارہ کو بچپن ہی سے عشق کی حد تک عقیدت ومحبت تھی:

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ، حضرت امام التبلیغ مولانا محمد یوسف الدہلوی نور اللہ مرقدہ، حضرت مولانا سید یوسف بنوری نور اللہ مرقدہ اور حضرت سلطان القلم مولانا مناظر احسن گیلانی نور اللہ مرقدہ"

(شخصیات وتأثرات ص ۱۳۲، ۱۳۳)

مگر ہوش سنبھالنے کے بعد ان اکابر کے علاوہ پانچویں بزرگ، جن کے کمالات، علوم ومعارف فضل واحسان، ورع وتقویٰ، دعوت وعزیمت، حق گوئی وبے باکی، ملت اسلامیہ کی سربلندی کے لئے گھلنے اور پگھلنے سے بہت زیادہ متأثر ہوا، جن کی خدمات پر بے حد رشک آیا اور جن سے غائبانہ عقیدت، محبت میں بدل گئی وہ

حضرت اقدس مولانا سید ابوالحسن علی ندوی قدس سرہ کی جامع صفات اور ہمہ گیر شخصیت تھی۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی المعروف بہ علی میاں قدس سرہ کے کس کس گوشۂ حیات اور کمالات زندگی کو احاطۂ تحریر میں لایا جائے؟ اسے کس طرح شروع کیا جائے؟ اور کہاں سے شروع کیا جائے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا، زبان وقلم اور الفاظ وحروف ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ حضرت مرحوم کی وفات کا سانحہ جہاں ہند وپاک کے مسلمانوں کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ وہاں عرب وعجم اور شرق وغرب اور دنیائے اسلام کے مسلمان، اس صدمے سے دوچار ہیں، حضرت مولانا علی میاں کی وفات سے ایک طرف اگر ان کے پسماندگان اور متعلقین غم زدہ ہیں، تو دوسری طرف ان کی وفات سے حجاز مقدس اور حرمین کے اکابر علماء اور ارباب اقتدار بھی اس صدمۂ جانکاہ کو سہارنے کی ہمت نہیں پاتے، چنانچہ شیخ محمد بن عبداللہ السبیل صدر شئون حرمین شریفین اور مسجد حرام کے خطیب وامام، اس سانحہ پر اپنے تعزیتی مکتوب میں لکھتے ہیں:

"محترم علماء کرام، گرامی قدر ذمہ داران ندوۃ العلماء اور ملت اسلامیہ ہند!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

شدید قلبی رنج واندوہ اور غم کے ساتھ عالم جلیل اور داعی عظیم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی وفات کی خبر ملی، اللہ تعالیٰ اس عظیم صدمہ کو جھیلنے کی سکت آپ اور ہم سب کو عطا فرمائے اور آپ تمام پسماندگان کو بیش از بیش اجر سے نوازے اور اس خسارے کی تلافی فرمائے، ہم آپ سے تعزیت کرتے وقت خود بھی تعزیت کے مستحق ہیں، بلکہ ساری

امت اسلامیہ سے تعزیت کی جانی چاہئے۔

حضرت مولانا کا سانحۂ وفات ایک زبردست حادثہ ہے اور شدید آزمائش ہے جس سے تمام مسلمانان عالم اس وقت دوچار ہیں۔ اس لئے کہ مولانا مرحوم نے دعوت الی اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے اپنی زبان وقلم اور جسم وجان کو وقف کر دیا تھا اور اس میدان میں ان کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں آپ کو اور تمام برادران اسلام کو اس صدمہ جانکاہ کو سہارنے کی طاقت عطا کرے اور عالم اسلام کی اس محرومی کی تلافی فرمائے۔

ہم اس موقع پر آپ کو یہ اطلاع بھی دینا چاہیں گے کہ خادم الحرمین الشریفین فہد بن عبد العزیز فرماں روائے مملکت سعودی عرب نے حرم کی و مدنی دونوں جگہ ۲۶ر رمضان ۱۴۲۰ھ بروز دوشنبہ بعد نماز عشاء (یعنی ستائیسویں شب) حضرت مرحوم کے لئے غائبانہ نماز جنازہ ادا کرنے کا حکم صادر فرمایا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ علامہ مرحوم کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے اور انہیں اپنے نیکوکار بندوں میں شامل فرمائے اور انہیں ابرار واتقیاء، شہداء وصالحین کے ساتھ اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

آپ کا بھائی
محمد بن عبد اللہ السبیل
صدر امور حرمین شریفین۔
امام وخطیب مسجد حرام، مکہ مکرمہ

(پندرہ روزہ تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ر رمضان تا ۳۰ر شوال ۱۴۲۰ھ)

حضرت مولانا علی میاں قدس سرہٗ تکیہ کلاں رائے بریلی انڈیا میں مشہور علمی شخصیت حضرت مولانا عبد الحی، صاحب نزہۃ الخواطر کے گھر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گھر رائے بریلی میں اپنے والد ماجد اور بڑے بھائی جناب ڈاکٹر سید عبد العلی سابق ناظم ندوۃ العلماء سے حاصل کی۔ اس کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دار العلوم دیوبند سے تکمیل ہوئی۔ قرآن کریم کی تفسیر امام الاولیاء حضرت مولانا احمد علی لاہوری قدس سرہ سے پڑھی، حضرت لاہوریؒ سے ہی بیعت ہو کر مجاز بیعت قرار دیئے گئے، بعد میں آپ نے قطب الاقطاب حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوری قدس سرہ سے اصلاحی تعلق قائم فرمایا اور ان سے بھی خلافت واجازت کی خلعت سے سرفراز ہوئے۔

علوم عالیہ وآلیہ کی تکمیل کے ساتھ آپ نے فن ادب عربی میں رسوخ حاصل کیا، برصغیر اور عالم اسلام کی ممتاز شخصیت جناب پروفیسر خلیل عرب سے آپ نے عربی پڑھی، اور اس میں اتنا کمال حاصل کیا کہ دنیائے عرب آپ کی فصاحت وبلاغت کا لوہا مانتی تھی۔ آپ کی تصانیف برصغیر پاک وہند سے زیادہ بلاد عرب میں محبوب ومقبول تھیں۔ بقول ایک عرب دانشور کے کہ،

"اگر اس دور میں جاہلی شعراء اور اہل لغت عربی ہوتے تو وہ آپ کو سجدہ کرتے"۔

آپ عوام وخواص اور عرب وعجم کے امام اور محبوب تھے۔ آپ کی خدمات جلیلہ کے عوض سعودی عرب کی جانب سے آپ کو شاہ فیصل ایوارڈ دیا گیا، برونائی کے بادشاہ نے عالم اسلام کی عظیم شخصیت اور خدمات عالیہ کے عوض آپ کو اپنے ملک کا سب سے بڑا ایوارڈ دیا، اسی طرح دبئی حکومت کی طرف سے بھی سب سے بڑے ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا، مگر ایوارڈوں سے حاصل ہونے والی لاکھوں ڈالر کی رقم حضرت مرحوم نے مجاہدین افغانستان اور دینی مدارس کو عطیہ کر دی۔

لیکن جہاں تک حضرت مرحوم کی ذات، ان کی اولو العزمی اور مرتبہ ومقام کا تعلق ہے، وہ دنیا کے بڑے سے بڑے انعام اور ایوارڈ سے بالاتر تھے۔ جن دنوں سعودی حکومت نے حضرت اقدس کو ان کی خدمات کے اعتراف میں شاہ فیصل ایوارڈ دیا تھا، انہیں دنوں راقم الحروف نے ماہنامہ "بینات" میں حضرت کی شخصیت سے متعلق جن تأثرات کا اظہار کیا تھا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے یہاں نقل کر دیا جائے:

"سعودی حکومت کی جانب سے امسال "شاہ فیصل ایوارڈ" عالم اسلام کے مایہ ناز مفکر حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مد ظلہ العالی کو دیا گیا۔ سعودی حکومت کی طرف سے معارف پروری کا یہ اظہار لائق تحسین ہے اور اسلامی حکومتوں کے لئے لائق تقلید بھی۔ جہاں تک مولانا کی ذات گرامی کا تعلق ہے ان کی شخصیت دنیا کے کسی بڑے سے بڑے انعام سے بالاتر ہے۔ وہ اس قافلہ کے نمائندہ ہیں جو "إنْ أَجْرِيَ إلَّا عَلَى اللّٰہ" کے فلسفے پر یقین رکھتا ہے اور جس کے نزدیک پوری دنیا مچھر کے پر کے برابر بھی قیمت نہیں رکھتی۔ اس لئے ہمارے نزدیک "شاہ فیصل ایوارڈ" سے حضرت کی عزت ووقار میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ بلکہ یہ اس ایوارڈ کے لئے باعث صد ناز ہے کہ مولانا نے اسے قبول فرمالیا۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے حضرت مولانا کو محض اپنی عنایت ومحبت سے جن فطری خصائص وکمالات، جن ملکات حمیدہ

اور جذبات صالحہ، جس سوز و گداز اور درد دل، جس قلب صافی اور نفس مطمئنہ سے نوازا ہے اور ان کے سینۂ بے کینہ میں اسلام اور عالم اسلام کی سربلندی اور اصلاح امت کے لئے گھلنے اور پگھلنے کی جو دولت ودیعت فرمائی ہے اور پھر ان کی زبان و قلم سے اسلام کی پیغام رسانی کا جو کام لیا ہے اس کا اصل صلہ، اور بے حد و بے پایاں صلہ ان کو خدا تعالیٰ کے سوا کون دے سکتا ہے؟ اور وہ آخرت کے سوا کہاں مل سکتا ہے؟ تاہم "ثم یوضع لہ القبول فی الارض" کے مطابق دنیا میں جو مقبولیت و محبوبیت انھیں اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے وہ اسی موہبت کا ایک ثمرہ ہے۔ حضرت مولانا نے مشرق و مغرب اور عرب و عجم میں مسلسل اسلام کی دعوت کا صور پھونکا ہے اور وہ پوری انسانیت کو اسلام کے خوان پر جمع ہونے کی دعوت دے رہے ہیں۔ وہ ہیں کبھی امریکہ و لندن پہونچ کر "مغرب سے صاف صاف باتیں" کرتے نظر آتے ہیں۔ کبھی قاہرہ میں "اسمعی یا مصر" کی اذان دیتے ہیں۔ اور کبھی اسمعوھا منی صریحۃ ایہا العرب" کے ذریعہ معدن اسلام (عرب) کے نمائندوں کے مقتداؤں کو بیدار کرتے ہیں کبھی انھیں "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" کی کہانی سناتے ہیں۔ کبھی انھیں "جس کا ایک رخ وجد آفریں ہے تو دوسرا خون افشاں"۔ کبھی ان کے سامنے "تاریخ دعوت و عزیمت" کھول کر رکھتے ہیں۔ کبھی انھیں "اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" کے ہولناک پہلوؤں سے آگاہ کرتے ہیں۔ کبھی انھیں آج کے نظریاتی قافلوں سے ہٹ کر "کاروان مدینہ" میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ الغرض مولانا کی دعوت شرق و غرب، عرب و عجم اور افریقہ و ایشیا کی حد بندیوں سے بالاتر ہے، وہ پوری انسانیت کو، سسکتی بلکتی انسانیت کو، مادی زخموں سے چور چور انسانیت کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے وابستگی کی دعوت دیتے ہیں۔ سعودی حکومت اور دیگر اسلامی ممالک کی طرف سے مولانا موصوف کی دینی خدمات کی قدر دانی کا صحیح طریقہ یہ ہے وہ اس دعوت کو اپنائیں جو مولانا مدظلہ کی طرف سے مسلسل پیش کی جا رہی ہے، اور جس کے لئے ان کی پوری زندگی وقف ہے۔"

(شخصیات و تاثرات ص ۴۴۱، ۴۴۲)

حضرت مولانا علی میاں قدس سرہٗ کا اس ہیچمدان کے ساتھ نہایت مشفقانہ تعلق تھا، وہ اپنے چھوٹوں کے ساتھ ان کی حیثیت سے بڑھ کر اعزاز و اکرام کا معاملہ فرماتے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی حیات پر آپ کی عربی تصنیف "المرتضیٰ" شائع ہوئی، اپنے دستخطوں کے ساتھ جناب مولانا قاری سید رشید الحسن صاحب زیدمجدہم کی وساطت سے ناکارہ کو بھجوائی اور فرمائش کی کہ اس پر بینات میں تبصرہ کیا جائے۔ راقم الحروف نے اس کو اول سے آخر تک مطالعہ کیا اور حضرت اقدس کو عریضہ لکھا کہ: اس کی تعریف میں کچھ کہنا "مادح خورشید مداح خود است" کا مصداق ہوگا، ماشاء اللہ کتاب میں بہت ہی اہم معلومات جمع ہوگئی ہیں اور نہایت الجھے ہوئے مضامین کو بہت ہی عمدہ اور سلجھے ہوئے انداز میں پیش فرمانا آنجناب ہی کے لائق تھا!

اس کے علاوہ غالباً طالب علمانہ اشکالات بھی پیش کئے، اس پر حضرت مرحوم نے اس ناکارہ کی جس طرح حوصلہ افزائی فرمائی، وہ میری سوچ و فکر سے کہیں زیادہ اونچی تھی، چنانچہ حضرت مرحوم نے اس خط کی رسید بھیجتے ہوئے لکھا:

"رائے بریلی

فاضل گرامی و محب سامی جناب مولانا محمد یوسف صاحب زیدت معالیکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ! گرامی نامہ مورخہ ۱۲ر جمادی الآخر کو، مجھے ایک طویل سفر کی وجہ سے تاخیر سے ملا، پڑھ کر بڑی مسرت ہوئی، یہ کتاب کی پہلی رسید ہی نہیں سند بھی ہے، میں آپ کی پسندیدگی کو قبولیت کی ایک علامت سمجھتا ہوں، دوسرا ایڈیشن پریس جا رہا ہے اس میں اہم تصحیحات اور بعض ترمیمات کر دی گئی ہیں جن سے توازن و اعتدال میں اضافہ ہوگیا ہے، ان شاء اللہ طباعت کے بعد کتاب ارسال خدمت کی جائے گی۔ بینات میں تعارف کا اشتیاق رہے گا۔ ڈاکٹر زاہد علی صاحب کی کتاب "ہمارا اسماعیلی مذہب اور اس کا طریقہ کار" (ناقل) شائع کر کے آپ نے ایک اہم خدمت انجام دی ہے کتاب پہونچ گئی۔ میں نے "تاریخ دعوت و عزیمت" کے پہلے حصہ میں اس سے مدد لی تھی، اور اس کے اقتباسات پیش کئے تھے۔ کارڈ لکھنے کی معافی چاہتا ہوں اس لئے کہ اس کے جلد پہونچنے کی امید ہوتی ہے۔ والسلام

مخلص

ابوالحسن علی

۲۲ر فروری ۱۹۸۹ء"

حضرت کی وفات سے امت ایک عظیم رہبر

(باقی صفحہ ۱۴۰ پر)

ربّانی امت

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نوّر اللہ مرقدہٗ

تحریر: علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی ——— ترجمہ: مطیع الرحمن عوف ندوی

علمائے اسلام میں بڑی عظیم ہستیوں نے امسال داغ مفارقت دیا، اور رمضان المبارک کے اخیر عشرہ اور سب سے افضل دن جمعہ کے روز شمسی تاریخ کے آخری مہینہ میں جب کہ اکثر لوگوں کے نزدیک دوسرا ہزارہ ختم ہو رہا تھا، باوضو، نماز جمعہ سے قبل اسی کی تیاری و انتظار میں اور حسب معمول سورۂ کہف کی تلاوت کرتے ہوئے عالم اسلام کی عظیم شخصیت، داعی الی اللہ و ربانی امت، علامہ دوراں، عربی النسل، حسنی النسب، ہندی نژاد، شیخ الامت داعی الی الخیر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نور اللہ مرقدہ نے بھی اس جہان فانی کو الوداع کہا، ان کی شخصیت محتاج تعارف نہیں اور نہ ہی ان چند صفحات پر ان کی زندگی کے کارناموں اور نقوش کو شمار کیا جا سکتا ہے۔

مشیت خداوندی سے بڑے بڑے اہل علم و فضل اور اصحاب افتاء اس سال ہم سے رخصت ہو گئے جن میں علامۃ الجزیرہ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز، ادیب و دانشور شیخ علی طنطاوی، عظیم فقیہ علامہ مصطفےٰ الزرقاء، اور محدث کبیر علامہ محمد ناصر الدین البانی جیسے اہم علماء یکے بعد دیگرے جدا ہوتے گئے پھر اس کاروان علم و فضل اور اس سنہری کڑی کا خاتمہ امام جلیل شیخ ابوالحسن علی ندوی پر ہوا۔

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

میں نے ان شخصیات کی خصوصیات اور ان کے شاندار نقوش کو امت تک پہونچانے کی کوشش کی، قطر کے ٹیلی ویژن پر واگراموں انٹر نیٹ اور دیگر مواصلاتی ذرائع اخبارات و رسائل کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے یہ فرض ادا کیا، یہ ہم پر ان کا حق تھا، اور نوجوان نسل کے لئے ضروری بھی تھا کہ وہ ان اکابر کی قدر و منزلت کو پہچانیں، اور انھوں نے اپنے دین و وطن کے لئے زندگی بھر جو قربانیاں پیش کی ہیں ان سے واقف ہو سکیں۔

اس کے پیش نظر ہم نے شیخ ندوی کی زندگی کے بارے میں جو کچھ اس سے قبل لکھا ہے ہم چند اقتباسات کے ساتھ اس موقع پر کچھ کہنا چاہیں گے۔

ہم اس امام ربانی، اسلامی، قرآنی اور محمدی شخصیت کے بارے میں اپنا درد دل کیوں نہ سنائیں، جبکہ وہ میرے بھائی، شیخ اور محبوب تھے۔

میں نے انھیں ربانی کہا، کیونکہ سلف کا اس پر اتفاق ہے کہ جو صاحب علم ہو، باعمل ہو، اسی کے ساتھ وہ لوگوں کو تعلیم بھی دیتا ہو تو وہ ربانی ہے۔ اور جو علم رکھتا ہے لیکن اس پر عمل نہیں کرتا وہ ربانی نہیں ہے، وہ علم بے مصرف و بے فائدہ ہے، جس سے حضورؐ نے پناہ مانگی ہے، اور فرمایا "اللھم انی اعوذ بك من علم لا ینفع و من قلب لا یخشع"۔ اور جس نے علم کے ساتھ ساتھ اس پر عمل تو کیا لیکن دوسرے کو اس کی تعلیم نہیں دی، اور اس کی جانب لوگوں کو بلایا نہیں، وہ بھی ربانی ہونے کا مستحق نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، (وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبَّانِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ) اور جس نے اپنے علم پر عمل بھی کیا اور اس کی جانب دوسروں کی رہنمائی بھی کی، درحقیقت وہی ربانی ہے (وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ)۔

ربانیہ کا لفظ شیخ ابوالحسن نے تزکیہ و تصوف کی تعبیر و ادائیگی کے لئے استعمال کیا ہے۔ قرآن نے جسے تزکیہ کہا ہے، اور اس کو حضورؐ کے مشن اور احسان کا اہم شعبہ قرار دیا ہے جسے حضورؐ نے اس طرح بیان کیا ہے" ان تعبد اللہ کانك تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراك" انھوں نے اپنی قیمتی کتاب "ربانیۃ لا رہبانیۃ" (اس کتاب کا اردو ترجمہ "تزکیہ و احسان" کے نام سے شائع ہوا ہے) میں اس لفظ کا استعمال کیا ہے جس سے انھوں نے خالصۃً لوجہ اللہ تصوف و سلوک مراد لیا ہے، جو تمام بدعات و خرافات اور عقائد و سلوک کے غلو سے پاک ہو۔

اس طرح انھیں "اسلامی" کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام ہی ان کا گوشت پوست تھا، اور وہی ان کا اوڑھنا بچھونا، وہی اول و اعلیٰ اور مبتدا و منتہا تھا، اسی کے لئے وہ جیتے تھے اور اسی کے لئے مرنے کا حوصلہ رکھتے تھے، اور خدا ہی سے مدد چاہتے تھے اور اسی سے لو لگاتے تھے، غصہ بھی اس کے لئے ہوتے اور محبت بھی اس کی خاطر کرتے تھے تصنیف و تالیف کا کام بھی اسی دین کے غلبہ کے لئے کرتے تھے اور درس و محاضرہ کا مشغلہ بھی اسی کی خاطر اپناتے تھے، قیام و سفر کی

صعوبت جھیلتے تھے، اور اسی کے لئے صلہ رحمی سے وقطع تعلق کرتے تھے، یہی ان کا رات دن کا مشغلہ اور زاد سفر تھا۔ سچ یہ ہے کہ وہ اسلام ہی کے لئے جیتے تھے، اسی کے لئے تڑپتے اور مرتے تھے، اور اسلام ہی ان کی رگ وپے میں سرایت کئے ہوئے تھا۔

جو چیز ان کے ذہن ودماغ میں سمائی رہتی تھی اور جس سے انھیں عشق تھا وہ اسلام ہی تھا، اس کا پیغام، اس کی تہذیب، اس کا عروج وبیداری، امت مسلمہ کے مسائل، معاندین اسلام کے حملے، یہی سب ان کی فکریں تھیں، اور ان سب سے زیادہ اہتمام تھا خارجی حملوں کے پیش نظر داخلی محاذ کی تقویت کا، یعنی فرد کی تربیت، اس لئے کہ یہ معاشرے کے اندر اس کی حیثیت بنیادی اینٹ کی ہے، یعنی نفس کی اصلاح وتربیت، اور اپنے اندر تغیر وتبدیلی، کیونکہ اسی سے قوموں کا عروج وزوال وابستہ ہے۔ إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ۔

میں نے مرد قرآنی اس لئے کہا کیونکہ قرآن مجید ہی ان کا اصل سرچشمہ تھا، اسی سے وہ مدد لیتے اور اسی کے عشق میں ڈوبے ہوئے تھے اس کی تلاوت کرتے، اور لطف اندوز ہوتے تھے، اس کی آغوش میں پناہ لیتے اور چلتے تھے، آیات کی تلاوت اور ان پر غور وفکر کرتے، اور اس کے لعل وجواہر ڈھونڈتے تھے، اس کے باریک معانی اور مفاہیم کو وہ اپنے محاضرات، کتابوں اور رسالوں میں ایک متفکرانہ ومدبرانہ فہم، اور ایک بے چین ومتاثر دل کے ساتھ پیش کیا کرتے تھے، جس نے بھی ان کے محاضرات سنے یا کتابیں پڑھیں اس نے اس کا بارہا مشاہدہ کیا ہوگا اس طرح وہ صحیح معنوں میں ایک مرد قرآنی تھے۔

ان کے محمدی کہنے سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل اور ہاشمی حسنی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، نہ جانے کتنے حسنی وحسینی ہیں جن کے کردار ان کے نسب کو مشتبہ کرتے ہیں، ومن بطأ به عمله لم يسرع به نسبه۔ جس کا عمل کوتاہ ہو نسب اس کو اڑ نہیں لگا سکتا میرا مطلب صاف صاف یہ ہے کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے تمام طور وطریق، سلوک زندگی، اور طرز حیات میں اسوہ اور نمونہ بنایا تھا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہی کو اپنے لئے چراغ راہ اور روشنی کا مینار بنایا تھا، خواہ وہ زہد وتقویٰ، عبادت وریاضت ہو یا زندگی کے جھمیلوں اور اس کی زیب وآسائش سے کنارہ کشی کا معاملہ، وہ اس دور میں بھی سلف کی زندگی گذارتے تھے، اور آج کل جس طرح لوگ مال ومتاع، عیش وعشرت، اور زینت وآسائش کے دلدادہ ہوتے ہیں اس کا اہتمام کرتے ہیں وہ اس سے کوسوں دور تھے، انھیں دیکھ کر سلمان فارسیؓ اور ابو درداءؓ کا گمان گذرتا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ان کی گفتگو محض ایک محقق اور اسکالر کی گفتگو نہیں ہوتی تھی بلکہ ایک عاشق زار اور محب صادق کے دل سے نکلی ہوئی صدا ہوتی تھی، وہ محمد بن عبد اللہ کی نادر ومتاز شخصیت سے عشق کرتے تھے، اس کی جھلک ان کی کتاب "السیرۃ النبویۃ" ہی نہیں بلکہ تمام کتابوں، محاضروں، اور گفتگو میں نمایاں طور پر ملتی ہے، اور یہ عشق ومحبت اور وارفتگی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم زندگی سے بھی واقفیت اور ان کی سیرت کے جذب کرنے کی وجہ سے تھی، اور وہ ان کمالات وفضائل سے پورا فائدہ اٹھاتے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں جمع کر دیا ہے۔

علامہ کا پڑھا لکھا ہر معتقد اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ وہ ایک عالمگیر شخصیت کے مالک تھے اگرچہ وہ ہندنژاد تھے اور ان کی پرورش وپرداخت یہیں ہوئی تھی لیکن وہ بین الاقوامی نقطۂ نظر کے حامل اور آفاقی مقاصد کے علمبردار تھے، وہ عالمی تحریکوں اور سرگرمیوں سے وابستہ تھے اگرچہ وہ خاص طور سے ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل ومشکلات میں شریک ہوتے اور اس کا غایت درجہ اہتمام کرتے تھے جیسا کہ عائلی قوانین کے سلسلے میں حکومت ہند کی جانب سے یکساں سول کوڈ کے نفاذ پر ان کا سخت ردعمل سامنے آیا لیکن ان کی یہ سرگرمیاں صرف برصغیر تک محدود نہیں تھیں بلکہ وہ سارے جہاں میں پھیلی ہوئی تھیں اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ عالم عربی میں شیخ کی شہرت ہندوستان سے کم نہ تھی، ہم ان کو اکثر اکیڈمیوں اور اداروں میں بحیثیت رکن شریک پاتے ہیں، جیسا کہ وہ رابطۂ عالم اسلامی کے رکن اساسی اور "المجلس العالمی الأعلی للمساجد"، مجلس المجمع الفقہی، المجمع الملکی لبحوث الحضارۃ الاسلامیۃ (اردن)، المجمع العلمی (دمشق) کے ممبر تھے، انھوں نے ہی آکسفورڈ یونیورسٹی میں اسلامک سینٹر کے قیام کے لئے تگ ودو کی تاکہ یہ سینٹر خالص مغربی یونیورسٹی میں اسلامی فکر کی اشاعت کا مرکز بنے، قیام سے لے کر آخر تک وہ اس کے چیرمین رہے، اسی طرح انھوں نے اسلامی ادباء کے لئے ایک عالمی منبر کی حیثیت سے رابطۃ الادب الاسلامی کے قیام میں پیش قدمی کی اور اس کے بھی وہ تاحین حیات صدر رہے۔

جس نے شیخ کے محاضرات کو سنا اور

ان کے رسائل کو پڑھا ہے اور ان کے مخاطبین سے واقف ہے اس کے لئے ان کے عالمگیر ہونے کی تشریح کی ضرورت نہیں ان کے ان محاضرات میں "عربوں سے کچھ باتیں"، "مغرب سے صاف صاف باتیں" اور اسی طرح ان کی "اسمعیات" ہیں جنہیں محاضرات و رسائل کی شکل میں شیخ نے ایک مشفق داعی اور رہنما کی حیثیت سے بعض ملکوں میں پیش کیا خلاً "اسمعی یا مصر اسمعی یا زہرۃ الصحراء (کویت) اسمعی یا ایران وغیرہ وغیرہ۔

میں نے انھیں بھائی اس لئے کہا کیوں کہ ہم دونوں کو اسلام کی اخوت ایک دوسرے سے مربوط کئے ہوئے ہے، جو ابنائے اسلام میں چھوٹے بڑے کو آپس میں مربوط کرتی ہے (انما المؤمنون اخوۃ) "المسلم أخ المسلم" اور "اخوۃ العلم" علم اور اہل علم کے درمیان ایک رشتہ ہے اسی طرح اخوۃ الدعوۃ ہے یعنی کار دعوت داعیوں کے درمیان رابطہ کی ایک چیز ہے، خواہ باہم جغرافیائی اعتبار سے ان میں کتنی ہی مسافت ہو، اسی طرح اُخوۃ المحنۃ ہے، یعنی امت کی آزمائش میں برادرانہ شرکت جس میں غفلت، علماء کے درمیان اختلافات اور دشمن کے حملوں کی تاب نہ رکھنا، حکمرانوں کا بگاڑ، عوام کی غفلت وغیرہ۔

میں نے ان سے بعض کتابیں پڑھی ہیں اور فائدہ اٹھایا ہے اور اپنی اکثر کتابوں میں ان کے حوالے دیئے ہیں اس طرح وہ میرے استاذ اور شیخ بھی ہوتے ہیں، ان کی ہر کتاب کا ایک الگ لطف ہے ان کی ایک متعین فکر ہے جو ہر جگہ نظر آتی ہے، معاصر داعیوں اور مفکروں میں کوئی نہیں نظر آتا جس نے شیخ کی کتابوں سے استفادہ نہ کیا ہو اور ان سے اقتباسات نہ لئے ہوں جیسے شہید محمد قطب داعی اسلام شیخ محمد الغزالی، اسلامی ادیب و انشا پرداز شیخ علی طنطاوی وغیرہ۔

شیخ نے جب ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۹۵۱ء میں مصر کا سفر کیا تو میں نے ان سے باقاعدہ استفادہ کیا اور ان کی شاگردی اختیار کی، اسی طرح بعد کی ملاقاتوں میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا، سچ یہ ہے کہ شیخ اپنے حرکت و عمل، سکون و خاموشی اور گفتگو و مذاکرہ میں ایک آئیڈیل اور نمونہ کے انسان تھے۔

مجھے یاد ہے کہ جب انھوں نے تیس سال قبل قطر کا سفر کیا اور وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے پریشان تھے، ان کے بعض دوستوں نے اہم شیوخ اور تاجروں سے ملاقات کی رائے دی کہ ہم ان سے ملیں، ان کے سامنے دارالعلوم کے مسائل رکھیں اور ان سے تعاون طلب کریں، تو انھوں نے فرمایا کہ ہم ہرگز ایسا نہیں کر سکتے، ہم نے پوچھا کیوں؟ تو انھوں نے فرمایا کہ یہ لوگ مریض ہیں ان کا مرض دنیا کی محبت ہے اور ہم ان کے معالج ہیں، آخر طبیب اپنے مریض کے آگے ہاتھ پھیلا کر کیسے ان کا علاج کر سکتا ہے، کیا وہ ان سے دنیا کی کوئی چیز مانگ کر ان کا علاج کرے گا۔ ہم نے ان سے کہا کہ آپ اپنے لئے تھوڑی مانگ رہے ہیں بلکہ آپ تو دارالعلوم اور اس کے اساتذہ و طلبہ کے لئے تعاون کے خواہاں ہیں، تاکہ وہ ادارہ اسی طرح علم کی روشنی پھیلانے میں گامزن رہے، اس پر انھوں نے فرمایا کہ یہ لوگ اس کا فرق نہیں کرتے، اور وہ ہمیشہ آپ ہی کو طالب اور دست سوال دراز کرنے والا سمجھتے رہیں گے۔

ایک بار ہم نے رمضان میں ان سے کہا کہ آپ آخری عشرہ تک ہمارے پاس ٹھہر لیجئے ہم آپ کے ساتھ تعاون کا کام انجام دیں گے تو انھوں نے کہا کہ آخری عشرہ میں ہمارا ایک خاص معمول ہے جس کو ہم کسی بھی طرح سے چھوڑنا پسند نہیں کرتے، ہم اس موقع کو اپنے اور اپنے خدا کے لئے فارغ کر لیتے ہیں۔

اس سے ہمیں بخوبی معلوم ہو گیا کہ شیخ کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک خاص معاملہ ہے جس سے ان کو کوئی بھی سرگرمی باز نہیں رکھ سکتی، چنانچہ ہم نے اپنے اس ارادہ کو ترک کر دیا، ہم نے اس میں ان کی تقلید کی کوشش کی لیکن ناکام رہے، ہر چیز اسی کے لئے آسان ہوتی ہے جس کے لئے وہ بنائی گئی ہو۔

میں نے انھیں اپنا محبوب کہا، حقیقۃً مجھے ان سے محبت ہے اور امید ہے کہ یہ محبت خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہوگی میں نے ان سے ان کے اخلاص وللّٰہیت، یقین و توکل، کرب اور بیکلی، غیرت و حمیت، اعتدال و تواضع، اور ان کی فکر کی پاکیزگی، حسد اور کینہ سے دل کی صفائی، شرک و بت پرستی، بدعات و خرافات سے عقائد و عبادات کی سلامتی کی وجہ سے محبت کی، ان کی زبان طعن و تشنیع اور مداہنت سے پاک صاف تھی میں نے اہم مسائل میں ان کی مشغولیت، حقیقت پسندی، اثبات و تعمیر اور معیار و سطح کی بلندی و گہرائی کی وجہ سے ان سے محبت کی، میں نے ان سے ان کے پاکیزہ اخلاق، نرم روی، ان کی زندگی کے طور و طریق، مزاج کی شگفتگی و نرمی کی وجہ سے محبت کی۔ اور میں ان کی محبت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی قربت کا امیدوار ہوں اور مجھے توقع ہے کہ میرا حشر ان ہی کے ساتھ ہوگا۔ (مع الذین أنعم اللہ علیھم من النبیین الی آخر الآیۃ)۔

بالکل ایسے ہی جیسے کسی شاعر نے کہا ہے!

أحب الصالحین ولست منھم
عسا نی ان انال بھم شفاعۃ

واذكره من بضاعته المعاصي
وان كنا سواء في البضاعة

میں کوئی تنہا ہی شیخ کا عاشق نہیں ہوں بلکہ جو بھی ان سے واقف ہے اور ان کو قریب سے دیکھا یا پڑھا ہے اس نے ان سے محبت کی پھر اس کی قربت جس قدر بڑھتی گئی، محبت بھی بڑھتی گئی۔

علماء کے سلسلہ میں بہت سے لوگ اختلافات رکھتے ہیں لیکن شیخ ابوالحسن پر سب کا اتفاق ہے چاہے وہ ان کے ہم مشرب وہم مسلک ہوں یا نہ ہوں، ان کی جامعیت میں سب ایک ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو جو خصوصیات وامتیازات عطا فرمائے ہیں بہت کم کسی میں ملیں گے (والله يختص برحمته من يشاء والله ذوالفضل العظيم)۔

میں شیخ ابوالحسن کو چالیس سال سے جانتا ہوں جب انھوں نے ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۹۵۱ء میں اپنے مختلف ممالک کے سفر میں پہلی بار مصر کا سفر کیا اس وقت میں کلیۃ اصول الدین میں طالب علم تھا اور تحریک اخوان المسلمین کا سرگرم کارکن، اور جامع ازہر کے اخوانی طلبہ کا ذمہ دار بھی، اس وقت میں المحلۃ الکبریٰ کی ایک مسجد میں خطیب بھی تھا۔

اد میں استاذ محترم احمد امین کی سربراہی میں قائم ادارہ لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر سے شائع شدہ کتاب ماذا خسر العالم.... کو پڑھ چکا تھا مجھ کو کتاب بہت پسند آئی میں نے اپنے بعض دوستوں سے اسے پڑھنے کے لئے بھی کہا جب کہ میں مصنف کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا اس کتاب پر استاد احمد امین کا مقدمہ تھا لیکن وہ پھیکا تھا درحقیقت انھوں نے اس کا حق نہیں ادا کیا۔

لیکن یہ کتاب اسلامی نقطۂ نگاہ سے تاریخ اسلامی اور عالمی تاریخ کی نئی نئی راہیں کھولنے والی تھی، اور اس کتاب میں ایک مصلح ومجدد، داعی ومؤرخ کی دور اندیشی اور باریک بینی کارفرما تھی، جو تاریخ پر خاصی دسترس رکھتا ہو اور تاریخ کو اپنے مقاصد اور پیغام کے لئے کس طرح استعمال کرنا چاہئے اسے خوب پتہ ہو۔ اپنی اسی انفرادیت وامتیاز کی وجہ سے یہ کتاب مجھے بے حد پسند آئی۔

اس کتاب کی تصنیف میں مصنف کی انگریزی زبان سے واقفیت، تجزیاتی شعور، تہذیبی دعوتی اور اصلاحی وجدان نے بڑا تعاون کیا اور اپنی مخصوص صلاحیتوں کی وجہ سے ہی وہ اپنی ممتاز کتاب میں فکر ونظر کے نئے نئے دریچے کھول سکے۔

مصر میں ہندوستانی اساتذہ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ استاد ابوالحسن الندوی کو جانتے ہیں میں نے برجستہ کہا کہ "ماذا خسر العالم" کے مصنف؟ ان لوگوں نے کہا کہ ہاں! میں نے کہا وہ کیسے ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ وہ آج قاہرہ آرہے ہیں، میں نے ان سے شیخ ابوالحسن کی تشریف آوری پر اطلاع اور ملاقات کی آرزو ظاہر کی کہ ہم اس موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتے۔ چند دنوں کے بعد شیخ اپنے دو دوستوں اور ندوی بھائیوں کے ساتھ تشریف لائے جن میں ایک شیخ معین الندوی تھے، دوسرے کا نام یاد نہیں رہا۔

شیخ "موسکی" کی تنگ وتاریک گلیوں میں ایک بہت ہی معمولی حجرہ میں ٹھہرے اس لئے کہ وہ نہ تو ہوٹل میں ٹھہر سکتے تھے اور نہ ہی وہ باوجود قدرت کے اس کو پسند کرتے تھے وہ تو سعودی عرب میں رابطہ کے جلسوں میں ان ہوٹلوں کو چھوڑ دیا کرتے تھے جن میں مہمانوں کو ٹھہرایا جاتا تھا جبکہ وہ فرسٹ کلاس کے ہوٹل ہوا کرتے تھے اور وہ اپنے بعض دوستوں کے پاس ٹھہر جایا کرتے تھے اسی طرح وہ صاحب ثروت اور مالداروں کے پاس بحیثیت مہمان قیام کو قبول نہیں کرتے تھے چاہے وہ ان کے مال میں شبہ کی وجہ سے ہو یا ان کے گراں بار ہونے کے خدشے سے، جب شیخ نے مصر کا سفر کیا تو وہ جوان تھے ان کی سیاہ داڑھی، روشن چہرہ، بلند عزم وہمت، ایمانی روح اور بھڑکنے والی غیرت وحمیت، ان کا امتیاز تھی ان کے اندر جوانوں کا جوش اور بوڑھوں کی حکمت ودانائی بھری ہوئی تھی، وہ مثبت عالمی فکر اور بیک وقت باغیرت اور مومن دل سے آراستہ وپیراستہ تھے۔

میں اپنے رفیق اور دوست اور بھائی محمد الدمرداش مرادؒ کے ساتھ شیخ کی رہائش گاہ پر ملاقات کے لئے گیا اور ہم نے ان کو اپنے گھر واقع شبرا میں دعوت دی تاکہ وہاں ازہر کے بعض اخوانی نوجوان جو دعوت کے کام میں سرگرم عمل تھے ملاقات کرالیں۔ ہم نے ان کو ایک خاص موقع پر دعوت دی جس میں اخوانی نوجوان رات میں تعلیم وتعلم اور عبادت وریاضت کے لئے جمع ہوتے تھے شیخ ہم سے معلومات حاصل کرنے کے زیادہ خواہش مند تھے، وہ ہم سے حسن البناء شہیدؒ کی زندگی ان کے کلام، ان کے طرز حیات اور مختلف امور میں ان کے طریقۂ کار کے بارے میں دریافت کرتے رہے، حسن البناء واقعتاً ایک امام ربانی تھے وہ اسلامی حکومت کا مطالبہ کرنے والے محض ایک لیڈر نہیں تھے بلکہ وہ ان سب سے پہلے ایک مربی تھے اور مسلمانوں کی نئی نسل کی ایسی تربیت کرنا چاہتے تھے جن کا اسلام پر کلی ایمان واعتقاد ہو، جو اس

کی تعلیمات پر کاربند ہوں اور اس کے راستہ میں دعوت و جہاد کے لئے ہمہ وقت تیار رہیں۔

ہماری ان سے کئی ملاقاتیں رہیں اور ہم اسلام کے نوجوان داعی ہمارے ساتھی احمد العسال اور بھائی امر داش وغیرہ شریک کار تھے، مصر میں شیخ ابوالحسنؒ کا زمانہ بہت ہی مبارک اور فائدہ مند گذرا کوئی بھی دن محاضرہ یا کسی خاص درس یا کسی خاص ملاقات سے خالی نہیں جاتا تھا۔ انھوں نے دار الشبان المسلمین میں "المسلمون علی مفترق الطرق" (مسلمان دوراہے پر) کے عنوان سے ایک محاضرہ پیش کیا اور دار العلوم کالج میں محمد اقبال شاعر الاسلامی فی الہند (ہندوستان کے اسلامی شاعر علامہ اقبال) کے عنوان سے لکچر دیا، اس موضوع سے شیخ کو خاص مناسبت اور دلچسپی رہی، بیشمار اشعار یاد تھے اور روائع اقبال (نقوش اقبال) کے نام سے ایک کتاب بھی تصنیف کی۔

شیخ نے قاہرہ میں بہت سے عالموں، داعیوں اور مفکروں سے ملاقاتیں کیں اور انھوں نے وہاں سے واپسی کے بعد "مذکرات سائح فی الشرق العربی (شرق اوسط کی ڈائری) میں ان تمام شخصیات سے ملاقات اور گفتگو کو جمع کر دیا وہاں انھوں نے مشہور ادیب و ناقد سید قطب شہیدؒ سے ملاقات کی، سید قطبؒ مولانا سے بہت متاثر ہوئے اور ان کی کتاب "ماذا خسر العالم" کے لئے ایک دوسرا مقدمہ تحریر کیا، جس میں کتاب اور صاحب کتاب کا پورا پورا حق ادا کر دیا، وہاں انھوں نے شیخ محمد الغزالی سے کئی بار ملاقات کی اور وہ ان کے بعض دعوتی اسفار میں شریک بھی رہے دونوں نے ایک دوسرے کو بہت پسند کیا شیخ نے اپنی ڈائری میں اس کا تذکرہ کیا ہے، مجھ کو یاد ہے کہ شیخ ندوی اپنے بعض دعوتی و اسلامی لٹریچر کو اپنے ساتھ لے گئے تھے ان تمام رسالوں میں بہت بڑے جوش و جذبہ کے ساتھ، بلند افکار اور صاف ستھری باتیں ادبی چاشنی اور وجدان کے ساتھ اور روحانی احساس اور گہرائی کے ساتھ پیش کی گئی تھیں۔

مجھے یاد ہے کہ شیخ غزالی نے ان رسالوں کو پڑھا اس میں دو رسالے ایک "من العالم الی جزیرۃ العرب" اور دوسرا "من جزیرۃ العرب الی العالم" تھا، ان دونوں رسالوں میں شیخ نے یہ لکھا تھا کہ آج اس وقت دنیا جزیرۃ العرب سے ہدایت اور دین حق کی کتنی محتاج و منتظر ہے اور جزیرۃ العرب نے اس سے پہلے دنیا کو کیا عطا کیا ہے۔

ہم نے شیخ کے رسالوں میں ایک نئی زبان اور ایک تازہ روح پائی اس سے ہمارے ذہن و دماغ کے دریچے کھلے، پہلے ہم ان تمام چیزوں سے صرف نظر کئے ہوئے تھے شیخ کے رسالوں ہی نے رستم کے دربار میں ربعی ابن عامر کے موقف کی طرف اور ان کے بلیغ کلمات کی طرف ہم کو متوجہ کیا جس میں انھوں نے چند جملہ میں اسلام کے فلسفہ کو پیش کر دیا ہے اور بہت ہی خوشگوار ایجاز اور فصیح و بلیغ اسلوب کے ساتھ اپنے مقاصد کو اجاگر کیا ہے ان اللہ ابتعثنا لنخرج الناس..... شیخ ابوالحسن الندویؒ میرے علم کے مطابق وہ پہلی شخصیت ہیں جنھوں نے اس قیمتی موقف اور ان کلمات سے ہم کو باخبر کیا اس کے بعد دیگر مصنفین نے ان کو نقل کیا اور یہ اقتباس پوری دنیا میں رائج ہو گیا۔

شیخ نے ہمارے استاد بہی الخولی سے ملاقات کی استاد البہی ان سے بہت متاثر ہوئے اور اپنے رسالہ میں اس تاثر کا اظہار کیا، اسی طرح شیخ نے صالح العشماوی اور دوسرے اخوانی فائدین سے ملاقاتیں کیں، ان کے ساتھ بیٹھے گفتگو کی، اور اس کے بعد اپنے ایک رسالہ میں اس کو نشر کیا، جس کا عنوان تھا "أرید أن أتحدث الی الاخوان" انھوں نے علامہ ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ سے بھی ملاقات کی جنھوں نے آپ کی کتاب "ماذا خسر العالم" پر مقدمہ لکھا ہے۔

نیز انھوں نے داعی و ادیب شیخ احمد الشرباصی سے بھی ملاقات کی جنھوں نے ماذا خسر کے شروع میں مصنف کتاب کی زندگی سے متعلق ایک انٹرویو شائع کیا ہے، اس میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ ان کو مصر میں سب سے تعجب خیز چیز کیا نظر آئی؟ انھوں نے جواب دیا کہ سب سے عجیب چیز مجھے علماء کی بے ریشی نظر آئی، جس نے اپنی زندگی و وطن میں کسی عالم کو بے ریش نہ دیکھا ہو اس کے لئے یہ بڑی تعجب خیز بات ہے، ہمارے نزدیک یہ انگریزوں کا طرز و شعار ہے، یا پھر جو لوگ بے دین ہوتے ہیں ان کا، لیکن یہ علماء کا عام شعار بن جانا، عجیب معلوم ہوتا ہے، یہ بھی عجیب بات ہے کہ بعض لوگ ازہر کی قدیم روایات کو واپس لانا چاہتے ہیں، اور وہ دوبارہ عمامہ پہننے کو لازم قرار دینے کے موڈ میں ہیں، یہ خالص تقلید ہے، انھیں داڑھی کی طرف توجہ کرنی چاہئے، جو ایک اسلامی شعار و سنت رسولؐ ہے۔

شیخ نے اتنے طویل و عریض شہر قاہرہ ہی تک اپنی سرگرمیوں کو محدود نہیں رکھا، بلکہ وہ دوسرے علاقوں میں بھی تشریف لے گئے، وہاں لوگوں نے ان کی تقریریں سنیں اور عام مسلمانوں نے ملاقاتیں کیں۔

انہی شہروں میں المحلۃ الکبریٰ بھی ہے، جس کی ایک مسجد میں میں خطبہ دیا کرتا تھا، وہاں

ڈاکٹر محمد سعید صدر الجمعیۃ الشرعیہ نے انھیں مدعو کیا تھا، وہ دانتوں کے ایک ماہر ڈاکٹر ہیں اور اپنی پوری زندگی احیاء سنت کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں۔ شیخ سمجھ گئے کہ ان کے اور اخوان کے درمیان کچھ نا اتفاقی ہے، کیونکہ ڈاکٹر صاحب شیخ سے اخوان کے نوجوانوں کی شکایت کرتے تھے کہ وہ ان کی طرح داڑھی نہیں رکھتے، مونچھ نہیں ترشواتے، ترک عامہ کے عادی ہیں، اور نماز میں خشوع وخضوع کا خیال نہیں کرتے، شیخ نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ اخوان کی دعوت عام دعوت ہے، اس کا مشن یہ ہے کہ عام لوگ اسلام کے بنیادی اصولوں پر جمع ہو جائیں۔ اس کے بعد ان کی خاص آداب کی بتدریج تربیت ہوتی رہے، اس لئے امت کے اندر دو طرح کے نہج کا موجود ہونا ضروری ہے، ایک اخوان کا عام منہج وطریقہ، اور دوسرا خاص نہج، جیسا کہ جمعیۃ کا ہے، ڈاکٹر صاحب کو شیخ کی بات سمجھ میں آئی اور انھوں نے ان کے ساتھ مجھے بھی کھانے پر مدعو کیا۔

لیکن جلد ہی بات آئی گئی ہوگئی، اور جب وہ شیخ کے ساتھ مقام "تبروہ" گئے اور میں نے کچھ بات کی تو ڈاکٹر سعید صاحب غصہ ہو گئے، میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا کہ وہ کیوں غصہ ہوئے؟ لیکن شیخ نے بڑی حکمت کے ساتھ معاملہ کو نمٹایا اور لوگوں نے مسجد میں قیام لیل کے ساتھ رات گذاری، اور شیخ کی دعوت پر بہت سے لوگ اس میں حاضر ہوئے۔

مصر کا یہ سفر ان سے میری پہلی ملاقات وتعارف کا ذریعہ بنا، اس کے بعد یہ ربط دن بدن بڑھتا گیا، اور ایک لمحہ ایسا بھی آیا جب شیخ کی خیریت واحوال کا یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ اور یہ انقلاب جون کے بعد ہوا جب اخوان پر پابندی عائد کر دی گئی، اور ہم لوگوں کو جیل کی سلاخوں میں ڈال دیا گیا۔ اور مصر پر تیسرے بیرونی حملے کی وجہ سے حکومت کو ہم سے مدد لینے پر مجبور ہونا پڑا، اور شیخ ندوی اور علامہ مودودی کو مصری بغاوت اور جمال عبد الناصر کے مخالفین کے دشمنوں میں شمار کیا گیا، اسی وجہ سے جب الازہر میں مجمع البحوث الاسلامیہ کے قیام کا قانون پاس ہوا جس میں عالم اسلام کے بڑے بڑے علماء کو شامل کیا جانا تھا تو اس میں ان دونوں حضرات کے نام کو شامل نہیں کیا گیا، جب کہ یہ لوگ اس کے خاص نمائندے اور مستحقین تھے، اور دونوں علمی اور عالمی حیثیت ومقام کے حامل تھے۔

اس کے بعد کچھ ایسے حالات ہوئے کہ شیخ کے سفر مصر (۱۹۵۱ء) کے دس سال بعد مجھے قطر جانا پڑا، اور دوحہ آنے کے تقریباً چھ سات ماہ بعد شیخ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، یہ ملاقات پچھلی یادوں اور تعلقات کی تجدید تھی، جس کا ہم اس سے پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

اس کے بعد شیخ کی کتابوں اور رسائل ومحاضرات کے ذریعہ میں ان سے وابستہ رہا، اسی طرح "البعث الاسلامی" جو ہندوستان میں اسلامی دعوت کا ترجمان تھا اور شیخ کے دو شریف النفس اور داعی شاگرد استاذ محمد الحسنی مرحوم اور الاستاذ سعید الاعظمی (بارک اللہ فی عمرہ ونفعہ) نکالتے تھے، اس رسالہ سے ہم شیخ کے مضامین، محاضروں یا اسی طرح مفید چیزوں سے مستفید ہوتے تھے جن سے ان کا کوئی بھی شمارہ خالی نہ جاتا تھا۔

اس دوران شیخ کی جو اہم کتابیں شائع ہوئیں وہ یہ ہیں:

رجال الفکر والدعوۃ فی الاسلام (تاریخ دعوت وعزیمت) جلد اول، یہ کتاب اپنے موضوع پر منفرد شمار کی جاتی ہے۔

یہ کتاب اصلاً ایسے محاضرات پر مشتمل ہے جس میں ہر دور کے مجدد دین اسلام کا تذکرہ ہے اور جنہیں شیخ نے دمشق کے کلیۃ اللغۃ کے طلبہ کے سامنے اس کے ذمہ دار داعی وفقیہ ڈاکٹر مصطفی السباعی کی دعوت پر پیش کیا تھا۔

شیخ ندوی نے یہ ایک بہت عمدہ چیز تیار کی، اور اس میں اسلامی تاریخ اور اس کے مختلف ادوار سے شیخ کو گہری واقفیت کا پتہ چلتا ہے، پھر مجدد دین اسلام کے کارناموں امت کے اندر اس کے اثرات، اور ہر مجدد کے آنے کا ایک خاص وقت کہ جب اس کی سخت ضرورت تھی کہ ان کی خصوصیات ایسی تھیں کہ اس ضرورت کو وہی پورا کر سکتے تھے، شیخ کو ان تمام امور پر خاص درک حاصل تھا۔

اس جلد کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا، اور ان میں شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ، حضرت مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ دہلوی، امام احمد بن عرفان الشہید، اور امیر المومنین حضرت علی (المرتضیٰ) وغیرہ کی سوانح شامل ہے، اس دوران جو بعض دوسری کتابیں منظر عام پر آئیں ان میں "الصراع بین الفکرۃ الاسلامیہ والفکرۃ الغربیہ" (اسلامیت ومغربیت کی کشمکش) اس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ مغربی فکر کس طرح مسلمانوں کے اندر داخل ہوئی، اور اس نے اسلامی فکر کو پیچھے کر دیا، جب کہ وہ ان ممالک کی پروردہ اور مستحق عنایت تھی، اور اس میں واضح کیا کہ کس طرح اسلامی فکر کے اثرات رفتہ رفتہ ختم ہوتے گئے پھر اللہ تعالیٰ نے اسلامی فکر کے مجددوں کو بھیجا جنہوں نے اس کو زندہ کیا اور

اس کا اصل مقام دلایا۔

انھیں تصنیفات میں "الارکان الاربعہ" بھی ہے، جس میں عبادات کے موضوع پر بحث کی گئی ہے، دل اور عقل کو بیک وقت خطاب کرنے والے ایک مفکر ادیب و داعی کی زبان سے ارکان اسلام پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

انھیں میں ایک کتاب "ربانیۃ لا رہبانیۃ" ہے، جس میں اسلام کے روحانی پہلو پر گفتگو ہے، حلول اور وحدۃ الوجود، اور دیگر غالی صوفیاء کے طریق نہیں بلکہ کتاب و سنت کے پیرو ایک مسلمان کی طرح گفتگو کی گئی ہے، جو عارف باللہ ہو اور روحانی تجربات سے بہرہ ور ہو۔ اس کتاب نے امت کے لئے لعل و گوہر کا ایک خزینہ بکھیر دیا ہے، اور اس میں کانوں کو مانوس اور بشارت دینے والی اصطلاحات و مضامین کا استعمال کیا گیا ہے۔

اس کے بعد بھی شیخ کی بیشتر کتابیں منظر شہود پر آئیں جنھیں ہر مقام پر قبول عام حاصل ہوا۔

میں لکھنؤ کی اپنی اس ملاقات کو نہیں بھلا سکتا جو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں شیخ سے ہوئی، اس وقت شیخ نے ندوہ کے قیام کے پچاسی سالہ جشن پر مجھے دعوت دی تھی، اور شیخ کی دعوت کو بے شمار علماء نے قبول کیا تھا، اور مختلف ملکوں سے لوگ تشریف لائے تھے جن میں شیخ عبدالحلیم محمود شیخ الجامع الازہر بھی تھے جن کو شیخ نے اس جشن کا صدر بنایا تھا، ان کے ساتھ ڈاکٹر احمد حسین الازہری وزیر اوقاف مصر بھی اس وقت موجود تھے، اور امارات کے چیف جسٹس شیخ احمد عبدالعزیز المبارک نے حکومت قطر میں تربیت کے وزیر شیخ عبداللہ ابراہیم الانصاری، حکومت شارقہ میں امور دینیہ کے صدر شیخ عبدالعلی المحمود، اور شیخ عبدالمعز عبدالستار، مدیر توجیہ العلوم الشرعیۃ، اور سعودی عرب اور خلیجی ممالک کے بہت سے علماء شریک تھے۔

ندوۃ العلماء کی آغوش میں ہمارے یہ ایام بہت ہی خوشگوار گذر رہے تھے، اور یہ جشن بہت ہی شاندار و یادگار تھا، اس میں ہزاروں ہزار کی تعداد میں مسلمان اور ہندو شریک ہوئے اور مہمانوں نے شیخ ندوی کے اعزاز و اکرام کے سایہ میں یہاں کے خوشگوار لمحات گذارے، یہاں تک کہ برادرم محمد المہدی البدری کو یہ کہنا پڑا کہ شیخ نے ہماری ضیافت میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور ہر طرح سے آرام پہونچانے اور بے پناہ اکرام میں نظیر قائم کر دی۔

اس جشن میں فوٹو گرافر تصویر کھینچنے آئے تو شیخ نے کہا کہ اگرچہ ہم تصویر کے خلاف ہیں، لیکن آج اپنے ان عرب مہمانوں کے اکرام میں ہم اس کی اجازت دیتے ہیں جو تصویر میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔

شیخ نے ایک بار مجھ سے فرمایا تھا کہ آپ کی گفتگو و بیان میں ایک روح ہے، اور ایک خاص حرارت پائی جاتی ہے اور اس کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ مترجم افکار و معانی کو نقل کرتا ہے وہ بات کی روح اور اس کی حرارت کی ترجمانی نہیں کر سکتا، یا پھر آپ کی طرح قادر الکلام اور حرارت و روح رکھنے والا ہو۔

لیکن دار المصنفین اعظم گڑھ میں مجھے ایسا مترجم ہاتھ لگ گیا، یعنی شیخ کے خاندان کے ایک شیریں گفتار اور جادو بیان نوجوان مولانا سلمان ندوی، انھوں نے "مستشرقین پر سیمینار" میں میری تقریر کا ترجمہ کیا، تو شیخ نے اس پر کہا کہ الحمد للہ، سلمان نے بیک وقت روح اور معنیٰ دونوں کی ترجمانی کی ہے۔

ہم نے ندوۃ العلماء اور اس کے دار العلوم کو بہت قریب سے دیکھا ہے، جس کے دیکھنے سے قبل ہمارے ذہن و دماغ آشنا اور مشتاق دیدار تھے، "والاذن تعشق قبل العین احیانا" چنانچہ جب ہم نے اس کو اپنی نگاہوں سے دیکھا اور وہاں چند ساعتیں گذاریں تو اس کو اس سے بہتر پایا جیسا سنا تھا، اور ہم قدیم شاعر کے اشعار گنگنانے پر مجبور ہوئے۔

كانت محادثة الركبان تخبرنا
عن جعفر بن رباح اطيب الخبر
حتى التقينا، فلا والله ما سمعت
اذنى باحسن مما قد رأى بصرى!

گذرنے والے قافلے مجھے جعفر بن رباح کے سلسلہ میں بہت اچھی اچھی باتیں بتایا کرتے تھے۔ اور جب ان سے ملاقات ہوئی تو خدا کی قسم میری نگاہوں نے ان کے بارے میں جو کچھ سنا تھا ان کو اس سے بہتر پایا۔

دار العلوم ندوۃ العلماء ایسی جگہ ہے جہاں آ کر شعراء و ادباء بے ساختہ نغمہ سنج ہو جاتے ہیں، اور علماء اور داعی جس کی تعریف و تحسین میں رطب اللسان نظر آتے ہیں، علامہ علی طنطاوی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ کاش میں بچپن کی عمر میں دوبارہ پہونچ جاتا اور اس ادارہ میں تعلیم حاصل کرتا، یہاں کے اساتذہ کی شاگردی و صحبت کے لطف لیتا، اور طلبہ کا رفیق بنتا، یہاں کی چہار دیواری میں سانس لیتا اور یہاں سے علم و ایمان کی دولت حاصل کرتا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ندوۃ العلماء نے قدیم نافع اور جدید صالح سے استفادہ کو اپنا شعار بنایا ہے، اور مستحکم ایمان اور وسیع علم کے درمیان ہم آہنگی اس کا خاص مقصد ہے، نیز اپنے عزائم و مقاصد پر پامردی و ثبات، اور اس کے وسائل و ذرائع، آلات کی فراہمی، قدیم

ورثہ سے مفید چیزوں کو اپنانا، غیر ضروری چیزوں کو چھوڑنا اس کا خاص امتیاز ہے۔

عالم اسلام میں بھی بنیادی نظام تعلیم میں اصل دشواری یہ تھی کہ وہ دو متضاد بنیادوں پر قائم تھا، اس میں بھی ایک قدیم ورثہ کی نمائندگی کرنے والا اور جدید چیزوں سے صرف نظر کرنے والا گروہ تھا، دوسرا جدید چیزوں کو اس کے رجحانات، معاش اور مادی وکیونل نظریات کے ساتھ اس کو من وعن قبول کرنے والا تھا، وہ قدیم اقدار وروایات اور عقائد ومسلمات کا صاف منکر تھا، ان میں یہ قدیم طبقہ اس بات کا قائل تھا کہ قدماء نے جو کچھ چھوڑا ہے اس سے بہتر لانے کا امکان نہیں ہے، اس لئے نہ تو اجتہاد کی ضرورت ہے، اور نہ ہی ادب میں نئے گوشے تلاش کرنے کی، اور نئی نئی ایجادات واختراعات میں سر کھپانے کی، اور نہ ہی دین وزندگی میں کسی تجدد کی ضرورت ہے ان کے بالمقابل تجدید پسند طبقہ تھا جس کی خواہش تھی کہ ہر چیز کو بدل کر رکھ دیا جائے انھیں کے بارے میں اقبال نے کہا تھا کہ حرم کعبہ کو تو نیا نہیں کر سکتے، اور ان کے بارے میں رافعی نے کہا کہ وہ بیک وقت دین وزبان اور چاند سورج سب کچھ بدل ڈالنے کے آرزو مند ہیں۔

اس موقع پر ندوۃ العلماء ہی کا یہ سب سے بڑا کارنامہ، اور سب سے اہم قدم تھا جس نے دونوں انتہاؤں کے مابین انسجام وہم آہنگی اور رابطہ کا کام انجام دیا، اور ہر ایک کو دوسرے سے فائدہ اٹھانے کی جانب ابھارا۔ اس طرح ندوۃ العلماء کی کوششوں سے قدیم وجدید طبقہ کے مابین کشمکش کا خاتمہ ہوا، اور بنیاد پرستی وتجدد پسندی کا قلع قمع ہوا، جیسا کہ آج کہا جاتا ہے کہ اس نے امتزاج وہم آہنگی اور اعتدال وتوازن کے شعار کو بلند کیا۔

یہ ندوۃ العلماء کی خوش نصیبی رہی ہے کہ اس کو روز اول سے مردان کار ملتے رہے جنھوں نے اس کے مشن اور کاز کو پائیداری ومضبوطی عطا کی، وہ علم وفکر کے میدان میں کوہ ہمالہ جیسے طویل القامت تھے، دین واخلاق، عزیمت ودعوت میں سرو کی طرح بلند قد والے تھے، اس سنہری کڑی میں علامہ شبلیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، علامہ عبدالحی حسنیؒ جیسے گوہر نایاب رہے اور سب کے سب علم وفکر کی بلند وبالا چوٹیوں کی طرح تھے۔

ان تمام اہم ہستیوں نے اپنے اساتذہ سے کسب فیض کیا، ان کی روح کو اپنے اندر جاگزیں کیا، اور ان کے اخلاق وکردار سے خود کو بنایا سنوارا اور انہیں کے طریقے پر زندگی بسر کی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ ندوۃ العلماء میں ایک ممتاز ایمانی وعلمی ماحول وفضا کو قائم کر دیا اس جیسا خوشگوار ماحول کہیں دوسرے ادارہ میں نہیں ملتا، اور یہاں کی طرح معلم کی بات سننے والا اس سے محبت کرنے والا، اور اس کے پیغام پر یقین رکھنے والا کسی دوسری جگہ نہیں ملتا۔

دوسرے اداروں اور یونیورسٹیوں میں بڑا اچھا نہج ونظام موجود ہے، لیکن اچھے اساتذہ فراہم نہیں، اور اگر آپ ان کے اندر علمی پہلو تابناک وروشن پالیں تو دیکھیں گے کہ ان کا دل مردہ ہے اور ایمانی وفکری ناحیہ سے ان کی زندگی بے روح وبے کیف ہے۔ ان میں جمود وتعطل کار فرما نظر آئے گا۔

اس کو ہم نے قطر میں خوب خوب دیکھا، ہم نے علوم شرعیہ میں موضوع اور اس کے متعلقات کو دیکھتے ہوئے بہتر سے بہتر کتابیں لکھیں لیکن طلبہ کی جانب اس کی حرارت اور روح کے ساتھ ان کو منتقل کرنے والے اساتذہ نہ ملے، بلکہ بعض تو ایسے اساتذہ ہیں جو زندہ دلوں کو مردہ کر رہے ہیں اور اس کی حرارت ایمانی پر اس طرح برف ڈال دیتے ہیں جو اس کی حرارت کو ختم کر کے راکھ کے ڈھیر میں بدل دیتی ہے۔

اس کے بعد تین بار ندوہ جانے کی سعادت نصیب ہوئی، ایک بار "المستشرقون والاسلام" کے موضوع پر سمینار میں شیخ کی دعوت پر، جو دار المصنفین اعظم گڈھ میں ہوا، میرے ساتھ برادران مکرم ڈاکٹر عبد العظیم الدیب اور ڈاکٹر علی المحمدی تھے، شیخ اور ان کے دوستوں نے مجھے اس تین روزہ سمینار کی صدارت سونپی، اس موقع پر محدث ہند علامہ شیخ حبیب الرحمن الاعظمی کی ملاقات سے شرف یاب ہوا، اور جب ہم لکھنؤ واپس ہوئے تو ان کا بہت بہت تذکرہ رہا۔

دوسری بار دو ہفتہ کے لئے شیخ کی دعوت پر ندوۃ العلماء جانا ہوا، جس میں مجھے دار العلوم اور المعہد العالی للدعوۃ والفکر الاسلامی کے طلبہ کے سامنے محاضرے دینے تھے، اس وقت مجھے اس علمی وایمانی فضا میں زندگی گذارنے کا ایک زریں موقع ہاتھ لگا، جہاں لوگ محض خدا کا واسطے اور اسی کے ساتھ، اور اسی کے سہارے جیتے ہیں، اور علم وایمان اور دعوت واصلاح کے ماحول میں سانس لیتے ہیں۔

میری حرماں نصیبی کہ اس وقت شیخ ندوی ہندوستان سے باہر اپنے ایک مبارک سفر پر تھے، اپنی واپسی پر دیوبند کے صد سالہ جشن میں شریک ہوتے ہوئے میری ان سے ملاقات ہوئی، شیخ نے مجھ سے کہا: مجھے میرے رفقاء نے بتایا کہ آپ نے وہاں لوگوں کے دلوں پر جادو کر دیا ہے، اور ان پر اپنا سکہ جما دیا ہے، میں نے کہا کہ یہ ان حضرات کی محبت ہے جسے میں فضل خداوندی سمجھتا ہوں۔

تیسری مرتبہ عرصہ تین سال قبل شیخ

نے دار العلوم میں اساتذہ وطلبہ کے سامنے محاضرے کے لئے مجھے دعوت دی، میں نے ندوہ کی آغوش میں کئی دن گذارے جنہیں اپنی عمر کے سب سے حسین دن سمجھتا ہوں، اس وقت میں نے علوم شرعیہ کے اصول پر کئی محاضرے دیئے، اور اللہ تعالیٰ کی اس توفیق پر اس کی حمد بیان کرتا ہوں، اور پھر شیخ کے وہاں موجود ہونے اور میرے محاضروں میں ان کی شرکت نے میرے عزم و حوصلہ کو جلا بخشی۔

شیخ سے مختلف موقعوں پر ملاقاتیں ہوتی رہیں، جامعہ قطر کے قیام کے وقت شیخ کے آس پاس قطر میں ان سے ملاقات ہوئی وہاں انھوں نے "دور الجامعۃ فی تکوین الأجیال"، "نئی نسلوں کی تعمیر میں جامعہ کا کردار" کے عنوان سے محاضرہ دیا، اسی طرح ۱۴۰۱ھ کے اوائل میں قطر میں منعقد سیرت عالمی کانفرنس میں ان سے ملاقات کی سعادت ملی، یہ کانفرنس پندرہویں صدی ہجری کے استقبال کے لئے ایک جشن کے طور پر کی جارہی تھی اس طرح الجزائر کے "ملتقی الفکر الاسلامی" میں بھی ہماری ان سے ملاقات ہوئی۔ اور مجلس المجمع الفقہی کے زیر انتظام رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ میں ہماری ان سے اکثر وبیشتر ملاقات ہوا کرتی تھی جس میں بحیثیت رکن میں شریک ہوا کرتا تھا۔

اسی طرح آکسفورڈ اسلامک سینٹر بھی ہم لوگوں کی ملاقات کا سبب بنا کرتا تھا، ہمیشہ ہمیش ہمارے دل اور روح شیخ جلیل سے خالص اور اسلام کی خاطر محبت کے سایہ میں ملتے رہیں گے، یہ اسلام جس سے خدا نے ہم کو سرفراز کیا، اور اس کے پیغام کا علمبردار بنایا اور اس کی دعوت کو پھیلانے اور امت کے مسائل میں حصہ لینے کی توفیق بخشی۔

میں ندوۃ العلماء کے اساتذہ وطلبہ خاص کر شیخ کے بھانجے عالم جلیل شیخ محمد رابع حسنی ندوی سے تعزیت کرتا ہوں، اسی طرح تمام باشندگان ہندوستان سے اس علامۂ ہند اور اس کی سب سے بڑی دولت کے گم ہوجانے پر تعزیت کرتا ہوں۔ اس طرح میری تعزیت ساری روئے زمین پر بسنے والی انسانیت سے ہے جس نے ایسے داعی اور امام کو رخصت کردیا سارے زمانے کے لئے جس کا ثانی ونظیر پانا مشکل ہے، ہم خدا کے سامنے دست بدعا ہیں کہ وہ ہم لوگوں کو اس رنج والم پر صبر عطا فرمائے اور ان کا بہترین جانشین نصیب فرمائے اور شیخ ندوی کی رحمت ومغفرت فرمائے اور ان کی خدمات کو ان کا بہتر صلہ عطا فرمائے۔

عرفان وعلم کا مہِ کامل نہیں رہا

پروفیسر سید طفیل احمد مدنی

عرفان وعلم کا مہِ کامل نہیں رہا
فضل وکمالِ عشق کا حاصل نہیں رہا

صد حیف اب وہ مومنِ کامل نہیں رہا
ملت کے غم سے جو کبھی غافل نہیں رہا

وہ شیخِ وقت و عارفِ کامل نہیں رہا
وہ جس کے معترف تھے سبھی اہلِ معرفت

اب کاروانِ زیست میں شامل نہیں رہا
وہ بوالحسن علی وہی ہمنامِ مرتضیٰ

وہ عندلیبِ باغِ مزمل نہیں رہا
انسانیت کا درس دیا جس نے عمر بھر

وہ ماہرِ علوم و مسائل نہیں رہا
سیرت نگارِ سید کونین و مرتضیٰ

افسوس اب وہ ذاکر و شاغل نہیں رہا
درویشِ باوقار خوش اوقات وخوش کلام

وہ میرِ کاروانِ دلائل نہیں رہا
وہ پاسبانِ عظمتِ سادات قطبیہ

وہ بے نیازِ دولتِ زائل نہیں رہا
ٹھکرا دیا تھا جس نے ہر اعزازِ دنیوی

وہ خوش نصیب سید عادل نہیں رہا
جس کو کلیدِ کعبہ ملی تھی بحکمِ رب

اب صدرِ بزم و رونقِ محفل نہیں رہا
اسلام کا مفکرِ ذیشان و محترم

کوئی حجاب بیچ میں حائل نہیں رہا
بس لب بلب یوں رب سے ملا نفس مطمئن

جو تیری یاد سے کبھی غافل نہیں رہا
اللہ اس کی قبر کو بھر اپنے نور سے

گلشن میں اب وہ شورِ عنادل نہیں رہا
اک پھول کے نہ ہونے سے خاموش ہیں سبھی

وہ دیدہ ور وہ جوہرِ قابل نہیں رہا
بے نورِ چشم نرگسِ بیمار کیوں نہ ہو

تکیہ کو غم ہے صاحبِ منزل نہیں رہا
ندوہ اداس ہے کہ گیا شیخِ معتبر

اب یہ ولی فائق و کامل نہیں رہا
صدیقؓ وا احمدؒ و وصیؒ پہلے ہی جاچکے

اک جامعِ کمال و فضائل نہیں رہا
ملت کا فرد فرد کرے کیوں نہ تعزیت

وہ میرِ اشیخ و مرشدِ کامل نہیں رہا
روتا ہے اک زمانہ اسے کیوں نہ روؤں میں

اب آہ ایک عالم و فاضل نہیں رہا
سوچا سنِ وفات تو ہاتف نے دی صدا

جاکر کہے طفیل
وہ تاجدارِ مملکتِ دل نہیں رہا

۱۴۲۰ھ

توصیف کیا بیاں کریں ان کے کمال کی

مولانا محمد تقی عثمانی

اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا ایسی بنائی ہے کہ اس میں غم و خوشی اور راحت و تکلیف دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں، نہ یہاں خوشی خالص ہے نہ غم خالص۔ اس لئے یہاں غموں اور صدموں کا پیش آنا کوئی اچنبھے کی بات ہے نہ کوئی غیر معمولی چیز، لیکن بعض صدمے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا اثر پوری امت پر پڑتا ہے اور ان کے عالمگیر اثرات کی وجہ سے ان کا زخم مندمل ہونا آسان نہیں ہوتا ـــــ (رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ میں) ایک ایسا ہی عظیم صدمہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب رحمہ کی وفات کا پیش آیا، جس نے ہر اس شخص کو ہلا کر رکھ دیا، جو حضرت مولانا کی شخصیت اور ان کی خدمات سے واقف ہے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی قدس سرہ ہمارے دور کی ان عظیم شخصیات میں سے تھے جن کے محض تصور سے دل کو ڈھارس اور روح کو یہ اطمینان نصیب ہوتا تھا کہ قحط الرجال کے اس زمانے میں بفضل تعالیٰ ان کا سایۂ رحمت پوری اُمت کے لئے ایک سائبان کی حیثیت رکھتا ہے علم و فضل کے شناوروں کی تعداد اب بھی شاید اتنی کم نہ ہو، عبادت و زہد کے پیکر بھی اتنے نایاب نہیں لیکن ایسی شخصیات جو علم و فضل، سلامت فکر، ورع و تقویٰ اور اعتدال و توازن کی خصوصیات جمع کر لینے کے ساتھ ساتھ امت کی فکر میں گھلتی ہوں اور جن کے دل درد مند میں عالم اسلام کے ہر گوشے کیلئے یکساں تڑپ موجود ہو، خال خال ہی پیدا ہوتی ہیں اور ان کی وفات کا خلا پُر ہونا بہت مشکل ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو ان خصوصیات سے نوازا تھا۔ اور اب ان صفات کا جامع دور دور کوئی نظر نہیں آتا۔

حضرت مولاناؒ اصلاً دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے تعلیم و تربیت یافتہ تھے۔ لیکن اس کے بعد انہیں اللہ تعالیٰ نے دارالعلوم دیوبند سے بھی اکتساب فیض کی توفیق عطا فرمائی تھی اور اس طرح ان کی ذات میں برصغیر کے ان دونوں عظیم اداروں کے محاسن جمع فرمادیئے تھے پھر علم ظاہر کے اس مجمع البحرین کو اللہ تعالیٰ نے علم باطن کا بھی حصہ وافر عطا فرمایا انہوں نے حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ کی خدمت سے فیض حاصل کیا۔ اور طریقت کے میدان میں بھی حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے خلیفہ مجاز کی حیثیت سے آپ کا فیض دور دور تک پھیلا۔

آپ کی اردو اور عربی تصانیف اتنی ایمان افروز، فکر انگیز اور معلومات آفریں ہیں کہ وہ دل کو ایمان و یقین سے سرشار کرنے کے علاوہ دین کا صحیح مزاج و مذاق انسان پر واضح کرتی ہیں اور اسے افراط و تفریط سے ہٹا کر اعتدال کے اس جادۂ مستقیم پر لے آتی ہیں جو ہمارے دین کا طرۂ امتیاز ہے ان کی تحریروں میں علم و فکر کی فراوانی کے ساتھ بلا کا سوز و گداز ہے جو انسان کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ خاص طور پر مغربی افکار کی یورش نے ہمارے دور میں جو فکری گمراہیاں پیدا کی ہیں۔ اور عالم اسلام کے مختلف حصوں میں جو فتنے جگائے ہیں ان پر حضرت مولانا کی بڑی وسیع و عمیق نظر تھی اور انہوں نے اپنی تقریر و تحریر کے ذریعہ ان فتنوں کی تشخیص اور ان کے علاج کی نشاندہی اتنی سلامت فکر کے ساتھ اتنے دلنشین انداز میں فرمائی ہے کہ عہد حاضر کے مؤلفین میں شاید ہی کوئی دوسرا ان کی ہمسری کرسکے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں عربی زبان کی تحریر و تقریر پر وہ قدرت عطا فرمائی تھی، جو بہت سے عرب اہل قلم کیلئے بھی باعث رشک تھی اس منفرد صلاحیت سے انہوں نے خدمتِ اسلام کا وہ عظیم الشان کام لیا جو عربی زبان و ادب کے معاصر ماہرین میں سے شاید کسی نے نہ لیا ہو۔ ان کی فصیح و بلیغ عربی تحریروں نے عربوں کو دین کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ اور مغرب کی فکری یلغار سے سہمے ہوئے عرب ممالک میں دین کا پیغام اتنی خود اعتمادی، اتنے یقین اور اتنے پر جوش انداز میں پہنچایا کہ آج بے شمار عرب مسلمان اپنی اسلامی بیداری کو ان تحریروں کا مرہون منت سمجھتے ہیں ان کی تحریر و تقریر میں جو اخلاص، درد مندی اور دلسوزی کوٹ

کوٹ کر بھری ہوئی تھی، وہ ان کی سخت سے سخت بات کو بھی مخاطب کیلئے قابل قبول بنا رہی تھی۔ اس کا نتیجہ تھا کہ عربوں پر کھری کھری تنقید کے باوجود عرب ممالک میں ان کی مقبولیت کسی بھی غیر عرب کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی عرب ملکوں کے مقتدر حلقوں سے بھی ان کے مراسم تھے اور وہ ان مراسم کو خدمت دین کیلئے استعمال فرماتے تھے اور ان کی بدولت بہت سے منکرات کا سد باب ہوا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بارے میں اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ حضرت مولاناؒ کی قیادت نے اس ادارے کو نئی زندگی بخشی۔ یہ ادارہ درحقیقت حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ نے مسلمانوں کی اہم وقتی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے قائم فرمایا تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ یہاں سے ایسے اہل علم پیدا ہوں جو دینی علوم سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ عصری علوم سے بھی اتنی واقفیت رکھتے ہوں جو ان کی دعوت کو معاصر تعلیم یافتہ حضرات میں زیادہ موثر بنا سکے۔ یہ ایک عظیم الشان مقصد تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس ادارے پر تاریخ و ادب اتنا غالب آتا گیا کہ اس کی دینی چھاپ ماند پڑنے لگی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کو دوبارہ اپنے اصل مقصد کی طرف اس حکمت وبصیرت کے ساتھ لوٹایا۔ کہ اس کی نمایاں خصوصیات بھی برقرار رہیں لیکن اس کے ساتھ اس میں ٹھیٹھ اسلامی علوم کا معیار بھی پہلے سے کہیں زیادہ بلند ہوا۔ اس کی مجموعی فضا پر تدین تقویٰ اور انابت الی اللہ کا رنگ بھی نمایاں ہو۔ اور تاریخ و ادب کو دین کی دعوت اور مقاصد شریعت کا خادم بنا کر اس طرح استعمال کیا گیا کہ یہ ادارہ دعوت و خدمت دین کا ایک اہم مرکز بن گیا، جس کی خدمات سے پورے عالم اسلام نے استفادہ کیا، حضرت مولاناؒ نے اپنی انتھک جدوجہد سے اس ادارے میں اپنے ہم رنگ علماء کی ایک بڑی کھیپ تیار فرمائی جو بفضل تعالیٰ حضرت مولانا کے انداز فکر و عمل کی امین ہے اور انہی کے طرز و انداز پر دین کے مختلف شعبوں میں گرانقدر خدمات انجام دے رہی ہے۔

یوں تو حضرت مولاناؒ کی تمام ہی تصانیف ہمارے ادب کا بہترین سرمایہ ہیں لیکن "تاریخ دعوت و عزیمت" اور "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" اور "عالم اسلام میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" یہ تین کتابیں ایسی ہیں کہ راقم الحروف نے ان سے خاص طور پر بہت استفادہ کیا اور ان کے ذریعے بہت سی زندگیوں میں فکری اور عملی انقلاب رونما ہوا۔ اس کے علاوہ ان کے بہت سے چھوٹے چھوٹے مقالے جو الگ کتابچوں کی شکل میں ـــــ ہیں بلا کی تاثیر رکھتے ہیں خاص طور پر ـــ "اسمعوها مني صريحة ايها العرب" اور "من غار حرا" "ترشيد الصحوة الاسلامية" اور آخر میں وہ مقالے ہیں جنہوں نے دلوں کو جھنجھوڑ کر انہیں فکر و عمل کی سیدھی راہ دکھائی۔

عصری ضرورتوں کا احساس ہمارے دور میں بہت سے علماء، رہنماؤں اور اہل قلم کو ہوا۔ اور انہوں نے اخلاص کے ساتھ دین کی عصری حاجتوں کی تکمیل میں اپنی توانائیاں صرف کیں لیکن بسا اوقات عصری حاجتوں کی فکر نے ان کو دین کی سکہ بند اور ٹھیٹھ تعبیر سے ڈگمگا کر ایسی راہ اختیار کرنے پر آمادہ کر دیا جو جمہور امت اور سلف صالحین کے جادہ مستقیم سے ہٹی ہوئی تھی لیکن حضرت مولانا علی میاں قدس سرہٗ کا معاملہ ان سے کہیں مختلف تھا۔ اس دور کا کوئی بھی حقیقت پسند انسان اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ وہ امت مسلمہ کی عصری ضروریات کا مکمل احساس و ادراک رکھتے تھے۔ لیکن ان ضروریات کی تکمیل انہوں نے ہمیشہ جمہور امت کے مسلمہ عقائد و نظریات کے دائرے میں رہتے ہوئے کی اور کسی قسم کی مرعوبیت اور معذرت خواہی کی پرچھائیں بھی ان کی تحریروں پر نہیں پڑ سکی۔

جب مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب مرحوم نے جماعت اسلامی کی بنیاد ڈالی تو وقت کی ایک اہم ضرورت سمجھ کر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے بھی ان کا ساتھ دیا، لیکن جب ان کے طرز فکر و عمل سے اختلاف سامنے آیا تو حضرت مولاناؒ ان سے الگ تو ہو گئے، لیکن جماعت اسلامی اور مولانا مودودی صاحبؒ کی مخالفت کو اپنا ہدف نہیں بنایا، بلکہ مغربی افکار کی تردید میں انہوں نے جو قابل قدر کام کیا تھا اس کی تعریف و توصیف میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا لیکن ان کے طرز فکر و عمل پر ـــــــــ مولاناؒ نے "اسلام کی سیاسی تعبیر" جس انداز سے سپرد قلم فرمائی وہ انہی کا حق تھا۔ اس کتاب کے ذریعے انہوں نے مولانا مودودیؒ اور ان کے طرز فکر کے حامل دوسرے اہل علم سے اپنے اختلاف کو انتہائی متانت کے ساتھ مدلل اور مستحکم انداز میں بیان فرما کر ان بنیادی نکات کی نشاندہی فرمائی جن میں ان حضرات کی سوچ قرآن وسنت کے جادۂ اعتدال سے ہٹ گئی تھی۔

حضرت مولاناؒ کی پوری زندگی ایک جہد

مسلسل سے عبارت تھی دنیا کے کسی بھی خطے میں مسلمانوں کی کوئی تکلیف یا خراب ان کے دل میں کانٹا بن کر چبھ جاتی تھی اور وہ مقدور بھر اس کے ازالے کے لئے بے چین ہو جاتے تھے ان کی خود نوشت سوانح حیات "کاروانِ زندگی" کے نام سے سات جلدوں میں شائع ہوئی ہے اور جس کے مطالعے سے ان کی ہمہ جہتی خدمات کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سکتا ہے۔ بلکہ مجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ اتنی مصروف زندگی میں انھوں نے اپنی یہ سوانح کس طرح تالیف فرمائی جس میں ان کی سرگرمیوں کی تفصیلات اتنی جزرسی کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ سچ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی سے کام لیتے ہیں تو اس کے اوقات میں بھی برکت عطا فرما دیتے ہیں۔ اس سوانح کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ محض واقعات زندگی کی داستان نہیں بلکہ اس میں قدم قدم پر قاری کیلئے فکر و بصیرت کے نئے پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انھیں جن ہمہ جہتی خدمات کیلئے چنا تھا ان کے پیش نظر وہ کسی ایک ملک کی نہیں پورے عالم اسلام کی شخصیت تھی میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کے سامنے جب بھی حضرت مولانا کا ذکر آتا تو اکثر وہ فرمایا کرتے تھے وہ "موفق من اللہ" ہیں اور جوں جوں حضرت مولاناؒ کی خدمات سامنے آتی گئیں حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کے اس جملے کی حقانیت واضح ہوتی گئی۔ لیکن ان ہمہ جہتی خدمات اور عالمگیر مقبولیت کے باوجود حضرت مولاناؒ تواضع کے پیکر تھے ان کے کسی انداز و ادا میں عجب و پندار کا کوئی شائبہ نہیں تھا قبول حق کے لئے ان کا ذہن ہمیشہ کھلا ہوا تھا، وہ اپنے چھوٹوں سے بھی ایسا معاملہ فرماتے تھے جیسے ان سے استفادہ کر رہے ہوں مجھ ناچیز کے ساتھ حضرت مولاناؒ کی شفقت و محبت اور عنایات کا جو معاملہ تھا اسے تعبیر کرنے کے لئے الفاظ ملنے مشکل ہیں۔ اگرچہ پاکستان اور ہندوستان کی بنا کے بعد مجھے حضرت مولانا سے شرف ملاقات اور حضرت کی صحبت سے مستفید ہونے کے مواقع کم ملے۔ لیکن الحمدللہ خط و کتابت کے ذریعہ ان سے تعلق قائم رہا۔ میں نے اپنے بہت سے ذاتی اور اجتماعی مسائل میں حضرت مولاناؒ سے رہنمائی طلب کی اور انھوں نے ہمیشہ بڑی شفقت و محبت کے ساتھ اپنے ارشادات سے نوازا۔ میں ایسے مواقع کی تلاش میں رہتا تھا جب حضرت مولاناؒ کی زیارت و ملاقات کا شرف حاصل ہو امیر ایہ اشتیاق۔ سو فیصد فطری تھا کہ میرے لئے ان کی حیثیت ایک رہنما کی تھی میں اس بات کا حاجتمند تھا۔ کہ ان کی صحبت جتنی ہو سکے میسر آئے لیکن یہ حضرت مولاناؒ کی شفقت کی انتہا تھی کہ وہ بھی محض اپنے الطاف کریمانہ کی بنا پر مجھے اس سعادت سے بہرور کرنے کی کوشش فرماتے تھے، ایک مرتبہ مجمع الفقہ الاسلامی ہند کا اجلاس بنگلور میں ہونا تھا۔ احقر نے حاضری کا فی الجملہ وعدہ کر لیا تھا۔ حضرت مولانا کا گرامی نامہ آیا کہ میں نے تم سے ملنے کی خاطر اس سفر کا ارادہ کیا ہے بعد میں اتفاق سے مجھے ایسی مجبوری پیش آگئی کہ میں وہاں نہ پہنچ سکا اور اس وقت ان کی زیارت سے محروم رہا میں اپنی نادانی سے یہ سمجھا تھا کہ حضرت نے احقر کی خاطر داری کیلئے مذکورہ بالا نقرہ لکھ دیا ہوگا۔ لیکن بعد میں انھوں نے اپنے خطوط میں جس طرح اس پر افسوس کا اظہار فرمایا۔ اور صرف خطوط ہی میں نہیں اپنی خود نوشت سوانح میں بھی اس واقعے کا جس طرح ذکر فرمایا ہے وہ احقر کو غرق ندامت کرنے کیلئے کافی ہے۔

امسال دارالعلوم کراچی کی طرف سے شوال کے آخر میں فضلائے دارالعلوم کی دستار بندی کے لئے سالہا سال کے بعد ایک جلسہ منعقد کرنے کا خیال ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اس موقع پر اکابر علماء کا ایک اجتماع بھی ہو جائے اس موقع پر جن اکابر علماء کو دعوت دینے کا خیال تھا ان میں حضرت مولانا کا اسم گرامی سرفہرست تھا۔ چنانچہ احقر نے جمعرات ۲۱ رمضان المبارک کو ندوۃ العلماء میں فون کیا معلوم ہوا کہ حضرت رائے بریلی تشریف فرما ہیں وہاں فون کیا گیا تو حضرت اس وقت فون کے پاس نہیں تھے، فاضل گرامی جناب مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب سے بات ہوئی انھوں نے بتایا کہ الحمدللہ حضرت کی صحت بہتر ہے فالج کا جو اثر پچھلے دنوں ہوا تھا بفضل تعالیٰ وہ اب زائل ہو چکا ہے اور حضرت کمزوری کے باوجود روزے بھی رکھ رہے ہیں یہ سن کر الحمدللہ بہت اطمینان ہوا۔ جناب مولانا رابع صاحب نے میرا پیغام حضرت تک پہنچانے کا وعدہ کیا اور فرمایا کہ آپ سے حضرت کو جو محبت ہے اس کے پیش نظر وہ اس دعوت کو ضرور اہمیت دیں گے۔ تاہم میں نے اس سے وہ مناسب وقت معلوم کیا جس میں ان سے براہ راست بات ہو سکے۔ مولانا نے فرمایا کہ صبح دس بجے کے قریب حضرت فون کے پاس ہوتے ہیں۔ میں نے ارادہ کیا کہ ان شاء اللہ ہفتے کی صبح کو حضرت سے ہمکلامی کا شرف حاصل کروں گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا جمعہ کی رات کو میرے بھتیجے عزیز خلیل اشرف عثمانی صاحب سلمہ نے فون پر بتایا کہ ریڈیو ٹیلیویژن سے حضرت کی وفات کی خبر نشر ہو چکی ہے۔ دل پر بجلی سی گری مگر اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر سر تسلیم خم کئے بغیر چارہ نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے پاس بلانے کیلئے رمضان کا مبارک مہینہ جمعہ کا مقدس دن

(باقی صفحہ ۱۲۰ پر)

"کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے"

مولانا ضیاء الدین اصلاحی۔ مدیر "معارف" اعظم گڈھ۔

افسوس اور سخت افسوس ہے کہ محفلِ دوشیں کا وہ چراغِ سحر جو پچھلے برس ہی سے ضعف و مرض کے جھونکوں سے جھلملا جھلملا کر سنبھل جاتا تھا بالآخر ہمیشہ کے لئے بجھ گیا یعنی اس دور کے بہت مقبول و مقدس بزرگ، دنیائے اسلام کے محبوب و محترم عالم، عرب و عجم کی سرمایۂ افتخار و نازش ذات، شرق و غرب کی موقر و مکرم ہستی، ہر فرقہ و مذہب کے معتمد شخص، انسانیت کے پیام رساں اور علمبردار، مسلمانوں کے راہبر و رہنما، دین و مذہب کے عاشق و شیدائی، اسلام کے داعی و نقیب، ایمان و یقین کے حامل و مبلغ، عزیمت و جہاد کے پیکر، خانۂ کعبہ کے کلید بردار، ہندوستان میں سرمایۂ ملت کے نگہبان، ندوۃ العلماء کے ناظم، دار المصنفین کے روح رواں، مسلم پرسنل لا بورڈ اور دینی تعلیمی کونسل کے صدر، رابطۂ عالم اسلامی اور مدینہ یونیورسٹی کے تاسیسی رکن، رابطۂ ادب اسلامی کے بانی و صدر، اسلامی سینٹر آکسفورڈ یونیورسٹی کے چیرمین اور ہند و بیرونِ ہند کے مختلف اداروں اور انجمنوں کے سربراہ اور سرپرست حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ۲۲ر رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ / ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء کو اس سرائے فانی کو الوداع کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اور اپنے لاکھوں عقیدت مندوں، قدردانوں، رفیقوں اور عزیزوں کو غم زدہ اور سوگوار چھوڑ کر زبانِ حال سے یہ کہتے ہوئے موت کی آغوش میں چلے گئے۔

اضاعونی وای فتی اضاعوا
لیوم کریھۃ وسداد ثغر

بیسویں صدی کے اختتام سے ایک برس پہلے جب شمسی سال کے ختم ہونے میں ایک دن رہ گیا تھا تو یہ المناک اور دلدوز خبر بجلی بن کر گری؛

نعی الرکب اوفی حین آبت رکابھم
لعمری لقد جاؤا البشر فا وجعوا
نعوا باسق الافعال لایخلفونہ
تکاد الجبال الصم منہ تصدع

عین نصف النہار کے وقت وہ آفتاب عالم تاب غروب ہوگیا جس سے ہندوستان اور پوری دنیائے اسلام منور تھی، اس وجود مقدس کا خاتمہ ہوگیا جس کے ذکر جمیل سے مسجدیں، خانقاہیں، مدارس، جدید تعلیم گاہیں، یونیورسٹیاں اور ریاست و حکومت کے ایوان پُرشور رہتے تھے، وہ برگزیدہ ہستی معدوم ہوگئی جس کے ایک ہاتھ میں جام شریعت اور دوسرے میں سندان عشق تھا، وہ میر کارواں رخصت ہوا جس کا شغل ذکر کے ساتھ فکر اور جس کا معمول تسبیح و مناجات کی طرح وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل تھا۔ وہ نہ ملت کے جوانوں کی طرح نخچیر زمانہ تھا اور نہ پیرانِ کہن سال کی طرح بیگانۂ ایام۔ یہی وہ چراغ تھا جس سے علم و عرفان اور شریعت و طریقت کی بزم روشن تھی، اس کے فیض سے ایمان کی بادِ بہار چل رہی تھی، معرفت و یقین کی دوکان آراستہ تھی، دریائے علم رواں اور دوائے دل ارزاں تھی، اس کی ذات لکھنؤ اور رائے بریلی میں فضل و کمال، محبت و معرفت، یقین و نگاہ اور رشد و ہدایت کی شمع فروزاں تھی، اس کی ہستی سیرت و خُلق محمدیؐ، شاہ علم اللہؒ کے زہد و ریاضت، سید احمد شہیدؒ کے جہد و جہاد اور مولانا عبدالحئیؒ کے علم و دانش کا مجموعہ تھی اور اس کی ذات میں اسلاف اور اپنے بزرگ اجداد کی بہت سی روایات و خصوصیات اکٹھا ہوگئی تھیں، ارشاد و ہدایت، وعظ و نصیحت، درس و تدریس، تلاش و مطالعہ، تحریر و تصنیف اور دین و ملت کی راہ میں جاں فروشانہ جذبہ اور مجاہدانہ اخلاص۔

ولیس علی اللہ بمستنکر
ان یجمع العالم فی واحد

۲۲ر رمضان المبارک کو جمعہ کی نماز پڑھ کر بعض اعیانِ شہر کے ساتھ اپنی رہائش گاہ کے سامنے صحن میں بیٹھا تھا کہ شہر کے ایک صاحب کے فون سے اس حادثۂ فاجعہ کی اطلاع ملی تصدیق اور تدفین کا وقت معلوم کرنے کے لئے لکھنؤ اور رائے بریلی فون کرایا مگر پتہ نہیں چلا، خبر پھیلی تو دار المصنفین کے احاطے کے لوگ، شبلی کالج کے اساتذہ اور شہر کے بعض حضرات میری قیامگاہ پر جمع ہوگئے، ڈاکٹر مسیح الرحمٰن لکچرر شبلی کالج نے لکھنؤ میں اپنے بڑے بھائی مولانا سعید الرحمٰن اعظمی کے یہاں فون کرایا تو خبر کی تصدیق ہوگئی اور ساڑھے چار بجے میں ان کے اور اپنے رفقاء، عزیزوں اور ڈاکٹر سلطان سلطان رکن مجلس انتظامی دار المصنفین کے ساتھ روانہ ہوا، مگر تکیہ سے

۳ کلومیٹر پہلے ہی گاڑی روک دی گئی، ہم لوگ پیدل چل پڑے، راستے میں آدمی ہی آدمی تھے، کچھ تو نماز جنازہ اور تدفین میں شریک ہوکر واپس آرہے تھے اور کچھ بے تابانہ تدفین میں شریک ہونے جارہے تھے، ہم لوگوں کو جنازے کی سعادت سے محروم رہ جانے پر بڑا قلق ہوا، دو تین گھنٹے گزار کر بمشکل مولانا کے خواہر زادگان مولانا سید محمد رابع اور مولانا سید محمد واضح سے ملاقات کرکے ۸ بجے صبح اعظم گڈھ واپس اس حال میں آئے۔

اذا ما دعوت الصبر بعدک والبکا
اجاب البکا طوعا ولم یجب الصبر

کئی روز تک گم صم رہا، کسی کام میں جی نہیں لگتا تھا، قلم اٹھانے کا یارا نہ تھا، حیص بیص میں دن بیت گئے، ہفتے گزر گئے، جنوری کے آخری عشرے میں مولانا مستقیم احسن نے بمبئی سے فون کیا "ابھی تک معارف نہیں پہونچا، مولانا پر مضمون کا شدید انتظار ہے"، حکیم محمد مختار اصلاحی اور پروفیسر خورشید نعمانی ردولوی اور دوسرے قدردانان معارف کی طرف سے بھی ماتمی تحریر کے لئے بیقراری ظاہر کی گئی۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

اس پیہم تقاضے اور شدید اصرار نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا مگر اسی اثنا میں اعظم گڈھ میں فساد کی آگ بھڑک اٹھی جس کی زد سے دار المصنفین بھی محفوظ نہیں رہا، نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ کا منظر تھا، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات نہ تنہا ان کے عزیزوں اور نیازمندوں کا حادثہ ہے اور نہ دار المصنفین اور ندوۃ العلماء کی دنیا ویران ہوئی ہے، بے شمار ادارے، تنظیمیں اور انجمنیں بے رونق ہوگئی ہیں، امت بیچارہ کا سرمایۂ اعتماد جاتا رہا، عالم اسلام کا سہارا ختم ہوگیا، تباہ و خستہ حال ہندوستان کا غمخوار چلا گیا، آہ وہ پُر درد آواز خاموش ہوگئی جو نصف صدی تک ہندوستان اور دنیائے اسلام کے ہر سانحہ پر صدائے صور بن کر بلند ہوتی تھی، واحسرتا! وہ بے قرار دل ساکت ہوگیا جو مسلمانوں کی ہر مصیبت پر تڑپتا اور تڑپاتا تھا، وا اسفا! وہ اشک آلود آنکھیں بند ہوگئیں جو دین و ملت کے ہر غم میں خوں بار رہتی تھیں، ہائے اس پُرجوش سینہ کا تلاطم ختم ہوگیا جو آلام و مصائب کے پہاڑوں کو خس و خاشاک کی طرح بہائے جاتا تھا، ہم کس کس چیز کا ماتم کریں اور کس کس کے لئے روئیں، وہ ایک فرد نہیں ایک قوم، ایک شخص نہیں ایک ملت اور تنہا نہیں مجموعۂ صفات و کمالات تھا۔

وما کان قیس هلکه هلک واحد
ولکنه بنیان قوم تهدما

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا پدری سلسلہ حضرت امام حسنؓ پر اور مادری سلسلہ حضرت امام حسینؓ پر منتہی ہوتا ہے۔ حضرت امام حسنؓ کے صاحبزادے حسن مثنیٰ سے امام حسینؓ کی چھوٹی دختر فاطمہ صغریٰ منسوب تھیں، اس لئے ان کے خاندان کو حسنی حسینی کہا جاتا ہے، اس خاندان کے پہلے بزرگ جو مدینہ منورہ سے ہندوستان تشریف لائے وہ امیر قطب الدین محمد المدنیؒ تھے جو شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے بھانجے اور جلیل القدر ولی تھے، انھوں نے کڑا مانک پور اور اس کے نواح کو نور اسلام سے منور کیا، کڑا میں ان کی اولاد تقریباً ایک صدی تک عزت اور نیک نامی کی زندگی بسر کرتی رہی، جب اس خانوادے کے ایک بزرگ میر سید قطب الدین محمد ثانی کو جالس کا قاضی مقرر کیا گیا تو وہ وہاں منتقل ہوگئے، ان کے بیٹے سید علاء الدینؒ نصیرآباد کے قاضی ہوکر وہاں جا بسے۔ ان کے ایک پوتے قاضی سید احمدؒ تھے جن کے فرزند سید محمد معظم کے دو نامور فرزند تھے، سید محمد فضیل اور سید محمد اسحٰق۔ اول الذکر حضرت سید آدم بنوریؒ کے جلیل القدر خلیفہ اور ممتاز عارف باللہ حضرت شاہ علم اللہؒ کے والد بزرگوار تھے جن کی پانچویں پشت میں مرد حق آگاہ اور مجاہد کبیر حضرت سید احمد شہیدؒ پیدا ہوئے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ موخر الذکر کی نسل سے تھے جن کی نوائے حق اور نالۂ درد سے عرب و عجم گونج رہا ہے۔

سالہا گوش جہاں زمزمہ زا خواہد شد
زیں نواہا کہ دریں گنبد گردوں زدہ ام

خاندان قطبی کی دونوں شاخوں میں اتنے اولیا، علما اور مشائخ پیدا ہوئے کہ کم خاندانوں میں ہوئے ہوں گے، مولانا علی میاںؒ کے جد امجد مولوی حکیم سید فخر الدین خیالیؒ علمی و باطنی کمالات سے مالا مال تھے، فارسی، اردو خاص کر بھاشا کے اچھے اور صاحب دیوان شاعر تھے، ان کی اکثر تصنیفات تلف ہوگئیں لیکن جو محفوظ رہ گئیں وہ بھی کم نہیں "مہر جہاں تاب" بڑی عجیب اور اہم ہے جس کے حصہ اول کا نصف اول عربی، فارسی، اردو اور بھاشا کے شاعروں کا تذکرہ ہونے کی بنا پر اردو کے ناقدوں اور محققوں کا بھی مرکز توجہ ہے، ان کے فرزند اور مولانا علی میاںؒ کے پدر بزرگوار مولانا حکیم سید عبدالحئیؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء نے عربی میں "نزہۃ الخواطر" اور "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند" اور اردو میں "گل رعنا" یادگار چھوڑیں جو ہمیشہ حوالے اور مرجع کا کام دیں گی۔ مولانا علی میاں کا ننہال بھی علمائے کبار

اور اولیائے عظام سے معمور تھا۔

ایں سلسلہ از طلائے ناب است
ایں خانہ تمام آفتاب است

سید محمد فضیل کے فرزند حضرت شاہ علم اللہؒ حرمین شریفین کے مستقل قیام کے ارادے سے نصیر آباد سے روانہ ہوئے اور رائے بریلی میں جہاں آکر پہنچے تو ایک بزرگ مجذوب کے کہنے سے ارادہ تبدیل کردیا اور جنگل میں دریائے سئی کے کنارے مٹی اور پھوس کا ایک مکان اور مٹی ہی کی مسجد تعمیر کرکے طرح اقامت ڈال دی، قریب کے ایک گاؤں لوہانی پور کے زمیندار دولت خاں نے بخشہ دس بیگھا زمین نذر کی۔ جو آگے چل کر دائرہ شاہ علم اللہؒ یا تکیہ کے نام سے موسوم ہوئی۔ شاہ علم اللہؒ کے بنی اعمام نصیر آباد ہی میں سکونت پذیر رہے، جب یہاں کے مولانا سید عبد العلی نصیر آبادیؒ کی شادی مولانا سید محمد ظاہر کی جو حضرت شاہ علم اللہؒ کی پانچویں پشت میں تھے دو صاحبزادیوں سے یکے بعد دیگرے ہوئی تو وہ نصیر آباد سے ترک سکونت کرکے دائرہ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی منتقل ہوئے، اسی مقتدر خاندان میں آگے چل کر مولانا علی میاںؒ کی ولادت ہوئی اور دائرہ شاہ علم اللہؒ یا تکیہ ان کا مولد و منشا تھا۔

بلاد بہا حل الشباب تمائمی
و اول ارض مس جلدی ترابہا

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تسمیہ خوانی تکیہ رائے بریلی میں ہوئی اور مکتبی تعلیم امین آباد لکھنؤ کے محلہ بازار جھاؤ لال کی مسجد نوازی کے مکتب میں پائی، یہ محلہ اب محمد علی لین کہلاتا ہے، یہاں ان کے والد کا مکان اور مطب تھا۔ ابھی وہ نو دس کے ہی کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا اس لئے اس کو چھوڑ کر تکیہ آنا پڑا مگر جلد ہی ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبد العلیؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء نے بھی اسی محلہ میں اپنا مطب شروع کیا تو ان کو بھی لکھنؤ بلالیا اور بڑی شفقت اور دل سوزی سے ان کی سرپرستی اور تربیت کی۔ مولانا کو اردو کا اچھا ذوق اور شعر فہمی کی صلاحیت یہیں پیدا ہوئی، انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے فاضل ادب اور فاضل حدیث کے امتحانات دیئے اپنے پھوپھا مولانا سید محمد طلحہؒ پروفیسر اورینٹل کالج لاہور سے صرف و نحو کی مشق کی، دارالعلوم ندوۃ العلماء سے استفادے کا آغاز ہوا تو مولانا شبلی جیراجپوری سے فقہ اور مولانا حیدر حسن خاں سے حدیث کی کتابیں پڑھیں، ۲۹ء میں لاہور کا سفر کیا، مولانا سید محمد طلحہ کے ہمراہ علامہ اقبال اور دوسرے ناموروں سے ملاقات کا شرف حاصل کیا، اگلے برسوں میں پھر جاکر مولانا احمد علیؒ سے مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے طرز تفسیر و فکر کے مطابق قرآن مجید اور حجۃ اللہ البالغہ کا درس لیا، اس طرز میں اس سے پہلے ان کے خواجہ تاش خواجہ عبدالحی فاروقیؒ استاذ تفسیر جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بھی اپنے گھر پر قرآن شریف کی بعض سورتیں پڑھ چکے تھے، ۳۲ء میں مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے درس حدیث میں شرکت کے لئے دیوبند تشریف لے گئے، ان سے بعض قرآنی مشکلات میں رہنمائی کے بھی طالب ہوئے۔

برصغیر میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ عربی کے سب سے ممتاز انشاپرداز اور مصنف تھے۔ ان کی تعلیم کا آغاز ۱۹۲۴ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر مولانا خلیل عرب کے گھر پر ہوا اور عربی بولنے اور لکھنے کی مشق بھی یہیں ہوئی، طلبہ کے لئے عربی بولنا لازمی تھا، اردو بولنے پر جرمانہ ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں عربی اخباروں اور رسالوں کے مطالعہ کا چسکا لگا جو ان کے بڑے بھائی اور مربی ڈاکٹر سید عبد العلیؒ کے یہاں آتے تھے، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ان کے مطالعہ کا مزید موقع ملا، مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کی دوستی اور رفاقت سے اس ذوق میں جلا پیدا ہوئی، مولانا کے مضامین مصر کے رسالوں میں چھپنے لگے، ستمبر ۳۰ء میں علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی ندوہ میں ادب عربی کے اعلیٰ استاذ ہوکر آئے تو یہاں عربی ادب کے نئے دور کا آغاز ہوا، ان سے مولانا علی میاں نے بھی فائدہ اٹھایا، مولانا سید سلیمان ندوی اور ہلالی صاحب کی نگرانی اور مولانا مسعود عالم ندوی کی ادارت میں مئی ۳۲ء میں الضیاء کا اجرا ہوا، جس کے مولانا مستقل مضمون نگار تھے، یہ رسالہ تین سال بعد بند ہوگیا، اس کے تخم سے "البعث الاسلامی" اور "الرائد" نکلے جن کے مولانا سرپرست اور نگراں تھے، عربی تحریر و تقریر سے ان کا شغف مدۃ العمر قائم رہا، ۱۹۵۶ء میں وہ دمشق یونیورسٹی کے وزیٹر پروفیسر ہوئے۔ یہاں کی المجمع العلمی کے رکن بھی تھے۔ عربی میں ان کے مضامین و کتب اتنی کثیر تعداد میں ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے، اپنی اس خصوصیت کی بنا پر وہ عرب ملکوں کے ہر پروگرام میں مدعو ہوتے تھے اور وہاں کے اکثر اداروں اور انجمنوں کے ممبر بھی تھے ان سے زیادہ کسی ہندوستانی نے عرب ملکوں کا سفر نہیں کیا، ان کی اردو کتابوں کے عربی ترجمے بھی شائع ہوئے، وہ عرب ملکوں کے موجودہ فضلا، اور اہل قلم سے کسی اعتبار سے کم پایہ نہ تھے، اپنی اسی شہرت و مقبولیت اور دینی عظمت و وجاہت کی بنا پر کلید کعبہ ان کے حوالے کی گئی تھی و کفیٰ بہ فخرا۔

مولانا علی میاں نے بیس سال کی عمر حصول تعلیم میں گزاری، ۱۹۳۴ء میں ندوۃ العلماء میں تفسیر وادب کے استاد مقرر ہوئے، درس تیاری، محنت اور مطالعہ کے بعد دیتے تھے، اس ضمن میں ندوہ کی سفارت، اس کے تعارف اور اس کے مقاصد کی اشاعت کے لئے سفر بھی کیا، ۱۹۴۱ء میں مولانا سید سلیمان ندوی کی نگرانی اور ان کی اور مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کی ادارت میں "الندوہ" پھر جاری ہوا اور فروری ۱۹۴۲ء میں بند ہوگیا، دعوتی ذوق کی بنا پر بعد میں بھی صحافت سے دلچسپی رہی، ۱۹۴۸ء میں مولانا عبدالسلام قدوائی کے اشتراک سے پندرہ روزہ اخبار "تعمیر" نکالا اور اس کے لئے متعدد فکر انگیز مقالات لکھے، ہفتہ وار ندائے ملت کے اجرا میں بھی ان کی مساعی شامل تھیں، ان کی سرپرستی میں پندرہ روزہ "تعمیر حیات" شائع ہوا جو اب بھی جاری ہے۔ ان کو اپنے ندریسی دور میں عربی زبان وادب کے نصاب کی اصلاح کا خیال ہوا، اس کے لئے مختارات، القراءۃ الراشدۃ اور قصص النبیین وغیرہ خود لکھیں اور اپنے عزیزوں اور شاگردوں سے متعدد ریڈریں لکھوائیں، ان کو کورس کی کتابوں کی ترتیب کا خاص سلیقہ تھا، ۱۹۳۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے لئے بی۔ اے کلاس کی ایک کتاب تیار کی جس کا معاوضہ ۵۰۰ روپیہ ملا اور مولانا سید سلیمان ندویؒ نے مبارک باد بھی دی۔ انھوں نے دارالعلوم کے طلبہ میں دینی روح پھونکی اور ندوہ کے مقاصد سے دلچسپی پیدا کی۔ دوسرے دینی مدارس سے اس کا ربط بڑھایا، تبلیغ ودعوت دین کے کام سے مولانا کو زیادہ مناسبت تھی، اس میں انہماک بڑھا تو ندریس سے ضابطہ کا تعلق ختم کر لیا، لیکن ندوۃ العلماء سے ان کا خاندانی دموروثی تعلق تھا، اس کی محبت ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اور یہی آئندہ ان کا اوڑھنا بچھونا ہوگیا تھا،

۱۹۴۸ء کے وسط میں اس کی مجلس انتظامی کے رکن منتخب ہوئے اور جنوری ۱۹۴۹ء میں انھیں نائب معتمد بنایا گیا اور مولانا سید سلیمان ندوی کے انتقال کے بعد ۱۹۵۴ء میں معتمد ہوئے، ۱۹۶۱ء میں اپنے بھائی ومربی کی وفات کے بعد ناظم ندوۃ العلماء بنائے گئے، ان کے زمانے میں ندوہ کو عالم گیر شہرت ومقبولیت نصیب ہوئی، علمی، تعلیمی، دینی اور روحانی حیثیت سے ترقی ہوئی، عمارتوں میں بکثرت اضافے اور توسیع ہوئی، گوناگوں شعبے اور دفاتر قائم ہوئے، مالی حیثیت سے مستحکم ہوا، مختلف شہروں میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں، پچاسی سالہ جشن منایا گیا، بین الاقوامی سیمینار ہوئے، جلسے، اجتماعات اور تقریبات آئے دن کا معمول ہوگئے ہیں، غرض انھوں نے ندوۃ العلماء کے چپہ چپہ پر اپنے لازوال نقوش چھوڑے ہیں۔

لعمرك ما وارى التراب فعاله
ولكن ما وارى ثيابا و اعظما

ہندوستان اور عالم اسلام کے بے شمار اداروں سے ان کا تعلق تھا، ہر ادارہ ان سے اپنی نسبت کو باعث فخر سمجھتا تھا، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی سے ان کو گہرا اور مخلصانہ لگاؤ تھا، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی سے عقیدت مندانہ تعلق کی بنا پر وہ اس کے کاموں میں پیش پیش رہتے اور پوری دلچسپی لیتے، اس کی ترقی وکامیابی سے خوش ہوتے، وہ اور ان کے بڑے بھائی اس کی مختلف مجالس کے رکن تھے، مولانا عبدالماجد دریابادی کے انتقال کے بعد ان کو مجلس علم کا صدر بنایا گیا،..... ڈاکٹر سید محمود اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے انتقال کے بعد وہی اس کے روح رواں تھے، بڑی پابندی سے دارالمصنفین کے جلسوں میں تشریف لاتے، اس کے جشن طلائی اور اسلام ومستشرقین پر بین الاقوامی سیمینار کو کامیاب بنانے میں انھوں نے پوری سرگرمی دکھائی، یہاں سے ان کے والد بزرگوار کی کتاب "گل رعنا" اور الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند کا اردو ترجمہ شائع ہوا، خود ان کی کتاب "تاریخ دعوت وعزیمت" کے شروع کے دونوں حصوں کا پہلا ایڈیشن یہیں سے نکلا۔ معارف پابندی سے پڑھتے، کسی مہینے میں تاخیر ہوتی تو شکایت کرتے ابھی جلد ہی ان سے پوچھا گیا کہ آپ کا پسندیدہ رسالہ کون ہے تو جواب دیا معارف۔ دارالمصنفین کو مالی فائدہ بھی پہونچاتے۔ یوپی کے سابق وزیر اعلا مسٹر بھوگنا نے ندوۃ العلماء کو ایک لاکھ روپئے دیئے اسے دارالمصنفین کی طرف منتقل کرادیا، مولانا سید سلیمان ندوی کی "سیرۃ النبی" حصہ ہفتم کا مقدمہ انھوں نے لکھا تھا، یہ کتاب جنرل ضیاء الحق مرحوم کو بہت پسند آئی اور انھوں نے مولانا کو ایک لاکھ روپئے نذر کرنا چاہا تو فرمایا میں اس کا مستحق نہیں، دارالمصنفین اور سید صاحب کی بیگم ہیں، چنانچہ نصف نصف رقم دونوں کو ملی، حال ہی میں ابوظبی اور برونائی کی حکومتوں سے ان کو خطیر رقم ملی، اسے انھوں نے مدارس میں تقسیم کردیا، اس موقع پر بھی دارالمصنفین کا خیال رکھا۔ ان کی سفارش سے اسے رابطہ عالم اسلامی سے ایک اچھی رقم سالانہ ملتی تھی، اگر عرصے سے وہ بند ہوگئی۔

تقریر وتحریر کا ملکہ خداداد تھا، اردو اور عربی دونوں کے ممتاز خطیب اور نامور مصنف تھے، ان کے معاصرین میں ان سے زیادہ شاید ہی کسی نے تقریریں کی ہوں اور تحریری ذخیرہ چھوڑا ہو، ان کا طغرائے امتیاز یہ بھی تھا کہ انھوں نے اپنے اس جوہر کا صحیح استعمال کیا، ان کی ہر تقریر وتحریر

کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ اور اسلام کی سربلندی ہوتا، ان کی طبیعت کا سوز اور دل کی دردمندی تقریروں اور تحریروں کو اس قدر موثر بنا دیتی تھی کہ ان کو سننے اور پڑھنے والے پر رقت طاری ہو جاتی تھی، تقریر و بیان پر معجزانہ قدرت کی وجہ سے ۱۹۴۳ء میں جب مولانا عبدالسلام قدوائی نے ادارہ تعلیمات اسلام قائم کیا اور اس کے زیر اہتمام ان پر قرآن مجید اور حدیث شریف کے درس کی ذمہ داری ڈالی تو اس میں لکھنؤ کے تعلیم یافتہ طبقہ، اعلیٰ عہدیداروں اور دیندار مسلمانوں کا بڑا مجمع ہونے لگا، اس خصوصیت کی بنا پر نوعمری ہی میں وہ بڑے بڑے جلسوں میں تقریر کے لئے بلائے جاتے اور ندوہ کے نمائندے ہو کر اہم علمی اجتماعات میں مقالے پڑھنے کے لئے مدعو کئے جاتے، ۱۹۳۶ء میں علی گڑھ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی جبلی میں شرکت کی اور ۱۹۳۸ء میں اس کے پٹنہ کے اجلاس میں شریک ہوئے، ۱۹۴۲ء میں جامعہ ملیہ کے شعبہ اسلامیات کی دعوت پر "مذہب و تمدن" کے عنوان سے مقالہ پڑھا، جو بعد میں کتابی صورت میں چھپا، ادب و انشا سے فطری دلچسپی تھی، اس کا بانکپن ان کی ہر تقریر و تحریر میں نظر آتا، کبرسنی کے باوجود ان کے زور و اثر اور حسن بیان میں کوئی فرق نہیں آیا، سیرت سید احمد شہیدؒ، مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہونچا، ارکانِ اربعہ، نبی رحمت، المرتضیٰ اور تاریخ دعوت و عزیمت وغیرہ سے اگر ان کی تلاش و تحقیق، کدو کاوش، محنت و دیدہ ریزی، دقت آفرینی اور نکتہ سنجی کا پتہ چلتا ہے تو دوسری تصانیف سے فکر و خیال کی بلندی، رعنائی بیان، زور قلم، تازگی، آمد، روانی اور بے ساختگی کا اندازہ ہوتا ہے، ان کی تمام تصنیفات کو حسن قبول حاصل ہوا اور اردو میں لکھی گئیں ان کے عربی اور جو عربی کے اردو ترجمے ہوئے، اکثر کے انگریزی اور دوسری زبانوں میں بھی ترجمے ہو گئے۔ ان کی عظیم الشان دینی و دعوتی خدمات اور گوناگوں تصنیفات کی وجہ سے ۱۹۸۰ء کا فیصل ایوارڈ ملا، یہ اور اس کے بعد کے ایوارڈ سے ملنے والی ساری رقم اسلام کے مفاد اور دینی خدمات کے میدان میں صرف کردی اور اپنے لئے ایک حبہ بھی نہ رکھا۔

نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

مولانا شروع سے محب وطن اور تحریک آزادی کے حامی تھے، انگریزوں سے نفرت کے جراثیم موروثی تھے، ۸ برس کی عمر میں وہ تحریک خلافت کا جوش و خروش اور پھر ۳۰ مارچ ۱۹۲۴ء کا وہ منحوس دن دیکھ چکے تھے جب انگریزوں کی سازش سے کمال اتاترک نے بیک جنبش لب اس کا خاتمہ کر دیا تھا، دیوبند کے قیام اور حضرت مدنیؒ کی صحبت نے اس رنگ کو اور چوکھا کر دیا تھا، اپنے تجربہ و مطالعہ سے ایک انگریز ہی کیا سارے یورپ کے الحادی و مادی نظریات کو وہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے سم قاتل سمجھتے تھے، عملی سیاست سے کنارہ کش رہنے کے باوجود ان کا اور ان کے گھرانے کا رجحان جمعیۃ العلماء اور مجلس احرار کی طرف تھا، ۱۹۴۲ء میں کانگریس نے "ہندوستان چھوڑو" کی تجویز منظور کی تو ان علماء کے طرز عمل کو پسند کیا جو جنگ آزادی اور استخلاص وطن کی تحریک میں شریک تھے، مگر آزادی کے بعد جب حکومت کے کارپردازوں کا رنگ بدلا اور مسلمان احساس کمتری اور مایوسی کا شکار ہونے لگے تو وہ جارحیت کے سامنے سپر انداز نہیں ہوئے، ۱۹۵۱ء میں ان کی دعوت پر ندوۃ العلماء میں ایک ملی اجتماع ہوا جس میں نشان راہ اور لائحہ عمل تجویز ہوا، یورپ کی سیاسی و تہذیبی تاخت، عقائدی ارتداد اور فکری و اخلاقی انتشار کا مقابلہ کرنے کے لئے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام قائم کیا، مشرکانہ عقائد اور دیومالائی تصورات کے انسداد کے لئے دینی تعلیمی کونسل کی رہنمائی کی، مسلمانوں میں ملی، دینی، فکری اور جرأت مندانہ قیادت کے خلا کو پُر کرنے کے لئے ندائے ملت جاری کیا، ۱۹۶۴ء میں کلکتہ، جمشید پور اور راؤرکیلا کے ہولناک فسادات کی سنگینی دیکھ کر ان کو خیال ہوا کہ تمام تعلیمی و تعمیری کاموں سے پہلے اس مسئلے کی طرف توجہ کرنے اور اس کو موثر بنانے کے لئے اکثریتی فرقہ کے جانباز اور سرفروش قائدین کو بھی اس میں شامل کرنے کی ضرورت ہے، اسی غرض سے مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی معیت میں ونوبا بھاوے اور جے پرکاش نرائن سے ملے، ڈاکٹر سید محمود کی قیادت میں ندوۃ العلماء میں مسلم مجلس مشاورت قائم ہوئی تو اس میں سرگرم حصہ لیا، ملک کو زوال اور اخلاقی بحران سے نکالنے اور ہندو مسلم خلیج پاٹنے کے لئے "پیام انسانیت" کی تحریک چلائی، عائلی قوانین کے تحفظ کے لئے مسلم پرسنل لا بورڈ کی سربراہی کی۔ بابری مسجد کے انہدام پر خون کے آنسو بہائے۔ غرض ان کا بے قرار اور دردمند دل ہر نازک موڑ پر برادران وطن کو درس حقیقت اور مسلمانوں کو شجاعت و عدالت کا سبق پڑھا کر اس کی تلقین کرتا رہا کہ ؎

معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز

مولانا ایک داعی و مصلح تھے، دعوت و عزیمت اور دینی غیرت و حمیت ان کی امتیازی شان تھی ان کا گھرانا عقائد و مسلک میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمعیل شہیدؒ کا سختی سے پیرو اور ولی اللہی فکر کا حامل تھا، ان کا محلہ بازار جھاؤلال بھی صحیح العقیدہ لوگوں سے آباد تھا، وہ شعائر اللہ کی توہین، دین و اخلاق اور انسانیت کی پامالی

برداشت نہیں کر سکتے تھے، اسلام کی سربلندی، اصلاح و دعوت اور دین کی تبلیغ و اشاعت میں ہمیشہ منہمک رہے، ۱۹۳۸ء میں ۲۱ برس کی عمر ہی میں ایک موقع پر ڈاکٹر امبیڈکر کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے بمبئی کا سفر کیا، وہ عمر بھر مسلمانوں کو مادی تمدن کے دریا کے خلاف تیرنے اور اس کا دھارا موڑنے اور اپنے باطل افکار و خیالات اور غلط رسوم و عادات کی قربانی دینے کے لئے آمادہ کرتے رہے، ندوۃ العلماء میں معلمی کے زمانے میں ان کے ذوق و رجحان میں تبدیلی آئی، اب ان کی پرواز مدرسہ کی چہار دیواری تک محدود نہیں رہنا چاہتی تھی اور وہ کسی صالح تحریک دعوت سے وابستہ ہونے کے لئے فکرمند رہتے، اس زمانے میں وہ مولانا مودودی کے مضامین سے بہت متاثر ہوئے اور چند برس تک حلقہ لکھنؤ کی جماعت اسلامی کے ذمہ دار بھی رہے۔ پھر مولانا محمد الیاسؒ کی دینی دعوت سے ان کا ربط و تعلق بڑھا اور عمر تک اس میں مشغولیت اور سرگرمی رہی، وہ اپنی اصلاح و تربیت اور تزکیۂ نفس سے بھی غافل نہ تھے، اس کے لئے مشائخ و اولیاء کی خدمت میں برابر حاضری دیتے، مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ سے بیعت ہوئے، ان کی سوانح اور مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کا تذکرہ لکھا، چند بار مولانا تھانویؒ سے بھی ملے، مولانا مدنیؒ سے برابر تعلق رکھتے۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ سے اکثر ملتے، مولانا شاہ وصی اللہؒ، مولانا محمد احمد پرتاب گڈھیؒ اور حضرت شاہ یعقوب مجددیؒ کی خدمت میں بھی باریاب ہوتے، موخرالذکر کے ملفوظات مرتب کر کے شائع کیا، سیرت و کردار، اخلاق و عادات اور اوصاف و محامد میں اسلاف اور اپنے اجداد کا نمونہ اور اقبال کے مردِ مومن کا آئینہ تھے، ان کی کوئی جسمانی یادگار نہ تھی، شادی

بیادِ حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی میاں ندویؒ

● محمد نفیس حسن دھلوی

"زباں پہ بارِ الٰہا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے"

وہ جس کے نام کی شہرت تمام عالم میں
ابوالحسن علی ندوی ہیں ہر زماں کیلئے

حجاز و یثرب و یورپ کی بزم کی رونق
یہ کہکشانِ محبت کہاں کہاں کیلئے

دیارِ ہند میں رہ کر تھا رشک دو عالم
تراقیام زمیں پہ تھا آسماں کیلئے

ہر ایک تیرے لبِ حق پرست کا شیدا
تری زبان تھی گویا ہر اک زباں کیلئے

جہاں کسی کو نہ ہوتی تھی جنبشِ لب تک
وہاں زبان و قلم تھے یہ ترجماں کیلئے

چمن میں پھول تھے لیکن مہک نہ تھی کافی
ترا وجود تھا خوشبوئے گلستاں کیلئے

چمن کی نذر ہوتی مستقل متاعِ حیات
رکھا نہ تنکا کوئی اپنے آشیاں کیلئے

کسے خبر ہے کہ کیوں شمع دل پگھلتی تھی
فغانِ نیم شبی تھی غمِ جہاں کیلئے

یہی پیام تھا انسانیت کا ہو پرچار
یہی تھی بادِ صبا ملک میں اماں کیلئے

جہانِ ظلم کی خاطر مشاورت کا قیام
تڑپتا دل تھا یہ مظلوم کی فغاں کیلئے

نظر تھی عائلی قانون کی حفاظت پر
یہی جہاد تھا اس دیں کے پاسباں کیلئے

ہر ایک اہلِ سیاست ترے اشارے کا
ہمیشہ منتظر حرفِ خوش بیاں کیلئے

رہِ سلوک میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی
یہ حسنِ ظن رہا خود اپنے بدگماں کیلئے

اٹھائی جس نے بھی انگلی وہ گر گیا خود ہی
یہ سب تماشے تھے بس حق کے امتحاں کیلئے

تری حیات کی خوشبو سے آشکار ہوا
بہار آئی تھی تہذیبِ گلستاں کیلئے

عزیز و اقربا بوبکر و رابع و واضح
یہ لب کشا رہیں تکمیلِ داستاں کیلئے

اسی خیال سے لکھی ہے خود نوشت اپنی
کوئی بڑھا نہ دے کچھ زیبِ داستاں کیلئے

رضائے حق کی بشارت تھی آخری لمحہ
پیامِ زیست ہوئی مرگ علی میاں کیلئے

نفیس دی ہے خدا نے یہ نظم کی توفیق
مرے قلم میں تھی جرأت کہاں بیاں کیلئے

"نگہ بلند سخن دلنواز جاں پرسوز
یہی تھا رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے"

۱۹۳۴ء میں ہو گئی تھی، اپنے برادرزادہ و خواہرزادگان کو اپنی اولاد سے زیادہ مانتے تھے، معنوی اولاد اور نیازمندوں کی تعداد حد و شمار سے باہر ہے، جن کے غم واندوہ کا کون اندازہ کر سکتا ہے...

تدمع العین و یحزن القلب ولا نقول الا مایرضی ربنا وانا بفراقك لمحزونون۔ اللھم صب علیہ شآبیب رحمتك واغفر لہ برحمتك یاارحم الراحمین۔

صدی کی شخصیت

مولانا وحید الدین خاں

عالم اسلام کی معروف شخصیت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کو انتقال ہوگیا۔ مولانا موصوف ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی شخصیت گویا سو سالہ دور کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔ تاریخ میں وہ اس دور کی علامت کے طور پر دیکھے جائیں گے۔ ان کو بلاشبہ صدی کی شخصیت (MAN OF THE CENTURY) کہا جاسکتا ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بیک وقت مختلف اور متنوع خصوصیات کے مالک تھے۔ وہ ایک ممتاز عالم تھے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کو ان کے زمانہ میں غیر معمولی ترقی حاصل ہوئی۔ انھوں نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور اسی طرح دوسرے بہت سے اداروں کی کامیاب قیادت کی۔ بیسویں صدی میں اٹھنے والی تقریباً تمام بڑی بڑی اسلامی تحریکوں سے ان کا براہ راست یا بالواسطہ تعلق تھا۔ وہ ہر حلقہ اور ہر گروہ میں یکساں طور پر عزت و اعتماد کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کو بلا اختلاف ایک بین الاقوامی شخصیت کہا جاسکتا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک فرد اپنی قوم میں نمائندہ قوم کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ مولانا موصوف کو یہی حیثیت حاصل تھی۔ ایسا شخص کسی قوم کے لئے بے حد قیمتی ہے۔ اپنی اس حیثیت کی بنا پر وہ پوری قوم کے لئے شیرازۂ اتحاد بن جاتا ہے۔ وہ اپنی قوم اور دوسری قوموں کے درمیان علمی رابطہ کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ وہ تمام لوگوں کے لئے مرجع قوم بن جاتا ہے۔ یعنی ایک ایسا شخص جس سے پوری قوم کے معاملہ میں رجوع کیا جاسکے وغیرہ

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ذات میں یہ تمام حیثیتیں بر تمام و کمال جمع ہوگئی تھیں۔ مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے ایک بار مولانا موصوف کو "رجل موہوب" کہا تھا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے لئے یہ خطاب لفظ بلفظ درست ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا کارنامۂ حیات تقریباً پوری صدی پر پھیلا ہوا ہے۔ وہ اپنی ذات میں ایک متحرک صدی تھے۔ صدی کی آخری تاریخ کو یہ متحرک شخصیت خاموش ہوگئی۔ وہ انسانوں سے ہو کر اپنے رب سے جا ملی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے اندر بیک وقت مختلف اور متنوع خصوصیات موجود تھیں۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے کہا تھا کہ یورپ میں جو کام اکادمی کرتی ہے، وہ ہمارے یہاں "یک آدمی" کرتا ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس قول کا ایک زندہ نمونہ تھے۔ وہ ایک فرد تھے مگر انھوں نے کئی اداروں کے برابر کام کیا۔

مولانا موصوف نے ایک طرف دارالعلوم ندوۃ العلماء جیسے ادارہ کے ذریعہ مسلمانوں کو علم دین سے بہرہ ور کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف موسسہ مطالعات و تحقیقات اسلامی لگزمبرگ جیسے اداروں کے ذریعہ لوگوں کے لئے عصری معرفت کا سامان کیا۔ ایک طرف انھوں نے اپنی موثر تقریروں کے ذریعہ مسلمانوں میں علمی جوش کو ابھارا اور دوسری طرف انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ انھیں گہرے علمی شعور سے آشنا کیا۔

ایک طرف انھوں نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذریعہ مسلمانوں کے ملی تحفظ کا انتظام کیا تو دوسری طرف "پیام انسانیت" کی تحریک کے ذریعہ انھیں داعی کے مقام پر کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ ایک طرف انھوں نے "ردۃ ولا ابا بکر لہا" جیسی کتابوں کے ذریعہ مسلمانوں میں دفاع اسلام کا جذبہ ابھارا اور دوسری طرف "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" جیسی کتابوں کے ذریعہ مسلمانوں کو اپنی تعمیر نو کی طرف متوجہ کیا۔ ایک طرف انھوں نے رابطہ العالم الاسلامی کے اہم رکن کی حیثیت سے عالمی مسلم اتحاد کی کوشش کی اور دوسری طرف رابطہ ادب اسلامی کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں کے اندر علم و ادب کے حصول کا شوق ابھارا۔ ایک طرف انھوں نے مدارس دینیہ کے قیام کے ذریعہ قدیم علوم کو زندہ کیا اور دوسری طرف آکسفورڈ یونیورسٹی کے اسلامک سنٹر کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں کے اندر جدید علوم کے ماہر پیدا کرنے کی کوشش کی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ذات بہت سی اعلیٰ قدروں کا نمونہ بن گئی تھی۔ انھیں میں سے ایک چیز وہ ہے جس کی بابت کہا گیا ہے کہ ــــ دنیا سے بے نیاز ہو جاؤ، دنیا خود تمہاری طرف دوڑ کر آئے گی۔ مولانا موصوف دنیا کی چیزوں سے بے نیاز ہو گئے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا نے خود اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیا۔

ایک بار ایک عرب سلطان ندوۃ العلماء (لکھنؤ) آئے۔ ان کے استقبالیہ میں جو جلسہ ہوا اس میں تقریر کرتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ایک عرب بزرگ کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا تھا: نعم الامیر علی باب الفقیر وبئس الفقیر علی باب الامیر۔ مولانا موصوف ساری زندگی اہل دنیا سے بے نیاز رہے مگر اہل دنیا نے خود اپنی ساری متاع ان کے سامنے پیش کر دی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا گیا۔ ان کو بڑے بڑے ایوارڈ دیے گئے، مثلاً کنگ فیصل ایوارڈ اسی طرح برونائی اور عرب امارات کے خصوصی ایوارڈ وغیرہ۔

مولانا موصوف کی ذات اس حقیقت کی ایک عملی مثال تھی کہ مال، عہدہ، عزت سب انسان کے تابع ہیں نہ کہ انسان ان چیزوں کے تابع ہے۔ انسان اگر اپنی انسانیت کو بلند کرلے تو بقیہ تمام چیزیں اپنے آپ اس کو حاصل ہو جائیں گی، بغیر اس کے کہ اس نے ان چیزوں کے لئے براہ راست جد و جہد کی ہو۔

ایک شاعر نے کسی کے بارے میں کہا تھا: "وہ اپنی ذات میں اک انجمن ہیں"۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ اپنی ذات میں ایک عالم تھے۔ ان کی موت بلاشبہ موت العالِم موت العالَم کی مصداق ہے۔ تاہم قابلِ اطمینان بات یہ ہے کہ مولانا موصوف نے اپنے پیچھے اپنے شاگردوں کی عظیم تعداد چھوڑی ہے۔ یقین ہے کہ مولانا موصوف کے بعد ان کی تربیت سے فیض یافتہ یہ حضرات اس عربی شعر کا مصداق ثابت ہوں گے: إذا مات منا سید قام سید (جب ہمارا ایک سردار وفات پاتا ہے تو دوسرا سردار کھڑا ہو جاتا ہے)۔

وہ ایک لفظ منوّر مفکرِ اسلام

● تسنیم فاروقی لکھنؤ

ان آٹھ حرفوں کے اندر ہزار معنی ہیں
ہزار رنگ ہیں بھی بے شمار معنی ہیں

یہ محض لفظ نہیں ہے خطابِ اعلیٰ ہے
یہ صرف قول نہیں ہے عمل کا طغرا ہے

وہ والقلم کا مفسر وہ شارحِ اقراء
وہ دیندار مکرم و مصلحِ دنیا

وہ آدمیت و انسانیت کا پرچم دار
سپاہ دعوت و حدت کا قافلہ سالار

وہ بدرِ عصر تھا ملت کی آگہی کے لئے
ہیں سوگوار سبھی بوالحسن علیؒ کے لئے

معاشرہ ہو کہ دین مبین ہو کہ ادب
سب اس کی پاک نگاری میں غرب ہو کہ عرب

وہ رشد خاص جو ندوہ کے جسم و جان میں ہے
امیر اس کا مری حسرتِ بیان میں ہے

یہ علم راز جہاں سے نجوم چمکے ہیں
دھنی قلم کے وقارِ علوم چمکے ہیں

وہ جن کے علم پہ ہندوستان فخر کرے
زمین ناز کرے آسمان فخر کرے

اگرچہ سب کی کتابوں کا ذکر ٹھن جائے
تو کائنات پہ اک سائبان بن جائے

جو روح کو سبق ایماں کا یاد ہوتا ہے
تو یوں ہی فکر و عمل سے جہاد ہوتا ہے

جہاد والوں کو مرحوم، لوگ کہتے ہیں
وہ جد و جہد کے شانوں پہ زندہ رہتے ہیں

وہ لا الٰہ کا داعی محرکِ اعظم
بس ایک درد کہ اسلام کا بڑھے دم خم

وہ ایک ساجد و عابد وہ پیکرِ ایثار
وہ ایک دور، وہ مقصد، وہ علم کا مینار

وہ دین مصطفوی کا مجاہدِ عریاں
وہ مجتہد وہ مبلغ وہ ہادیٔ دوراں

یہ مدعا تھا نہ اب گھر جلیں نہ باغ جلیں
صداقتوں کے لئے کچھ دل و دماغ جلیں

جو ملحدین ہیں چاہے وہ داغ داغ جلیں
فصیل دہر پہ حق کے لئے چراغ جلیں

زمینِ ہند سے وہ ایسا رہنما اٹھا
کہ جس سے دفترِ آفاق جگمگا اٹھا

یہ قصد تھا کہ چمن لالہ زار ہو جائے
یہ سعی تھی کہ وطن خوشگوار ہو جائے

چمن تو نکہتِ ایثار سے مہکتا ہے
ہمیشہ ثمرۂ نورِ عمل چمکتا ہے

علی میاںؒ کی حضوری میں محفلیں وہ کہاں
وہ مسکراتی صفیں اور شفقتیں وہ کہاں

وہ نرم لہجہ وہ لطفِ خطابِ عام کہاں
وہ رنگِ فجر کہاں وہ سکونِ شام کہاں

تمام ایسے کیا زہد و اتقا کا سفر
ہو جیسے عرش کی جانب کسی دعا کا سفر

امین شرع و فقہ خاکسار ہو کے گیا
صدی کی کاہکشاں پر سوار ہو کے گیا

وہ رب کی راہ میں سورج تھا زندگی کے لئے
صدی کا آخری دن تھا نئی صدی کے لئے

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

پروفیسر ضیاء الحسن ندوی

۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء مطابق ۲۲ر رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ اسلامیان عالم کے لئے عموماً اور مسلمانان ہند کے لئے خصوصاً ایک ایسا دن تھا جس نے اس پورے سال کو "عام الحزن" غم کا سال بنادیا۔ بیسویں صدی کا یہ آخری سال جاتے جاتے دل مسلم پر کیسے کیسے داغ لگا گیا، نہ جانے کب تک ان سے دھواں اٹھتا رہے گا۔ فقہ اسلامی کے عالمی شہرت یافتہ ماہر شیخ مصطفیٰ الزرقاء، عربی زبان کے بے مثال ادیب وخطیب شیخ علی طنطاوی، حدیث کے عالم بے بدل شیخ ناصر الدین البانی، سعودی عرب کے سب سے بڑے عالم، دارالافتاء والارشاد کے بانی وصدر شیخ عبد اللہ بن باز، سب اسی ایک سال کے اندر دنیائے فانی سے کوچ کرکے راہی ملک بقا ہو گئے۔ اور اس سال کے آخری دن ایک طرح ہمارا آخری سہارا بھی چھین لے گیا۔ علی میاں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ عالم اسلام عہد آفریں شخصیت سے اور دار العلوم ندوۃ العلماء اپنے سرپرست سے محروم ہوگیا۔

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے

۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جامع مسجد میں نماز جمعہ کے بعد برادرم ڈاکٹر شفیق احمد خاں ندوی، صدر شعبہ عربی نے جب یہ اندوہناک خبر سنائی تو تمام سننے والوں کے (جن میں یہ خاکسار اور برادر گرامی پروفیسر محمد اجتبا ندوی بھی شامل تھے) دل کی حالت چہروں سے جھلک رہی تھی۔ صبر کا دامن چھوٹنے کو تھا کہ جامعہ کے قدیم ومحترم استاد ڈاکٹر اکرام خاں صاحب کی زبان سے ادا ہوا یہ جملہ پردہ سماعت سے ٹکرایا "مسلمانوں کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے بڑا کوئی غم نہیں ہے" اور زخم پر مرہم کا کام کر گیا۔ سچ ہے حیات جاوداں تو آخرت ہی کے لئے ہے، اس عالم آب وگل کے لئے تو فنا مقدر ہے ۔

بہ گیتی گر کسے پائندہ بودے
ابو القاسم محمد زندہ بودے

مولانا کی حیات بھی خوش گوار تھی اور وفات بھی شاندار، قدرت نے انہیں ایسی ہر دلعزیزی عطا کی تھی جس کی آرزو سے شاید کوئی دل خالی نہ ہو۔ مقبولیت بارگاہ ایزدی کا تاج آخری سانس تک سر پر رہا۔ وہ ایک فقیر بے نوا تھے جنہوں نے بے تاج بادشاہی کی، بے شمار دل ان کے قلم رو میں تھے، ان کی تقریر وتحریر "از دل خیزد بر دل ریزد" کی زندہ مثال تھی، وہ کبھی کاسۂ گدائی لئے کسی بڑے سے بڑے دربار میں نہیں دیکھے گئے، البتہ صاحبان دربار کی تمنائے باریابی کے شاہد ہزاروں ہیں، کسی سلطان جابر کا رعب انہیں کلمۂ حق سے باز نہ رکھ سکا، اپنی گوناگوں علمی، سماجی وملی ذمہ داریوں کے باوجود اپنے معمولات، اوراد واذکار میں کبھی کمی نہ آنے دی بلکہ اس میں ادنیٰ تقدیم وتاخیر بھی گوارا نہ کی۔ دینی غیرت وحمیت اور حُبِّ رسول میں جس نے کسی بڑے سے بڑے حاکم کی پرواہ نہ کی ہو۔ خوش گوار زندگی کی اس سے زیادہ واضح، روشن، بے داغ اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔

رمضان کا مبارک مہینہ فالج زدہ اور کمزور جسم کے ساتھ تمام روزے پورے کئے، ایک وقت کی فرض نماز کیا، سنت ونفل بھی فوت نہیں ہوئی۔ ذکر وتلاوت میں شمہ برابر کمی نہ آئی، شدید علالت میں بھی جس کی جماعت نہ چھوٹی ہو، جمعہ کے تمام مسنون آداب سے آراستہ، تقویٰ طہارت کا پیکر حسب معمول مسجد جانے کے لئے تیار، دوران تلاوت جب سورہ یٰسین کی گیارہویں آیت "فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَأَجْرٍ كَرِيمٍ" (اسے مغفرت اور اجر کریم وعظیم کی خوشخبری سنادو) پر آخری سانس پر روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، کیا کوئی موت اس سے زیادہ قابل رشک اور شاندار ہو سکتی ہے؟

وفات کی خبر تیز ترین ذرائع ترسیل وابلاغ کی بدولت ساری دنیا میں اسی دن پہونچ گئی، امام حرم کعبہ شیخ محمد بن عبد اللہ السبیل نے فرمایا: "اس سانحہ اور اس محرومی پر ہم کسی اور سے کیا تعزیت کریں کہ ہم خود بلکہ ساری امت اسلامیہ آج سزاوار تعزیت ہے"۔ رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر عبد اللہ صالح العبید کا تاثر تھا کہ: "وہ اتحاد ویگانگت کا نمونہ، قوم وملت کے رہنما اور بے مثال دیدہ ور تھے"۔ عالمی رابطہ ادب اسلامی جس کی بنیاد ہی فکر ابو الحسن کی رہین منت ہے، کے نائب صدر اور سکریٹری جنرل ڈاکٹر عبد القدوس ابو صالح نے مولانا کو خیر وبرکت کی علامت قرار دیا اور لکھا کہ: "اس عظیم شخصیت کا رعب مخالف وموافق سبھی دلوں پر تھا، ان کا بدترین مخالف

بلکہ انھیں نظرانداز کرنے کی جسارت نہیں کرسکتا تھا۔ عالمی رابطۂ ادب اسلامی اپنے بانی صدر کے بعد دختر یتیم کی مانند ہے کہ اس کی تمام سرگرمیاں صاحب ذات والاصفات کی رہنمائی اور دعاؤں کی رہین منت ہیں۔

ادارہ امور اسلامیہ قطر کے ڈائریکٹر خلیفہ جاسم الکواری نے لکھا کہ "اس عالم جلیل اور یگانہ روزگار شخصیت سے محرومی مسلمانان عالم کے دل پر لگنے والی ایسی چوٹ ہے جس نے ان زخموں کو تازہ کردیا جو حالیہ برسوں میں ممتاز ترین علمائے دین کی ایک پوری کہکشاں کے غروب ہوجانے سے ان کے دل پر لگے تھے۔"

جمعیۃ علماء کے صدر مولانا سید اسعد مدنی نے فرمایا "مولانا کی شخصیت ساری دنیا کے لئے قابل احترام تھی" کل ہند مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری نے فرمایا "مولانا مرحوم کی ذات عالم اسلام کے لئے عموماً اور مسلمانان ہند کے لئے خصوصاً بہت بڑی نعمت خداوندی تھی" وقف دار العلوم دیوبند کے ناظم اعلیٰ مولانا محمد سالم قاسمی نے لکھا: "بیسویں صدی کی آخری جو تہائی میں پورے عالم اسلام میں کوئی دوسری شخصیت ان کی ہم پلہ نظر نہیں آتی" غلام محمود بنات والا، صدر کل ہند انڈین یونین مسلم لیگ کہتے ہیں: "دنیا ایک قدآور شخصیت سے محروم ہوگئی" مولانا محمد سراج الحسن، امیر جماعت اسلامی ہند نے دعا کی "مولانا علی میاں کی سرپرستی و رہنمائی میں ملک و ملت کی جو خدمات انجام پارہی تھیں، اللہ تعالیٰ انھیں شرف قبولیت بخشے۔"

نائب صدر جمہوریہ ہند شری کرشن کانت فرماتے ہیں "انھوں نے ساری ہندستانی تہذیب کی سوچ کو ایک نئی سمت دی" وزیر اعظم ہند نے کہا: "ہم نے ایک عظیم دانشور اور مفکر کھودیا" سابق وزیر اعظم وی پی سنگھ نے مولانا کی وفات کو اپنا ذاتی نقصان قرار دیا۔ صدر کانگریس سونیا گاندھی فرماتی ہیں: "ہم نے نہ صرف ایک اسلامی دانشور بلکہ دنیا کا سب سے بڑا قابل تعظیم مذہبی رہنما کھودیا ہے" وزیر اعلیٰ اتر پردیش کہتے ہیں "اسلام کے جید عالم نے پیام انسانیت کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا"

ممتاز مفکر مولانا وحید الدین خاں نے لکھا "ان کی شخصیت گویا سو سالہ دور کا احاطہ کئے ہوئے تھی، تاریخ میں وہ اس دور کی علامت کے طور پر دیکھے جائیں گے، ان کو بلاشبہ صدی کی شخصیت (MAN OF THE CEN-TURY) کہا جاسکتا ہے۔"

سعودی عرب کے روزنامہ عکاظ نے لکھا "وہ رہنما جس نے دنیائے اسلام کی شخصیت کا لوہا منوالیا" وہیں کے روزنامہ المدینہ نے لکھا "بیسویں صدی کے ساتھ اس کا مایۂ ناز سپوت بھی رخصت" جدہ کا روزنامہ اردو نیوز کہتا ہے "علی میاں کی وفات اس صدی کا آخری نقصان" عربی پریس کہتا ہے "ایک چراغ اور بجھا اور بڑھی تاریکی" ہندوستانی اخبارات لکھتے ہیں "وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان"، "اسلامی تاریخ و ادب کا آفتاب غروب ہوگیا"، "خانہ کعبہ کا کلید بردار نہ رہا"، "ایک عہد اور صدی کا خاتمہ"۔

یہ تعزیتی تبصرے جو سیکڑوں ہزاروں بیانات میں سے چند ہیں صرف اس لئے نقل کئے گئے کہ عام انسانی دنیا خصوصاً امت اسلامیہ کے ہر درد و غم کو اپنے دل پر لینے والی شخصیت اور اس پر نم ہونے والی آنکھ جب دنیا سے رخصت ہوئی تو ایسا محسوس ہونے لگا کہ دل کی جگہ محض گوشت کا ایک لوتھڑا اور آنکھ کی جگہ محض شیشے یا پتھر کا ایک ٹکڑا رہ گیا ہے۔ محرومی کی فضا میں یہ احساس ستانے لگا کہ شاید اسلام اور مسلمانوں کے اس آڑے وقت پر کوئی دوسری رونے والی آنکھ اور پگھلنے والا دل باقی نہ رہے حالانکہ اس ناامیدی اور مایوسی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ خون صد ہزار انجم سے سحر کی نمود کا مشاہدہ دنیا نے بار بار کیا ہے۔ مجھے یہ ماننے میں تامل ہے کہ مولانا کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کبھی بھی پر نہ ہوگا۔ میرا اور میری طرح پوری امت اسلامیہ کا ایمان ہے کہ علی میاں تو رخصت ہوگئے لیکن ان کا اور پوری کائنات کا خالق و مالک موجود ہے، وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا اور اس مجدد عصر کا بدل اور نعم البدل امت کو ضرور عطا کرے گا۔ آج اس غم کو ہلکا کرنے کے لئے ہمیں اسلام کے قرن اول کا وہ سانحۂ عظیم یاد آتا ہے جس پر عمر فاروقؓ جیسے آہنی اعصاب کا مالک بھی تھوڑی دیر کے لئے جیسے توازن کھو بیٹھا تھا اگر کسی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر زبان سے نکالی تو سر تن سے جدا کر دیا جائے گا۔ رنج و غم کی اس بوجھل فضا اور ذہنی و اعصابی تناؤ کے اس پرخطر ماحول میں اللہ کا ایک برگزیدہ بندہ مسجد نبوی کے منبر پر کھڑے ہوکر ارشاد فرماتا ہے کہ "لوگو! جو کوئی محمد کو پوجتا تھا وہ سن لے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے جا چکے پر جو اللہ کو پوجتا تھا وہ یقین رکھے کہ اللہ زندہ ہے، اسے کبھی موت نہیں ہے" یہ الہامی فقرے دل و دماغ کے زخموں پر مرہم بن کر نازل ہوئے، فکر و عمل کا کھویا ہوا توازن بحال ہوگیا اور لوگ محسن انسانیت کی ہدایات و تعلیمات کے حرف حرف پر عمل پیرا ہوگئے۔ تاریخ انسانیت کا یہ عظیم حادثہ اور اس کا سبق آموز ردعمل آج ہمیں بھی درس توازن دے رہا ہے اور جانے والے کے بہترین اور

مثالی شب و روز کی پیروی کا حوصلہ بخشتا ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی علمی اور تصنیفی خدمات اور ان کو ملنے والے علمی اور ادبی اعزازات کا تذکرہ اور تفصیل اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں ہے تاہم ایک اجمالی جائزہ بے موقع بھی نہیں ہے۔

۱۔ مولانا کی کتاب "نبی رحمت" جو اصلاً عربی زبان میں لکھی گئی ہے اردو میں اس کا ترجمہ مرحوم سید محمد الحسنیؒ نے کیا۔ یہ کتاب سیرت سید المرسلین پر ایک شاہکار تصنیف ہے۔

۲۔ "المرتضیٰ" حیات امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر عربی میں ایک نہایت متوازن کتاب ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

۳۔ "تاریخ دعوت وعزیمت" مولانا کی ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے جو اس موضوع پر اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ اس کے عربی اور انگریزی اور ترکی ایڈیشن بھی موجود ہیں۔

۴۔ "سیرت سید احمد شہیدؒ" کے نام ہی سے اس کا موضوع ظاہر ہے۔

۵۔ "مطالعہ قرآن کے اصول ومبادی"

۶۔ "نقوش اقبال" مولانا کی اصل عربی تصنیف "روائع اقبال" کا اردو ترجمہ ہے اور عالم عرب میں اقبال شناسی کا سب سے مستند ذریعہ ہے۔

۷۔ "مذہب وتمدن" عربی اور انگریزی میں بیروت، لکھنؤ اور کراچی سے شائع ہوئی۔

۸۔ "کاروان زندگی" سات ضخیم جلدوں میں مولانا کی خود نوشت سرگذشت حیات ہے۔

۹۔ "ارکان اربعہ" اسلام کے چار بنیادی ارکان نماز، روزہ، حج وزکاۃ اور اسلام کی اجتماعی زندگی میں ان ارکان کی اہمیت اور رموز واسرار کی تشریح کرتی ہے۔ عربی میں بیروت، ترکی زبان میں انقرہ، اردو اور انگریزی میں لکھنؤ اور کراچی سے شائع ہو چکی ہے۔

۱۰۔ "پرانے چراغ" تین ضخیم جلدوں پر مشتمل معاصر بزرگوں، دوستوں اور اساتذہ کے دلکش تعارف، تاثرات ومشاہدات کا مجموعہ ہے۔

۱۱۔ "منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین" اپنے موضوع پر شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔

۱۲۔ "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" مولانا کی وہ شہرہ آفاق تصنیف جو اس وقت دنیا کی چھ زبانوں عربی، انگریزی، فرانسیسی، اردو، فارسی اور ترکی میں طبع ہو چکی ہے۔ کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ عربی میں اس کے ۱۴، اور اردو میں گیارہ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

۱۳۔ "اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" اصلاً عربی زبان میں چھپی ہے، انگریزی اور اردو میں اس کا ترجمہ ہوا۔

۱۴۔ "پا جا سراغ زندگی" ان تقاریر کا مجموعہ ہے جو طلبائے مدارس کے سامنے مختلف مواقع پر کی گئی تھیں۔

۱۵۔ "حیات عبدالحئیؒ" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مولانا کے والد کا تذکرہ ہے۔

مولانا کی کم وبیش دو سو کتابوں کے تعارف کے لئے عمر نوح اور عزم کوہ کن چاہئے، تب شاید کئی جلدوں میں اس کو سمیٹا جاسکے اس لئے یہیں قلم روکنے میں عافیت ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی زندگی کا اصلی جوہر ان کے فکر وعمل کا توازن، انسانیت اور انسانی اقدار پر اعتماد، خلق خدا سے بے پایاں محبت، نیز دنیا کے اعلیٰ ترین اعزاز واکرام کے باوجود ان کی بے مثال تواضع وانکساری میں پنہاں تھا۔ شفیق جونپوری نے ایک مرتبہ کہا تھا ؎

خاکساری تیری دیتی ہے پیام بوتراب
تیری دانائی میں انداز عمر پاتا ہوں میں
گر نہیں سیف وعلم، نوک قلم سے کام لے
اے علی ندوی تجھے کچھ باخبر پاتا ہوں میں

اس مرد دانا، پیکر دانش وبینش مجسم علم وعمل اور نمونہ تقویٰ وطہارت کو نہ جانے کب تک دنیا یاد کرتی رہے گی، شعرا اور ادبا اپنے خون جگر کو اس کے لئے جلاتے رہیں گے۔ ان کی وفات پر چار دانگ عالم سے موصول تعزیتی پیغامات وتاثرات کو زبان خلق کا درجہ دیا جاسکتا ہے جو حال وقال دونوں سے گواہی دے رہے ہیں کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی عالم اسلام میں عصر جدید کے نقیب اور عالمی انسانی سماج میں ایک فکر جدید کے داعی تھے، ان کی سرپرستی میں گذشتہ تقریباً نصف صدی سے جاری عربی ماہنامہ "البعث الاسلامی" کے سرورق پر موجود یہ جملہ برابر قارئین کو یاد دلاتا رہتا ہے کہ:

شعارنا الوحید ـ الی الاسلام من جدید

ہماری واحد پہچان ـ اسلام کی طرف ازسر نو کوچ نئے سرے سے اسلام کی جانب سفر ہے۔

علی میاں کے فکر وعمل پر زندگی بھر سادگی، انکسار واعتدال سایہ فگن رہا۔ ان کی بے مثال محبوبیت کا راز بھی شاید یہی تھا۔ وہ قدیم صالح اور جدید نافع کو ہمیشہ خود بھی قبول کرتے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے رہے۔

جامعۃ الرشاد (اعظم گڑھ) کے بانی اور ناظم اور اسلامی علوم کے عظیم مصنف مولانا مجیب اللہ ندوی کسی مغل شاہزادے کے تحقیر آمیز رویہ پر خواجہ میر درد کا یہ شعر ؎

زنہار ادھر کھولیو مت چشم حقارت
یہ فقر کی دولت ہے کچھ افلاس نہیں ہے

سراپا عزیمت و دعوت

خواجہ حسن ثانی نظامی، نئی دہلی

حضرت مولانا علی میاں علیہ الرحمہ کی ایک مشہور اور اہم کتاب کا نام "تاریخ دعوت و عزیمت" ہے۔ سچ پوچھیے تو اس کتاب کا عنوان صاحب کتاب کی اپنی زندگی کا عنوان بھی ہے۔ دو لفظوں میں کسی بڑی علی میاں جیسی شخصیت کا بیان مشکل ہی نہیں ناممکن سی بات ہے لیکن مرحوم اس مشکل کو خود آسان فرما گئے انھوں نے دعوت و عزیمت کی تاریخ ہی نہیں لکھی خود اپنے آپ کو بھی اس تاریخ کا ایک بہت اہم حصہ بنا کر دکھا دیا۔ پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے سے دوری بتدریج خیر و برکت سے دوری اور عزیمت و دعوت کی تحریک کے انحطاط کا نمونہ بھی خود ہادیٔ اعظمؐ کے قول و ارشاد کے مطابق بنتی رہی۔ لیکن اسلام اور مسلمانوں کی طویل تاریخ کے دوران الحمد للہ وہ برا وقت کبھی نہیں آیا کہ اسلام اور عزیمت و دعوت کے سچے نمونوں کا فقدان ہو گیا ہو۔ جس زمانے کو ہم خیر القرون کے نام سے یاد کرتے ہیں اس کو بھی فتنوں کے ظہور اور جمل و صفین جیسی جنگوں کے باوجود خیر القرون ہی کہا اور مانا جاتا ہے۔ اس طرح موجودہ گئے گزرے زمانے میں بھی حضرت علی میاں جیسی شخصیتوں کا تواتر کے ساتھ باقی رہنا ثبوت ہے اس بات کا کہ چراغ مصطفویؐ برابر روشن رہا ہے۔ حضرت مرحوم نے دعوت و عزیمت کے پرچم کو بلند رکھ کر اپنی صدی اپنے زمانے کو بے مایہ ہونے سے بچا لیا۔ ان کے کام اور ان کی فیض بخش ذات کے اثر و نفوذ کا یہ عالم رہا کہ مشرق سے مشرق یعنی جغرافیائی اعتبار سے برونائی سے برونائی تک صرف عالم اسلام ہی میں نہیں کل جہان میں اس کمزور، بیمار اور نحیف انسان کی آواز پہنچتی رہی اور اثر انداز ہوتی رہی، اس کے توحید نشان لہجے کی دھمک صنم کدوں میں لرزہ ڈالنے کو کافی ہوتی تھی۔

ایک اور اہم پہلو مرحوم کی شخصیت کا یہ ہے کہ وہ بیک وقت تصوف دوست اور تصوف مخالف حلقوں میں مقبول تھے یعنی جیسا اجماع ان کی ذات پر عام مسلمانوں کا تھا ایسا اجماع کم دیکھنے میں آتا ہے، پچھلے کچھ برسوں میں ایک افسوسناک صورتحال یہ پیدا ہو گئی تھی کہ خانقاہیں علم سے عاری ہونے لگیں اور مدرسے روحانیت سے محروم نظر آنے لگے۔ حضرت علی میاں نے بیک وقت مدرسے اور خانقاہ کی لاج رکھی کہ نہ اس کو روحانیت سے خالی رکھا، نہ اس کو علم سے محروم ہونے دیا۔ وہ خود ایک صاحب اجازت اور صاحب نسبت بزرگ تھے، نقشبندیہ سلسلے کے علاوہ چشتی نظامی اور صابری اجازتوں سے آراستہ پیراستہ اور ہمیشہ فعال و سرگرم۔

علم و ادب، تعلیم و تربیت، روحانیت، دینی عظمت سیاسی بصیرت ہر حیثیت سے حضرت علی میاں فضائے بسیط اور آسمانوں کے آدمی تھے۔ لیکن اپنا جو روپ وہ ہمیں دکھا گئے وہ زمین کے انسان اور دھرتی کے باسی کا روپ رہا۔ نہ ثقہ علمائے کرام کا ساجبہ و دستار نہ تارک دنیا بے نیاز فقراء کی سی پیوند کاری بس اپنے علاقے یوپی، لکھنؤ کے پڑھے لکھوں اور شرفاء کا عام لباس کرتا پائجامہ شیروانی ہی کے کپڑے سے بنی اچکن کیپ، نشست و برخاست گفتگو کا انداز سب ویسا ہی۔ مگر ایک لحاظ سے منفرد بھی۔ لکھنؤ اسکول الفاظ کی ریل پیل اور آئینہ بندی سے عبارت سمجھا جاتا ہے، مگر علی میاں کے یہاں الفاظ بہت ہی احتیاط سے چنے ہوئے ہوتے۔ ہر لفظ باون تولے پاؤ رتی کی روایتی تول پر پورا اترنے والا، بیان میں نہ کہیں افراط نہ کہیں تفریط، مبالغے سے ایسا پاک اور بری کہ دوربین خوردبین کسی سے جانچ لیجیے، کسی بھی پیمانے سے ناپ لیجیے، میزان سے اتری اس میں کوئی چیز نہیں ملے گی۔ دو چار دفعہ کا صحبت یافتہ بھی اندازہ کر لیتا تھا کہ حضرت صرف متین اور سنجیدہ ہی نہیں ہیں، انھوں نے اپنے کسی لمحے کو نہ غیر ضروری طور پہ استعمال کیا ہے نہ وہ لفظوں کی فضول خرچی کے عادی ہیں۔ اسی طرح لاتو موضوعات سے بھی انھیں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بس یوں لگتا تھا جیسے لکھنؤ کی اجارہ داری کے ساتھ ہی وہ دہلی اسکول کی سادگی اور پرکاری کا سرمایہ بھی سارا کا سارا اپنے ساتھ اٹھا کر رائے بریلی لے گئے ہوں، متانت اور سنجیدگی ان کی شخصیت میں کچھ زیادہ ہی تھی شوخی نے دربار عالی میں شاید کبھی بار نہیں پایا۔ اور شوخی کا کیا مذکور چلتی ہوئی بات کو بھی غالباً اپنی چلت پھرت دکھانے کی اجازت ان کے ہاں کبھی نہیں ملی۔ عربی زبان و ادب میں ان کی شان اور آن بان سے تو خیر راقم الحروف نا آشنا ہے، لیکن اردو کی حد تک یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ سنجیدگی کے ایسے ہالے میں رہنے والا بندہ بولے تو اور لکھے تو، نرمی اور گداز ہولے ہولے قدموں سے وجدان و احساس کو یوں آن جگائیں۔ اور ذوق و شوق اور کیفیات کی پھواریں یوں حرف حرف سے چھوٹیں اسے حیرت ہی حیرت نہ کہیے تو کیا کہیے — مگر لاریب حیرت لیے ہو جو علی میاں سید زادے کے نانا پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ

(باقی صفحہ ۱۴۰ پر)

حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی حسنی ندوی علیہ رحمۃ

عرب علماء و دانشوروں کی نظر میں

● محمد شاهد ندوی بارہ بنکوی

"اپنی ذات میں انجمن" کی معروف اصطلاح یوں تو کئی لوگوں کے لئے استعمال کی گئی ہے لیکن کلید بردار خانہ کعبہ عالم عرب کے دل کی دھڑکن اور عالم اسلام کے جید عالم دین مفکر اسلام حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات والا صفات پر جس طرح یہ بات بجا طور پر صادق آتی ہے۔ اس طرح شاید کسی اور پر فی الوقت صادق نہ آسکے۔

حضرت مولانا ہندوستان کی اہم اور عظیم دینی تنظیموں، جماعتوں، تحریکوں اور اداروں سے وابستہ رہنے کے ساتھ ساتھ رابطہ عالم اسلامی کی مجلس عاملہ کے رکن، مؤتمر عالم اسلامی بیروت کی مجلس عاملہ کے ممبر، دمشق یونیورسٹی اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے سابق وزیٹنگ پروفیسر، اسلامک سینٹر جنیوا کی مجلس انتظامی کے رکن اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے اسلامک سینٹر لندن کے سربراہ تھے، مولانا کو ان تنظیموں اور اداروں میں ایک ممتاز حیثیت حاصل تھی جس کا اعتراف عرب علماء اور مفکرین اپنی تحریروں اور تقریروں میں برابر کرتے تھے،

حضرت مولانا کو عربوں نے ان کی دینی دعوتی خدمات کے اعتراف میں جو خطوط اور مکتوبات لکھے، اور ان میں عالمانہ بلند کلمات سے نوازا۔ ان سے ان کے حضرت مولاناؒ سے والہانہ عقیدت مندانہ بلکہ نیازمندانہ و محبت آمیز تعلق کا اظہار ہوتا ہے اور ان کی وفات کے بعد جو انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں کے نام تعزیتی خطوط لکھے اور اپنے رنج و غم کا اظہار کیا اور ان کے عربی اخبارات میں جو تأثرات شائع ہوئے ہیں۔ ان سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ عربوں کے دلوں میں حضرت مولاناؒ کی کتنی قدر و منزلت تھی اور ان کی عند اللہ اور عند الناس کتنی مقبولیت تھی واضح طور پر سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا کی عملی تفسیر معلوم ہوتی ہے، ہم ان جلیل القدر عرب علماء جنھوں نے حضرت مولانا کو برکۃ العصر کہا۔ ان کے بارے میں ان کے بلند کلمات و آراء کے کچھ نمونے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین کا مقام

ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین کے واسطہ سے مصر کے مشہور اہل قلم اور عالم عرب کے نامور محقق و مفکر اور قائد و مجاہد سیّد قطب شہید اپنے قلمی تأثرات میں حضرت مولاناؒ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"عصر حاضر کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کی جائے ان میں ماضی پر اعتماد مستقبل کے بارے میں امید اور حوصلہ پیدا ہو اس دین پر ان کا ایمان و یقین تازہ اور زندہ ہو جائے جس کا نام تو وہ لیتے ہیں لیکن اس کی حقیقت سے ناآشنا ہیں۔ ان کا تعلق اس دین سے زیادہ تر نسلی اور موروثی ہے، انھوں نے اس کو سمجھنے کی بہت کم کوشش کی ہے۔

اس موضوع پر تمام قدیم و جدید لٹریچر میں چند بہترین کتابیں جو میری نظر سے گذری ہیں ان میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی جدید تصنیف "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" خاص مقام رکھتی ہے"

(مقدمہ ماذا خسر العالم)

پوری انسانیت کے مربی و محسن

ترکی میں حضرت مولاناؒ کا تعارف کراتے ہوئے مصر کے مشہور عالم ڈاکٹر احمد یونس نے فرمایا

"مولانا سید ابوالحسن علی ندوی پوری انسانیت کے مربی و محسن اور رہنما ہیں اور عرب و عجم ان کی دعوت و فکر سے نہ صرف آشنا بلکہ قدرداں ہیں"

ڈاکٹر احمد یونس مصری

تاریخ کی روشن و شاندار علمی صفات

عظیم محدث اور ممتاز مفکر و داعی شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ صاحب حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے بڑا والہانہ تعلق رکھتے تھے جس کا کچھ اندازہ ان کے خطوط سے لگایا جاسکتا ہے وہ اپنے خط میں حضرت مولانا کو بڑے شاندار القاب و عنوان سے خطاب کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے آپ کو قلم کی طاقت، تحریر کی تاثیر اور اخلاص کی دولت سے نوازا ہے آپ کی باتیں۔ نوجوانانِ ملتِ اسلامیہ کے دلوں کی کنجی ان کے ارادوں اور ہمتوں کی بیداری اور کامیاب فہم جوئی کا وہ پیغام ثابت ہوتی ہیں جس سے امتِ مسلمہ کا پہلا قافلہ بہرہ ور تھا"

میرے محترم! آپ کو اللہ تعالیٰ نے جو دولت

علما کی ہے، اپنے خلوص دل، عقل روشن اور حسن کردار کے حامل ہونے کے سبب آپ ان معانی کو بیان کرنے کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔

محبکم عبدالفتاح ابو غدہؒ ریاض
۱۹/۷/۱۴۱۰ھ

(تعمیر حیات، ۱۰/ اگست ۱۹۹۰ء)

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں۔

"یحییٰ بن سعید ہم سے حدیث بیان فرماتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موتیوں کی بارش ہو رہی ہے واللہ آپ کی باتیں بھی ہمارے لئے ایسی ہی ہیں شکر اس خدا کا ہے جس نے آپ کو یہ نعمت دی اور اس پر قادر بنایا، اس کام کے لئے منتخب کر دیا اسکی قوت بخشی اور آپ کی شخصیت میں ہماری تاریخ کے روشن و شاندار علمی صفات دکھائے عالی مرتبت علماء سلف کی یاد تازہ کی، آپ الحمد للہ ان اسلاف کرام کو یاد دلانے کا بہترین نمونہ ہیں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اور اپنے رسول کی محبت پیدا فرما دی تھی۔ اور اللہ کی محبت کے سبب انہیں لوگوں میں محبوب بنا دیا تھا۔ آپ کا اس اعلیٰ نمونہ کا ہونا کوئی انوکھی بات نہیں کہ بڑے اور گھنے سایہ دار درخت کی شاخیں تازہ، ہری بھری اور شاداب ہی ہوا کرتی ہیں، وہ ہر وقت اور ہر جگہ اپنی عطر بیزی سے فضا کو معطر کرتا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کی عمر دراز فرمائے اور آپ کی بابرکت ذات کو عرصۂ دراز تک قائم رکھے۔"

محبکم عبدالفتاح ابو غدہؒ ریاض
۲۰/۴/۱۴۰۲ھ

(تعمیر حیات، ۱۰/ دسمبر ۱۹۸۹ء)

مولاناؒ کے علم و فہم اور فکر و بصیرت کا اعتراف

شامی اخوان کے مراقب عام ممتاز عالم و فقیہ اور شعلہ بار مقرر اور عظیم داعی ڈاکٹر مصطفےٰ السباعی صاحب، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ کی عالمانہ رفعت کے دل سے معترف اور سچے قدرداں تھے، یہاں ان کا وہ تاریخی مکتوب نقل کیا جاتا ہے جو انھوں نے ۱۹۵۵ء میں حضرت مولاناؒ کو دمشق یونیورسٹی میں بطور استاد تشریف آوری کیلئے لکھا تھا۔

سماحۃ الشیخ ابی الحسن علی الندوی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

غالباً آپ کو یہ علم ہو گیا ہوگا کہ دمشق کی سوریہ یونیورسٹی نے شریعت اسلامیہ کا شعبہ (کلیۃ الشریعۃ الاسلامیۃ) قائم کیا ہے، یونیورسٹی کے اس اقدام سے مسلمانوں اور حق و صداقت کے سبھی حامیوں کو خوشی ہوئی ہے۔

کالج کمیٹی نے مجھ سے خواہش ظاہر کی ہے اور وہ آپ کی منظوری کی امیدوار بھی ہے کہ میں آپ کو دو سال یا ایک سال کیلئے جیسا آپ پسند فرمائیں آپ کو یہاں درس دینے کی دعوت دوں کہ طلباء آپ کے علم اور اسلام کے پیغام کی گہری فہم و بصیرت سے فائدہ اٹھائیں۔

مجھے توقع ہے کہ آپ کی طرف سے جلد ہی وہ جواب ملے گا جو اس گرانقدر آرزو و تمنا کو عملی جامہ پہنانے کی نوید جانفزا لائے گا۔ ؎

مصطفےٰ السباعی
عمید کلیۃ الشریعۃ۔ دمشق
۱۲/ جون ۱۹۵۵ء

(تعمیر حیات ۲۵/ فروری ۱۹۹۰ء)

مولاناؒ کی شان و شکوہ

بلاد عربیہ کے مشہور و مایۂ ناز ادیب و انشاء پرداز صاحب قلم اور جید عالم دین شیخ علی طنطاوی صاحب حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے والہانہ اور عقیدتمندانہ تعلق و ربط رکھتے تھے اور ان کے علمی ذکری اور ادبی رفعت و برتری کے دل سے معترف اور بڑے مداح تھے۔

حضرت مولاناؒ نے اپنی کتاب "الطریق الی المدینۃ" (یہ جو عربی زبان و ادب کے شہ پاروں میں شامل ہے اور کاروان مدینہ کے نام سے اردو میں شائع ہو چکی ہے) شیخ علی طنطاوی سے حضرت مولانا رحمۃ اللہ نے مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی تو انھوں نے اس کے جواب میں جو کچھ لکھا اور جو حقائق ان کے مایۂ ناز قلم سے نکلے اس میں کتاب اور صاحب کتاب دونوں کا سراپا سامنے آگیا ہے ملاحظہ فرمائیں

"آپ نے مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی ہے مجھے اس سے معاف رکھئے کیونکہ اس کی نہ آپ کو ضرورت ہے نہ اس کتاب کو کتابوں کے مقدمہ کی وہی حیثیت ہوتی ہے جو تاجر کیلئے دلال یا ایجنٹ کی۔ نئے تاجر کو دلال کی اس لئے ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اپنے غیر معروف سامان کی شہرت بڑھائے، جب خود خریدار تاجر کو ایجنٹ سے زیادہ جانتے ہوں اور اس کا سامان خریدنے کے لئے اس زیادہ متمنی ہوں جتنا تاجر اس کے فروخت کرنے کا، تو ایسی حالت میں ایجنٹ کیا کام دے سکتا ہے۔

والسلام علیک رحمۃ اللہ
علی طنطاوی مکہ مکرمہ
۱۴/۱/۱۳۸۵ھ

(کاروان مدینہ۔ الطریق الی المدینہ)

شیخ ابو الحسن کی تحریروں میں ایک جادو ہے

شیخ محمد المجذوب ملک شام کے ایک جید عالم دین تھے، الاسلامی یونیورسٹی مدینہ منورہ میں استاذ تھے "علماء و مفکرون عرفتہم" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کی تصنیف و تالیف کی خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

؎ حضرت مولاناؒ نے استاذ زائر کی حیثیت سے بلا معاوضہ چند ہفتہ "رجال الفکر والدعوۃ" کے موضوع پر محاضرات دینا منظور فرمایا اور تشریف لے گئے۔

"شیخ ندوی کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی ادبی تحریر میں ایک سحر ہے ایک ایسا جادو ہے جو عموماً دوسرے مصنفین کی تحریروں میں نہیں ملتا۔ اس کے بعد حضرت مولانا کے اوصاف و کمالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔"

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے اپنے اس نیک بندے کے اخلاص کو قبول فرمالیا ہے اس لئے آپ کی کوشش میں برکت ہے اور آپ کی تقریروں و خطابت میں کشش و مقبولیت رکھی ہے اور آپ کے عمیق مطالعہ و اخلاص سے لبریز اور حقائق سے بھرپور تقریروں کو جو ہندوستان میں اور بلاد عربیہ اور یورپی ممالک کے مختلف اسلامی سمیناروں میں کی گئی ہیں جن میں آپ اپنے آرام و راحت کو قربان کر کے شرکت فرماتے ہیں، اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے زبردست مقبولیت سے نوازا ہے، یہاں تک کہ وہ ایک حق کے متلاشی کیلئے سیرابی و آسودگی کا سامان بن گئی ہیں یہ سب اسلئے ہوا کہ آپ کا مقصد صرف اللہ کی رضا کا حصول تھا نہ کہ شہرت و منفعت کی طلب۔"

مزید لکھتے ہیں!

شیخ ابوالحسن کے تذکرہ سے میرا مقصد ان کے عظیم شخصیت کو روشناس کرانا نہیں ہے بلکہ وہ تو جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) کی مجلس انتظامی کے تاحیات رکن ہیں لیکن اس کے باوجود انھوں نے کبھی بھی جامعہ سے ایک پیسہ نہیں لیا۔ اور مجھے یاد نہیں پڑتا کہ وہ کبھی کسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوں حالانکہ اس کمیٹی میں شرکت کی غرض سے ان کو بارہا آنا پڑا مجھے تمام علماء امت میں ان (شیخ ابوالحسن) جیسے عظیم زاہد کی مثال نہیں ملتی۔ دنیا سے بے نیازی اس کمزور و نحیف جسم کی خصوصیت ہے۔ یہی وہ امتیاز ہے جس کی بناء پر وہ معاشرہ کی خرابیوں پر انگلی اٹھانے اور اس کی اصلاح میں پورے طریقے سے لگے ہوئے ہیں نہ کسی غلط کو صحیح کہتے ہیں نہ کسی حقیقت پر پردہ ڈالتے ہیں۔ آپ کی گفتگو کانوں میں رس گھولتی ہے اور آپ کی باتوں میں ایسی حقیقت بھری ہوئی ہے کہ اس کو کوئی غلط نہیں کہہ سکتا۔ (علماء مفکرون عرفتہم)

مسلم دنیا کے لئے اعلیٰ مثال

علامہ شیخ یوسف القرضاوی عرب کے مشہور محقق عالم و داعی اور نامور مصنف ہیں آپ مصری ہیں عربی کے باکمال خطیب ہیں موجودہ عرب علماء میں ان کو خاص احترام حاصل ہے۔ انھوں نے حضرت مولانا کے بارے میں جو بلند کلمات لکھے ہیں ملاحظہ فرمایئے اور اندازہ کیجئے عشق الٰہی کی معجزنمائی کا کہ نغمۂ ہندی کی حجازی لے پر عرب کا ایک بہترین عالم اور دانشور کس طرح جھوم رہا ہے۔

"ہم نے اپنے بزرگ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو مسلم دنیا کیلئے ایک اعلیٰ نمونہ پایا۔ تجدیدی فکر رکھنے والے داعی، ربانی علماء کی رقت قلب و لطافت مزاج کے حامل، اسلاف جیسا پختہ عقیدہ، توحید اور سنت نبوی کے منبع، معلومات و ثقافت میں جدید تعلیم یافتہ جیسا علم و فہم اور عمل میں کتاب و سنت کے چشمۂ صافی سے فیضیاب، عربی فارسی اور اردو ادب میں باکمال، علوم اسلامیہ کے ذخیرہ سے اچھی طرح سیراب تھے نئی نسل حضرت والا کے علم نافع، عمل صالح اور تابندہ روح سے روشنی حاصل کرتی ہے وہ آپ کی ذات میں مرد مومن کی شان و آن مخلص کی صداقت، مجاہد کا صبر و ثبات زہد و استغناء کی طاقت، علم کا وقار اور اس داعی کی روح پائے گئے جس نے اپنی نماز و عبادت سب اللہ رب العالمین کی رضا کے حصول کے لئے کر دیا ہو۔ (تعمیر حیات ۱۰ر جنوری ۱۹۸۰ء)

اسلام کی آواز

"مصر کے شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود نے حضرت مولانا کی عالمانہ بصیرت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا۔ شیخ ابوالحسن علی الندوی۔۔۔ آپ نے اپنی زندگی خدا تعالیٰ کے لئے وقف کر رکھی ہے اور اپنے شب و روز ایک مخلص و متقی مسلمان جیسے گذار رہے ہیں۔ آپ نے پاکیزہ اسلوب و کردار اور فکر انگیز اسلامی لٹریچر کے ذریعہ اسلام کی آواز کو دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلایا ہے، نیز اپنے دور دراز ممالک کے اسفار کے ذریعہ آپ نے اسلام کی اشاعت و تبلیغ کا فریضہ انجام دیا اور لوگوں کی رہنمائی و رہبری فرمائی۔

عالم اسلام کے گل سرسید

علامہ شیخ احمد بن ابراہیم الغزاوی (نائب مجلس شوریٰ سعودی عرب) جزیرۂ عرب کے معاصر شعراء میں سب سے بڑے قابل قدر ادیب اور شاعر تھے جو صرف سلاطین و ملوک کی مدح کرتے تھے، انھوں نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی مدح میں عربی میں ایک نظم ان کی حیات ہی میں لکھی اور فرمایا تھا کہ۔

"میں نے اب تک بادشاہوں کی مدح کی ہے آج عالم اسلام کے گل سرسید کے حق کی ادائیگی کر کے اپنے کلام کو کارآمد کر رہا ہوں۔"

سعودی فرمانروا شاہ فیصل کی نظر میں

ممتاز عالم دین، نامور محقق اور جادو بیان خطیب شیخ مناع قطانؒ سربراہ شعبہ علوم اسلامیہ امام محمد بن سعود اسلامی یونیورسٹی ریاض سے شاہ فیصل بن عبدالعزیز آل سعود رحمۃ اللہ علیہ نے عالم اسلام کے ممتاز علماء کی فہرست تیار کرائی شیخ رحمہ اللہ نے فہرست پیش کی، شاہ فیصل نے فہرست دیکھی اور اپنے قلم سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا نام سرفہرست لکھ کر آخری شکل دینے کا حکم دیا۔

(شیخ مناع قطان سے ایک گفتگو)

آپ ہندوستان جارہے ہیں تو شیخ ابوالحسن سے پوچھیئے گا۔

سفیر سعودی عرب برائے ہند عزت مآب شیخ انس یوسف یاسین رحمہ اللہ ماہ رمضان ۱۳۹۳ھ کی ۳ تاریخ کو اپنی چھٹی گذار کر ہندوستان واپس آرہے تھے روانگی سے قبل شاہ فیصل کو سلام و وداع کے لئے حاضر ہوئے۔ دورانِ گفتگو شاہ سے عرض کیا کہ آج یہاں تیسرا روزہ ہے اور ہندوستان میں یکم رمضان ہے۔ میں نے ہندوستان پہنچکر اگر وہاں کے مطابق پورے روزے رکھے تو میرے ۳۰ یا ۲۱ روزے ہوجائیں گے ایسی صورت میں میرا کیا عمل ہونا چاہیئے؟ شاہ فیصل نے شیخ انس یاسین کا سوال سن کر فرمایا: تم ہندوستان جارہے ہو جہاں شیخ ابوالحسن علی جیسے جلیل القدر عالم ہیں اور تم یہ مسئلہ مجھ سے پوچھ رہے ہو؟۔

ہم شیخ ابوالحسن کو سننا چاہتے ہیں

رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی مجلس تاسیسی کی نشستوں کے اختتام پر سعودی فرمانروا شاہ فیصلؒ کی خدمت میں مجلس کے اجلاس کی رپورٹ اور شکریہ وسپاس پیش کرنے کیلئے منتخب علماء کا ایک وفد ریاض روانہ ہوگیا جس کے اراکین میں عراقی عالم ومجاہد اور اخوان المسلمین کے ممتاز رہنما شیخ محمد محمود الصواف مکہ مکرمہ کی سربرآوردہ شخصیت شیخ محمود الحافظ اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہم اللہ شامل تھے شیخ صواف نے بادشاہ سلامت سے گفتگو شروع کی اور اجلاس کی کارروائیوں اور تجویزوں کو بیان کر رہے تھے کہ شاہ فیصل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا! "نبغی نسمع الشیخ ابوالحسن" ہم تو شیخ ابوالحسن سے کچھ سننا چاہیں گے!

مومنِ مخلص کی شان

مفتی امین الحسینیؒ فلسطین کے مفتی اعظم اور ایک عالم دین اور عظیم مجاہد تھے انھوں نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو ایک ذاتی خط میں بڑے بلند کلمات سے خطاب کرتے ہوئے لکھا۔

"آپ کو مومن مخلص کی شان کے مطابق مرض کی تشخیص اور اس کیلئے دوا تجویز کرنے کی سعادت کی توفیق (منجانب اللہ) حاصل ہوئی ہے اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ امت کے اندر آپ جیسے مخلص اور کارکن علماء کی تعداد کو بڑھائے اور اللہ آپ کو اپنے حفظ وامان میں رکھے"۔ (تعمیر حیات ۲۵ر جنوری ۱۹۹۱ء)

میرا عقیدہ ویقین ہے

جامعہ ام درمان الاسلامیہ سوڈان کے عالم دین اور عظیم مفکر شیخ محمد المبارک کو حضرت مولاناؒ سے انتہائی درجہ میں عقیدت ومحبت تھی انھوں نے اپنے خط میں لکھا:

"دمشق میں آپ سے ملاقات کا موقع ہمارے لئے بڑی سعادت کا باعث تھا۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ مجھے آپ سے جو خصوصی محبت ہے وہ کسی اور مفکر و داعی سے نہیں باوجودیکہ میں ان سب حضرات کا قدرداں ہوں اور سبھی سے محبت رکھتا ہوں۔

خدا گواہ ہے کہ میں آپ کی عنایت وتوجہ کو رضاء خداوندی کے اسباب میں سے شمار کرتا ہوں۔ یہ میرا عقیدہ ویقین ہے، محض تکلف اور خوش کرنے کے لئے نہیں لکھ رہا ہوں اس وقت آپ کے سوا کوئی میرے لئے اس منزل ومرتبہ کا نہیں، میری اس عقیدت کا یہ عالم ہے کہ میں برابر سوچتا رہتا ہوں کہ قیامت کے دن آپ میرے سامنے ہوں گے میں آپ کو پکاروں گا اور مضبوطی کے ساتھ آپ کا دامن پکڑلوں گا۔ میرے دل میں بارہا یہ خیال آیا لیکن میں آپ سے بیان نہیں کرسکا۔

اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ حشر میں مجھے آپ کے ساتھ اپنی رحمت کے سایہ میں رکھے گا۔ (تعمیر حیات ۱۰ر جولائی ۱۹۹۰ء)

ذیل میں عربی اخبارات میں شائع شدہ عرب علماء کے تاثرات پیش خدمت ہیں۔

دعوت الی اللہ کیلئے جسم وجان اور قلم وزبان وقف

• عالم جلیل اور داعی عظیم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے دعوت الی اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کیلئے اپنی زبان وقلم اور جسم وجان کو وقف کر دیا تھا۔ اور اس میدان میں ان کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ مولانا مرحوم کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے اور انھیں اپنے نیکوکار بندوں میں شامل فرمائے اور انہیں ابرار واتقیاء، شہداء وصالحین کے ساتھ اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔

شیخ محمد بن عبداللہ السبیل

(صدر نشین امور حرمین شریفین امام وخطیب مسجد حرام مکہ مکرمہ)

آخری سانس تک قرآن وسنت پر مضبوطی سے قائم رہے

• علامہ سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ایک طویل عرصہ تک مسلمانانِ عالم کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا اور اسلام کے اصل پیغام اور اس کی صحیح روح سے دنیا کو متعارف کرایا اور پوری حکمت ودانائی کے ساتھ دین حنیف کی دعوت دیتے رہے اور اس راہ میں سلف صالحین کے اسوہ حسنہ کو برابر مشعل راہ بنائے رکھا۔ اپنی آخری سانس تک

قرآن وسنت پر مضبوطی سے قائم رہنے کی تلقین کرتے رہے۔

ڈاکٹر عبداللہ صالح عبید
(جنرل سکریٹری رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ)

جملہ مسلمانانِ عالم اس دانائے راز سے محروم

● ہم سب کے مخدوم ومشفق حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے محرومی کا غم محض رسمی تعزیت سے کم نہیں ہوسکتا ہندوستانی مسلمان اپنے سرپرست سے محروم ہوکر یتیموں کے مانند ہوگئے ہیں۔ اس عظیم شخصیت کا رعب وجلال مخالف وموافق سبھی کے دلوں پر تھا۔ اور ان کا بدترین مخالف بھی انھیں نظر انداز کرنے کی جسارت نہیں کرسکتا تھا۔ اور رابطہ ادبِ اسلامی اپنے بانی صدر کے بعد دختر یتیم کے مانند ہے کہ اس کی تمام تر سرگرمیاں اسی ذات والاصفات کی رہبری اور دعاؤں کی رہین منت تھیں۔

جملہ مسلمانانِ عالم اور بالخصوص ہندوستانی مسلمان اس دانائے راز سے محروم ہوکر اب کدھر جائیں اور کس کا سہارا لیں کہ ان کے درمیان سے خیر وبرکت کی علامت گویا اٹھ گئی۔ اور وہ مسلسل کئی نسلوں کے معلم ومربی اور اس عہد کے سب سے بڑے عالم اور داعی سے محروم ہوگئے۔

ڈاکٹر عبدالقدوس ابوصالح
نائب صدر عالمی رابطہ ادب اسلامی سعودی عرب

سب سے بڑا کارنامہ

● "مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے عربوں کی طرف اپنی توجہ مبذول کی انھیں بیدار کیا، انھیں اپنے حقیقی منصب اور ذمہ داری سنبھالنے کی دعوت دی اور انھیں یاد دلایا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اعزاز وسربلندی، اسلام کے بدولت عطا کی۔ اور قرآن نے انھیں دنیا کی قیادت کیلئے تیار کیا"۔

ڈاکٹر انور الجندی

دعوت واصلاح کے امام

● "علامہ سید ابوالحسن علی ندویؒ دعوت واصلاح کے اماموں میں سے ایک امام تھے، ان کے اندر بیک وقت زہد وورع جہاد وسرفروشی اور فکر وادب کا حسین امتزاج پایا جاتا تھا۔ علامہ کی زندگی دعوت الی اللہ خدمت اسلام اور اشاعتِ خیر کیلئے ایک جہد مسلسل سے عبارت تھی۔

ڈاکٹر احمد عثمان توپجری
(رکن مجلس شوریٰ سعودی عرب)

ناقابلِ تلافی نقصان

● حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات کی خبر سے ہمارے اوپر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس عالم جلیل اور یگانۂ روزگار شخصیت سے محرومی مسلمانان عالم کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی علمی جدوجہد، دعوت وارشاد اور غرباء ومساکین کی امداد میں صرف کردی۔

خلیفہ جاسم الکواری
(ڈائریکٹر ادارہ اسلامی امور قطر)

صحیح مقام کا اندازہ

● حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی پوری زندگی کا ایک ایک لمحہ ملت اسلامیہ میں بیداری پیدا کرنے میں گذارا مولانا ندوی ان قائدین میں تھے جنھوں نے مسلمانوں کو جوڑنے کی کوشش کی اور خالص دینی بنیاد پر علمی اور ثقافتی مجالس قائم کیں، میں جس قدر بھی کوشش کروں الفاظ اپنی وسعت کے باوجود ناکافی ہیں جن سے آپ کے صحیح مقام کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

عبدالرحمن بن ناصر العوہلی
(سفیر مملکت سعودی عرب برائے ہندوستان)

خالص اسلامی دعوت کے خوشگوار نتائج سامنے آئے

● حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اپنی خالص اسلامی دعوت اور برصغیر میں اس کے دوررس اثرات کی وجہ سے مشہور ومقبول ہوئے اس دعوت کے خوشگوار نتائج سامنے آئے یقیناً علماء کی وفات امت کے لئے بہت بڑا خسارہ ہوا کرتی ہے مولانا مرحوم کی بے شمار تصنیفات ہیں جو اسلام کی خدمت کے جذبہ اور اس کیلئے درد وتڑپ سے مالا مال ہیں۔

شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ آل الشیخ
مفتی عام سعودی عرب

کلید کعبہ

● علامہ ابوالحسن علی ندویؒ ایک عظیم عالم دین تھے، انھوں نے اپنی زندگی ایک معلم، مؤلف اور داعی الی اللہ جیسی گذاری انھوں نے اپنی اسی (۸۰) تصنیفات کے اندر اپنے اس علمی ورثہ کو چھوڑا جن کا کئی اسلامی اور بعض یورپی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ سعودی حکومت نے آپ کے علم وزہد اور تقویٰ سے متاثر ہوکر آپ کو کلید کعبہ عطا کی تھی جب آکسفورڈ اسلامک سنٹر کا قیام عمل میں آیا تو اس کے بانیوں نے اس کی صدارت شیخ ندوی ہی کو سونپی، مولانا ندوی ایک ایسے مثالی عالم تھے جن کے علم کی وجہ سے ان کے معاصر فخر محسوس کرتے تھے۔

ڈاکٹر ذکی بدر سربراہ جامعہ اسلامیہ لندن

دنداں شکن جواب

شیخ سید ابوالحسن علی ندویؒ دین کے معاملہ میں بڑے حساس اور غیرت مند تھے اس میں نہ کبھی نرمی برتی اور نہ مداہنت سے کام لیا۔ اور نہ اللہ کے معاملہ میں کبھی کسی کی پرواہ کی بلکہ اسلام پر جب کبھی کوئی حملہ ہوا اور اس پر آنچ آئی تو آپ نے پوری قوت اور پامردی کے ساتھ اس کے لئے سینہ سپر ہوگئے اور اسلام کی طرف سے بھرپور دفاع کیا اور اس کا دنداں شکن جواب دیا۔ اور اپنے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہیں آنے دی۔

ڈاکٹر محمد عبدہ یمانی
سابق وزیر الاعلام سعودی عرب

دعوت اسلامی کے علمبردار

● شیخ ندوی دعوت اسلامی کے علمبرداروں میں سے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ ہندوستان میں دعوت کے میدان میں بڑے بڑے کام لئے وہ حدیث کے امام تھے، ان کی وفات بلاشبہ دعوت کے میدان میں اثر انداز ہوگی۔ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ایک ایسے مدرسہ کی طرح تھے جو حکمت اور سلوک اور خالصتہً اللہ کیلئے دعوت میں ممتاز ہو

ڈاکٹر ابراہیم الفائز
استاذ کلیۃ الشریعۃ،

مسلمان ایک معتبر و مستند عالم سے محروم ہوگئے

● شیخ ندوی مربیوں اور داعیوں میں سے تھے اور ان کی ذاتی زندگی اور تالیفات اسلام کے بارے میں ان کی پیش کردہ خدمات کی روشن دلیل ہیں، ان کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ایک ایسے باعمل داعی تھے کہ جس کے نقوش اس کے ختم ہونے کے بعد بھی زندہ و باقی رہیں گے۔ تصنیف و تالیف میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں نے ایک عظیم اسلامی داعی اور معتبر و مستند عالم کھو دیا۔

ڈاکٹر ابراہیم الوہیبی
جنرل سکریٹری ندوۃ الشباب الاسلامی الحالیہ جدہ

دعوت کے میدان میں انمٹ نقوش

● شیخ ندوی کی دعوت کے میدان میں بڑی جانفشانیاں اور انمٹ نقوش ہیں اور دعوت کے سلسلہ میں ان کا ایک خاص اسلوب و نہج ہے جس میں وہ ممتاز و منفرد ہیں۔

ڈاکٹر خلیل اسکیل حمادہ
استاذ شاہ سعود یونیورسٹی (ریاض)

امتیازی شان

● شیخ ابوالحسن علی ندویؒ نے دعوت الی اللہ کے میدان میں بڑا مجاہدہ کیا اور عالم اسلام میں اسلامی پرچم کو بلند کیا وہ عصر حاضر کے علماء اور مصلحین کے درمیان علم و عمل، اخلاص و للّٰہیت اور اسلوب دعوت میں امتیازی شان رکھتے تھے۔

عمر بن محمد السبیل
امام و خطیب مسجد حرام مکہ مکرمہ

عصر حاضر کے مجدد

● مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ عصر حاضر کے ایک مجدد تھے انھوں نے اپنے قلم سے دعوت کے میدان میں جہاد کیا، دین محمدیؐ کو غیروں کی تاویلات اور تحریفات سے بچایا۔ اسلام کی سچی دعوت و تعلیم کو ہندوستان میں خصوصاً اور عرب ممالک میں عموماً پیش کیا۔

نادر عبدالعزیز النوری
صدر مجلس ادارہ فلاح و بہبود (سعودی عرب)

دعوت و اصلاح کے نقوش

● حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے دعوت و ارشاد اور وعظ و نصیحت کے ذریعہ اسلام کی خدمت انجام دینے میں بڑا مجاہدانہ کردار ادا کیا اور نہ صرف ہندوستان اور عرب ممالک بلکہ ساری دنیا میں ان کی دعوت و اصلاح کے نقوش ثبت ہیں۔ انھوں نے اپنے علم و عمل سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو بڑا فائدہ پہونچایا۔

ڈاکٹر صالح مہدی السامرائی
صدر اسلامک سینٹر (جاپان)

انکی تصنیفات منارۂ نور اور مشعل راہ ہیں

شیخ ندویؒ نے اسلامی بیداری پیدا کرنے اور فکر کو جلا بخشنے میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کی تصنیفات اور کتابیں ہمارے لئے مشعل راہ ہیں جن سے مسلم نوجوان اسلامی علوم کے میدان میں اپنی علمی و فکری تشنگی دور کر رہے ہیں۔ اور وہ بڑی عقیدت و احترام کے ساتھ مسلم گھرانوں میں پڑھی جاتی ہیں۔

احمد عبدالوہاب بن عبدالرحمٰن نوردلی
نائب سکریٹری الندوۃ العالمیۃ للشباب الاسلامی جدہ

زہد و تقویٰ کے پیکر

میں نے ابوالحسن علی ندوی کو زہد و تقویٰ کے اعتبار سے بہت بلند مقام پر پایا۔ لوگوں کی زبانیں پرہیزگاری اور خدا ترسی کے کلمات سے تر رہتی ہیں لیکن ان کے دلوں کا حال کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ ان کے دل اس کیفیت سے یکسر خالی ہوتے ہیں جس کا وہ مظاہرہ کرتے ہیں۔ لیکن شیخ ابوالحسن زہد و تقویٰ کے پیکر تھے وہ باعمل علماء کی حسین لڑی کا ایک نہایت خوبصورت موتی اور امت کا بچا ہوا خزانہ تھے۔

عبداللہ السلطنطاوی (عمان)

مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ

علالت سے وفات تک

تحریر: حسین امین

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ یہ ایک ایسا نام ہے جسے بچپن سے لے کر جب اس نام کے مالک سے صورت آشنا بھی نہیں تھا ہمیشہ اس حیثیت سے جانا کہ اس نام کے مالک کی شخصیت بہت محترم ہے۔ پھر صحافت کے پیشے میں داخلے ہونے کے بعد سے اس نام نامی کو متعدد نوعیت کے پس منظر اور تناظر میں اور مختلف زاویوں سے لکھنے کی سعادت حاصل کرنے کا موقع پانے میں جتنا خوش نصیب راقم الحروف رہا ہے اتنا شاید ہی کوئی دوسرا صحافی ہو۔ اس نام سے اور اس کے مالک سے ساری محبت، انسیت اور عقیدت یکطرفہ نہیں رہی ہے بلکہ دوسری طرف سے بھی بے حد شفقت اور محبت ملتی رہی ہے اور خاندانی روابط کے پس منظر میں حضرت مولانا علی میاں کی طرف سے ایک "عزیز" کا درجہ عطا ہوا تھا چنانچہ وہ ہمیشہ راقم کو اپنے اعتماد میں لیا کرتے تھے۔ اس وقت اس نام کو لکھتے وقت کلیجہ منہ کو آرہا ہے کہ ابھی "اس روز" ہی تو انھوں نے ندوہ کے مہمان خانے کے سامنے راقم کو اپنے پاس بلاکر "دھوپ کھانے" کو کہا تھا، اور یہ جان کر کہ عید الفطر کے روز یہ ناچیز ائے . پی میں رہے گا، خوشی ظاہر کرتے ہوئے رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ آج اس نام کا مالک موجود نہیں ہے، خالقِ کائنات نے اپنے اس نیک بندہ مولانا علی میاںؒ کے درجات بلند کرنے کے لئے بیسویں صدی کے آخری دن ۲۲ رمضان المبارک کو جس کی آنے والی شب میں شب قدر کا امکان ہوتا ہے، نصف النہار سے کچھ قبل نماز جمعہ کی تیاری کے بعد سورہ یٰسین کی تلاوت کے دوران عین اس وقت جب وہ کمرہ سے باہر ایک مرد مومن کی شان سے جمعہ کے لئے نکلنے والے تھے اپنے حضور میں بلا لیا اور ان کو اسی تاریخ کا حصہ بنا دیا جس کے مطالعے کا شوق ان کو "لت" کی حد تک تھا۔

مولانا علی میاں نے جن کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے وقت ابھی مدتوں اپنی انگلیوں پر قابو رکھنا پڑے گا، جتنی قابل رشک زندگی گذاری اتنی ہی قابل رشک وفات پائی جس کی تفصیل سننے والا کوئی بھی شخص بہ آواز بلند اس تمنا کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کاش اپنا بھی آخری وقت ایسا ہی ہو۔

مولانا علی میاں کی علالت کے آغاز سے لے کر ان کے سانحہ ارتحال تک ملت اسلامیہ میں ان کی صحت کے لئے دعاؤں اور فکرمندی کی جو کیفیت تھی اس کو قلم بند کرنے کے لئے ایک پوری کتاب مرتب کی جاسکتی ہے، اور شاید ایسا ہو بھی تاکہ ان کی شخصیت سے جس کا نصب العین کار نبوت کو آگے بڑھانا تھا، آنے والی نسلیں ہمیشہ متعارف ہوتی رہیں گی۔ بہر حال از راہ تذکرہ اس فکر کی سطح یہ تھی کہ ہندوستان کے وزیر اعظم اٹل بہاری باجپئی، ان کی پارٹی کے اعلیٰ مرکزی و ریاستی رہنما اور وزراء، یوپی کے گورنر اور متعدد وزراء نے ملک کے ایک ممتاز شہری اور عالمی سطح کے ممتاز عالم دین اور بے داغ شخصیت کی حیثیت سے ندوہ کے مہمان خانے میں پہونچ کر ان کی عیادت کی۔ ملک کی جدوجہد آزادی کی قیادت کرنے والی سیاسی جماعت کانگریس کی صدر اور پارلیمنٹ میں حزب اختلاف کی لیڈر سونیا گاندھی اور ان کی بیٹی پرینکا گاندھی، سابق وزیر اعظم ہند وی۔ پی سنگھ، مرکزی حکومت کے ممتاز سابق وزراء نرائن دت تیواری، ملائم سنگھ یادو، جعفر شریف، کیپٹن ستیش شرما ایم۔ پی، جی ایم بنات والا، مولانا اسعد مدنی صدر جمعیۃ العلماء ہند، سید سبط رضی وغیرہ صاحبان، خادم الحرمین شریفین، جلالۃ الملک فہد بن عبدالعزیز کی طرف سے ان کے خصوصی ایلچی کی حیثیت سے سفیر سعودی عرب برائے ہند ہز ایکسی لینسی عبدالرحمٰن بن ناصر العویلی اور سفارت خانے میں دینی امور کے انچارج ہز ایکسی لینسی ولید بن عبدالکریم، ایران کے صدر عزت مآب محمد خاتمی کی طرف سے ان کے مشیر برائے سنی امور مولانا اسحاق مدنی اور مشیر برائے شیعہ امور مولانا محمد علی خلیلی نے بہ نفس نفیس ندوہ پہونچ کر مولانا علی میاں کی عیادت کی۔ اس کے علاوہ دوسرے ملکوں کے سربراہوں نے بھی یا تو کسی ایلچی کے ذریعہ یا ٹیلی فون اور فیکس کے ذریعہ خیریت معلوم کی۔

مولانا علی میاں کے لئے صحت کی دعاؤں کے ساتھ ان کے عقیدت مندوں نے خود کو کسی اندوہناک خبر کو سننے کے لئے اگرچہ تیار کر لیا تھا لیکن اللہ کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ چنانچہ جب مولانا کے سانحہ ارتحال کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیلی تو ساری "تیاری" "بے سود" ثابت ہوگئی۔ صبر کا دامن چھوٹ گیا۔

دراصل مولانا علی میاںؒ نے اپنی وفات سے چند روز قبل کٹھمنڈو سے روانہ ہونے والے انڈین ایر لائنس کے ایک طیارے کا اغوا

کئے جانے کے خلاف ایک بیان جاری کیا تھا جس سے سبھی کو ان کی صحت کے بارے میں تسلی ہو گئی تھی۔ یہ بیان ان کی فعال اور ہمہ وقت سرگرم زندگی کا حصہ تھا جس نے کسی ناخوشگوار خبر کے تصور کو ختم کر دیا تھا۔

مولانا علی میاں کی رحلت کے بعد ملت اسلامیہ کی حالت کیا تھی اس کی ایک مثال ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء کی کڑکڑاتی سردی اور کہرے کی دبیز چادر میں لپٹی ہوئی اس سیاہ رات کو دیکھنے میں آئی جب دوپہر سے اپنے گھروں سے کار، اسکوٹر، موٹر سائیکل، سائیکل، ٹرین غرض ہر دستیاب سواری سے روانہ ہونے والوں کا سلسلہ رات تک جاری رہا تھا، ہر راستہ گویا رائے بریلی کے علمی، سیاسی اور دینی اعتبار سے مشہور تاریخی شہر میں تکیہ کلاں پر واقع دائرہ شاہ علم اللہ پر ختم ہو رہا تھا جہاں حسنی سادات خانوادے کے عظیم مجاہد آزادی سید احمد شہیدؒ نے ہندوستان کو برٹش راج کے چنگل سے آزاد کرانے کے لئے جدوجہد آزادی کا آغاز کیا، حکیم سید عبدالحی حسنی نے اپنی تحریروں سے علمی خزانے مالا مال کئے۔ ان کے صاحبزادوں ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی اور مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے علم اور دین کی خدمت میں اپنے بزرگوں کے کام کو آگے بڑھایا۔ مولانا علی میاں نے تو اپنی الگ پہچان کے ساتھ بزرگان دین کا نچوڑ تھے نہ صرف اپنے خاندان کا نام روشن کیا بلکہ اپنے "وطن عزیز" کی "آبرو" بن کر اس کا سر اکثر فخر سے اونچا کیا۔ اس روز ہر گھر میں اداسی کا سماں تھا، کہیں کوئی پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا کہیں کوئی سر پکڑے بیٹھا تھا۔ مگر اہل خاندان پر آنسوؤں کی سوغات کے ساتھ سکینہ کی چادر تنی ہوئی تھی لکھنؤ اور دوسرے شہروں میں مساجد سے گلوگیر اور رندھی آواز میں اعلان ہو رہا تھا۔ لکھنؤ میں بعض ٹرانسپورٹروں نے رائے بریلی کیلئے بسوں کا مفت انتظام کر دیا تھا، بازار بند ہو گئے تھے۔ لکھنؤ رائے بریلی روڈ پر کئی جگہوں پر خاص کر بچھراواں میں سڑک کے کنارے رہنے والوں نے اپنے گھر میں افطار اور نماز کا اہتمام کر رکھا تھا تا کہ اس وقت ادھر سے گذرنے والوں کو زحمت نہ ہو۔ اس سڑک پر اس رات کی ساری سیاہی کو ادھر سے گذرنے والی کار کی ہیڈ لائٹوں نے نگل لیا تھا۔ رات کے کسی بھی حصے میں سڑک کے کسی بھی حصے پر روشنی کی کمی نہیں تھی۔ اتنی بڑی تعداد میں کاروں کا آنا جانا اس سے پہلے وہاں رہنے والوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اور تکیہ کلاں پر ایسا انسانی سمندر کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ ان سواریوں پر ارباب اقتدار اور ان کے نمائندے بھی تھے، علمائے حق بھی تھے، اکابرین ملت بھی تھے، وکلا تھے صحافی تھے کاروباری تھے، دانشور تھے، سیاسی، سماجی اور ملی رہنما تھے، عورتیں تھیں اور بچے تھے۔

اداس دلوں کی اس بھیڑ میں ہر دل رو رہا تھا، حضرت مولاناؒ کے آخری دیدار کے لئے لمبی قطار لگی ہوئی تھی، تدفین کا وقت آیا تو کاندھا دینے کے لئے ہر شخص بے چین تھا، مولانا کے گھر سے ان کے آبائی قبرستان تک کا چند منٹوں کا راستہ کئی گھنٹے میں طے ہوا۔ لاکھوں نے نماز جنازہ میں شرکت کی اور تدفین کے بعد مٹی دینے کا سلسلہ کئی روز تک جاری رہا متعدد بار قبر سے مٹی زیادہ ہو جانے کی وجہ سے ہٹائی گئی۔

اس وقت جب لوگ تیزی کے ساتھ رائے بریلی کی طرف بھاگ رہے تھے، دنیا بھر میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جس نے اپنے کو دوسرے ہی قسم کی مصروفیت میں لگا رکھا تھا۔ یہ طبقہ اخبار نویسوں کا تھا جس کا قلم اسی تیزی سے اس "رات" سے آج تک چل رہا ہے جس تیزی سے سواریاں رائے بریلی کی طرف رواں دواں تھیں۔ اخبارات دیر رات تک خبریں جمع کرتے رہے جو رائے بریلی سے براہ راست موبائیل کے ذریعہ بھیجی جا رہی تھیں۔ اور اس کے بعد مولانا علی میاں کے بارے میں خصوصی اشاعتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ندوۃ العلماء کے ترجمان پندرہ روزہ "تعمیر حیات" نے جس کا ۲۵ر دسمبر تا ۱۰ر جنوری والا شمارہ پریس میں پہونچ چکا تھا۔ مولانا علی میاں کی رحلت سے متعلق تمام تفصیلات کے ساتھ منظر عام پر آنے میں اپنے کو ممتاز کیا۔ اس شمارہ کی اشاعت کو روک لیا گیا تھا اور اسے عملاً ایک خصوصی نمبر کی شکل دے دی گئی تھی جو دوسرے تمام خصوصی نمبروں میں اس لحاظ سے بھاری تھی کہ صدر نشین امور حرمین شریفین امام وخطیب مسجد حرام مکہ مکرمہ شیخ محمد بن عبداللہ السبیل کا تعزیتی پیغام شامل کیا گیا، حرمین شریفین میں مولانا علی میاں کی غائبانہ نماز جنازہ کی خبر شامل کی گئی جو ۲۶ر رمضان المبارک کو ۲۷ ویں شب میں خادم الحرمین شریفین جلالۃ الملک فہد بن عبدالعزیز فرماں روائے مملکت سعودی عربیہ کے حکم سے ادا کی گئی تھی۔ مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کا جامع مضمون شامل کیا گیا۔

مولانا علی میاں کے خادم خاص حاجی عبدالرزاق، مولوی سید بلال حسنی ندوی اور مولوی سید محمود حسنی ندوی کی مولاناؒ کے بارے میں روایتوں پر مشتمل جسے مولانا نذر الحفیظ ندوی نے ترتیب دیا تھا ایک بھرپور مضمون شامل کیا گیا۔ خود مولانا نذر الحفیظ کا کوئی مضمون نہیں ہے لیکن مذکورہ حضرات کی روایت جس انداز میں ترتیب دی گئی ہے وہ بجائے خود ان کے حضرت مولاناؒ کے تعلق سے جذبات و احساسات کی مکمل ترجمان ہے۔ اس شمارہ میں سکریٹری جنرل رابطہ عالم اسلامی ڈاکٹر عبداللہ صالح العبید، نائب صدر عالمی رابطہ ادب اسلامی ڈاکٹر عبدالقدوس ابوصالح (جس

کے حضرت مولاناؒ صدر تھے) خلیفہ جاسم الکواری مدیر ادارۃ الشئون الاسلامیہ وزارت اوقاف والشئون الاسلامیہ قطر، مولانا شاہ ابرار الحق (ہردوئی) جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ مولانا نظام الدین صاحب، صدر جمعیۃ العلماء ہند مولانا سید اسعد مدنی، نائب مہتمم دار العلوم دیوبند مولانا عبد الخالق، نائب صدر جمہوریہ ہند کرشن کانت جی، وزیر اعظم ہند اٹل جی، وی۔ پی سنگھ، پارلیمنٹ کی لیڈر آف اپوزیشن مسز سونیا گاندھی، وزیر اعلیٰ یوپی کلیان سنگھ وغیرہ ممتاز شخصیات کے تعزیتی پیغام اور عربی اور ہندوستانی میڈیا کے بعض حلقوں کی شاہ سرخیاں بھی جمع کر دی ہیں، "مولانا علی میاں ایک نظر میں" کے عنوان سے ان کی زندگی کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اور پروفیسر وصی احمد صدیقی صاحب نے اس انکساری کے ساتھ دل کو چھو لینے والا خصوصی اداریہ لکھا کہ "یہ اداریہ حضرت مولانا کے دینی اور علمی کارناموں کے بیان کے لئے نہیں لکھا جا رہا ہے، سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لئے"۔ ایک اور خصوصی شمارے کے لئے تعمیر حیات کے عملے کا قلم اب بھی چل رہا ہے۔

ملک اور بیرون ملک کے اخبارات مولانا علی میاں کے سانحۂ ارتحال کی خبر تک محدود نہیں رہے جو شاہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئی بلکہ پہلے ہی دن سے بیسویں صدی کے تین چوتھائی حصے پر اپنی ایک منفرد اور لاثانی شناخت کے ساتھ دعوتی، علمی، دینی، تعلیمی، تصنیفی، تحقیقی اور خدمت خلق کے میدانوں پر چھائی رہنے والی انقلابی شخصیت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی کی جو خیر و برکت کی منزل کا راستہ مختصر کرنے کے لئے "معنوی اور فکری شاہراہیں" کھودنے کے بھی داعی تھے، شخصیت پر بھرپور مضامین بھی شائع کئے جس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے،

دنیا بھر کے ممتاز علماء اور اکابرین ملت نیز دانشور حضرات نے اپنے مختلف جرائد میں تحریروں اور یادگاری جلسوں میں اپنی تقریروں میں بعض ایسی صفات بیان کی ہیں جو مولانا علی میاں کی شخصیت کے ان پہلوؤں کو نمایاں کرتی ہیں جو بصورت دیگر کبھی سامنے نہ آتیں۔ مثلاً ٹرینٹی کلوز لندن کے انڈیا مسلم فیڈریشن ہال میں برطانی مسلم تنظیم انڈین مسلم فیڈریشن کے زیر اہتمام مولانا علی میاںؒ کی یاد میں ہونے والے جلسے میں جس میں مولانا کی ایک تقریر کا کیسٹ بھی سنوایا گیا اسلامک فاؤنڈیشن لیسٹر کے ڈاکٹر مناظر احسن صاحب نے بتایا کہ مولانا جب انگلستان آتے فاؤنڈیشن میں ضرور آتے اور نصیحت کرتے کہ ہر مکتبۂ فکر کے علماء کو مدعو کیا جائے اور اتحاد قائم کرنے پر زور دیا جائے۔

مشہور زمانہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے سنٹر برائے اسلامک اسٹڈیز کے ڈائرکٹر فرحان نظامی نے انکشاف کیا کہ اگر مولانا دلچسپی نہ لیتے تو یہ عظیم مرکز کبھی قائم نہ ہوتا جس کی فاؤنڈیشن کے وہ چیئرمین بھی تھے۔ انھوں نے ندوہ کی ضروریات کا ذکر کبھی کسی سے نہیں کیا جب کہ اس سنٹر کے قیام کے لئے ضرور ایسا کیا۔ اس جلسے میں اسلامک مشن کے سابق صدر رشید احمد صدیقی، لندن میں مولانا علی میاں کے مستقل میزبان سرور صاحب اور لٹن اسٹون مسجد کے امام مولانا الیاس نے بھی اظہار خیال کیا۔ مولانا علی میاں کی یاد میں نہ صرف جرائد خصوصی نمبروں کی اشاعت میں پیش پیش ہیں بلکہ مختلف تنظیمیں ان کی یاد میں عام جلسے کرنے میں بھی جوش و خروش سے سرگرم ہیں۔

مولانا علی میاں کی یاد میں دہلی سے جناب شاہد صدیقی کی ادارت میں نیشنل پریس کے زمرے میں آنے والے ہفت روزہ جدید "نئی دنیا" نے جو خصوصی نمبر شائع کیا وہ اپنا جواب آپ ہے۔ اس میں نہ صرف مولانا کی مختلف جہتوں پر مضامین ہیں بلکہ بعض نادر تصاویر بھی شامل کی ہیں۔ لکھنؤ میں ممتاز عالم دین اور خطیب مولانا سید سلمان حسینی ندوی کی سرپرستی میں شائع ہونے والے جمعیت شباب الاسلام کے ترجمان ماہنامہ "بانگ درا" کی خصوصی اشاعت میں بھی مولانا علی میاں کی شخصیت کے مختلف گوشوں پر ممتاز صحافی عشرت علی صدیقی، مولانا سید محمد واضح رشید ندوی، مولانا سید سلمان حسینی ندوی، مولانا محمد سعد کاندھلوی (تبلیغی مرکز نظام الدین) مولانا یوسف لدھیانوی، ممتاز عالم دین مولانا برہان الدین سنبھلی، امین الدین شجاع الدین، مولانا محمد خالد ندوی غازی پوری، محترمہ ڈاکٹر نسیم اقتدار علی، قاضی مجاہد الاسلام قاسمی اور مولانا شاہد سہارنپوری وغیرہ صاحبان نے فاضلانہ مضمون لکھے ہیں۔ ماہنامہ "رضوان"، ہفت روزہ "اخبار نو" "الجمعیۃ" دہلی، پندرہ روزہ "خبردار" دہلی، سہ روزہ "دعوت" دہلی، لکھنؤ کے روزنامے "صحافت" "ان دنوں"، "سہارا" نے مولانا علی میاںؒ کی شخصیت پر مضامین شائع کئے۔

انجمن ترقی اردو ہند کے ترجمان ہفت روزہ "ہماری زبان" نے مولاناؒ سے عقیدت کا حق متعدد مضامین شائع کر کے ادا کیا ہے جس میں "مولانا ابو الحسن علی ندوی، وضاحتی کتابیات" کے عنوان سے دو قسطوں پر ایک مضمون اہمیت کا حامل ہے جو ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دستیاب اردو کتابوں پر مبنی ہے اس میں مولانا کی ۶۱ تصنیفات کی فہرست ہے۔ اس مضمون کی آخری قسط یکم جون ۲۰۰۰ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ "سالار" بنگلور "سیاست" حیدر آباد، "آزاد ہند" کلکتہ، "انقلاب"

قاردو ٹائمز" بمبئی سمیت برصغیر کا شاید ہی کوئی روزنامہ یا رسالہ ایسا ہو جس نے مولانا کے متعلق خصوصی اشاعت نہ کی ہو۔

روزنامہ صحافت لکھنؤ نے ۱۲ر جنوری ۲۰۰۰ء کی اشاعت میں مولانا علی میاں کی تصانیف کی ایک فہرست شائع کی ہے۔ اور یہ ایک خاص بات ہے کہ بعض جرائد نے مولانا کی صرف تصانیف کی فہرست شائع کی ہے جس سے ان کی شخصیت ان کی تصانیف کے آئینے میں ابھرتی ہے۔ پندرہ روزہ "خبردار" دہلی نے جناب سعید سہروردی کا ایک مضمون بعنوان "اپنی ذات میں انجمن تھے علی میاں" شائع کیا جس میں مصنف نے مولانا کو عظیم عالم کے زمرے میں رکھ کر وضاحت کی کہ اس کی زندگی درس مسلسل ہوتی ہے اپنی زندگی کے باہر علمی زندگی میں بھی وہ مینارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا علی میاں بیک وقت کئی اقلیموں کے تاجدار تھے۔ ان کے ہر وصف کے لئے ایک صحیفہ درکار ہے۔

مولانا علی میاںؒ کے سانحۂ ارتحال کے بعد سے نہ صرف صحافت کی دنیا آج تک ان کے اوصاف، ان کی تصنیفات، ان کی علمی، دینی، پیام انسانیت کی شکل میں انسانی خدمت کے حوالوں سے قلم چلا رہی ہے، بلکہ دنیا بھر کی مختلف ملی تنظیموں کی طرف سے مختلف عنوان سے جلسوں کی شکل میں عقیدت کا خراج پیش کیا جا رہا ہے۔

لکھنؤ میں جسے مولانا علی میاںؒ اپنا وطن ثانی کہتے تھے شہریوں نے ان سے اپنی عقیدت اور محبت کا حق ادا کرنے کے لئے کرسچین کالج گراؤنڈ پر جلسہ پیام انسانیت کا انعقاد کیا تو سارے شہر نے اپنا کاروبار معطل کر کے اس میں لاکھوں کی تعداد میں شرکت کی۔ شہر کے کیلے اور تھوک کی منڈیاں بند رہیں جو بڑی بات تھی، دہلی، مراکش، ایران کی مناز اسلامی، مسیحی، بودھی، جینی اور ہندو دھرم کی روحانی شخصیات نے اس جلسے میں حصہ لیا۔ حکومت یوپی کے نمائندے کے طور پر ریاستی وزیر چودھری نریندر سنگھ نے شرکت کی اور کہا کہ مولانا علی میاں کی وفات صرف ان کے خاندان کے لئے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لئے باعث صدمہ ہے۔

اسی طرح مولانا عبدالشکورؒ ہال اور قصبہ بجنور ضلع لکھنؤ میں بڑے جلسے ہوئے۔ عربی ممالک اور یورپ کے مختلف شہروں میں حضرت مولاناؒ پر جو سیمینار اور جلسے ہوئے اس کے لئے ایک مفصل مضمون کی ضرورت ہے۔

ہندوستان کی تاریخ میں شاید یہ پہلا موقع تھا جب تقریباً بیک وقت تین بڑے شہروں میں کسی ممتاز شخصیت کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لئے سیمینار کا اہتمام ہوا۔ یہ شہر بھی اپنی اپنی جگہ منفرد شخصیت کے حامل تھے۔ یعنی لکھنؤ، علی گڑھ (مسلم یونیورسٹی) اور بمبئی جہاں انجمن اسلام کے زیر اہتمام اس کے صدر ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا کی زیر صدارت ۲۸ر مارچ کو سیمینار ہوا۔ اسی روز جمعیت شباب الاسلام کے بانی سربراہ مولانا سید سلمان حسینی ندوی کی کاوش سے ملیح آباد کے مشہور برائے آم قصبہ کے علاقہ کٹولی میں واقع جامعہ سید احمد شہیدؒ کے زیر اہتمام سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار ہوا جس میں شرکت کرنے والوں میں مسجد اقصیٰ کے امام ڈاکٹر شیخ محمد محمود الصیام شامل ہیں، علی گڑھ میں یونیورسٹی کے شعبہ سنی دینیات کے ناظم مسعود عالم قاسمی صاحب کے زیر اہتمام ۲۶ر مارچ کو منعقدہ سیمینار میں بھی ڈاکٹر شیخ محمد صیام نے حصہ لیا تھا۔ اس وقت کے وائس چانسلر محمود الرحمٰن صاحب مولانا علی میاں کے نام سے ایک چیئر قائم کرنے کا اعلان پہلے ہی کر چکے تھے۔ پھر رائے بریلی نے اپنے "لعل رتن" کی یاد میں کل ہند سطح کا جلسہ "پیام انسانیت" منعقد کیا جس میں سابق وزیر اعظم ہند وشوناتھ پرتاپ سنگھ سمیت ملک کی اکابر شخصیات نے شرکت کی جس کی صدارت مولانا علی میاں کے جانشین اور ان کے ہی خانوادہ کے ایک فرد مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے فرمائی۔ ملک کے باہر بھی مولانا علی میاںؒ کی یاد میں جلسوں کا اہتمام کیا گیا جس میں سے دو تین جو نیپال کے علاقوں کٹھمنڈو اور سنسری میں دار العلوم نور الاسلام کے زیر اہتمام پیام انسانیت اور اصلاح معاشرہ کے عنوان سے جلسے ہوئے جن میں اہل ہنود نے بھی حصہ لیا۔ سنسری میں وہاں کے ایس ڈی او اور ضلع مجسٹریٹ نے دونوں غیر مسلم ہیں جلسہ پیام انسانیت میں شرکت کی، کٹھمنڈو کی جامع مسجد میں بھی ایک بڑا جلسہ ہوا۔ ان تقریبات میں مولانا محمد عباس ندوی، مولانا محمد ایوب ندوی وغیرہ صاحبان نے کلیدی رول ادا کیا اس کے علاوہ انڈونیشیا، ملیشیا اور برطانیہ وغیرہ میں بھی مولانا کی یاد میں بین الاقوامی اجتماعات ہونے کی تیاری چل رہی ہے۔ لندن میں بھی ایک سیمینار ہوا۔

زیر نظر مضمون محض ایک خاکہ ہے ان حالات کا جو مولانا علی میاں کی علالت سے لے کر وفات تک اور اس کے بعد تک ہم اور آپ دیکھتے، سنتے اور پڑھتے چلے آرہے ہیں۔ یہ مضمون دستیاب مواد کی بنیاد پر تیار ہوا ہے اس میں بہت سی کمیاں ہیں جس کا راقم کو اعتراف ہے۔

مولانا علی میاں کے سانحۂ ارتحال پر جو عالمی شخصیات کے تعزیتی پیغام آئے ان میں امام حرم شیخ عبداللہ السبیل اور خادم الحرمین الشریفین ملک فہد بن عبدالعزیز نے جو تعزیتی پیغام بھیجا اور

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کو ندوۃ العلماء کا ناظم منتخب کئے جانے پر جو مبارکباد کا پیغام آیا وہ بھی اپنی جگہ پر علمی حیثیت کے حامل ہیں۔ نہ صرف خادم الحرمین الشریفین ملک فہد بلکہ ایران، یو۔اے۔ای اور دیگر گلف ممالک، وزیر اعظم ہند اٹل بہاری باجپئی، پارلیمنٹ میں حزب اختلاف کی لیڈر اور کل ہند کانگریس کی صدر مسز سونیا گاندھی وغیرہ کے تعزیتی پیغامات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ تمام مذکورہ سرگرمیوں میں ایک اور زبردست سرگرمی وہ ہے جو ملک فہد بن عبدالعزیز خادم الحرمین الشریفین کے حکم سے ہوئی تھی یعنی مولانا علی میاں کے لئے باقاعدہ اعلان کرکے حرمین شریفین میں غائبانہ نماز جنازہ۔ یہ درجہ ان ہی کو نصیب ہوتا ہے جن کے درجات اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں بلند ہوتے ہیں۔ اور مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بارگاہ الٰہی میں درجات کی بلندی کا حال تو یہ تھا کہ ان کو کعبۃ اللہ کے کلید بردار شیبی نے ایک بار کعبۃ اللہ کا دروازہ کھولنے کے لئے کلید کعبہ پیش کی جو ایک تاریخ ساز واقعہ تھا، یہ بھی کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ قرآن شریف کے اردو ترجمے اور تفسیر کی اشاعت سے قبل مولانا علی میاںؒ کی منظوری کو حرف آخر قرار دیا جائے اور مترجم حضرت مولانا محمود حسنؒ اور مفسر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کے ساتھ مولانا علی میاں کا نام بھی شامل کیا جائے۔ یہ بھی کچھ کم تاریخی اہمیت کا واقعہ نہیں ہے کہ ایسا موقع آئے جب مولانا علی میاں کے ایک طرف امام حرمین شریفین شیخ السبیل تشریف فرما ہوں اور دوسرے بازو پر امام مسجد اقصیٰ ڈاکٹر شیخ محمد صیام جلوہ افروز ہوں۔

مولانا علی میاں کے بارے میں تمام تحریریں اور تمام تقریریں ایک ایسے علمی ذخیرے کی حیثیت رکھتی ہیں جو اگر جمع کر دی جائیں تو آنے والی نسلیں اور محقق ہمیشہ ان سے مستفید ہوتے رہیں۔

وہ جن کا رتبہ عالی رہا اعلیٰ قیادت میں

مجیب بستوی

جناب بوالحسن ندویؒ رہیں دامان رحمت میں — رہے مشہور جو تشہیر انسانی اخوت میں
وہ جن کے سامنے حکام عالم سر جھکاتے تھے — وہ جن کا رتبہ عالی رہا اعلیٰ قیادت میں
بصیرت پر سیاسی، جن کا لوہا مان جاتے تھے — سبھی اہل سیاست، قومی و ملکی سیاست میں
کتابیں جن کی لاتعداد علمی اور اصلاحی — بہت مدت سے ہیں مقبول اسلامی شریعت میں
پتہ دیتی ہیں ندوہ والوں کی اندوہگیں آنکھیں — نہ فرق آئے خدایا ندوۃ العلماء کی عظمت میں
حضور پاکؐ کی مدحت میں گذرا جن کا ہر لمحہ — رہا مصروف ہر لمحہ جو مولا کی عبادت میں
مہارت جن کو حاصل تھی علوم دین و دنیا کی — جمال العلم ندوہ ہو گیا جن کی نظامت میں
جنہوں نے بیش قیمت کارنامے کتنے کر ڈالے — مثیل ان کا نہیں ملتا کوئی دنیا کی وسعت میں
گذر اوقات فرماتے تھے مولا کی عطاؤں پر — رہے مشہور پھر بھی وہ غریبوں پر سخاوت میں
مثال ان کی نہیں ملتی کہیں اقصائے عالم میں — نہیں شبہ کوئی ان کی قیادت اور کرامت میں
نہ ہوں کیوں واضح و رابع بھلا مغموم اور محزوں — نہیں جب بوالحسن موجود ندوہ کی عمارت میں
وہ سلمان و صہیب آئے ہوئے ہیں اشک برساتے — علاوہ صبر کے اب کیا ہے اک معصوم فطرت میں
وہ عبداللہ و حمزہ اور ہیں عمار نم دیدہ — کہ ان کے دن گذرتے ہیں بڑی نا دیدہ حالت میں
بلال اسحاق احمد اور وہ محمود وہ جعفر — قیامت ان پہ ٹوٹی جیسے میدان قیامت میں
حسین آئے، حسن کے غمناکی کی حالت میں — گھڑی ان کی گذرتی ہے بہت حرمان و حسرت میں
ملے رزاق حاجی پھر نثار احمد، نیاز احمد — بہت ہیں غمزدہ، رہتے جو تھے حضرت کی خدمت میں

نہیں چلتا مجیب اپنا قلم اب اور کیا لکھے
دعا ہے بس یہی حضرت مرے پہونچے ہوں جنت میں

(بقیہ)

توصیف کیا بیاں کریں

اور وہ وقت منتخب فرمایا جس میں وہ تلاوت قرآن کریم میں مشغول تھے۔ ان کی زندگی جتنی پاکیزہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے موت بھی ایسی ہی پاکیزہ عطا فرمائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس واقعے پر یوں تو ہر مسلمان تعزیت کا مستحق ہے۔ لیکن خاص طور پر حضرت کے اہل خانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے منتظمین اور اساتذہ نیز حضرت کے تمام متوسلین کی خدمت میں البلاغ کی طرف سے پیغام تعزیت پہنچ سکے۔

حضرت مولانا اب دنیا میں نہیں ہیں، لیکن انھوں نے جو گرانقدر آثر چھوڑے ہیں وہ انشاء اللہ رہتی دنیا تک امت کی رہنمائی کریں گے۔

ہر آنکھ آج اس کے لئے اشکبار ہے
شمس و قمر اداس فضا سوگوار ہے

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی وفات پر

سیمنار، علمی مذاکرے، سمپوزیم، رسائل کے خصوصی نمبر

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

● محمد شاہد ندوی بارہ بنکوی

کلکتہ و کابل میں بچھی ہے صف ماتم
اس غم میں سیہ پوش ہیں بغداد و سمرنا

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات جمعہ کے روز ۲۲ رمضان ۱۴۲۰ھ اور عیسوی بیسویں صدی کے آخری دن ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کو ہوئی۔ تقریباً دو لاکھ افراد نے سخت سردی اور کہیں لمبی مسافتیں طے کرکے جنازے میں شرکت کی۔ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، دبئی شارجہ عمان کی مسجدوں میں تدفین سے پہلے ہی نماز جنازہ غائبانہ پڑھی گئی جس میں سرکاری طور پر خادم الحرمین الشریفین کے حکم سے حرمین شریفین میں شب قدر کو نماز جنازہ غائبانہ پڑھی گئی۔ رباط۔ الجزائر، موریتانیا۔ لیبیا۔ اور دنیا کے دوسرے کنارے پر سنگاپور، کوالالمپور (ملیشیا) تھمرح (ملیشیا)، جاکرتا (انڈونیشیا) کے علاوہ آسٹریلیا کے متعدد مقامات پر جلسہ ہائے تعزیت منعقد ہوئے۔ ان کی فہرست تیار کرنا مشکل ہے۔ البتہ جو خاص اطلاعات اور اخبارات کے ذریعہ جن کا علم ہوا۔ ان کا ذکر ان سطور میں کیا جا رہا ہے۔

لکھنؤ میں ہونے والے اہم اجلاس

● ادارہ دار المبلغین لکھنؤ کے زیر اہتمام ۵ فروری ۲۰۰۰ء کو مولانا عبدالشکور ہال میں مولانا علی میاں کی یاد میں "پیغام رشد و ہدایت" کے عنوان سے ایک بڑا جلسہ ہوا۔ اس جلسہ میں مولانا عبداللہ عباس ندوی مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا عبدالعلیم فاروقی، ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی وغیرہ نے بڑے جذباتی انداز میں مولانا کی سیرت کے علمی، دعوتی اور اصلاحی پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اور عرب و عجم کے حکمرانوں، سلاطین و امراء سے مولانا کے بے غرض زاہدانہ تعلقات کا تذکرہ کیا۔

● شہر لکھنؤ کی جانب سے انجمن محمدیہ ویلفیئر سوسائٹی نظیر آباد لکھنؤ کے زیر اہتمام گنگا پرشاد میموریل ہال امین آباد میں ایک اہم یادگاری جلسہ مولانا کی یاد میں منعقد ہوا۔ جس میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، مولانا محمد زکریا ندوی اور ڈاکٹر کلب صادق وغیرہ نے حضرت مولانا کو ان کی ہمہ جہت اور عالمگیر شخصیت اور ان کے داعیانہ کردار کی روشنی میں خراج عقیدت پیش کیا۔

● مولانا علی میاں یادگاری کمیٹی کے زیر اہتمام قصبہ بجنور لکھنؤ میں مولانا کی یاد میں ایک جلسہ "امن و آشتی" کے عنوان سے مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں گورنر اترپردیش جناب سورج بھان نے کہا کہ مولانا علی میاں ایک نیک انسان اور سچے دیش بھگت تھے اس جلسہ میں ڈاکٹر کلب صادق۔ اور مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی نے مولانا کی امتیازی خصوصیات پر روشنی ڈالی۔

● حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی یاد اور ان کی تحریک "پیام انسانیت" کے سلسلے میں کرسچن کالج کے گراؤنڈ گولہ گنج لکھنؤ میں ایک عظیم الشان اجلاس ہوا۔ جس میں مختلف مکاتب فکر کے علماء و دانشوروں نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مولانا علی میاں ندوی سے حقیقی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے پیام "پیام انسانیت" کو نہ صرف عام کیا جائے، بلکہ اسے عملی جامہ پہنایا جائے، اور ان کی زندگی کو نمونہ اور مشعل راہ بنایا جائے۔ اس جلسہ میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، مولانا احمد میاں فرنگی محلی، مولانا سلمان حسینی ندوی، مولانا سجاد نعمانی، ڈاکٹر کلب صادق مولانا عبدالعلی فاروقی، مولانا جہانگیر عالم قاسمی شنکر اچاریہ سوامی نند وغیرہ نے شرکت کی۔

● جمعیت شباب الاسلام کے زیر اہتمام جامعہ سید احمد شہید احمد آباد کٹولی لکھنؤ میں ۲۸، ۲۹، ۳۰ مارچ ۲۰۰۰ء کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنی دعوت و فکر کے آئینہ میں" کے موضوع پر ایک سہ روزہ سیمنار منعقد ہوا۔ جس میں مسجد اقصیٰ کے امام شیخ محمد محمود الصیام نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی، اور حضرت مولانا کی شخصیت پر ایک قصیدہ سنایا اور ان کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی، سیمنار میں

مولانا عبداللہ عباس ندوی، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا تقی الدین ندوی، مولانا محمد اجتباء ندوی مولانا سید نظام الدین (پٹنہ) مولانا سعید الرحمن اعظمی ندوی، مولانا شمس الحق ندوی، مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا محمد سالم قاسمی، مولانا محمد باقر حسین بستوی، مولانا عبدالکریم پاریکھ، جناب عشرت علی صدیقی مولانا سید سلمان الحسینی ندوی، مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی، مولانا نذر الحفیظ ندوی، مولانا محمد خالد ندوی، ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی، مولانا نثار الہدیٰ قاسمی، قاری محمد قاسم (مدراس) ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی (علی گڑھ) شیخ محمد عبداللہ مولانا شمس تبریز خاں صاحب، ڈاکٹر طفیل احمد مدنی مولانا عبدالعلیم قاسمی بھٹکلی وغیرہ نے مولانا کی علمی ودینی اور ادبی خدمات پر تقریریں کیں اور مقالات پڑھے، مقررین نے کہا کہ حضرت مولانا ایک بے لوث انسان تھے، ان کے اندر انسانیت کا درد تھا۔ وہ ملک وطن کے سلسلے میں بہت فکرمند رہتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ حضرت مولانا کے کام اور پیغام کو عام کیا جائے اور اپنے اندر جذبۂ عمل پیدا کیا جائے، یہی مولانا کا پیغام تھا، اور یہی ان سے سچی عقیدت ومحبت کی نشانی ہے۔

● مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی یاد میں ہونے والے سیمینار میں ایک سیمینار "مولانا علی میاں اور حب الوطنی" کے عنوان سے ۵ اگست ۲۰۰۰ء کو مولانا محمد علی جوہر فاؤنڈیشن لکھنؤ کے زیر اہتمام گاندھی بھون میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی صدارت میں ہوا جس کا افتتاح کرتے ہوئے مولانا عبداللہ عباس ندوی نے کہا کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایک پکے مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک سچے محب وطن بھی تھے، اور تحریک پیام انسانیت کے پلیٹ فارم سے انکی ملکی وقومی خدمات اسکی زندہ مثال ہیں" مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے اپنی صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ آزادی کے بعد پوری دنیا میں خصوصاً عالم اسلام میں ہندستان کا تعارف ایک معتبر اور پروقار ملک کی حیثیت سے حضرت مولاناؒ نے کرایا انھوں نے کہا کہ مولانا جہاں چودہ سو سالہ تاریخ کے امین تھے وہیں جذبۂ حب الوطنی میں اپنی مثال آپ تھے، اس سیمنار سے مولانا عبدالکریم پاریکھ، مولانا سید سلمان حسینی ندوی، پروفیسر محمود الرحمن (سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) پلمایم گولاڈ (علی گڑھ) عشرت علی صدیقی، چودھری اشرف الدین داؤ جی گپتا، ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد۔ اور وصی احمد صدیقی وغیرہ نے بھی خطاب کیا۔

علی گڑھ کے اہم سیمنار

شعبۂ عربی اسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی جانب سے ۲۳،۲۴ فروری ۲۰۰۰ء کو مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ "ہندوستان میں علوم عربیہ واسلامیہ کا ارتقاء" کے موضوع پر دوروزہ علمی مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا جس میں ہندوستان کے اہم اداروں، جامعات اور مدارس کے معروف علماء وادباء اور اساتذہ نے مولانا ندوی کی علمی وادبی خدمات پر مقالے پیش کئے، اور بحث ومباحثہ میں حصہ لیا، اس ادبی وعلمی مذاکرہ میں مولانا سعید الرحمن اعظمی ندوی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء، ڈاکٹر محمود الرحمن صاحب وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، پروفیسر کفیل احمد، ڈاکٹر محمد صلاح الدین عمری، پروفیسر محمد راشد ندوی اور پروفیسر محمد سالم قدوائی وغیرہ نے حضرت مولاناؒ کی علمی ودینی خدمات پر اپنے تحقیقی مقالے پیش کئے۔

● ۵ مارچ ۲۰۰۰ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک دوسرا دوروزہ اہم سیمنار ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے زیر اہتمام حضرت مولانا کی شخصیت پر ہوا جس میں مولانا نظام الدین صاحب جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ، مولانا مسعود عالم قاسمی ناظم شعبۂ دینیات اور مفتی ظفیر الدین صاحب دارالعلوم دیوبند، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی لکھنؤ، مولانا سید سلمان الحسینی ندوی مولانا عتیق احمد بستوی، مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی ندوۃ العلماء لکھنؤ کے علاوہ ملک کے اہم علماء ودانشوروں نے شرکت کی اور مقالے پڑھے ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی خود تو شرکت نہ فرماسکے۔ البتہ ان کا مقالہ بعنوان "مولانا علی میاں اور ندوۃ العلماء" ان کے عزیز سید محمود حسنی ندوی نے اس سیمنار میں پیش کیا، وائس چانسلر ڈاکٹر محمود الرحمن صاحب نے خصوصی طور پر دلچسپی لی اور شرکت بھی کی، اور "باغ علی میاں" کے نام سے ایک چمن کا افتتاح امام مسجد اقصیٰ شیخ محمد محمود الصیام سے کرایا۔

دہلی

پیام انسانیت کے واسطے سے ایک سیمینار دہلی میں عزت مآب جناب کرشن کانت نائب صدر جمہوریہ ہند کی صدارت میں منعقد کیا گیا، جس میں محترم نائب صدر صاحب کے علاوہ سابق وزیر اعظم جناب وی پی سنگھ، جناب اٹل بہاری واجپئی وزیر اعظم ہند کے دہلی سے باہر ضروری سفر کی وجہ سے ان کی نمائندگی مرکزی وزیر جناب راج ناتھ سنگھ نے کی، ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی معتمد تعلیمات ندوۃ العلماء مولانا عبداللہ عباس ندوی، مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب وغیرہ نے تقریریں کیں جلسہ میں دہلی کی سربرآوردہ شخصیتوں کے علاوہ دہلی یونیورسٹی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جامعہ ہمدرد کے اساتذہ وطلباء اور عوام وخواص کا ایک بڑا مجمع شریک ہوا!

● دہلی شاخ کے عالمی رابطہ ادب اسلامی نے

حضرت مولانا علی میاںؒ کی یاد میں جلسہ منعقد کیا اس میں صدر رابطہ شاخ دہلی پروفیسر محمد اجتباء ندوی نائب صدر پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی پروفیسر شفیق احمد خاں ندوی وغیرہ نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو خراج عقیدت پیش کیا، پروفیسر شیث اسماعیل اور جناب وکیل احمد نے اپنی تعزیتی نظمیں پڑھیں۔

● ایک جلسہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کانفرنس ہال میں ڈاکٹر ذاکر حسین اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جانب سے منعقد کیا گیا جس میں پروفیسر اختر الواسع، خواجہ حسن ثانی نظامی پروفیسر نثار احمد فاروقی، پروفیسر ظفر احمد نظامی اور پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی نے مقالات پڑھے۔ اس سیمینار کے اہم شرکا میں پروفیسر شمیم احمد حنفی، پروفیسر علی نقی جعفری، پروفیسر محمد اجتباء ندوی، پروفیسر بدر الدین الحافظ اور پروفیسر شفیق احمد خاں وغیرہ تھے، جلسہ میں حضرت مولانا کیلئے دعائے مغفرت بھی کی گئی۔

ممبئی

انجمن اسلام ممبئی کے زیر اہتمام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی حیات و خدمات پر ایک سیمینار ۲۰ مارچ ۲۰۰۰ء کو صابو صدیق انجینئرنگ کالج کے لطیفی ہال میں منعقد ہوا۔ اس سیمینار میں مولانا محمد سالم قاسمی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی مولانا تقی الدین ندوی مظاہری، ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا، مولانا ابوظفر حسان ندوی، جناب شمیم طارق مولانا عبد الرزاق ندوی وغیرہ نے شرکت کی مقررین نے اپنی تقریروں اور مقالوں میں جذباتی انداز میں حضرت مولانا کو خراج عقیدت پیش کیا انھوں نے کہا کہ مولانا علی میاں ندوی ایک غیر متنازع شخصیت تھے جن کو ہر مذہب مسلک والے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

اورنگ آباد

● جامعہ کاشف العلوم اورنگ آباد میں حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی حیات و خدمات پر ایک اہم سیمینار ۲۹ اپریل ۲۰۰۰ء کو ہوا جس میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا واضح رشید ندوی، مولانا عبد الکریم پاریکھ، پروفیسر ضیاء الحسن ندوی، مولانا نذر الحفیظ ندوی، پروفیسر محمد اجتباء ندوی، مولانا محمد سالم قاسمی کے علاوہ دیگر علماء و ادباء نے حضرت مولاناؒ کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی، اور مقالے پڑھے، مقالات کے عناوین اور شرکاء کے اعتبار سے یہ سیمینار بڑا کامیاب رہا۔

رائے بریلی

● وصی نقوی نیشنل انٹر کالج رائے بریلی میں مولانا کی یاد میں ہونے والے "پیام انسانیت" کے جلسہ سے مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا عبد الکریم پاریکھ، مولانا کلب صادق، مولانا عبد اللہ مغیثی، مولانا محمد حمزہ حسنی ندوی، اور سابق وزیر اعظم وی۔ پی سنگھ وغیرہ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مولانا علی میاں نے ہمیں پیام انسانیت کی جو راہ دکھائی ہے اس کو اختیار کرکے زندگی کا سفر طے کریں۔ مقررین نے کہا کہ مولانا نے اپنے کردار و عمل سے انسانیت کو زندہ کیا۔ اس لئے ہمیں بھی صالح پاکیزہ اور سچا انسان بننا چاہیئے۔

کلکتہ

● مدرسہ باب العلوم کلکتہ کی جانب سے حضرت مولانا علی میاں ندوی کے نام سے ایک خصوصی سیمپوزیم کلکتہ مسلم انسٹی ٹیوٹ ہال میں منعقد ہوا جس میں مولانا سعید الرحمن اعظمی ندوی اور مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی نے کہا کہ مولانا کی ہمہ جہت شخصیت اپنے اندر ایک دعوت اور ایک پیغام رکھتی ہے، آج اس تاریک دور میں مولانا کی تعلیمات کو عام کرنے کی سخت ضرورت ہے، سیمپوزیم سے دوسرے اہم علماء و دانشوروں نے بھی خطاب کیا۔

سری نگر کشمیر

● انجمن نصرۃ الاسلام سری نگر کشمیر کے زیر اہتمام میر واعظ مولوی محمد عمر فاروق کی سربراہی میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی حیات و خدمات کے موضوع پر ایک اہم سیمینار ہوا جس میں مولانا محمد خالد ندوی غازیپوری، مولانا انظر شاہ کشمیری اور مولوی محمد عمر فاروق نے حضرت مولانا کی علمی، عملی، فکری، روحانی اور دعوتی زندگی پر بھرپور روشنی ڈالی۔

نیپال

● جامعہ نور الاسلام جلپا پور نیپال کے زیر اہتمام ایک جلسہ ہوا جس میں حضرت مولاناؒ کو جذباتی انداز میں یاد کیا گیا۔ اسی طرح مدرسہ نور العلوم نول پراسی میں بھی ایک بڑا جلسہ ہوا۔

دہرہ دون

● شہر دہرہ دون میں انجمن شباب الاسلامی کے زیر اہتمام ایک اہم جلسہ ہوا جس میں مقررین نے کہا کہ حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی ذات والا صفات ایک "شجرہ طیبہ" تھی، جس کی جڑیں ہندوستان میں اور شاخیں سارے جہان میں پھیلی ہوئی ہیں، اس کے ثمرات انشاء اللہ رہتی دنیا تک سر سبز و شاداب، زندہ اور زندگی بخش رہیں گے۔

مقررین نے کہا کہ حضرت مولانا نے اپنے افکار و خیالات، داعیانہ کردار، حکمت و بصیرت اور مومنانہ فراست کے جو گرانقدر نقوش چھوڑے ہیں وہ عوام و خواص سب کے لئے مفید ہیں اس لئے لوگوں کو ان سے فائدہ اٹھانا چاہیئے

جلسہ سے انجمن کے سکریٹری جناب بسال الدین ندوی حقانی اور جناب عبد الصمد قاسمی نے بھی خطاب کیا۔

دبئی

● ابنائے ندوہ امارات کے زیر اہتمام دبئی میں حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کی حیات و خدمات کے موضوع پر جناب سید خلیل الرحمٰن کی صدارت میں ۸ رجون ۲۰۰۰ء کو ایک سیمنار ہوا جس میں دبئی و شارقہ میں مقیم ابنائے ندوہ کے علاوہ شہر دبئی کے چیدہ وچنیدہ علماء، تجار، دانشور اور علم دین سے شغف و تعلق رکھنے والے لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی، اس سیمنار میں جن ندوی فضلاء نے حضرت مولانا کی حیات و خدمات کے مختلف گوشوں پر مشتمل مقالے پڑھے وہ یہ ہیں۔ جناب مظفر علی ندوی، جناب سید محمد ظفر ندوی، جناب نعمت اللہ ندوی، جناب عبید اللہ صدیقی ندوی، حبیب اللہ ندوی، جناب عبد المتین منیری بھٹکلی اور محمد نعمان ندوی بھٹکلی،

جلسہ کی صدارت مولانا احمد سعید ندوی بھوپالی نے کی۔ اور مولانا محمد خالد ندوی کانپوری نے تلاوت کلامِ پاک ربانی سے جلسہ کا افتتاح کیا پھر جمعیت ابناء ندوہ کے سکریٹری جناب نظام الدین صاحب ندوی نے حاضرین کا استقبال کرتے ہوئے سیمنار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اس سیمنار سے ہمارا مقصد محض شخصیت پرستی یا ایک رسم کی ادائیگی نہیں ہے بلکہ مادرِ علمی ندوۃ العلماء کی فکر اور حضرت مولانا کی تعلیمات و ارشادات کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہونچانا ہے۔

● دبئی ہی میں حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کی یاد میں "انڈین اصلاحی سینٹر" اور "مرکز اہلسنۃ والجماعۃ" کی جانب سے اہم جلسے ہوتے جن میں وہاں کے اہم علماء، ادباء اور دانشوروں نے شرکت کی، اور مقررین نے حضرت مولانا کی عالمی پیمانہ علمی، دینی اور دعوتی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس کے علاوہ دبئی کی مختلف اسلامی انجمنوں، تنظیموں اور اداروں کی طرف درجنوں جلسے ہوئے اور ان میں مولانا کے اوصاف و کمالات بیان کئے گئے۔

ملیشیا

● ملیشیا میں حضرت مولانا کی وفات کی اطلاع ملتے ہی کوالالمپور، ترنگانو، قدح، کلنتن، جزیرۂ ملکا میں تعزیتی جلسے اور غائبانہ نماز جنازہ کا اہتمام کیا گیا۔ سب سے بڑا تعزیتی جلسہ ۲۷ر رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ کو معہد التربیۃ الاسلامیہ قدح میں ہوا جہاں پورے ملیشیا سے ندوی فضلاء شریک ہوئے ان کے علاوہ ملیشیا کے ممتاز علماء اور داعیوں نے اس جلسہ میں حضرت مولانا کی وفات پر اپنے رنج و غم کا اظہار کیا۔

رمضان المبارک کے بعد کوالالمپور میں دو بڑے سیمنار منعقد ہوئے جن میں حضرت مولانا کی زندگی اور علمی و دعوتی کارناموں پر مقالات پیش کئے گئے۔

پہلا سیمنار کوالالمپور میں انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کے زیر اہتمام ہائر اسٹڈی کے اساتذہ اور طلبہ کی طرف سے منعقد کیا گیا جلسہ کی صدارت وائس چانسلر ڈاکٹر محمد کمال حسن نے کی۔ انھوں نے مولانا کی شخصیت اور ان کی جامعیت اور ان کے علمی و دعوتی کارناموں کا جائزہ لیا۔ اور اس طرح کے علمی سیمنار کے انعقاد کو وقت کی ضرورت قرار دیا۔ وائس چانسلر کے علاوہ شعبۂ تاریخ کے صدر ڈاکٹر ارشاد الاسلام نے مولانا کی زندگی اور علمی و تربیتی کارناموں پر مقالہ پیش کیا۔ دوسرا مقالہ ڈاکٹر منجد بہجت پروفیسر شعبۂ عربی ادب نے مولانا کے تنقیدی اصول و معیار کے عنوان سے پیش کیا۔ ڈاکٹر منجد نے چند ماہ قبل ایم اے کے ایک مقالہ کی نگرانی بھی کی تھی۔ جو مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی عربی زبان و ادب کی خدمات سے متعلق تھا۔ تیسرا مقالہ کلیۃ اصول الدین کے پروفیسر ڈاکٹر محمد بن نصر نے پیش کیا جس کا موضوع تھا "معاشرہ کی اصلاح کے بارے میں مولانا ندویؒ کا طریقۂ کار" ڈاکٹر محمد بن نصر یونیورسٹی سے نکلنے والے رسالہ کے چیف ایڈیٹر بھی ہیں۔ انھوں نے مولانا کے تعلیمی اور تربیتی ادارہ اور مجددین و مصلحین کی اصلاحی جد و جہد کے بارے میں مولانا کے اصول اور طریقۂ کار کا جائزہ ان کی تحریروں کی روشنی میں لیا۔ اور بتایا کہ شیخ ندوی نے موجودہ دور کے نوجوانوں کی ذہن سازی کا جو طریقہ اختیار کیا وہ نبوی ﷺ اسلوب سے ہم آہنگ ہے، چوتھا مقالہ شعبۂ قرآن و سنّت کے استاذ لیث سعود قیسی نے پیش کیا جس کا عنوان تھا شیخ ندوی اور ان کی کتاب "السیرۃ النبویۃ" صاحب مقالہ نے تفصیل کے ساتھ اپنے مقالہ میں بتایا کہ مولانا ندوی نے سیرت کے موضوع پر جو کتاب لکھی ہے وہ وہ اپنے منہج اور اسلوب کے اعتبار سے اچھوتی اور انیلی کتاب ہے یہ صرف آنحضرت کی سیرت ہی نہیں بلکہ اسلام کی جامع اور زندہ تصویر ہے۔ اس میں مغرب کے شک آفریں تہذیب سے متأثر نئے طبقہ کی تسکین کا پورا سامان موجود ہے۔ یہ کتاب غیر مسلموں کو بلا تحفظ کے دی جا سکتی ہے۔

سیمنار کا آخری مقالہ شعبۂ تاریخ و اسلامی تہذیب کے پروفیسر ڈاکٹر محسن محمد صالح کا تھا۔ جنھوں نے "رویۃ الندوی للتاریخ الاسلامی" کے عنوان سے محاضرہ پیش کیا۔ اس مقالہ میں مولانا کی "مقتوع ثقافت" چار زبانوں پر قدرت

اوران کے علمی وتاریخی ذخیروں تک رسائی کا تذکرہ کرکے یہ بتایا کہ مولانا نے روایتی تاریخی کتابوں پر بھروسہ نہ کرکے نئے سرچشمے تک رسائی حاصل کی۔ انھوں نے تاریخ نویسی کے لگے بندھے طریقہ پر تنقید کی اور نئے انداز سے تاریخ نویسی کا بلند معیار پیش کیا۔ اس میں جامعیت اور توازن ہے

● دوسرا سیمنار ملیشیا کے نوجوانوں کی مشہور تنظیم حرکۃ الشباب الاسلامی (ABIM) کے زیر اہتمام انٹرنیشنل یونیورسٹی کے کیمپس میں ملک فیصل ہال میں منعقد کیا گیا۔ اس میں شرکت کیلئے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاذ مولانا نذرالحفیظ ندوی کو دعوت دی گئی تھی۔ مولانا نے اپنی تقریر میں حضرت مولانا کی حیات و خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس سیمنار میں احمد فہمی زمزم ندوی اور بدرالدین ندوی نے مولانا کے حیات و خدمات اور تصنیفی خصوصیات پر مقالے پیش کئے۔ ان کے علاوہ ملیشیا کے ممتاز عالم و محقق ڈاکٹر عثمان محمدی نے مولانا کے تربیتی افکار و نظریات پر مقالہ پیش کیا۔

چوتھا مقالہ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کے پروفیسر و پرنسپل کلیۃ اصول الدین ڈاکٹر عبدالمجید نے پیش کیا۔ جس کا عنوان تھا "مغربی افکار پر مولانا ندوی کی تنقید"۔ پانچواں مقالہ ایم کے سابق صدر پروفیسر صدیق فاضل نے پیش کیا مقالہ کا موضوع تھا "فکر دین کی تجدید میں مولانا ندوی کا حصہ"۔

مقالات کے علاوہ عربی اور ملیشین زبانوں میں حضرت مولانا کی تصنیفات کی نمائش بھی لگی تھی جو دلچسپی سے اور شوق سے لوگوں نے دیکھی اس موقع پر ندوی فاضل احمد فہمی زمزم کی ترتیب دی ہوئی کتاب کا رسم اجرا بھی ہوا۔ یہ کتاب ملیشین نوجوانوں کی تنظیم (ABIM) کی فرمائش پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور ان کی حیات و خدمات اور علمی کارنامے کے عنوان سے ملیشین زبانوں میں تیار کرائی گئی تھی۔ چند گھنٹوں کے اندر اس کتاب کے پانچ ہزار نسخے ..... شائقین نے خرید لئے۔

سائنس یونیورسٹی پنیانگ کے منتخب اساتذہ اور رابطہ ادب اسلامی کے ارکان کی ایک نشست شعبۂ ادب کے دفتر میں منعقد ہوئی۔ مولانا نذرالحفیظ ندوی نے اس موقع پر حاضرین کی طلب و خواہش پر مولانا کے انتقال کے واقعہ کی تفصیلات بتائیں

انڈونیشیا

● انڈونیشیا کے شہر جوان اور جاکرتا سے جو اطلاعات ملی ہیں ان سے معلوم ہوا کہ بڑی مسجدوں میں غائبانہ نماز جنازہ کا اہتمام کیا گیا۔ اور تعزیتی جلسے بکثرت منعقد کئے گئے۔

بنگلہ دیش

● بنگلہ دیش اور تھائی لینڈ سے ندوی فضلاء نے غائبانہ نماز جنازہ اور تعزیتی جلسوں اور سیمنار کی تفصیلی خبریں ارسال کی ہیں اس کے علاوہ اردن کی راجدھانی عمان، دمشق استنبول تونیہ، القرہ۔ ریاض، دمام۔ الخبر جدہ، حرمین شریفین رباط کاسا بلانکا، الجزائر، بیروت، دبئی شارجہ ابوظہبی میں تعزیتی جلسے منعقد کئے گئے۔ جن میں چندکی خبریں دی جارہی ہیں، جنوبی افریقہ اور مشرقی افریقہ کے شہروں اور مقامات پر بھی جلسے ہوئے۔

پاکستان

● پاکستان میں کراچی، لاہور، فیصل آباد، گجرانوالہ، اسلام آباد، اکوڑہ خٹک، کوئٹہ، پشاور، حیدرآباد، سندھ سے تعزیتی جلسوں اور سیمناروں کی تفصیلی رپورٹیں موصول ہوئی ہیں۔

رابطۂ ادب اسلامی کے زیر اہتمام لاہور اور اسلام آباد میں سیمنار ہوا۔

● اسلام آباد میں حضرت مولاناؒ پر ایک سیمنار کا انعقاد انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کے زیر اہتمام ہوا، جس میں صدر پاکستان جناب رفیق تارڑ نے خصوصی دلچسپی لی اور شرکت فرمائی عرب ممالک کے اہم مفکرین، ادبا رخصوصاً مصر کے فضلاء نے شرکت کی اور اپنے تاثرات پیش کئے اور مقالات پڑھے۔

مصر

● مصر میں رابطۂ ادب اسلامی کے زیر اہتمام حضرت مولانا کی یاد میں ایک اہم جلسہ کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں رئیس جامعۃ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم عویس نے بھی شرکت کی اس جلسہ میں مصر کے نامور علماء و فضلا شریک ہوئے اور حضرت مولانا کی علمی، دینی، دعوتی اور اصلاحی خدمات پر تقریریں کیں۔ ڈاکٹر عبدالحلیم عویس نے کہا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ ایک بابصیرت، عالم دین بلند پایۂ مفکر اور ممتاز صاحب قلم شخصیت کے حامل تھے۔ اس کے علاوہ مصر میں مقیم ندوی فضلاء کی جانب سے دو جلسے منعقد ہوئے، جن میں ندوی فضلاء نے اپنے محسن و مربی حضرت مولانا علی میاں کے عظیم کارناموں پر روشنی ڈالی اور اپنے جذبات و احساسات کا اظہار بڑے مؤثر اور دل گیر انداز میں کیا۔ اسی طرح مصر کے دیگر شہروں میں حضرت مولانا کی یاد میں متعدد جلسوں اور سیمناروں کا اہتمام کیا گیا۔

جنوبی افریقہ

● جنوبی افریقہ میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے موسوم دارالعلوم زکریا میں حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں ایک عمومی جلسہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی صدارت میں ہوا۔ جس میں حضرت مولانا کے بارے میں دارالعلوم کے مفتی رضاء الحق صاحب کا عربی میں منظوم نذرانۂ عقیدت دارالعلوم کے ایک طالب علم نے پیش کیا جس کے ہر شعر سے عقیدت و محبت کے جذبات کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کے بعد مفتی رضاء الحق صاحب نے نثر میں بھی حضرت مولانا سے اپنے والہانہ تعلق و جذبات کا اظہار ایک مقالہ میں کیا۔ خصوصاً حضرت سید احمد شہیدؒ کے احسانات اور ان کے دینی و دعوتی کارناموں اور سرفروشانہ کوششوں کا تذکرہ نہایت والہانہ انداز سے کیا۔ جس کا ایک سبب خود مفتی صاحب کا علاقہ پنج تار سے وطنی تعلق بھی ہے جو حضرت سید صاحب کی سرفروشانہ کوششوں کا ایک مرکز رہا ہے۔

جلسہ کے آخر میں صدارتی تقریر فرماتے ہوئے مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے حضرت مولانا کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی طرف روشنی ڈالتے ہوئے بعض اہم واقعات کی طرف اشارہ کیا کہ حضرت مولانا نے کیسے کیسے اہم اور نازک موقع پر بات کی اور اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت ایسی کھل کر سامنے آئی کہ تمام سننے والے اور حاضرین مجلس حیرت میں رہ گئے۔

اس جلسہ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مؤقر استاد مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی اور مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی نے بھی شرکت کی۔

برطانیہ

● برطانیہ کے مسلم کمیونٹی فورم کی جانب سے ڈیوس میری اسپورٹس سنٹر واقع ویسٹ پارک لندن میں ۳۰ جولائی ۲۰۰۰ء کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت پر ایک عالمی سیمنار ہوا۔

لندن کے اس سیمنار میں امریکہ، یورپ افریقہ، ہندوستان، پاکستان، دبئی، لندن کویت انگلینڈ اور عرب ممالک کے جید علماء و فضلاء، ادباء اور دانشوروں نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ پر مختلف عنوانات کے تحت مقالے پیش کئے۔ اور ان کی زندگی کے مختلف گوشوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔

اس سیمنار میں شریک ہونے والوں میں مولانا محمد تقی عثمانی (پاکستان) مولانا مجاہد الاسلام قاسمی، مولانا سید سلمان الحسینی ندوی، مولانا مفتی احمد خان پوری، مولانا عبداللہ کیودرا وی (ہندوستان) مولانا تقی الدین ندوی مظاہری (دبئی) مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی (لندن) ڈاکٹر مزمل حسین، مولانا محمد یعقوب قاسمی (امریکہ) مولانا محمد عیسیٰ منصوری (لندن) مفتی زبیر بیات (افریقہ) ڈاکٹر مناظر احسن، ڈاکٹر ڈیوڈ براڈنگ (انگلینڈ) کے نام قابل ذکر ہیں۔

انگلینڈ

● شمالی انگلینڈ کے شہر بائلے (BATLEY) میں حضرتؒ کی یاد میں ۲۴ جنوری ۲۰۰۰ء کو ایک اہم جلسہ ہوا، جس میں مولانا محمد یعقوب قاسمی (ڈیوز بری) نے حضرت مولانا کے مناقب اور اوصاف پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ حضرت مولانا کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ دین کا درد اخلاص نیت اور دین کی خاطر سب کچھ کر گزرنے کا جذبہ ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ جلسہ سے مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مولانا مرحوم ان شخصیتوں میں تھے کہ ان کی صحبت اور عقیدت سے جس نے فیض پایا اس نے بڑی چیز پائی۔

اسی طرح ملک و بیرون ملک میں سیکڑوں علمی، دینی اور ادبی اداروں، تنظیموں، انجمنوں کے زیر اہتمام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ہشت پہل، عالمگیر و ہمہ گیر شخصیت پر علمی مذاکرے سیمنار، کانفرنس، سمپوزیم اور اجلاس منعقد ہوئے، جن میں حضرت مولانا کے اوصاف و کمالات، افکار و تصورات اسلوب دعوت، مختلف تحریکات دینی و علمی اداروں سے ان کا قائدانہ تعلق، عرب و عجم پر ان کے فکر کے اثرات اور دیگر بہت سی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اخبارات و رسائل اور خصوصی و یادگاری نمبر

● حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی دینی علمی، دعوتی اصلاحی، ادبی خدمات اور ان کے کارناموں کو اجاگر کرنے اور ان کے دعوتی پیغام کو عام کرنے اور ان کی تحریک پیام انسانیت کو مزید تقویت پہنچانے کے لئے ملک کے اندر اہم دینی اداروں اور ان کے اصلاحی رسالوں کے ذمہ داروں نے حضرت مولاناؒ کی شخصیت پر عربی اور اردو میں درجنوں خصوصی اور یادگاری نمبر نکالے جن میں حضرت مولاناؒ کی ہمہ جہت اور ہمہ گیر بلکہ

عالمگیر شخصیت کو ان کے شایان شان خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ کتابیں تصنیف کی گئیں اور رسالوں میں کثرت سے مضامین شائع کئے گئے۔

البعث الاسلامی

● "البعث الاسلامی" جو دارالعلوم ندوۃ العلماء کا اہم دینی اصلاحی اور ادبی رسالہ ہے اس نے ۲۹۰ صفحات پر مشتمل خصوصی نمبر "عدد ممتاز عن فقید الامۃ الإسلامیۃ سماحۃ العلامۃ الشیخ ابی الحسن علی الحسنی الندوی" کے نام سے نکالا جس میں ہندوستان اور عرب ملکوں کے علما، ادبا اور دانشوروں کے اہم مضامین خطوط، پیغامات شائع ہوئے یہ خصوصی نمبر مجلس صحافت ونشریات ندوۃ العلماء کے زیر اہتمام مولانا سعید الرحمن اعظمی ندوی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء کی ادارت میں منصۂ شہود پر آگیا ہے۔

الرائد

● "الرائد" بھی ندوۃ العلماء کا ایک مؤقر عربی رسالہ ہے جسے عرب دنیا میں بڑی مقبولیت حاصل ہے اور عرب علماء وادبا بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس نے بھی حضرت مولانا پر اپنا خصوصی شمارہ "عدد ممتاز عن سماحۃ الشیخ الندوی" کے نام سے شائع کیا۔ یہ شمارہ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی سرپرستی اور مولانا سید واضح رشید ندوی اور مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کی سربراہی میں منظر عام پر آگیا ہے۔ یہ دونوں رسالے عربی جاننے والوں کے لئے بیش قیمت تحفہ ہیں۔

تعمیر حیات

● حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات کے فوراً بعد "تعمیر حیات" نے اپنا خصوصی ضمیمہ عام شمارہ کے ساتھ نکال دیا تھا جس میں حضرت مولانا کی عظیم المرتبت شخصیت اور ان کے اوصاف وکمالات کا تذکرہ چند مضامین کے ساتھ اجمالاً آگیا تھا۔ اب ماشاء اللہ حضرت کی سیرت وسوانح پر عرب وعجم کے نامور مشہور ومعروف علماء ادبا اور دانشوروں کے اہم مضامین مولانا کی علمی و دینی خدمات، افکار وخیالات، اسلوب دعوت طریقۂ کار مختلف تحریکوں، اداروں، انجمنوں سے ان کا قائدانہ تعلق اور عرب وعجم پر ان کی فکر کے اثرات اور ان کے امتیازی اوصاف وکمالات، منتخب شعراء کے کلام و دیگر بہت سی خصوصیات پر مشتمل خصوصی ویادگاری مجلہ "مفکر اسلام نمبر" منصۂ شہود پر آگیا ہے اور آپ کے ہاتھوں میں ہے جس میں حضرت کی ہمہ گیر، عالمگیر شخصیت اور پاکیزہ زندگی کا مکمل احاطہ کیا گیا ہے، تعمیر حیات کا یہ خصوصی اور یادگاری نمبر مولانا عبداللہ عباس ندوی معتمد تعلیمات دارالعلوم ندوۃ العلماء مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء کی سرپرستی میں مولانا سید محمد واضح رشید ندوی، پروفیسر وصی احمد صدیقی، پروفیسر سید محمد اجتباء ندوی، پروفیسر ضیاء الحسن ندوی مولانا نذر الحفیظ ندوی، مولانا محمد حمزہ حسنی ندوی (ناظر عام ندوۃ العلماء) کی نگرانی اور مولانا شمس الحق ندوی کی ادارت میں شائع ہو کر منظر عام پر آگیا ہے۔ یہ نمبر خوبصورت ٹائٹل دیدہ زیب کتابت عمدہ طباعت، بہترین کاغذ اور دیگر بہت سے محاسن وخوبیوں پر مشتمل ہے اور ظاہری ومعنوی اعتبار سے قابل تعریف اور ایک تاریخی دستاویز ہے۔

فریگرینس آف ایسٹ

● دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے نکلنے والے انگریزی سہ ماہی "فریگرینس آف ایسٹ" نے بھی اپنا خصوصی شمارہ علی میاں نمبر (SPECIAL ISSUE ON ALI MIYAN) انگریزی میں نکالا ہے جس میں حضرت مولانا علی میاں ندوی کی حیات وخدمات اور دعوت وتعلیمات پر انگریزی میں اہم مضامین شامل کئے گئے ہیں یہ میگزین مولانا سید واضح رشید ندوی اور جناب شارق علوی کی سربراہی میں ماشاء اللہ منظر عام پر آگیا ہے۔

بانگ درا لکھنؤ

● انجمن شباب الاسلام لکھنؤ کی جانب سے مولانا سید سلمان الحسینی الندوی کی سربراہی میں بانگ درا کا خصوصی نمبر نکلا جو مضامین کے لحاظ سے قابل تحسین اور قابل مطالعہ ہے۔ اس رسالہ کے "مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں نمبر" میں ملک وبیرون ملک کے نامور اہل علم علماء ادبا دانشوروں کے اہم مضامین شامل ہیں جو قارئین کو دعوت مطالعہ دیتے ہیں۔

الفرقان لکھنؤ

● الفرقان لکھنؤ کا بھی خصوصی شمارہ شائع ہوا جس میں حضرت مولانا کی دینی وعلمی خدمات پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

لاریب کلکتہ

● مدرسہ باب العلوم کلکتہ کے رسالہ لاریب نے

ایک خصوصی اور یادگاری مجلہ "مولانا علی میاں نمبر" شائع کیا۔ یہ مجلہ اپنے منتخب مضامین اور حضرت مولانا کی شخصیت اور ان کے اقوال و احوال کے لحاظ سے قابلِ قدر اور داد و تحسین کے لائق ہے

رضوان لکھنؤ

● ماہنامہ "رضوان" لکھنؤ کی طرف سے بھی حضرت مولانا کی شخصیت پر خصوصی شمارہ نکالا گیا یہ شمارہ مولانا محمد حمزہ حسنی ندوی کی ادارت میں منظرِ عام پر آگیا ہے، اور اہلِ علم صاحبانِ قلم، عوام و خواص خصوصاً خواتین کے لئے حضرت کا ایک تحفہ ہے جسے حاصل کر کے ضرور مطالعہ کیجئے۔

الصحوۃ الاسلامیۃ حیدرآباد

● جامعہ اسلامیہ دارالعلوم حیدرآباد سے عربی میں نکلنے والے رسالہ "الصحوۃ الاسلامیۃ" کا مفکرِ اسلام حضرت مولانا علی میاں نمبر نکلا اس میں عرب و عجم کے علماء و دانشوروں کے منتخب مضامین شائع ہوئے ہیں

الداعی دارالعلوم دیوبند

● الداعی جو دارالعلوم دیوبند کا عربی ترجمان ہے۔ اس کے فاضل ایڈیٹر نظام خلیل امینی نے بڑی نفاست اور ذوق سے اعلیٰ ترین پیمانہ پر حضرت مولانا کی شخصیت پر خاص نمبر عربی میں شائع کیا ہے جو ایک دستاویزی حیثیت رکھتا ہے اور خود رئیس التحریر کی تحریر اخلاص و صداقت کا نمونہ ہے۔

الشارق اعظم گڈھ

● جامعہ اسلامیہ منظر بلند قلندر پور اعظم گڈھ کا ترجمان رسالہ "الشارق" کا خصوصی نمبر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی یاد میں مولانا تقی الدین ندوی مظاہری کی سرپرستی میں شائع ہوا، جس میں حضرت مولانا کی عظمت و رفعت اور ان کے اوصاف و کمالات کا تذکرہ ملک بیرون کے اہلِ علم و قلم نے اپنے مضامین میں بڑے محبت آمیز انداز میں کیا ہے۔

نوائے ادب بمبئی

● انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا قریبی تعلق تھا۔ اور وہ انجمن کے معاملات میں دلچسپی بھی لیا کرتے تھے اس انجمن کے زیرِ اہتمام "سہ ماہی نوائے ادب" کا "مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نمبر" شائع ہوا ہے جس میں حضرت مولانا کی حیات و خدمات کے بارے میں فکر انگیز اور معلومات افزا مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ انجمن اسلام اپنے محسن کو اس خصوصی نمبر کے ذریعہ خراجِ عقیدت پیش کر کے انکے کارناموں کی یاد تازہ کردی ہے۔

نصرۃ الاسلام کشمیر

● ماہنامہ "نصرۃ الاسلام" جو خطۂ کشمیر کا ایک دینی تعلیمی، اخلاقی، اصلاحی اور ادبی رسالہ ہے۔ جس نے حضرت مولانا کی شخصیت پر اپنا ایک خصوصی شمارہ "مفکرِ اسلام نمبر" نکالا ہے، یہ نمبر انجمن نصرۃ الاسلام کے سرپرست میر واعظ مولوی محمد عمر فاروق کی سرپرستی اور محمد سعید الرحمٰن شمس کی ادارت میں شائع ہوا ہے جس میں متعدد اہلِ قلم کے مضامین شائع کئے گئے ہیں۔

ارمغان شاہ ولی اللہ پھلت

● ماہنامہ "ارمغان شاہ ولی اللہ" پھلت نے اپنا خصوصی شمارہ "گوشۂ مفکرِ اسلام" کے نام سے نکالا جس میں حضرت مولانا کی شخصیت، حیات اور امتیازی کمالات اور ان کی تعلیمات پر مشتمل مضامین شائع کئے گئے ہیں۔

نئی دنیا دہلی

● ہفت روزہ "نئی دنیا" دہلی نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی پر اپنا خصوصی شمارہ "مفکرِ اسلام نمبر" بڑی آن بان اور بڑے آب و تاب کے ساتھ باتصویر شائع کیا۔ یہ شمارہ اپنے مضامین انتخاب، تصاویر اور ترتیب و تزئین کے لحاظ سے قابلِ قدر اور قابلِ تحسین ہے۔ اس میں مولانا کی خدمات اور عالمی پیمانہ پر ان کی مقبولیت اور ان کی خصوصیات و امتیازات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے یہ رسالہ تصاویر کی وجہ سے بڑا پُرکشش تھا اور بروقت بھی نکلا تھا۔ اس لئے اس کو بے اشاعت ایک لاکھ کے قریب ہوئی اور کئی ایڈیشن بھی نکلے۔

الجمعیۃ دہلی

● ہفت روزہ "الجمعیۃ" نئی دہلی نے اپنا خصوصی شمارہ "مفکرِ اسلام مولانا علی میاں ندوی نمبر" کے نام سے شائع کیا، جس میں حضرت مولانا کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے، ان کی دینی خدمات کا اعتراف بھی کیا گیا ہے اور ان کی تعلیمات کو مشعلِ راہ بنانے کی ترغیب بھی دی گئی ہے۔

افکار ملی دہلی

• "افکار ملی" دہلی نے بھی اپنا ایک خاص شمارہ حضرت مولانا کی یاد میں نکالا اس میں اہل قلم اور صاحبان علم ودانش نے حضرت مولانا کی خدمات اوران کی امتیازی خصوصیات کا بڑے دلنشیں انداز میں تذکرہ کیا۔

ملی اتحاد دہلی

• "ملی اتحاد" دہلی نے بھی اپنی ایک اشاعت میں حضرت مولانا پر ایک خصوصی ضمیمہ شائع کیا، جس میں مولانا کی پہلو دار شخصیت پر روشنی ڈالی گئی ؛

ہدایت جے پور

• ماہنامہ "ہدایت" جے پور نے بھی ایک خصوصی نمبر حضرت مولانا علی میاں کی نسبت سے نکالا، جس میں حضرت مولانا کی عالمی پیمانہ پر مقبولیت اوران کی دینی و دعوتی خدمات کا تذکرہ اہل علم وقلم نے تفصیل سے کیا۔

تذکیر غازی پور

• مجلہ "تذکیر" غازی پور نے بھی اپنی خصوصی اشاعت "بیادگار مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندوی" میں کئی اہم مضامین اور حضرت مولانا کی اہم تحریریں شائع کرکے حضرت مولانا کو خراج عقیدت پیش کیا ہے،

نقش نوائط بھٹکل

• بھٹکل سے حضرت مولانا علی میاں صاحب ندوی کو بڑا لگاؤ تھا۔ اور اہل بھٹکل بھی حضرت حضرت مولانا سے عقید تمندانہ بلکہ نیازمندانہ تعلق رکھتے تھے وہاں سے نکلنے والے رسالہ "نقش نوائط" نے اپنا خصوصی شمارہ "مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں نمبر" کنڑ زبان میں شائع کرکے اپنی محبت وعقیدت کا اظہار کیا ہے،

ارمغان جامعہ بھٹکل

• جامعہ اسلامیہ بھٹکل سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا بحیثیت سرپرست بڑا تعلق تھا اور جامعہ کے اساتذہ بھی حضرت مولانا سے بڑی عقیدت ومحبت رکھتے تھے۔ طرفین کے اس خصوصی تعلق کی بنا پر جامعہ میں حضرت مولانا کی یاد میں جلسہ بھی ہوا۔ اور طلباء نے اپنے اساتذہ کی نگرانی میں حضرت مولانا پر ایک خصوصی رسالہ اردو میں ارمغان جامعہ کا "مفکر اسلام نمبر" بھی نکالا۔ جس میں مولانا کی حیات وخدمات پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

الزہرۃ بھٹکل

• اسی طرح جامعہ اسلامیہ بھٹکل سے نکلنے والے عربی مجلہ "الزہرۃ" نے بھی "عدد ممتاز عن سماحۃ الشیخ ابی الحسن علی الحسنی الندوی" کے نام سے خصوصی نمبر نکالا ہے، اس میں بھی حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے عظیم کارناموں اور عالمی پیمانہ پر ان کی دینی ودعوتی کوششوں کو بیان کیا گیا ہے۔

صوت القرآن احمد آباد

• ماہنامہ "صوت القرآن" احمد آباد کی جانب سے "مفکر اسلام نمبر" شائع ہوا، جس میں حضرت مولانا کی ہمہ گیر شخصیت اوران کی دینی وعلمی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

بیرون ملک کے اخبارات ورسائل

• اسی طرح ملک اور بیرون ملک سے شائع ہونے والے عربی، اردو، ہندی کے جرائد ورسائل میں حضرت مولانا کی حیات وخدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی، اور اور بہت خوب لکھا گیا۔ روزنامہ "الشرق الاوسط" لندن، "المدینہ" مدینہ منورہ، روزنامہ "عکاظ" مدینہ منورہ، روزنامہ "البیان" متحدہ عرب امارات، "صراط مستقیم" برمنگھم، "اردو نیوز" جدہ، "المجتمع" کویت، المسلمون، الدعوۃ، الاعتصام، الرابطہ، العالم الاسلامی کے علاوہ دوسرے بہت سے عربی رسالوں نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو خراج عقیدت پیش کیا اور عرب اہل قلم ودانشوروں کے معیاری مضامین بھی شائع کئے۔

پاکستانی اخبارات ورسائل

• پاکستان کے اہم رسالوں میں "الفاروق" کراچی، "البلاغ" کراچی، "تعمیر افکار" کراچی، "ختم نبوت" کراچی، "تکبیر" کراچی، "بینات" کراچی، "انوار مدینہ" لاہور، "حق چاریار" لاہور، "الحق" اکوڑہ خٹک، "النصیحۃ" لاہور۔ "الصیانۃ" لاہور، "ترجمان القرآن" لاہور، وغیرہ نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت پر تفصیلی مضامین چھاپے اور مولانا کی زندگی کے نقوش اور خدمات کا تفصیلی خاکہ پیش کیا، جن میں ماہنامہ "الحق" کا کردار خاص طور پر قابل ذکر رہا ہے۔

بنگلہ دیش کے اخبارات و رسائل

• بنگلہ دیش کے اخبارات و رسائل میں بھی حضرت مولانا کی سیرت پر مضامین شائع کئے گئے جو کافی مقبول ہوئے۔

ہندوستانی اخبارات و رسائل

• ہندوستان کے عربی، اردو، ہندی، انگریزی اخبارات و رسائل نے بھی اس سلسلے میں قابل ذکر رول ادا کیا ہے، اور حضرت مولانا کی جلالتِ شان اور علمی شخصیت سے قارئین کو روشناس کرایا۔ ان اخبارات و رسائل میں "البعث الاسلامی" "الرائد" "تعمیر حیات"، "کاروانِ ادب"، "فریگرینس" (انگریزی) ندوۃ العلماء لکھنؤ، "بانگِ درا" لکھنؤ، الفرقان لکھنؤ، ندائے ملت لکھنؤ، البدر، کاکوری لکھنؤ، نئی دنیا، نئی دہلی، روزنامہ انقلاب ممبئی، معارف اعظم گڑھ، ماہنامہ "دارالعلوم دیوبند"، ماہنامہ "مظاہر علوم سہارنپور"، آئینہ دارالعلوم دیوبند، ندائے دارالعلوم وقف دارالعلوم دیوبند، یادگار شیخ سہارنپور، ندائے شاہی مرادآباد، فیض محمود اعظم گڑھ، الرشاد اعظم گڑھ، الشارق اعظم گڑھ، ماہنامہ رضوان لکھنؤ، سہ ماہی اسلام اور عصر جدید دہلی، ماہنامہ اشرف العلوم حیدرآباد، ملی اتحاد دہلی، ارمغان پھلت مظفر نگر، سہ روزہ دعوت دہلی، افکار ملی دہلی، اردو راشٹریہ سہارا لکھنؤ، روزنامہ اندنوں لکھنؤ، حقیقت لکھنؤ، پیام صبح لکھنؤ، مرکزیہ لکھنؤ، صحافت لکھنؤ، لاریب لکھنؤ، السراج جھنڈا نگر، نور توحید کشمیر، فراستہ المومن کانپور، نقیب پٹنہ، اردو ٹائمز ممبئی، سالار بنگلور، سیاست بنگلور، روزنامہ مقدس اورنگ آباد، ماہنامہ ہدایت جے پور، مجلہ تذکیر غازیپور، نقش نوائط بھٹکل، الداعی دارالعلوم دیوبند، سہ ماہی صفا حیدرآباد، ماہنامہ ہجرت و نصرت پٹنہ، روحانی اسرار سہارنپور، دعوت و عزیمت دہلی، اخبار مشرق کلکتہ، صوت الامۃ بنارس، محدث بنارس، ترجمان القرآن بنارس، المحمود ہاپوڑ، المآثر مئو، نور توحید جھنڈا نگر، برہان دہلی، النور بہار اشٹر، ماہنامہ ذکری رامپور، سہ ماہی اسلام دہلی، نصرۃ الاسلام کشمیر، روزنامہ ٹائمز اورنگ آباد، پائنیر لکھنؤ، ٹائمس آف انڈیا لکھنؤ، ہندوستان ٹائمس لکھنؤ، اسٹیٹس مین دہلی، حیات جدید کانپور، انڈین ایکسپریس دہلی، جاگرن لکھنؤ، مسلم بنگلور، ریڈینس دھلی، ارمغان جامعہ بھٹکل کے علاوہ سیکڑوں ہندی، انگریزی، عربی، اردو، فارسی اخباروں نے حضرت مولانا پر ان کی شایانِ شان مضامین شائع کئے۔ اور ٹی وی ریڈیو وغیرہ نے خبریں نشر کیں، اور حضرت مولانا کی پاکیزہ سیرت اور ان کی دینی و علمی خدمات سے لوگوں کو روشناس کرایا۔

عالم تھے باعمل تھے محبِّ وطن بھی تھے

قمر الحفیظ قمر

حق گوئیوں کی شان تھے سید ابوالحسنؒ　　مذہب کی آن بان تھے سید ابوالحسنؒ
دانشور و مفکرِ اسلام ہی نہیں　　دنیا کے پاسبان تھے سید ابوالحسنؒ
تہذیب و انکسار کی دولت سے مالامال　　مخلص تھے مہربان تھے سید ابوالحسنؒ
عالم تھے باعمل تھے محبّ وطن بھی تھے　　انسانیت کی جان تھے سید ابوالحسنؒ
شام و عرب عجم ہوں کہ یونان و مصر ہوں　　سارے جہاں کی شان تھے سید ابوالحسنؒ
اک محسنِ جلیل کی تعریف کیا لکھوں　　اس دور کے نشان تھے سید ابوالحسنؒ
صدیقؓ کی صفت تھی جسارت عمرؓ کی تھی　　عثمانیت کی شان تھے سید ابوالحسنؒ
قول و عمل میں فاتح خیبر کی تھی ادا　　ملت پہ سائبان تھے سید ابوالحسنؒ
ہندوستاں کو ناز تھا حضرت کی ذات پر　　ہندوستاں کی جان تھے سید ابوالحسنؒ
ان کے قلم نے طے کیا کونین کا سفر　　خوش قول و خوش بیان تھے سید ابوالحسنؒ
دین محمدیؐ کا گلستاں کھلا رہے　　توحید کی زبان تھے سید ابوالحسنؒ
ندوہ کہ جس کا درس ہے آفاق پر عیاں　　ندوے کے پاسبان تھے سید ابوالحسنؒ

قمر الحفیظ تم بھی بڑے خوش نصیب ہو
تم پر بھی مہربان تھے سید ابوالحسنؒ

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ
کی
معروف تصنیفات اور ان کا پیغام
ایک تجزیہ

پروفیسر وصی احمد صدیقی

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے "آں" فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید
(اقبال)

میں نے یہ قطعہ جو شاعر مشرق نے اپنے لئے لکھا تھا ذرا سی تبدیلی کے ساتھ صرف اس لئے لکھا ہے کہ اپنے بعد دوسرے دانائے راز کے نہ آنے کا جو اندیشہ علامہ کو تھا وہ بجا نہ تھا خود ان کی حیات میں دانائے راز کی آمد ہو چکی تھی' وہ نظم کی اقلیم کے بادشاہ تھے۔ حضرت مولانا نثر کے، قدرِ مشترک اسلام کا ماضی، حال اور مستقبل تھا۔ دونوں برگزیدہ ہستیوں کو انعام ان کی زندگی ہی میں مل گیا۔ بقائے دوام کا تاج دونوں کے سر پر رکھا گیا۔ ایسا لگا کہ مافوق الفطرت قوتوں نے پیکرِ مرئی اختیار کیا۔ دونوں کے کمال عطیۂ الٰہی تھے۔ ایک غیبی قوت دونوں کو قلم پکڑ کر لکھا رہی تھی۔ گزری ہوئی تاریخ سامنے لائی جا رہی تھی۔ ماضی کے دھندلے نقوش صیقل پا رہے تھے۔ دونوں کے دل عشق کے جلوہ گاہ تھے۔ دونوں کے احساس فطری حسین اور عالی تھے۔ دونوں کے علم بے پناہ تھے، ایک اگر بے مثال شاعر تھا تو دوسرے کا ادراک بھی شاعرانہ تھا۔ دونوں حضرات جس ماحول میں تھے اس سے ان کو بھڑک نہ تھی مگر دونوں اپنے ماضی کو مڑ مڑ کر دیکھتے تھے اور سوچتے تھے کہ انسانیت کا پودا تو ہم نے لگایا تھا اور علم تو ہمارا گمشدہ مال تھا۔ یہ کیسی خزاں آ گئی۔ یہ اپنی متاع ہم نے کیسے کھو دی۔

میرے یہ دونوں ممدوح صحیح معنوں میں سزاوارِ مدح ہیں مگر مجھے اپنے مضمون کے موضوع کا خیال آ رہا ہے۔ اب میں حضرت مولاناؒ کی تصنیفات کے بیان پر آتا ہوں۔

میں نے ان کی کتابیں جو اردو میں ہیں پڑھی ہیں۔ ان کی تقریریں بھی سنی کم اور پڑھی زیادہ ہیں اور بطور تحدیث نعمت عرض کر رہا ہوں کہ میں ان کے ذہنی ماحول میں تقریباً جذب ہو گیا ہوں۔ میں کندن تو نہیں بن سکا لیکن مسِ خام سے کوئی بہتر چیز ضرور ہو گیا ہوں۔ یہ میرا احساس ہے۔ وہ کتابیں پڑھیں جن کی معنویت سے قطع نظر ان کے الفاظ کے تار و پود میں بھی ریشم کی ہمواری اور بلور کی شفافیت ہے۔

میں ان کے تعلیمی طریقے، ان کے قرآن مجید کی تدریس، ان کا عربی دنیا سے تعلق اور اس طرح کے موضوعات پر کچھ نہیں لکھنے جا رہا ہوں۔ میں دینی تعلیم کا پس منظر نہیں رکھتا اور نہ زبانِ عرب سے واقف ہوں پھر کیسے ان موضوعات پر لکھنے کا اہل ہوں۔ عرفی کا شعر میرے حسب حال ہے ؎

مرا بصحبتِ یار حدیثِ زیرِ لبی الیست
کہ اہلِ بزم عوام اند گفتگو عربی الیست

میں نے اسی خیال کو عرفی سے مستعار لیا ہے ؎

ہر ایک سے کہا بزم میں پر کوئی نہ سمجھا
شاید کہ میرے حال کا قصہ عربی ہے

اس کے لئے دوسرے مردانِ کار ہیں۔ زبان عربی کے محرم۔ علوم جدید و قدیم کے ماہرین اور راموزِ مذہب کے واقف کار۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ وہ دانائے راز تھے جن کی دانائی کا ان کی زندگی میں اعتراف کیا گیا۔ یہ ہماری ملت کے مزاج سے ذرا سی الگ بات ہے ورنہ ہم اپنے ساری عقیدت کے اظہار کو موت کے بعد کے لئے رکھ چھوڑتے ہیں۔ یہ ایک منفرد بات ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ کارواں کا متاع گراں بہا ہونے کے ساتھ ساتھ میر کارواں بھی تھے۔

حضرت مولانا نے ماضی کی طرف نظر دوڑا کر اپنے گزرے ہوئے سنہرے عہد کو دکھایا ہے۔ حال پر مہربانی کی نظر ڈالی ہے اور شاندار مستقبل کے لئے فکر کی ہے۔ انھوں نے دین و دنیا کے بیچ کی خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی اور یہ پیغام دے گئے اسی زندگی سے آنے والی دائمی زندگی کی امیدیں وابستہ ہیں۔ فرمایا کہ آزادی اور انسانیت کی تکمیل محض ایمان اور ایثارِ نفس کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے۔ ان کے خواب، ان کے خیال تقریباً بشارتوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے رسمی عقیدے اور روایتی مسلمات کو اسی حد تک قبول کیا جو ان کی تحقیق کی کسوٹی پر پورے اترے۔ ان کی ذکاوت تقریباً وجدان کی شکل میں تھی۔ وہ ایک

وہی ملک کے حامل تھے اور ان کے علمی کارنامے مذہب کے خواص کے محدود حلقے سے نکل کر عوام تک پہونچے۔ بقول میرؔ

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

حضرت نے بتایا کہ مذہب کا مقرر کردہ نصب العین ہی انسان کی منزلِ مقصود ہے اور کوئی منزل نہیں جس کی طرف ہمارا کارواں رواں ہو۔ انسانی روح لانہائی ہے اور ہمارا پروردگار جو لامکاں اور لازماں ہے اسی پر ہمیں ایمان قائم رکھنا ہے اور اسی سے مدد مانگنا ہے۔

حضرت مولانا کے قوت احساس میں انتہا درجہ کی ذہانت اور قوت تخیل میں انتہا درجہ کی وسعت تھی انھوں نے قرون وسطیٰ کی طرف بازگشت کو منتہائے مقصود نہیں سمجھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اللہ کا دین مکمل ہے مگر زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے اور اسلام کے ابدی حقائق ایسے ہیں کہ وہ ہر دور میں دنیا کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔

پھر یہ بات دہراؤں گا کہ حضرت مولانا زندگی کا وسعت یافتہ تصور اور تہذیب کے قدروں کا تربیت یافتہ علم رکھتے تھے۔ ایسا علم جو لامتناہی اور ابدی ہے۔ ان کی کتابیں جیتی جاگتی روحیں لگتی ہیں۔ جہاں وہ تاریخ کے نکتے بیان نہ کر رہے ہوں بلکہ صرف بات کر رہے ہوں تو ان کا وہبی بیان منطقی دلائل پر مافوق ہو جاتا تھا۔ پھر لگتا تھا کہ ہم فیضان قدسی سے مستفید ہو رہے ہیں۔ اس بیان کو ہم حضرت کا اندرونی تقاضہ سمجھیں یا آمد کہیں یا الہام، یہاں پر ناطقہ سر بگریباں ہے۔

حضرت مولانا سے میں نے اپنی تلخیص نگاری کی داد پائی ہے لیکن گفتگو میں نہیں، صرف تاثرات میں۔ بقول غالبؔ "پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں"۔ کبھی کبھی یہ فرمایا کہ مفید کام کر رہے ہو۔ آج کل لوگوں کے پاس ضخیم کتابیں پڑھنے کا وقت نہیں، جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے میرا انعام صرف مہربان چہرے کے نقوش ہوتے تھے۔ بس دو مرتبہ حضرت مولانا نے بشاشت کا اظہار کیا تھا اور مہربانی کے کلمات کہے تھے جو آج بھی مجھے فخر و مسرت سے بھر دیتے ہیں۔ پہلی مرتبہ جب میں تاریخ دعوت و عزیمت کی دوسری جلد سے تیسری جلد پر آیا یعنی امام ابن تیمیہ سے شاہجہان آباد جنت پر تو مضمون کے تسلسل میں روانی رکھنا تقریباً پل بنانا تھا۔ اس کو میں نے اس طرح لکھا تھا۔

"اس حقیر مضمون نگار کو یہ احساس ہوتا کہ جیسے وہ ایک عظیم الشان بلند و بالا سر بفلک پہاڑ کی چوٹی سے ایک ایسی خنک وادی میں داخل ہو گیا ہے جہاں ہر طرف سبزہ ہے۔ گھنے سایہ دار درخت ہیں۔ شفاف پانی کی نہریں بہہ رہی ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ جیسے گناہ گار پر اللہ کی رحمت کا نزول ہو رہا ہے"۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ تم نے بڑی خوبی سے سب کا حق ادا کیا ہے۔ دوسری مرتبہ جب میں نے پُرانے چراغ پر تبصرہ "شہر خوشاں کے مکیں" کے نام سے لکھا تھا اور ابتدا شیکسپیئر کی ایک برمحل چھوٹی سی نظم کے ترجمے کی تھی۔ یہ نظم میں آگے لکھوں گا۔ حضرت مولانا نے نام کی بھی داد دی تھی اور نظم کی بھی، اس داد کا ذکر ضروری نہ تھا مگر کیا عرض کروں میری خوشی کا پیمانہ گہرا نہیں ہے اور چھلک جاتا ہے۔

میں نے تلخیص نگاری کی ابتدا تاریخ دعوت و عزیمت سے کی تھی۔ ان کتابوں سے حضرت مولانا نے ماضی کے مرجھائے ہوئے نقوش میں نیا رنگ بھرا تھا۔ اسلام کی بہترین شخصیتوں کو بقائے دوام دیا۔ جو آنکھ سے اوجھل تھے سامنے آ گئے اور ہمیں چلتے پھرتے نظر آنے لگے لیکن اپنے اس مضمون کو میں سیرت سید احمد شہیدؒ سے شروع کروں گا۔ حضرت سید احمد شہید کی زندگی اور شہادت اس آیت کی عملی تفسیر ہے جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

"ان ایمان والوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ انھوں نے اللہ سے جس بات کا عہد کیا تھا اسے سچ کر دکھایا، ان میں کچھ وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے اور کچھ وہ ہیں جو (شہادت کے) مشتاق ہیں اور انھوں نے اپنے (قول کو) ذرا بھی نہیں بدلا"

یہ کتاب ملت کے لئے حضرت مولانا کا ایک عظیم تحفہ ہے۔ شہیدوں کے ذکر کا زندگی سے بھرپور پیغام۔ وہ شہدا جن کے امیر حضرت سید احمد شہیدؒ تھے۔ وہ مجاہدین جو آب و گل کی تسخیر کے لئے نکلے تھے۔ بادشاہوں سے خراج لینے والے درویش جو سورج اور چاند پر کمند ڈالتے تھے اور جن کی آغوش میں زمان و مکان تھے۔ اپنی محفلوں میں وہ ایسے نرم تھے جیسے پرنیاں اور حریر اور رزم گاہ میں وہ اپنے آپ کو بھول جاتے تھے۔ یہی لوگ رنگ بدلتے آسمان کو نظام تازہ بخشتے تھے۔ علامہ اقبالؔ نے ان حضرات کا کیسا خوبصورت بیان کیا ہے۔

یہ کتاب حضرت سید احمد شہیدؒ کی مفصل سوانح حیات ہے جس میں ان کے اصلاحی اور تجدیدی کارناموں کا بیان ہے۔ اس عظیم الشان تحریک کا بیان جس کے اثر میں علماء حجروں سے اور امراء محلوں سے نکل نکل کر میدان میں آ رہے تھے۔ اسلام کے اخلاقی، روحانی، مادی اور سیاسی غلبہ کی کوشش کرنا۔ یہ ایثار اور سرفروشی کی ایک داستان ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے لئے یہ شعر

حسب حال ہے ؎

ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر
مگر یہ زندگیِ مستعار رکھتے ہیں

ان مجاہدین نے کیا نہیں دیکھا۔ میدان جنگ کے سب نشیب و فراز اور حالات کے سب تغیرات دیکھے۔ فتوحات بھی ہوئیں، علمداری بھی قائم ہوئی۔ ایک دینی ریاست کا انتظام بھی کرنا پڑا۔ شکستیں بھی ہوئیں، اسلام کی غیرت کے یہ محافظ اپنے محفوظ گھروں سے نکلے اور بہت دور بالاکوٹ کی پہاڑیوں میں اپنی جان جان آفرین کے سپرد کردی۔ نہ مال غنیمت نہ مقبوضہ علاقے، دن کا نیّر درخشاں ڈوب گیا اور رات کی چاندنی کی چھاؤں میں اپنی آخری آرام گاہ میں لیٹ گئے۔

ایک خونچکاں کفن پر کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

(غالب)

حضرت مولانا نے مسلمانوں کے ہاتھ میں رشد و ہدایت اور عزم و ہمت کا ایک صحیفہ دے دیا۔

پھر "ماذا خسر العالم" منظر عام پر آئی جو تیس برس کی عمر میں لکھی گئی تھی اور جس نے ساری علمی دنیا میں ایک ہلچل مچادی اور جس کے آگے ابن خلدون کے فلسفۂ تاریخ کا مشہور مقدمہ گرد ہوگیا۔ حضورؐ کی بعثت کے وقت دنیا کا کیا حال تھا اور انسانیت کس پستی تک پہونچ چکی تھی۔ اسلام نے کس طرح زمام قیادت اپنے ہاتھ میں لی اور اس کی ترقی نے دنیا کی تہذیب پر کیا اثر ڈالا۔ پھر یہ قیادت کیسے کمزور اور غافل لوگوں کے ہاتھ میں پہونچی۔ مسلمانوں کا زوال صرف ایک ملی حادثہ نہیں بلکہ انسانیت کی بدقسمتی تھی۔ کتاب پڑھ کر پتا چلتا ہے کہ مسلمانوں نے کیسی مجرمانہ کوتاہی اور غفلت کا ارتکاب کیا، یہ نکتہ ہر جگہ واضح رہا کہ اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود نہ بدلے۔

حضرت مولانا نے بڑے شاندار اسادوں سے بڑھا مگر سچی بات یہ ہے کہ وہ تلمیذ الرحمٰن تھے "ماذا خسر العالم" یا "شرق اوسط کی ڈائری" لکھتے وقت مولانا کی عمر ۳۰ یا ۳۱ سال کی تھی مگر ان کا علمی ادبی اور ذہنی سانچہ بن چکا تھا۔

مولانا کی کتابوں کے متعلق میری خردو کی سطریں "تاریخ دعوت و عزیمت" کی سیریز سے متعلق تھیں جن کا ذکر میں پھر اس طرح کروں گا کہ حضرت مولانا نے اپنی ملت کے روحانی وارثوں کے نام اور کام کو ایک لوح سیمیں پر ثبت کیا ہے۔ یہ وہ انگارے تھے جو بجھے نہ تھے مگر تاریخ کے خاکستر میں دب گئے تھے۔ انھیں مولانا نے کرید کرید کر نکالا ہے اور پھونک پھونک کر روشن کیا ہے۔

پھر حضرت مولانا کی سیریز "پرانے چراغ" سامنے آتی ہے جس پر میں نے مضمون "شہر خموشاں کے مکیں" کے عنوان کے تحت لکھا تھا اس کی ابتدا شیکسپیئر کی اس چھوٹی سی نظم سے ہوئی ہے (ترجمہ):

جب اپنے بیٹھے خاموش خیالوں میں۔
گذرے ہوؤں کی یاد آتی ہے۔
میں سرد آہیں بھرتا ہوں ان کی یاد میں جو
کھو گئے۔
اور پرانے غموں کے ساتھ نئے غم بھی
سامنے آجاتے ہیں۔
میری آنکھیں بہتی ہیں ان کے لئے جن کو
موت نے چھپالیا۔
اور کراہتا ہوں ان صورتوں کے لئے جن
کو دیکھنا اب نصیب نہ ہوگا۔
یہ بیان ہے ان کا جن کو میں پہلے بھی رو چکا
ہوں۔

ان کتابوں میں ان لوگوں کا بھی بیان ہے جو خود حضرت مولانا کے گھر کے گوہر شب چراغ تھے۔ ایسے لوگ بھی جن سے علم اور محبت کے سبب سے ربط قائم ہوا۔ پرانے چراغ سے الادین کے چراغ کا جن سامنے آتا ہے مگر اس کا کام عجیب و غریب پرتکلف کھانوں کی فراہمی اور محلات کی تعمیر نہیں بلکہ وہ ایک دردمند دل، حساس اور بیدار ذہن کے مالک کا تابع ہے اور اس نے بصائر اور معرفت کا قیمتی ذخیرہ فراہم کیا ہے۔ مضامین الگ الگ لوگوں پر ہیں مگر ان میں ایک خارج از بیان صفت ہے جو سارے مضامین کو ایک وحدت بخشتی ہے۔ ان لوگوں کا ذکر ہے جن کی زندگی کی نیکیاں، غیر معمولی علم ولیاقت، اسلامی سیرت و اخلاق، ظاہری اور باطنی کمالات کے خود حضرت مولانا شاہد ہیں۔

حضرت مولانا انتقال فرماگئے۔ دیکھیں اس سیریز کا کون تتمہ لکھتا ہے۔

اب حضرت مولانا کی کتاب کاروان مدینہ کا ذکر آتا ہے۔ اقبالؔ نے جس دیار کے لئے کہا تھا "اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است" مضامین کا یہ کاروان اسی سمت رواں ہے۔ ان مضامین کے لئے کون سا لفظ استعمال کیا جائے۔ سروش غیبی، فیضانِ الٰہی ساری کتاب ربودگی اور از خود رفتگی وجد اور سرور کی فضا رکھتی ہے۔ وہ باتیں جو عام مسلمانوں کے علم میں ہیں ان کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک پراسرار تغیر ان باتوں میں ایک نئی آب و تاب پیدا کر دیتا ہے۔ دل کھنچا جاتا ہے۔ دل کی گہرائیوں میں موسیقی گونجنے لگتی ہے۔ ایک برقی رو ہے جو دل کو مرتعش کر دیتی ہے۔ ایک مکمل سکون کا احساس ہوتا ہے۔

یہ ایک بلند نگاہ، لطیف الاحساس اور صاحبِ تخیل مصنف کے قلم کی سحر طرازی ہے جسے سحر حلال کہیں گے۔ مصنف نے اپنی کتاب کی تزئین کے لئے آسمان کے تارے نہیں توڑے

ہیں، ان کے پیر زمین ہی پر رہے ہیں۔ وہ زمین جس نے وہ آسمان پیدا کیا جو کتاب کے اندر اور لوگوں کے دل پر محیط ہے۔

اس کتاب کو پڑھتے ہی مصنف کی کتاب "نبیؐ رحمت" کا خیال آتا ہے۔ سیرت مبارکہ پر وہ کتاب جس کا حسن، حسنِ بیان، حسنِ ترتیب اور حسنِ انتخاب میں مضمر ہے۔ اس کتاب میں حضورؐ کی مبارک سیرت اور پاک زندگی کے درخشاں نقوش ثبت ہیں۔ جو زندہ حقیقتیں اور جانی ہوئی سچائیاں ہیں اسے اپنی حقیقی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ حضورؐ کی سیرت لکھتے وقت کوئی بھی عاشقِ رسولؐ اپنے امنڈتے ہوئے جذبات کو ایک طرف نہیں رکھ سکتا ہے مگر فلسفہ آرائی اور رنگ آمیزی کہیں بھی نہیں ہے۔ سیرتِ رسول پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں مولانا سلیمان منصور پوری کی کتاب رحمۃ للعالمین کو حضرت مولانا اپنی محسن کتابوں میں مانتے ہیں مگر مولانا کی یہ کتاب اس لئے دوسری کتابوں سے مختلف ہے کہ نئی نسل کی فہم اور نفسیات کی موجودہ سطح اور عصری اور علمی اسلوب کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ قدیم و جدید دونوں قسم کے علمی ماخذ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ کاروانِ مدینہ اور اس کتاب میں وہ فرق ہے جو نعت اور تاریخ میں ہوتا ہے۔ نعت کا تعلق صرف والہانہ فریفتگی سے ہے۔ تخیل نعت کی جان ہے۔ یہاں شاعرانہ ادراک صوفیانہ ادراک بن جاتا ہے۔ نعت شعورِ حسن کا اظہار ہے۔ ان لاہوتی طبقات تک پرواز جو صرف عشق کے پروبال پر ہو سکتی ہے۔ پیکرِ نبوی کے جمالِ جہاں آرا کا ذکر، بے پناہ جذبہ رحمت کا ذکر، اللہ اور اس کے فرشتوں کے حضور پر درود بھیجنے کا ذکر، شفیع و شافع روزِ جزا ہونے کا ذکر، شبِ معراج کا ذکر، نعت کا تعلق گو نظم سے ہے مگر نثر میں بھی نعت ہو سکتی ہے۔ حضرت خدیجہؓ کا آپؐ کو تسکین دینا۔ ام معبد کا سراپائے رسول کا بیان یہ سب نعت ہے۔ نعت اور سیرت میں فرق ہے۔ سیرت حضورؐ کی مقدس زندگی کا مکمل بیان ہے۔ نعت اُس زندگی کا روحانی کہیں یا وجدانی جزو ہے۔

حضرت مولانا مرحوم کی کتاب "المرتضیٰ" جو عربی میں لکھی گئی اور جس کا ترجمہ اردو میں جناب مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی نے کیا تھا اپنے طرز کی واحد کتاب ہے جو حضرت سیدنا علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کی مکمل سوانح حیات ہے اور ان کے خصائص اور کمالات پر روشنی ڈالتی ہے۔ یہ ایک ایسے نادرۂ روزگار عبقری شخصیت کی سوانح ہے جن کی اصلی شخصیت افراط و تفریط اور اختلافات کے پردے کے پیچھے چلی گئی ہے۔ مسلمانوں کے مختلف گروہوں نے ان کو اپنے افکار و نظریات اور روایتی عقائد کے تحت دیکھا ہے۔ المرتضیٰ کے مصنف نے ان کی پاک اور بیداغ زندگی، ان کی شخصی خصوصیات، ان کے اعلیٰ اسلامی قدروں کو جس پر وہ کاربند تھے اس انداز سے لکھا ہے کہ ان کے عہد کی پوری تصویر بھی سامنے آگئی اور عہدِ خلافت میں جن مسائل اور مشکلات سے وہ گزرے اور جو نازک مرحلے ان کی زندگی میں پیش آئے سب کا مورخانہ بیان بھی ہے۔ ان کی بے نظیر زاہدانہ زندگی، صحیح فیصلے اور اقدامات، فرزندانِ والا مرتبت اور سادات کرام (آل رسولؐ) کے اعلیٰ اخلاق و شمائل سب کا بیان مستند تاریخ کی کتابوں سے اخذ کیا ہے اور تجزیہ کیا ہے۔

یہ نبیؐ کے چچا زاد بھائی، یہ بچپن میں سب سے پہلے ایمان لانے والے، یہ ہجرت کی رات نبی کے بستر پر سونے والے، یہ امانتوں کی واپسی کے بعد حضور تک پہونچنے کے لئے مکہ سے مدینہ تک پیدل سفر کرنے والے جن کے پیروں کا ورم دیکھ کر حضورؐ روئے۔ یہ نبی کی بیٹی سیدۃ النساء حضرت فاطمہ زہراؓ کے زوج یہ جنت کے جوانوں کے سردار حضرات حسنینؓ کے والد، اس بے مثال کتاب میں ان کی تابناک زندگی کے سارے پہلو سامنے آگئے۔ یہ کتاب ایک تاریخی دستاویز اور رسول کے تربیت گاہ کے منتخب ترین تربیت یافتہ کی سیرت لکھنے کی ایک مخلصانہ کوشش ہے۔

حضرت مولانا کی کتاب بصائر ہندوستان کی اسلامی اور علمی تاریخ کا ایک منصفانہ جائزہ ہے۔ یہ کتاب اپنے زعیموں کی داستان، ان کے کارنامے، ان کا دبستان فکر، ان کے بنا کردہ اعلیٰ دینی مدارس، تربیتی مراکز ان کی لائی ہوئی اصلاحی تحریکات کا ایک خاکہ ہے۔ جن کا بیان ہے ان کی خوبی اور محبوبی سے مولانا کا دل سرشار ہے۔ کتاب میں ذکر کردہ قدسی صفات عالی نفوس حضرات احیائے دین کے بانی مبانی تھے ما نھوں نے مذہب کی تجدید کے ساتھ معاشرے کی تجدید بھی کی ہے۔ حضرت مولانا نے مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی سے ابتدا کی ہے اور علامہ سید سلیمان ندوی پر خاتمہ کیا ہے ایک طبقہ نے جماعتی مفاد یا شخصی مصلحت یا ایک خاص مشرب اور طریقہ کو فائدہ پہونچانے کے لئے ان بزرگوں کی بنا کردہ دینی تحریکوں، دعوتی سرگرمیوں اور اصلاحی کوششوں کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے اور تعلیمی مرکزوں کے سلسلے میں شکوک اور شبہات پیدا کرنے کی کوشش شروع کی ہے، یہ کتاب اس کے ازالے کے لئے لکھی گئی ہے۔ مصنف کتاب نے اس رکاکت اس شناعت کے توڑنے کے لئے کوئی الزام نہیں لگایا ہے، ان کی تحریر خالص ایجابی ہے۔ ایسی حقیقتوں کا بیان جو خود اپنی سچائی کی گواہ ہیں۔ جن کا بیان ہے ان پر پہلے بھی حضرت مولانا بڑے شاندار مضامین اور کتاب لکھ چکے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہؒ پر تاریخ دعوت و عزیمت کی دو ضخیم

جلدیں تصنیف کی ہیں جو دائرۃ المعارف کا درجہ رکھتی ہیں۔ حضرت سید احمد شہیدؒ پر مولانا کی تصنیف وہ معرکۃ الآرا تصنیف ہے جس کے ٹکر کی کتاب اردو میں نہیں لکھی گئی۔ اس کتاب میں حضرت مولانا سید اسماعیل شہیدؒ کے کارنامے کا مفصل بیان ہے۔

مولانا قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے حوالے مولانا کی بیشتر کتابوں میں مل جائیں گے۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ مولانا حسین احمد مدنیؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا، مولانا محمد الیاسؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ پر مولانا کے لکھے ہوئے بہترین خاکے "پرانے چراغ" میں شامل ہیں۔ ان حضرات نے آدم گری، مردم سازی اور روحانی تزکیہ اور تربیت کا کام انجام دیا ہے۔ ایسے مردان کار تیار کئے جو حمایت شریعت اور محو بدعت کا عظیم الشان کام انجام دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ ان کو نیک ہدایت دے جو بقول حضرت مولانا بے مقصد جہاد اور بغیر دشمن کی جنگ لڑنے پر آمادہ ہیں کیا یہ زمانہ انہی باتوں کا ہے۔

یہ کتابیں حضرت مولانا کی بہت معروف کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت مولانا کی بے شمار ایسی کتابیں ہیں جو مقامی اور وقتی مسائل کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں جیسے مغرب سے صاف صاف باتیں یا نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں۔

مغرب سے صاف صاف باتوں میں حضرت مولانا بقول مولانا محمد الحسنی مرحوم کے ایک ایسے داعی کی شکل میں سامنے آتے ہیں جو مغرب کو اسلام کی دعوت بغیر کسی ندامت اور شرمندگی کے دیتا ہے اور اس کے لئے غیر ضروری تاویلات کا سہارا نہیں لیتا۔ حضرت مولانا مغرب کو بنی نوع انسان کی قیادت میں اہم کردار ادا کرنے اور زندگی کا رخ تبدیل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ علوم اور وسائل پوری انسانیت کو بلاتفریق و امتیاز حقیقت اور سعادت سے ہم کنار کر سکتے ہیں بشرطیکہ ایمان اور صالح مقاصد کے ساتھ ان کا جوڑ ہو۔ انانیت تکبر اور علمی غرور قبول حق کی راہ میں حائل ہوگیا ہے۔

دوسری کتاب، امریکہ اور کناڈا میں مولانا مرحوم کی اہم تقریروں اور خطبات کا فکرانگیز مجموعہ ہے۔ مغربی تہذیب اور امریکی معاشرت کا جائزہ، تجزیہ اور مطالعہ ہے اور امریکہ کے مقیم مسلمانوں کے بارے میں اہم مشورے دیئے ہیں مشینی تہذیب کے سب سے بڑے مرکز میں اس بلند سطح سے گفتگو کی گئی ہے جس پر دیکھنے والوں کو پرانی اور نئی دنیا ایک بے حقیقت سراب اور اس کی چمک دمک جھوٹے نگینوں کی آب و تاب نظر آتی ہے۔

حضرت مولانا کی سیر کاروان زندگی کو میں نے سب سے آخر میں رکھا۔ میر کارواں کی آخری منزل تو آگئی، ساتویں منزل پر انھوں نے پڑا ڈالا۔ اب آگے نہیں بڑھنا ہے۔ نوا تو حضرت مولانا کی کبھی تلخ نہ ہوئی کیونکہ ذوق نغمہ کو انھوں نے کمیاب نہیں پایا، مگر اب نہ جرس کارواں ہے نہ حُدی خواں۔ اب آگے کچھ لکھتے وقت میرا دل بھر آتا ہے۔ بس یہی کہنا ہے کہ یہ سیر تاریخی مرقع ہونے کے علاوہ فکر و عمل کی بھی دعوت دیتی ہے۔ ان کتابوں میں ملک کے اندر اور ملک کے باہر طویل اسفار کا بیان ہے۔ اس دوران ہونے والے اہم واقعات پر تبصرہ ہے اور یہ تبصرہ نتائج کی شکل میں نظر آتا ہے۔ حضرت مولانا تو تاریخ اور فلسفہ تاریخ کے زبردست واقف کاروں میں رہے ہیں جن حالات اور جن واقعات کو وہ بیان کرتے ہیں ان کے اسباب و علل پر غور کرکے وہ منطقی نتیجہ پر آتے ہیں، کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کی رودادیں پوری دلچسپی پیدا کرتے ہوئے قاری کے علمی، دینی اور اصلاحی جذبہ کو بیدار کرتی ہیں۔ یہاں جغرافیائی حدود و ثغور سے معاملہ نہیں۔ مذہب جو سطور میں عیاں اور بین السطور میں نہاں ہے اس نے کسی ملک اور کسی زمانہ میں اپنی شکل نہیں بدلی۔ وہ نظریہ حیات سامنے آتا ہے جو اسلام کی دین ہے۔ ہر بیان میں ایک حسن تکمیل بھی ہے۔

یہ مضامین جہاں مولانا کے اجتہاد ذاتی کا اظہار کرتے ہیں وہاں یہ بھی لگتا ہے کہ مجددین، مجتہدین، مصلحین ایک جماعت میں اپنے تحائف حضرت مولانا کو دے رہے ہیں۔ مولانا کا ہر فرمانا مکمل اور مستند ہونا، ہم آہنگی، توازن اور جامعیت حضرت کی تحریر کے وصف ہیں۔ آپ سطح کے اوپر کے مشاہدات کے ساتھ سطح کے نیچے بہنے والی لہروں UNDER CURRENT کو بھی محسوس کرلیں گے۔ ؏

داستان فصل گل خوش می سرید عندلیب

بیاد مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

● رؤف دانش فیض آبادی

وہ جس کی یاد میں سارے جہاں نے اشک برسایا
وہ جس نے سارے عالم میں امامت کا لقب پایا
خدا کے فضل سے جس نے کلید کعبہ بھی پائی
غلامی مل گئی کعبہ کی یہ اعزاز بھی پایا
وہ علم اللہ کا تکیہ جو رمضاں کے مہینے میں
تلاوت ہوتی رہتی تھی جہاں تھا نور کا سایا
اسی ماہ مبارک میں یکایک صحن مسجد میں
قرآن پاک کے سایہ میں پیغام اجل آیا
یہ ان کا مرتبہ ہے آج خود دربار یزدی میں
کہ اس ماہ مبارک میں انھیں خالق نے بلوایا
وہ فخر قوم وہ شیخ حرم ندوہ کا دلدادہ
انھیں اوصاف کو لیکر ہر اک مسئلہ کو سلجھایا
رؤف اب ان حریم ناز کے جلوے نہ دیکھوگے
جسے شیخ حرم نے گل بہ داماں ہو کے دکھلایا

مردِ مومن کا آخری سفر

روایت :
حاجی عبدالرزاق (خادم خاص)
مولوی سید بلال حسنی ندوی
مولوی سید محمود حسنی ندوی
ترتیب : مولانا نذرالحفیظ ندوی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا معمول تھا کہ تہجد سے قبل بیدار ہوجاتے، استنجا اور وضو سے فارغ ہوکر نوافل کی نیت باندھ لیتے۔ کبھی چار، کبھی چھ، کبھی آٹھ رکعت پڑھتے، اس رمضان میں نوافل کا اہتمام بہت بڑھ گیا تھا، سحری ختم ہونے سے دس منٹ قبل سحری کھاتے، اس کے بعد کبھی تو ہاتھ اٹھا کر اور کبھی بغیر ہاتھ اٹھائے دعا فرماتے، اذان کے بعد فجر کی سنت پھر فرض کے بعد منزل پڑھتے اور لیٹ جاتے۔ آخری عشرہ میں فجر بعد جو لوگ واپس ہونے وہ مصافحہ کے لئے حاضر ہوتے، ان کو لیٹے لیٹے رخصت فرماتے اور دعائیہ کلمات کہتے۔ رمضان کے دنوں میں کوشش فرماتے کہ ساڑھے نو بجے اٹھ جائیں۔ استنجا اور وضو سے فارغ ہوکر دو رکعت نفل پڑھتے، پھر قرآن شریف کم ازکم آدھا پارہ ورنہ عام طور پر ایک پارہ تلاوت فرماتے۔ ادھر کچھ عرصہ سے یہ معمول ہوگیا تھا کہ قرآن پاک کی تلاوت کے بعد صبح کو متن بخاری شریف سماعت فرماتے قیام لکھنؤ میں مولوی سید عبداللہ حسنی اور رائے بریلی میں مولوی سید بلال حسنی کو قرأت کا شرف حاصل ہوتا، پھر لکھنے لکھانے اور تصنیف وتالیف کا کام شروع ہوجاتا، والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی صاحبؒ کے مرتب کردہ مجموعہ احادیث "تہذیب الاخلاق" کو بھی مطالعہ میں رکھنے لگے تھے۔ اس کے بعد سورہ یٰسین روزانہ گیارہ مرتبہ اور جمعرات کے دن تیرہ بار تلاوت فرماکر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر اس وقت تک کے تمام مجددین ومصلحین، مجاہدین اور اصحاب دعوت وعزیمت، ربانی وحقانی علماء، اور اپنے اساتذہ اور محسنوں، اور عزیز واقارب اور عام مسلمانوں کو ایصال ثواب کرتے، اس معمول میں کچھ کمی رہ جاتی تو عصر سے کچھ قبل یا بعد مغرب اس کی تکمیل فرماتے، عام طور پہ ان معمولات میں ناغہ نہیں ہوتا تھا، عصر بعد کی مجلس میں بھی زیر لب کچھ پڑھتے رہتے، مغرب بعد اوابین سے فراغت پر سورۂ فتح پابندی سے پڑھتے سفر میں سورۂ فتح عام طور سے اوابین سے پہلے اور بسا اوقات مغرب سے کچھ پہلے تلاوت کرلیتے۔ اسفار میں جس شہر اور بستی سے گذرتے وہاں کے مدفون مسلمانوں کے لئے ایصال ثواب کا اہتمام فرماتے۔

جان لیوا مرض سے سنبھالا لینے کے بعد اہل تعلق کا یہ تاثر تھا کہ یہ عارضی صحت ہے کسی وقت بھی یہ دولت بے بہا ہم سے چھن سکتی ہے۔ خود حضرت والا بھی اس طرح کے جملے بڑے درد وکرب سے مختلف اوقات میں فرماتے تھے اللّٰھم لقائك، کبھی فرماتے، اب ہم بھی چلے، خدایا عاقبت محمود کردی، کبھی فرماتے اے اللہ اب تو بلالے، اس معذوری کے ساتھ کب تک؟ ایک خادم سے مختلف وقتوں میں فرمایا کہ تم پر کام کا بوجھ بہت ڈال دیتے ہیں بس کچھ ہی دن تک ہے۔ کبھی فرماتے۔ اب ہم بھی چلے. بس کچھ دن اور، کچھ دن اور۔

شعبان کا آغاز ہوتے ہی یہ سوال خدام اور حضرت کے معالجین کے درمیان گردش کرنے لگا کہ رمضان کا مہینہ کہاں گذرے گا. ڈاکٹروں نے اصرار کیا کہ ندوہ میں گذرے، آخر میں حضرت والا کے انشراح اور مرضی پر چھوڑ دیا گیا۔

حضرت نے فرمایا کہ رمضان سے قبل رائے بریلی جانا ہے۔ چنانچہ ۲۷ر شعبان کو تکیہ تشریف لائے، ۲۸ر کو قیام کرکے خلاف معمول مولوی سید بلال حسنی سے فرمایا کہ مجھے مسجد لے چلو، مسجد کے صحن میں جانماز بچھادی گئی، دو رکعت نماز ادا کی، پھر مسجد کے اندرونی حصے میں تشریف لے گئے، وہاں بھی دو رکعت نماز ادا کی، پھر فرمایا کہ ندی کی طرف لے چلو، چنانچہ جہاں نئے زینے ہیں وہاں کھڑے ہوکر چاروں طرف دیکھا۔ فرمایا ماشاءاللہ، ماشاءاللہ اس کے بعد فرمایا کہ مسجد کی پشت پر لے چلو، جہاں سید صاحب کے زمانہ کا ایک پتھر رکھا ہوا ہے۔ تکان کے خیال سے یہ فرمائش نہیں پوری کی گئی۔ مسجد سے نکلتے وقت سامنے ہی شاہ علم اللہؒ کا روضہ ہے جہاں محبوب والدین اور بھائی بہن کے علاوہ بھی گنجہائے گراں مایہ دفن ہیں۔ وہیں زینے کے پاس ٹیک لگا کر کھڑے کھڑے دیر تک ایصال ثواب کرتے رہے۔ وہاں سے واپسی پر تکان کے باوجود گھر کے اندر تشریف لے گئے جہاں گھر کی تمام مستورات جمع تھیں، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب بھی موجود تھے. پندرہ منٹ کے بعد گھر سے واپس بنگلہ پر تشریف لے آئے۔ بعد نماز ظہر آرام کرکے اول وقت عصر

کی نماز پڑھی، پھر گھر تشریف لے جا کر ملاقات کی اور لکھنؤ روانہ ہو گئے۔

پہلا روزہ شروع ہوا تو فرمایا کہ معلوم نہیں پورا رمضان ملتا ہے یا نہیں۔ اے اللہ! تو پورے رمضان کی برکتوں سے نواز دے۔ اور فرمایا کہ جو کام دوائیں نہ کر سکیں وہ رمضان نے کر دیا۔

وطن میں آخری عشرہ گذارنے کے بارے میں حضرت والا نے اپنے معالجوں سے اجازت لے لی تھی۔ ڈاکٹر نفیر، ڈاکٹر عبدالمعبود خاں، ڈاکٹر سید قمر الدین اور ڈاکٹر کرنل شمسی اس مشورہ میں شریک تھے۔

۲۰ رمضان ۱۴۲۰ھ ۲۹ دسمبر ۱۹۹۹ء کو رائے بریلی ایک بڑے قافلے کے ساتھ روانگی ہوئی۔ یہاں معتکفین سے مسجد بھر گئی۔ پہلے دن حضرت والا نے دریافت فرمایا کہ مسجد میں کتنے لوگ ہیں۔ مولوی سید بلال حسنی نے عرض کیا کہ مسجد بھر گئی ہے۔ فرمایا: "بانی کا اخلاص ہے۔"

آخری شب تراویح کے بعد ساڑھے نو بجے مجلس میں معمول کے مطابق تشریف فرما مختلف سوالات کے جوابات دیئے، دمشق سے چھپ کر حضرت والا کی جو تصنیفات آئی تھیں ان کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ سب اللہ تعالیٰ نے لکھوائی ہیں۔ ایک خادم نے جو باہر کے دورے سے حاضر ہوئے تھے، حضرت کو جب یہ اطلاع دی کہ ایک صاحب خیر نے ۲۷ ہزار ڈالر ترکی کے ایک ناشر اور مترجم کو دیئے ہیں کہ وہ حضرت کی تمام تصنیفات شائع کر کے ترکوں میں مفت تقسیم کریں۔ تو اس خبر پر بڑی مسرت کا اظہار فرمایا۔ مجلس میں "العاقبۃ للمتقین" سے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا کہ عاقبت مذموم بھی ہوتی ہے اور محمود بھی، آخر میں استفسار فرمایا کہ کیا کل جمعۃ الوداع ہے؟

وصال کے دن بھی مذکورہ بالا روزانہ کے تمام معمولات پورے فرمائے۔ ساڑھے نو بجے بیدار ہو کر استنجا کو گئے، وضو کے بعد نوافل پڑھے پھر قرآن شریف کی تلاوت کی، سجدۂ تلاوت بھی کیا، لکھنؤ میں قرآن مجید ختم کر چکے تھے، تیرھواں پارہ آخری دن پڑھا، مولوی سید جعفر مسعود حسنی خدمت میں حاضر ہوئے اور تکیہ تشریف آوری پر اہل تکیہ کی مسرت اور شادمانی کا ذکر کیا اور عرض کیا کہ آپ تشریف لاتے ہیں تو بہار آجاتی ہے، فرمایا کہ یہ تکیہ کی خصوصیت ہے جو (انشاء اللہ) باقی رہے گی۔ تھوڑی دیر بعد لکھنؤ سے ڈاکٹر عبدالمعبود خان بھی حاضر ہو گئے، حضرت نے فرمایا کہ اتنی سخت سردی میں آپ آگئے، انھوں نے عرض کیا کہ حضرت سے وعدہ کیا تھا، یہ بھی کہا کہ ہم اپنے ساتھ آکسیجن اور مانیٹر بھی لائے ہیں تاکہ حضرت کو کوئی زحمت نہ ہو، یہ سن کر حضرت مسکرا دیئے۔ بھائی صابر جو برسوں سے حضرت کا خط بناتے آئے تھے ان سے خط بنوایا، اس کے بعد نہانے کی تیاری کی، بھائی ذکاء اللہ خاں ندوی راوی ہیں: غسل خانہ جانے سے پہلے سوال کیا کہ کیا آج ۲۲ رمضان ہے۔ پھر فرمایا کہ کیا نماز جمعہ ۱۵ منٹ تاخیر سے ہو سکتی ہے؟ بھائی عبدالرزاق نے عرض کیا کہ آپ فرمائیں تو تاخیر سے نماز ہوگی، ساڑھے گیارہ بجے غسل کے لئے تشریف لے گئے، پندرہ منٹ بعد غسل سے فارغ ہو کر آگئے۔ کپڑے زیب تن کئے شیروانی کے بٹن مولوی سید بلال حسنی نے لگائے۔ فرمایا کہ تم لوگ تیار ہو جاؤ، نماز میں پندرہ منٹ تاخیر کرا دو، فرمایا کہ اب ہم سورہ کہف پڑھیں گے۔ (اس سورہ کے پڑھنے کا معمول آٹھ سال کی عمر سے تھا)، یہ فرما کر بستر پر بیٹھ گئے، لیکن بجائے سورہ کہف پڑھنے کے سورہ یٰسین پڑھنے لگے، دس بارہ آیتیں ہوئی ہوں گی کہ زبان رک گئی، (یہ آیت فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ تھی جیسا کہ حاضر الوقت خدام نے بتایا) جس طرح بیٹھے تھے اس سے تھوڑا پیچھے کی طرف جھک گئے، مولوی بلال حسنی نے سر کو اور خادم خاص بھائی عبدالرزاق نے پاؤں کو اٹھا کر تخت پر لٹا دیا، ڈاکٹر سید قمر الدین اور ڈاکٹر عبدالمعبود خاں قریب ہی تھے، آکسیجن لگائی گئی۔ انجکشن جب رگوں میں نہیں لگ سکے تو کولھے میں لگائے گئے، ڈاکٹر قمر الدین صاحب نے ایک انجکشن دل پر لگایا، ہاتھ سے قلب کی مالش کی، اور منہ سے ہوا بھی بھرنے کی کوشش کی، لیکن راہِ حق کا یہ مسافر ان تمام طبی کوششوں سے پہلے ہی روانہ ہو چکا تھا، اس وقت بارہ بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی اور محبین واہل تعلق کے قافلے دیوانہ وار رائے بریلی پہونچنا شروع ہو گئے۔

مولوی سید حمزہ حسنی ندوی نے اس نازک موقع پر غسل، تجہیز و تکفین، نماز جنازہ اور تدفین کے سارے امور طے کئے۔

غسل دینے میں حسب ذیل حضرات شریک تھے، مولوی سید بنو ندوی (جنوبی افریقہ) جو رمضان گذارنے آئے تھے، حضرت کے مجاز بھی ہیں، خادم خاص بھائی عبدالرزاق، سید حسن عسکری طارق صاحب (مدینہ منورہ) مولوی سید بلال حسنی ندوی، حضرت کے کاتب خاص مولوی نثار الحق ندوی، مولوی نیاز احمد ندوی بھی شریک ہو گئے، اور اس موقع پر مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولوی سید سلمان حسینی ندوی، مولوی عبداللہ حسنی ندوی موجود تھے اور بھائی عبدالمعید پرتاپ گڈھی (خادم) عزیزان محمود حسنی، محمد معاذ کاندھلوی، سید فاروق سلمہم اور خادم مصباح الدین صدیقی موجود رہ کر معاونت

کر رہے تھے۔ اس موقع پر مولوی سید حمزہ حسنی، سید جعفر مسعود حسنی، سید عمار حسنی اور دیگر افراد خاندان موجود تھے۔

بعد مغرب سات بجے سے پونے دس بجے تک آخری دیدار کرنے والوں کا ہجوم رہا۔ جو بتدریج بڑھتا ہی جارہا تھا، نماز جنازہ کا اعلان دس بجے کیا گیا تھا، چنانچہ ٹھیک پونے دس بجے جنازہ اٹھایا گیا، دو منٹ کا راستہ پچیس منٹ میں طے ہوا، مسجد کے اندر منبر کے قریب جنازہ رکھا گیا مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی نے نماز جنازہ پڑھائی۔

ساڑھے دس بجے جنازہ قبر میں اتارا گیا، قبر میں جن لوگوں نے جنازہ اتارا ان میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مولوی سید عبداللہ حسنی ندوی، خادم خاص بھائی عبدالرزاق تھے، بھائی عبدالرزاق اور سید بلال حسنی لکڑی کے پٹرے لگا رہے تھے، محبوب منصور پوری پٹرے دے رہے تھے، آخری پٹرا لگانے سے پہلے کسی نے توجہ دلائی کہ کفن کا بند کھولا نہیں جاسکا، چنانچہ مولوی بلال حسنی نے قبر میں اتر کر بند کھول دیا، پھر آخری پٹرا بھی لگادیا گیا، تدفین روضہ شاہ علم اللہ میں ہوئی، جہاں آخری جگہ باقی تھی۔

مجمع غیر معمولی تھا، ساڑھے آٹھ بجے تھانیدار ایس پی کو رپورٹ دے رہا تھا کہ پونے دو لاکھ آدمی آچکے ہیں اور جوں جوں نماز کا وقت قریب آرہا تھا موسم کی سختی، سردی اور شدید کہرے کے باوجود آنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا اور سلسلہ تو تدفین کے بعد تک جاری رہا، دور دراز کی گاڑیاں سحر تک آتی رہیں۔ ؏

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

حادثہ جمعہ کو پیش آیا، جمعرات کو ڈاکٹر عبادالرحمٰن نشاط صاحب نے (جو حضرت کے مجاز بھی ہیں) حج کے سفر کی بات رکھی تھی حضرت نے منظور فرمالیا تھا اور ارادہ کرلیا تھا۔ اس کی بھی حضرت کو بڑی فکر تھی کہ روپے پیسے جمع نہ رہیں، جو آرہا ہے جاتا رہے، اس کے لئے باربار بھائی عبدالرزاق کو آواز دیتے اور مولوی بلال اور مولوی محمود کو بھی تاکید کی کہ جہاں مناسب سمجھو بتادو، ہم دیں گے۔

اس طرح حضرت حج کے سفر کی نیت کرکے، اور روزے کی حالت میں، نماز کی تیاری اور انتظار میں، دیتے دلاتے اور اپنی عملی زندگی سے زہد و عبادت و استغنا اور تعلق مع اللہ کی دعوت دیتے ہوئے رخصت ہوگئے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

وفات کے بعد

حضرت کے وصال کا صدمہ بہت غیر معمولی تھا۔ لیکن بزرگوں اور صلحاء کے انتقال کے وقت اہل تعلق اور مخلصین و محبین کو اللہ تعالیٰ برداشت کی قوت اور صبر وضبط کا یارا عطا فرما دیتے ہیں، دوسری خصوصیت جو عام طور پر اولیاء اللہ اور ربانی علماء کے وصال پر دیکھی جاتی بلکہ کھلے عام محسوس کی جاتی ہے وہ یہ کہ دہشت و گھبراہٹ کے بجائے پوری فضا پر سکینت و طمانینت کا شامیانہ تنا ہوتا ہے کوئی گھبراہٹ و مایوسی نہیں ہوتی اور نہ ہی فکرمندی اور تشویش ہوتی ہے بلکہ ذکر و دعا اور انابت کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ حضرت کے وصال کے وقت بھی ان ہی کیفیات اور احساسات کا غلبہ تھا۔ تیسرا احساس عام طور پر بزرگوں کی وفات پر ہر شخص کو خواہ وہ کتنا ہی قریب اور برسوں سے ساتھ رہا ہو، اپنی محرومی اور اس نعمت عظمیٰ کی ناقدری کا ہوتا ہے اس کے دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے اور ساری عمر کی تقصیریں یاد آتی ہیں اور حسرت ہوتی ہے کہ کاش اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت کی قدر کرلیتے۔ ؏

یک حرف کاشکے است صد جا نوشتہ ایم

اور

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

کا غمناک احساس ستاتا ہے۔

اوروں کا حال تو نہیں معلوم البتہ ہم نیازمندوں کا ایک احساس یہ بھی ہے کہ اتنی مدت گزرنے کے باوجود حضرت ہمارے درمیان موجود ہیں کہیں تشریف لے گئے ہیں تھوڑی دیر میں تشریف لے آئیں گے۔

آخری دیدار کے لئے جو لوگ آرہے تھے چہرہ مبارک پر پہلی نظر پڑتے ہی بے اختیار سسکی کی آواز نکل جاتی تھی۔ آنکھیں ضبط کے باوجود چھلک جاتیں۔ جذبات پر قابو پانا مشکل ہوجاتا زندگی میں جس طرح نظر بھر کر دیکھنا مشکل ہوتا تھا اسی طرح وفات کے بعد بھی چہرۂ مبارک پر چند لمحے سے زیادہ نظر جمانا ناممکن ہورہا تھا آنکھیں بند کئے اور سر جھکائے غم سے نڈھال لغزیدہ قدموں سے کسی گوشے کی پناہ لینے نکل جاتے۔ تاکہ خاموشی سے گھٹ گھٹ کر کسی طرح اس کوہ غم کو اٹھا سکیں۔

دیدار کیلئے سب سے زیادہ مضطرب مسجد کے معتکفین تھے ان کی بیقراری اور بے چینی صبر وضبط کے سارے بندھن توڑنے والی تھی لیکن مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ سمجھ کر خون کے آنسو پی گئے پھر بھی ذکر و تلاوت اور دعاؤں میں ان کا قلبی اضطراب ظاہر ہوجاتا اور آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی لیکن اس وقت ہوئی جب حضرت کا جنازہ مسجد کے اندر منبر کے قریب اس جگہ لایا گیا جہاں حضرت ہمیشہ نماز پڑھا

ادا فرماتے تھے۔

وصال کے بعد ہی مولانا سید محمد رابع صاحب کے مشورہ سے نماز جنازہ اور تدفین کا وقت دس بجے شب مقرر کر دیا گیا۔ اس کی اطلاع عام کر دی گئی۔ شدید سردی اور کہرے کے باوجود مجمع بڑھتا ہی گیا۔ لیکن یہ بھی اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم رہا کہ لاکھوں کا یہ مجمع بے قابو نہیں ہونے پایا۔ گھر سے جنازہ جیسے ہی نکالا گیا مضبوط فولادی ہاتھوں نے تابوت کے پائے اس طرح اپنے قبضے میں کر لیے کہ اژدحام سے تابوت موجوں کی طرح ہلکورے لے رہا تھا۔ اور دائیں بائیں جا رہا تھا مگر لاشِ مبارک تابوت پر ہی رہی آخری آرام گاہ تک کا سفر بڑے سکون سے طے ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم اور بہت بڑا احسان تھا یہ بھی ہوا کہ نماز جنازہ کی ادائیگی بھی بڑے اطمینان اور خشوع و خضوع کے عالم میں ہوئی۔ مائیک اور روشنی کے انتظام سے بھی اس میں مدد ملی جنازہ کے انتظار میں جو وقت گذرا اس میں بھی ذکر و دعاء کا اہتمام ہو رہا تھا اور تسبیحات کی تلقین بھی مائیک سے کی جا رہی تھی۔

نماز جنازہ کے بعد بڑی تعداد اسی وقت روانہ ہوگئی۔ انتظامیہ نے دو کلو میٹر پہلے ہی تمام سواریوں کو روک دیا تھا اس لئے آنے جانے میں یہ فاصلہ طے کرنا کمزوروں اور معمر حضرات کے لئے آسان نہ تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ کی خاص مدد رہی شدید کہرے کے باوجود تمام لوگ بخیر و خوبی اپنی منزلوں تک پہنچ گئے الحمدللہ کہ نہ کسی کو ٹھنڈک لگی اور نہ ہی کوئی حادثہ پیش آیا۔ دہلی سے مرکز نظام الدین۔ اور جامعہ ملیہ سے کچھ حضرات نے بذریعہ ہوائی جہاز آنے کی کوشش کی مگر شدید کہرے کی وجہ سے جہاز پرواز نہ کر سکا اور مسافروں کو جہاز سے اتر کر واپس جانا پڑا۔ ٹرین سے آنے والے بھی سولہ سترہ گھنٹے سے پہلے نہیں پہنچ سکے تعزیت کے لئے آنے والوں کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے خطوط تو ہزاروں کی تعداد میں دنیا کے کونے کونے سے آئے فیکس اور فون کے ذریعہ بھی تعزیت کا سلسلہ دو ماہ تک جاری رہا۔

اس خاندان والاشان کی یہ تاریخ رہی ہے کہ ہر دور میں تعلیم و تزکیہ کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ خاندان میں کسی نے بھی مشیخت کی دوکان نہیں لگائی جو اہل ہوتا اسی کی طرف خاندان اور خاندان سے باہر کے لوگ خود بخود بغیر کسی رسمی اعلان کے رجوع کرنے لگتے۔ اور اسی کو بڑا مان لیتے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا معاملہ یہ تھا کہ دس سال کی عمر ہی سے خاندان کے بزرگ حضرات دینی معاملات میں آگے کرنے لگے تھے۔ حضرت کی وفات کے بعد حضرت کے بھانجے اور خلیفہ مولانا سید محمد رابع حسنی صاحب ندوی کے ساتھ حضرت کے جانشین کی حیثیت سے لوگوں نے معاملہ شروع کر دیا۔ اور بغیر کسی رسمی کارروائی کے بیعت اور تجدید بیعت لوگ کرنے لگے۔

اللہ تعالیٰ نے ندوۃ العلماء کی نظامت کا مسئلہ بھی اسی طرح حل فرما دیا اور باتفاق آراء سب نے اس کو تسلیم کر لیا۔ حالات بہت جلد معمول پر آگئے۔ خادم خاص حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب کے رفیق سفر و حضر کی حیثیت سے رہتے ہیں کاتب خاص مولانا نثار الحق کا قیام تکیہ پر ہے، اندرون و بیرون ملک دورے بھی شروع ہوگئے ہیں عشاء کے بعد کی مجلس مہمان خانے میں اور بعد عصر اساتذہ دار العلوم اور طالبعلموں کی آمد کا سلسلہ معمول کے مطابق جاری ہو گیا ہے۔

داتا رکھے آباد ساقی تری محفل کو

لے افسوس کہ مولانا احقاق حق اور ابطال باطل کی سنجیدہ کوشش کرنے والے کراچی پاکستان میں ۱۸ ربیع الاول؟ ۱۴۲۱ھ کو شہید کر دیئے گئے۔ (ادارہ)

تاثرات مع تاریخ وفات

— • مجیب الغفار اسعد اعظمی

آہ صد افسوس سید ابوالحسن رخصت ہوئے
عالمِ بے مثل تھے وہ صاحب طبعِ نفیس
فکر اسلامی میں تھا ان کا بہت اونچا مقام
مختلف علمی اداروں کے وہ تھے رکن و رئیس
مغفرت کر ان کی اے اللہ اپنے لطف سے
قبر کی وحشت میں ہو تیرا کرم ان کا انیس
اسعدؔ اسوئے جناں جس دن ہوا اُن کا سفر
تھا جمعہ، بائیس رمضان، اور سن چودہ سو بیس

اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

یہ شکوہ کرنا کہ ہمیں بہت نازک زمانہ ملا ہے اور ہماری راہ کانٹوں سے بھری ہوئی ہے کم ہمتی کی بات ہے، بلند ہمتی کی بات یہ ہے کہ اگر راستہ آسان ہو تو آدمی کو شبہ ہونے لگے اپنے بارے میں کہ مجھے اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ میں کسی مشکل پر چلوں، اگر زندگی ساری کی ساری سہولتوں سے لبریز ہوتی تو زندگی میں لطف نہ رہتا، شاعر نے خوب کہا ہے ؎

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

بقیہ سراپا عزیمت و دعوت

وا السّلام کی ذات پاک کی تجلیات سے سنی سنائی حد تک بھی بے بہرہ اور ناواقف ہو۔ صدی پر صدی گزرتی گئی ان مبارک قدموں کے نشانوں پر سر کے بل چلنے والے اسی طرح کی شان دکھاتے آئے ہیں۔ جیسی شان علی میاں نے دکھائی۔ یہ بزرگ تو خاص کے مدینے کا رنگ رکھنے والے بزرگ ہیں، لکھنؤ و دہلی کے بیچارے اس کے آگے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔

حلوی قطعۂ تاریخ

۱۴۲۰ھ

مولانا محمد عثمان معروفی

رخصت ہوئے جہاں سے حضرت علی میاں
قرآن پڑھ رہے تھے ہوئے واصلِ جناں
انیس سو سے اوپر چودہ سنہ ولادت
انیس سو سے اوپر ننانوے میں رحلت
بائیس ماہ رمضان دن جمعۂ مبارک
چودہ سو بیس ہجری رحلت ہوئی اچانک
عثمان سالِ رحلت کہہ دولتِ سعید
۱۹۹۹ء
خلدِ بریں میں داخل حق منزل حمید
۱۴۲۰ھ

محمد عثمان معروفی کان المعید لہٗ
۱۴۲۰ھ

بقلم مداح محمد عثمان اعظمی
۱۹۹۹ء

تاریخ وفات

از: مجیب احمد کرنیل گنجوی

داعی إلی اللہ × عالم جلیل × مولانا السید
۲۲۳ — ۲۱۴ — ۱۹۲
ابوالحسن علی میاں × حسنی ندوی × علیہ الرحمۃ
۷۹۴ — ۱۹۸ — ۲۹۸
سنہ ۱۹۹۹ء

نکر چوں کردم زوال آمد صدا
شو مجیب از سال ہجری باخبر
بست و دو رمضان بود روز جمعہ
شد نہاں خورشید دیں چوں از نظر
اک الف زاید کن و بازش بخواں
شیخ العالم سید والا گہر
۱ × ۱۰۸۲ — ۳۳۷
سنہ ۱۴۲۰ھ

(بقیہ) مفکر اسلام ایک جامع اور متوازن شخصیت

امیر جماعت اسلامی ہند یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، میں نے ہندوستان میں مسلم مجلس مشاورت کے پلیٹ فارم پر بھی یہ بات کہی تھی، اس وقت بھی اس پر ایمان رکھتا تھا اور اب بھی ایمان رکھتا ہوں کہ اگر ملت کے مفاد کا تقاضا ہو کہ حرف غلط کی طرح جماعتوں کو مٹا دیا جائے تو میرے اخلاص کا تقاضا ہوگا کہ سب سے پہلے میں اسے قبول کروں۔ یہ وہ قربانی ہے جس کا سبق حضرت خالد بن ولیدؓ کی قربانی ہمیں دیتی ہے۔" (حدیث پاکستان۔ صفحہ ۱۶،۱۷)

(بقیہ) سرمایۂ ملت کے پاسبان

دنیا ہنما اور مشفق و مربی سرپرست اور باخدا عارف ربانی سے محروم ہو گئی، اور مجالس علم و عرفان اور طبقہ اہل علم یتیم ہو گئے ہیں۔

حضرت مرحوم کی ذات سے اللہ تعالیٰ نے وہ کام لیا جو پوری ایک جماعت کے لیے مشکل ہے یہ ان کی مقبولیت عند اللہ اور موفق من اللہ ہونے کی علامت ہے کہ ان کے لمحات زندگی کو دین اور اشاعت کے لئے قبول فرما لیا گیا۔

(بشکریہ "بینات" پاکستان)

لمحۂ فکریہ

مسلمانوں میں اسراف کی جو وبا آئی ہوئی ہے شادیوں اور دیگر تقریبات میں جس طرح اسراف و تبذیر جاری ہے۔ غیر اسلامی رسوم کی پابندی کی جا رہی ہے وہ کسی بھی قوم و ملت کیلئے تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ہے جس قوم کے لاکھوں لوگ نان جویں کے محتاج ہوں اور ستر پوشی کے لباس سے عاری ہوں۔ اہل ثروت اللہ کی عطا کردہ دولت کا بے جا استعمال کر رہے ہوں۔ ایسی صورت میں اس قوم کے مستقبل کا کیا ہوگا؟

(حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ)

محبوبیت اور مقبولیت کا راز

فرمایا کہ نماز، تلاوت، روزہ، حج وغیرہ اور لوگ بھی کرتے ہیں لیکن اولیاء اللہ اونچے مراتب پر ان اعمال کو استحضار نیت، بیداری احتساب کے ساتھ کرنے کی وجہ سے فائز اور ممتاز و فائق ہوتے ہیں۔ وہ دنیوی امور کو بھی استحضار نیت اور احتساب کی وجہ سے دینی امور بنا لیتے ہیں۔ اور یہی چیز ان کی محبوبیت اور مقبولیت میں اضافہ کا باعث بنتی ہے۔

اہل قلوب کی تاثیر و برکت

فرمایا: میرا یہ اعتقاد ہے، اور تھوڑا بہت مطالعہ بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ جہاں کہیں جو کچھ دین کا کام ہوا ہے وہ تو اہل قلوب نے کیا ہے یا اہل قلوب کے سایہ میں ان کی دعاؤں سے ہوا ہے، اہل قلوب کی دعا اور آہ سحرگاہی کی تاثیر و برکت ہے۔ دین کا نظام اور اس کا فروغ اہل اللہ کے قلوب سے وابستہ ہے۔

علی ٹھنڈک ہو آنکھوں کی، علی راحت ہو سینوں کی

دعا

ترا شیوہ کرم ہے اور میری عادت گدائی کی
نہ ٹوٹے آس اے مولا ترے در کے فقیروں کی
ترے دربار سے مایوس پھر جائیں بھلا کیونکر
کہ تو کرتا رہا ہے خواہشیں پوری حریصوں کی
ادھر بھی ابرِ رحمت آئے اور جم جم کے یوں برسے
کہ ہو سرسبز کھیتی ہم غریبوں بدنصیبوں کی
خزاں میں بھی شجر سرسبز ہو کر پھول پھل لائیں
ہو شہرت باغباں کی باغ کی غنچوں کی پھولوں کی
مری اولاد کو تو یا الٰہی اتنی ہمت دے
کہ ہو کر قوت بازو خبر لیں ہم ضعیفوں کی
انہیں کے علم اور اقبال کی شہرت جہاں میں ہو
ہے شہرت جیسی عالم میں نبیؐ کے ہم نشینوں کی
ابو بکرؓ و عمرؓ عثمانؓ علیؓ میں جتنے جوہر تھے
وہی جوہر ہوں ان میں اور وہی فطرت کریموں کی
ترے دربار سے بہترؔ کی بھی امید بر آئے
علی ٹھنڈک ہو آنکھوں کی علی راحت ہو سینوں کی

محترمہ خیر النساء بہترؔ
والدہ علی میاںؒ

جعفر مسعود حسنی ندوی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

ماہ و سال کے آئینہ میں

۵ر دسمبر ۱۹۱۳ء ——— ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء

۵ر دسمبر ۱۹۱۳ء ولادت

۱۹۲۳ء والد صاحب کی وفات ہوئی۔

● اردو، فارسی اور عربی تعلیم کا آغاز۔

۱۹۲۴ء ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لئے ڈاکٹر عبد العلی صاحب کے ساتھ کانپور سفر

۱۹۲۶ء ڈاکٹر ذاکر حسین۔ مولانا محمد علی جوہر۔ مولانا ظفر علی خاں، اور حکیم اجمل خاں سے ملاقات۔

۱۹۲۷ء لکھنؤ یونیورسٹی میں فاضل ادب میں داخلہ۔

۱۹۲۸ء شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی سے پہلی ملاقات۔

۱۹۲۹ء فاضل ادب کے امتحان میں فرسٹ ڈویژن فرسٹ آئے

● لاہور کا سفر کیا اور علامہ اقبالؔ اور حفیظ جالندھری سے تعارف حاصل ہوا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء مولانا حیدر حسن خاںؔ صاحب سے حدیث شریف کی تعلیم کا آغاز کیا۔

● انگریزی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔

۱۹۳۰ء والدہ صاحبہ کی آنکھ کے آپریشن کے سلسلہ میں چند روز میڈیکل کالج میں قیام رہا۔

● ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی کی آمد ہوئی۔

● مولانا داؤد غزنوی کے رسالہ "ھندستان کا مجاہد اعظم یا مجدد اعظم" کا عربی ترجمہ کر کے تصنیفی زندگی میں قدم رکھا۔

● ڈاکٹر تقی الدین ہلالی کے ساتھ، اعظم گڑھ، مؤ، اور مبارک پور کا سفر کیا۔

۱۹۳۱ء لاہور کا سفر۔

● مولانا احمد علی لاہوری کے درس قرآن اور حجۃ اللہ البالغہ کے درس میں شرکت کی۔

● مولانا احمد علی لاہوری کے شیخ خلیفہ غلام محمد بھاولپوری سے بیعت ہوئے۔

۱۹۳۲ء دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے اور مولانا حسین احمد مدنی کی خدمت میں حاضری دی اور درس حدیث میں شریک ہوئے۔

● "الضیاء" نامی رسالہ کا اجراء ہوا، اور یہیں سے آپ کی مضمون نگاری کا سلسلہ شروع ہوا۔

۱۹۳۳ء مفتی امین الحسینی سے پہلی ملاقات۔

۱۹۳۴ء دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تفسیر وادب کے استاذ کی حیثیت سے ۴۰ روپے ماہوار پر تقرر ہوا۔

● شادی ہوئی۔

● تھانہ بھون میں حاضری اور مولانا اشرف علی تھانوی سے پہلی ملاقات۔

۱۹۳۵ء بمبئی میں ڈاکٹر امبیڈکر کو اسلام کی دعوت دے کر اپنے دعوتی کا مشن کا آغاز کیا۔

۱۹۳۶ء علیگڑھ مسلم ایجوکیشن کی جبلی میں شرکت کی۔

● ٹونک کا سفر کیا اور نشانہ بازی کی تربیت حاصل کی۔

۱۹۳۷ء علامہ اقبال سے آخری ملاقات ہوئی۔

۱۹۳۸ء علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے B.A. کلاس کیلئے دینیات کی کتاب تیار کی۔

۱۹۳۹ء مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے پہلی ملاقات ہوئی۔

● سیرت سید احمد شہید طبع ہو کر منظر عام پر آئی۔

● ہندوستان کے دینی مراکز کا دورہ کیا۔

● مولانا عبد القادر رائے پوری سے پہلی بار تعارف حاصل ہوا۔

● مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی خدمت میں پہلی حاضری۔

۱۹۴۰ء "الندوہ" نامی رسالہ سہ بارہ جاری ہوا، اور مولانا عبد السلام قدوائی

کے ساتھ اس کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔
• مختارات کی تالیف کا کام مکمل ہوا۔
• مولانا محمد الیاس کاندھلوی سے دوسری ملاقات اور تبلیغی کام کا آغاز۔
۱۹۴۱ء مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی آپ کی دعوت پر ندوہ تشریف لائے۔
• جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کی۔
۱۹۴۲ء جماعت اسلامی کی مجلس عاملہ میں شرکت کے لئے لاہور کا سفر کیا۔
• مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ساتھ علی گڑھ کا سفر کیا۔
• جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں "مذہب و تمدن" کے عنوان سے ڈاکٹر ذاکر حسین ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر مجیب کی موجودگی میں مقالہ پڑھا۔
• مولانا محمد الیاس کاندھلوی کے ایما پر ندوۃ العلماء سے تنخواہ لینا بند کر دی۔
۱۹۴۳ء جماعت اسلامی سے کنارہ کشی اختیار کی۔
• مرکز تعلیمات اسلام کی بنیاد ڈالی اور اُس کے تحت درسِ قرآن کے حلقوں کا سلسلہ شروع کیا۔
• علامہ سید سلیمان ندوی کے اصرار پر دوبارہ تنخواہ لینا شروع کیا۔
۱۹۴۴ء پشاور میں سیرت کانفرنس میں شرکت کی۔
۱۹۴۵ء دارالعلوم ندوۃ العلماء کی ملازمت سے تعلق ختم کر لیا۔
۱۹۴۶ء لاہور کا سفر کیا اور مولانا احمد علی لاہوری سے خلافت ملی۔
• مولانا عبدالقادر رائے پوری سے اصلاحی تعلق قائم ہوا۔
• بھاگلپور میں فوجی ٹرک پر فساد زدہ علاقے کا دورہ کیا اور سروے کر کے شہداء کی رپورٹ تیار کی۔
۱۹۴۷ء والدہ صاحبہ، ہمشیرہ صاحبہ اور بھانجے سید محمد ثانی حسنی کے ساتھ پہلا حج کیا۔
• شاہ سعود کو خط لکھا جو بعد میں رسالہ کی شکل میں شائع ہوا۔
• جواہر لال نہرو کی دعوت پر منعقد ہونے والی ایشیائی کانفرنس میں شرکت کی دیگر شرکاء میں سروجنی نائیڈو، محمد علی جناح۔
۱۹۴۸ء "تعمیر" نامی رسالہ کا اجرا ہوا اور اس کی ادارت سنبھالی۔
• رکن مجلس انتظامی دارالعلوم ندوۃ العلماء کی حیثیت سے انتخاب عمل میں آیا۔
• مولانا عبدالقادر رائے پوری نے آپ کو خلافت عطا فرمائی۔
۱۹۴۹ء علامہ سید سلیمان ندوی کی تحریک پر نائب معتمد تعلیم بنائے گئے۔
• ہندو اور مسلمانوں کے مخلوط اجتماعات سے خطاب کا سلسلہ شروع کیا۔
۱۹۵۰ء دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم بنائے گئے۔
• دعوتی مقصد سے حج کا دوسرا سفر کیا، رفقاء مولانا عبداللہ عباس ندوی، مولانا طاہر جیتی مولانا محمد رابع حسنی۔
• خانہ کعبہ کے کلید بردار شیبی کی دعوت پر کعبہ کے اندر داخل ہونے کا پہلی بار شرف حاصل ہوا۔
• سید قطب شہید سے مکہ مکرمہ میں پہلی ملاقات ہوئی۔
• اپنے شیخ مولانا عبدالقادر رائے پوری کو لے کر دوبارہ خانہ کعبہ میں داخل ہونے کی سعادت حاصل کی۔
۱۹۵۱ء مصر کا سفر کیا۔
• قاہرہ یونیورسٹی میں محاضرہ دیا۔
• شیخ حسن البنا کے والد شیخ عبدالرحمٰن سے ملاقات کی۔
• سید قطب شہید کے مکان پر آپ کی موجودگی میں آپ کی مشہور کتاب "ماذا خسر العالم" پر علمی مذاکرہ ہوا۔
• اخوانی رہنما شیخ محمد الغزالی کے ساتھ مصر کے قصبات اور دیہاتی کا دورہ کیا۔
• اُردن گئے۔
• بیت المقدس میں رمضان آخری عشرہ گذارا، اور عید کی نماز ادا کی۔
• شریف حسین کی قیام گاہ پر ان کی عیادت کی۔
• اُردن کے حکمراں شاہ عبداللہ بن شریف حسین سے ملاقات کی اور بیت المقدس کی بازیابی کے سلسلہ میں گفتگو کی۔
• شام گئے۔
• دمشق یونیورسٹی میں "مسئلہ فلسطین کے بارے میں علم و تاریخ کی شہادت" کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔
۱۹۵۲ء ہندوستان میں فرقہ وارانہ صورتحال کو بگڑتے دیکھ کر ہندو اور مسلمانوں کے مشترکہ اجتماعات کے انعقاد کا سلسلہ شروع کیا۔
۱۹۵۳ء لکھنؤ میں تبلیغی مرکز قائم کیا۔
۱۹۵۴ء دارالعلوم دیوبند میں طلبہ سے پہلی بار خطاب کیا۔
• لاہور تشریف لے گئے اور مولانا عبدالقادر رائے پوری کی صحبت میں رمضان گذارا۔
• فتح پور جا کر شاہ وصی اللہ صاحب کی خدمت میں پہلی حاضری دی۔
۱۹۵۵ء آپ کی شاہکار تصنیف "تاریخ دعوت و عزیمت" مطبوعہ شکل میں سامنے آئی۔
۱۹۵۶ء دمشق یونیورسٹی کی دعوت پر وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے شام تشریف لے گئے اور آٹھ لکچرس دیئے۔
• شامی ریڈیو اسٹیشن سے دو تقریریں نشر ہوئیں۔
• دمشق میں اسلامی کانفرنس میں شرکت کی۔ صدارت سابق وزیر اعظم انڈونیشیا نے کی اور نائب صدر آپ منتخب ہوئے۔
• شام کے صدر شکری القوتلی اور پارلیمنٹ کے اسپیکر ناظم القدسی سے ملاقات کی۔

● دمشق کی علمی اکیڈمی کے ممبر منتخب ہوئے۔
● شامی پارلیمنٹ کے اجلاس میں شرکت کی۔
● سابق وزیر اعظم انڈونیشیا محمد ناصر سے ملاقات ہوئی۔
● سوڈان اور لبنان کا سفر کیا۔ اور دعوتی واصلاحی اور دینی تحریکوں کے قائدین سے ملاقات کی۔
● ترکی کا سفر کیا، کمال اتاترک کی اسلامی مخالف پالیسیوں کا مشاہدہ کیا، اور ہندوستان واپس آکر اس کی حقیقت سے لوگوں کو آگاہ کیا۔
● عراق کا سفر کیا۔ اور دعوتی واصلاحی تحریکی رہنماؤں سے ملاقات کی، اور عوامی جلسوں سے خطاب کیا۔

۱۹۵۷ء موتیا کی بند کی شکایت اور لکھنے سے معذوری۔

۱۹۵۸ء مولانا عبدالقادر رائے پوری کے ایما پر "قادیانیت" نامی کتاب لکھی۔

۱۹۵۹ء دمشق سے نکلنے والے عربی رسالہ "المسلمون" کا اداریہ لکھنے کی فرمائش کی گئی چنانچہ کئی ماہ تک مسلسل اس کے اداریے آپ ہی کے قلم سے نکلے۔
● لکھنؤ میں مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کے نام سے ایک ادارہ کی داغ بیل ڈالی۔

۱۹۶۰ء دینی تعلیمی کونسل کے قیام میں بنیادی حصہ لیا اور اس کے صدر منتخب ہوئے۔
● نقرس (Goul) کی تکلیف رہنے لگی۔
● ندوہ کے تعارف کیلئے برما کا سفر کیا۔

۱۹۶۱ء ڈاکٹر سید عبدالعلی کی وفات ہوئی۔
● دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ناظم منتخب ہوئے۔

۱۹۶۲ء علیگڑھ میں موتیابند کا آپریشن ہوا۔
● سعودی عرب کا سفر۔
● مدینہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا اور اس کے مشاورتی بورڈ کے بنیادی رکن نامزد ہوئے۔
● شاہ سعود اور لیبیا کے فرمانروا ادریس سنوسی سے ملاقت کی۔
● رابطہ عالم اسلامی کی تاسیس میں حصہ لیا اور اس کے رکن نامزد ہوئے۔
● مدینہ یونیورسٹی میں منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین کے عنوان سے کئی لیکچرس دیئے۔
● دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوری کے رکن نامزد ہوئے۔

۱۹۶۳ء حج کے مبارک موقع پر حرم شریف میں مصلی شافعی کے اوپر مکندنہ سے حجاج کرام کو خطاب کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔
● شاہ فیصل سے دوسری ملاقات ہوئی۔
● یورپ کا سفر ہوا۔
● اڈمبرا یونیورسٹی، لندن یونیورسٹی کے یونین ہال، اور لندن یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں تقریریں ہوئیں۔
● B.B.C. سے دو عربی تقریریں نشر کی گئیں۔
● سوڈانی رہنما حسن ترابی (جو اُس وقت طالب علم تھے) سے ملاقات۔
● اسپین کا سفر کیا۔

۱۹۶۴ء یورپ کا دوسرا سفر ہوا۔
● جرمنی میں برلن یونیورسٹی آف انجینئرنگ میں جرمن قوم سے خطاب کیا جرمن زبان میں آپ کی تقریر کا ترجمہ کیا گیا۔
● جمشید پور اور راؤڑکیلا کے فسادات کے بعد جے سرکاشی نرائن سے دہلی میں اور ونوبا بھاوے سے ناگپور جاکر ملاقات کی، اور ان سے اس موقعہ پر سامنے آنے کی اپیل کی۔
● بمبئی میں بائیں آنکھ کا آپریشن ہوا جو ناکام رہا۔
● مسلم مجلس مشاورت کے قیام میں نمایاں کردار ادا کیا۔
● شاہ فیصل سے تیسری ملاقات ہوئی اور اسلامی ملکوں کے حالات پر گفتگو ہوئی۔

۱۹۶۵ء مسلم مجلس مشاورت کی مہم کے دوران آپریشن زدہ آنکھ پر ہمرج کا اور پھر اسی آنکھ میں سنبل بائی کا سخت حملہ ہوا۔

۱۹۶۶ء مصر کے صدر جمال عبدالناصر کے خلاف آواز اٹھانے پر حکومت ہند نے آپ کا اسپورٹ اپنی تحویل میں لے لیا۔
● امام حسن البنا شہید کی خودنوشت پر سعید رمضان بوطی (حسن البنا شہید کے داماد) کی خواہش پر مقدمہ لکھا۔

۱۹۶۷ء حجاز کا سفر کیا اور طائف میں کار کا حادثہ ایسا سخت پیش آیا جس میں آپ کا بچنا کسی معجزہ سے کم نہ تھا۔

۱۹۶۸ء سعودی وزیر تعلیم کی دعوت پر ریاض یونیورسٹی میں تعلیم کے موضوع لکچر دیا۔
● والدہ صاحبہ کا انتقال ہوا۔
● کویت میں عرب ممالک کے وزرائے تعلیم کی میٹنگ کیلئے ایک مقالہ تحریر فرمایا۔

۱۹۶۹ء تبلیغی مرکز سے منتقل ہوئے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں قیام رہنے لگا
● یورپ کا تیسرا سفر کیا۔
برمنگھم یونیورسٹی اور لیڈس یونیورسٹی میں خطاب کیا۔
● صحت کی خرابی کے باعث دارالعلوم ندوۃ العلماء کی نظامت سے استعفیٰ دینا چاہا جو منظور نہ ہوا۔

۱۹۷۰ء تکیہ (آبائی گاؤں) میں سیلاب آنے کی وجہ سے شہر میں عارضی قیام فرمایا۔

۱۹۷۱ء سیتاپور میں دائیں آنکھ کا آپریشن ہوا۔

۱۹۷۲ء ترمیمی ایکٹ کے خلاف دہلی میں منعقد ہونے والے آل انڈیا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کنونشن کا افتتاح کیا۔

۱۹۷۳ء رابطہ عالم اسلامی کے وفد کی قیادت کرتے ہوئے افغانستان، ایران، لبنان، شام اور عراق کا دورہ کیا۔

● طہران میں آیۃ اللہ العظمیٰ مرزا محمد خلیل کمرئی کی طرف سے دیئے گئے استقبالیہ جلسہ میں ایرانی دانشوروں سے خطاب کیا۔

● لبنان کے وزیر اعظم تقی الدین الصلح سابق وزیر اعظم صائب سلام، وزراء اور ممبران پارلیمنٹ سے ملاقاتیں ہوئیں اور ان کے سامنے اپنے خیالات کے اظہار کا موقع ملا۔

● اُردن کے بادشاہ شاہ حسین سے ملاقات ہوئی۔

● سعودی عرب کے فوجی سینٹر کا معائنہ کیا اور فوجیوں سے خطاب کیا۔

۱۹۷۴ء تحریک پیام انسانیت کا آغاز کیا۔

● شارجہ کے حاکم سلطان محمد القاسمی کی دعوت پر عرب امارات کا دورہ کیا۔

۱۹۷۵ء دارالعلوم کے پچاسی سالہ جشن تعلیمی کا انعقاد کیا۔

۱۹۷۶ء ہمشیرہ محترمہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ کا انتقال ہوا۔

● ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد دہلی میں وزیر اعظم ہند اندرا گاندھی سے ملاقات کی اور نس بندی کے سلسلہ میں پوری جرأت و بیباکی کے ساتھ اسلامی موقف کی وکالت کی۔

● راشٹرپتی بھون دہلی میں موریٹانیا کے صدر مختار ولد داداصاحب سے ملاقات ہوئی۔

● Islamic universities federate کے جلسہ میں شرکت کے لئے مراکش کا سفر کیا۔

● مراکش کے بادشاہ شاہ حسن سے ملاقات کی۔

● شاہ خالد سے ملاقات۔

۱۹۷۷ء مسز اندرا گاندھی آپ سے ملنے کے لئے آپ کے گاؤں تکیہ آئیں۔

● سابق وزیر اعظم مسٹر چندر شیکھر اور حالیہ وزیر اعظم مسٹر اٹل بہاری باجپئی آپ سے ملنے کیلئے ندوہ آئے۔

● امریکہ کی مشہور مسلم تنظیم M.S.A. کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لئے امریکہ کا سفر کیا۔

● امریکہ کی پانچ مشہور یونیورسٹیوں کولمبیا یونیورسٹی (نیویارک) ہارورڈ یونیورسٹی (کیمبرج) ڈٹرائٹ یونیورسٹی (آن آربر) کیلی فورنیا یونیورسٹی (لاس انجلس) اور اوڑایو نیورسٹی (سالٹ لیک سٹی) میں لکچر دیئے۔

● فلاڈ ایلفیا (امریکہ) میں دائیں آنکھ کا آپریشن ہوا اور آنکھ کی معذوری جاتی رہی۔

● عظیم باکسر محمد علی کلے نے آپ سے ملاقات کی۔

۱۹۷۸ء پاکستان تشریف لے گئے "ایشیائی کانفرنس میں شرکت کی کانفرنس کی صدارت جنرل ضیاء الحق صدر پاکستان، اور نائب صدر حضرت مولانا منتخب ہوئے۔

● ایوان صدر میں جنرل ضیاء الحق صدر پاکستان سے ملاقات۔

● اسلامی نظریاتی کونسل میں آپ کے اعزاز میں استقبالیہ دیا۔

● ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے صدر حکیم محمد سعید کی دعوت پر پاکستانی دانشوروں کو خطاب کیا۔

سپریم کورٹ پاکستانی کی چیف جسٹس انوار الحق نے آپ سے ملاقات کی۔

● کراچی یونیورسٹی علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی (اسلام آباد) زرعی یونیورسٹی (فیصل آباد) پنجاب یونیورسٹی (لاہور) میں تقاریر ہوئیں۔

● جسٹس مشتاق چیف جسٹس پنجاب ہائی کورٹ (جنھوں نے ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کا فیصلہ دیا تھا) کی دعوت پر بار ایسوسی ایشن میں وکلاء جج صاحبان سے خطاب کیا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے ان کی قیام گاہ پر ملاقات کی۔

● مشہور امریکن نومسلمہ مریم جمیلہ سے ملاقات ہوئی۔

۱۹۷۹ء عرب ممالک کے وزرائے اوقاف کی میٹنگ میں رابطہ عالم اسلامی کی نمائندگی کی۔

● سیرت کانفرنس میں شرکت کے لئے قطر گئے۔

● قطر کے ولیعہد و وزیر دفاع سے ملاقات ہوئی۔

۱۹۸۰ء شارجہ کے حکمراں سلطان بن محمد القاسمی آپ سے ملنے کیلئے لکھنؤ تشریف لائے۔

● عراق کے صدر صدام حسین کے خصوصی ایلچی کی ندوہ آمد، اور آپ کو صدر صدام حسین کی طرف سے عراق کا دورہ کرنے اور ان کی زیر صدارت منعقد ہونے والی ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کی دعوت۔

● اُردن کی علمی اکیڈمی کے رُکن منتخب ہوئے۔

● فیصل ایوارڈ ملا، ایوارڈ کی رقم آپ نے افغان پناہ گزینوں، جماعت تحفیظ القرآن اور مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کیلئے مختص فرمادی۔

● دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ جشن کے موقع پر وہ تاریخی تقریر فرمائی جس کی گونج آج بھی اسی طرح سنائی دے رہی ہے۔

۱۹۸۱ء کشمیر یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری تفویض کی۔

۱۹۸۲ء مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر منتخب ہوئے۔

۱۹۸۳ء اُردن کے ولی عہد امیر حسن سے ملاقات ہوئی۔

● دبئی کا سفر۔

● امارات یونیورسٹی کے گرلس کالج اور العین یونیورسٹی میں محاضرہ دیا۔
● کویت کا سفر۔
کویت یونیورسٹی کے سائنس کالج اور جمعیت الاصلاح میں تقریر کی۔
● لندن کا سفر اور آکسفورڈ سنٹر میں اسلامک سینٹر کا افتتاح اور اُس کی صدارت۔

۱۹۸۴ء سعودی عرب کا سفر اور عالمی رابطہ ادب اسلامی کا قیام عمل میں آیا اور اس کے صدر منتخب ہوئے۔
● ایرانی رہنما آیۃ اللہ خمینی سے ملاقات ہوئی۔
● بنگلہ دیش کا سفر۔
● اسلامک فاؤنڈیشن اور ڈھاکہ کی مرکزی مسجد بیت المکرم میں خطاب کیا اور بنگالی ادیبوں اور صحافیوں کے سامنے تقریر کی۔
● اُردن اور یمن کا سفر کیا۔
● صنعاء یونیورسٹی اور یرموک یونیورسٹی میں تقریر کی۔
● یمن کے صدر علی عبداللہ صالح سے ملاقات ہوئی۔
● یمن کے وزیر اعظم عبدالعزیز عبدالغنی سے ملاقات۔
● یمن کے ایئر فورس اور نیشنل ڈیوژن سے خطاب کیا۔
● پاکستان کا سفر۔
● پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے کراچی آکر آپ سے ملاقات کی اور آپ نے ان کو مسجد اقصیٰ کا مرمری ڈھانچہ پیش کیا، جس میں اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ مسجد اقصیٰ کی بازیافت ایک صاحب ایمان صدر کی ذمہ داریوں میں سے ہے۔
سیرت النبیؐ کی ساتویں جلد پر آپ کے مقدمہ پر حکومت پاکستان نے ایک لاکھ روپئے کا انعام دیا۔ انعام کی یہ رقم آپ نے نصف دارالمصنفین اعظم گڑھ اور نصف علامہ سید سلیمان ندویؒ کی اہلیہ محترمہ کو دے دی۔

۱۹۸۵ء آکسفورڈ یونیورسٹی میں اسلامک سینٹر کو قانونی شکل حاصل ہوئی۔
● بروک سیلز اور لکسمبرگ کا سفر۔
● لکسمبرگ میں واقع ادارہ تحقیقات اسلام کی مجلس عاملہ کے جلسہ میں شرکت اور اُس کی صدارت کی۔

۱۹۸۶ء ترکی اور پاکستان کا سفر ہوا۔
● صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق سے ملاقات ہوئی۔
● سعودی عرب کا سفر اور جدہ میں آپ کے اعزاز میں کئے گئے جلسہ میں شرکت۔
● الجزائر کا سفر اور ملتقی الفکر الاسلامی میں شرکت۔
● دہلی، ناگپور، اور پونہ میں ڈائلاگ کا انعقاد اور ہندو دانشوروں کے سامنے آپ کی تقاریر ہوئیں۔
● آپ کی حکیمانہ اور مخلصانہ قیادت میں مسلم خواتین مطلقہ بل پالیامنٹ میں پاس ہوا۔

۱۹۸۷ء ملیشیا کا سفر کیا۔
● قومی یونیورسٹی، ٹیکنالوجی یونیورسٹی، ملیشین یونیورسٹی، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی میں خطاب کیا۔
● لندن کا سفر اور سینٹ کراس کالج میں عبدالعزیز المطوع لیکچرز سیریز کا افتتاح کیا۔
● سعودی عرب کا سفر اور رابطہ عالم اسلامی کی سلور جبلی میں شرکت۔

۱۹۸۸ء عرب امارات کا سفر۔
● شارجہ کے حاکم شیخ سلطان محمد القاسمی سے ملاقات، ابوظبی، دبئی اور شارجہ میں محاضرات ہوئے۔

۱۹۸۹ء انگلستان اور ترکی کا سفر۔
● سابق وزیر اعظم ترکی نجم الدین اربکان سے ملاقات۔

۱۹۹۰ء سعودی عرب کا سفر۔
● ولی عہد سلطنت امیر عبداللہ بن عبدالعزیز ریاض کے گورنر امیر سلمان بن عبدالعزیز سعودی عرب کے وزیر دفاع امیر سلطان سے ملاقاتیں ہوئیں۔
● بابری مسجد ورام جنم بھومی کے مسئلہ کو حل کرنے کیلئے سابق گورنر بہار یونس سلیم صاحب اور سابق گورنر آندھرا پردیش شری کرشن کانت (جو اس وقت ہندوستان کے نائب صدر ہیں) کے ساتھ کانچی پورم کے دو شنکر اچاریہ۔ شری یرم اچاریہ دوسرے شری وجیندر اچاریہ سے مدراس جاکر ان کے مٹھ میں گفتگو کی۔
● وزیر اعظم ہند شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ سے ملاقات۔

۱۹۹۱ء عراق نے کویت پر قبضہ کیا تو آپ نے عوامی جذبات کی پرواہ کئے بغیر اس قبضہ کو غیر اخلاقی، غیر شرعی، اور غیر عقلی قرار دیتے ہوئے کھل کر اس کی مذمت فرمائی۔
● سعودی عرب کا سفر۔ اور رابطۂ عالم اسلامی کے خصوصی اجلاس میں شرکت۔
● افغانستان کے سابق وزیر اعظم عبدرب الرسول سیاف سے ملاقات ہوئی۔
● شام کے سابق وزیر اعظم ڈاکٹر معروف الدوالیبی سے ملاقات ہوئی۔
● ترکی کے سابق وزیر اعظم نجم الدین اربکان سے ملاقات ہوئی۔
● بابری مسجد کے مسئلہ پر ہندو مذہبی پیشواؤں سے گفتگو اور وزیر

اعظم سے ملاقات پیام اور انسانیت کا جلسہ اور ممتاز ہندو دانشوروں کی شرکت۔

• سعودی عرب کے فرمانروا شاہ فہد بن عبدالعزیز کو خط لکھ کر سعودی معاشرہ کو اسلامی معاشرہ بنانے پر زور دیا۔

• اُردو اکیڈمی یوپی کی طرف سے مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ کا اعلان کیا گیا۔ ایوارڈ کی رقم آپ نے مولانا پر تحقیق کام کرنے والوں کیلئے مختص فرمادی۔

۱۹۹۲ء حکومت ہند کا ایک اعزاز قدم بھوشن قبول کرنے سے معذرت کی۔

• انگلستان کا سفر۔

اسلامک فاؤنڈیشن مارک فیلڈ (لیسٹر شائر) اسلامک سینٹر ریجنٹ پارک لندن میں خطاب کیا۔

• سنٹر فار اسلامک اسٹڈیز کے جلسہ انتظامی میں شرکت۔

• سنٹر اور ازبکستان کی حکومت کے مابین امام بخاری کی یادگار قائم کرنے کے سلسلہ میں ایک معاہدہ کیا۔

۱۹۹۳ء آکسفورڈ میں اسلام کے تاریخی وثقافتی اٹلس کے منصوبہ کو آخری شکل دی۔

• شکاگو (امریکہ) میں دُنیا کے تمام مذاہب کی عالمی کانفرنس میں شرکت کی۔

• ازبکستان، تاشقند اور بخارا کا سفر کیا۔

• امام بخاری کے نام سے موسوم ایک علمی مرکز کا افتتاح کیا۔

۴ سرسید ہاؤس (علی گڑھ) میں یونیورسٹی کے اساتذہ سے خطاب کیا۔

• لندن کا سفر کیا۔

• آکسفورڈ میں واقع بروکس یونیورسٹی میں تقریر کی۔

• دارالعلوم ندوۃ العلماء پر سی۔ بی۔ آئی نے چھاپہ ڈالا۔

• زخمی طلبہ کے لئے حکومت کی طرف سے ایک لاکھ روپئے کا اعلان اور آپ کا انکار۔

۱۹۹۵ء آپ کی سرپرستی میں تحفظ مدارس کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔

• قطر کا سفر۔

دوحہ یونیورسٹی میں تقریر۔ عرب خواتین کے پروگرام میں شرکت اور اُن سے خطاب۔

۱۹۹۶ء سابق وزیر اعظم دیوگوڑا کی آپ سے ملاقات کے لئے ندوہ آمد اور بی۔ جے۔ پی کا اس پر اعتراض۔

• ترکی میں آپ کے اعزاز میں ایک سیمینار کا انعقاد اور اُس میں آپ کی شرکت۔

• کلید کعبہ پیش کی گئی اور درِ کعبہ کھولنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

۱۹۹۷ء رابطہ ادب اسلامی کی کانفرنس میں شرکت کے لئے لاہور کا سفر۔

• صدر پاکستان فاروق احمد لغاری کی کانفرنس میں شرکت اور آپ سے ملاقات۔

• قادیانیت کے موضوع پر ندوہ میں ایک عالمی سمینار۔

• نئی تعلیمی پالیسی کے خلاف آپ کی دعوت پر ندوۃ العلماء میں دینی تعلیمی کونسل کا جلسہ۔

۱۹۹۸ء دوبئی حکومت کی طرف سے عالم اسلام کی ممتاز شخصیت کا ایوارڈ ملا، ایوارڈ کی رقم (ایک کروڑ بیس لاکھ) دینی مدارس اور تعلیمی مراکز میں تقسیم کردی گئی۔

• وزیر اعظم اٹل بہاری باجپئی نے اپنے لاہور کے بس سفر میں آپ سے ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی۔ آپ نے صحت کی خرابی کی وجہ سے اس سفر سے معذرت کی۔

✓ • سرکاری اسکولوں میں وندے ماترم اور سرسوتی وندنا لازمی قرار دیئے جانے پر آپ کا سخت ردِعمل۔

• رائی بریلی میں آپکے مہمان خانہ پر رات میں پولیس کا چھاپہ اور خانہ تلاشی۔ جس پر پورے ملک میں زبردست احتجاج کیا گیا۔ اور عرب دُنیا نے سخت ردِعمل ظاہر کیا۔

• آپکے سخت رویئے کو دیکھتے ہوئے نہ صرف یہ کہ سرسوتی وندنا کے احکامات منسوخ کردیئے گئے بلکہ وزیر تعلیم کو بھی برطرف کردیا گیا۔

• بنگلور میں میڈیا سینٹر کا افتتاح کیا۔

• اُردن کا سفر۔

• امیر حسن سے ملاقات۔

• شاہی محل میں آپ کے اعزاز میں دعوت اور وزراء اور حکومت کے اعلیٰ ذمہ داروں سے آپ کا خطاب۔

۱۹۹۹ء علالت۔

• سعودی سفیر کی عیادت کے لئے ندوہ آمد۔

• وزیر اعظم اٹل بہاری باجپئی، سابق وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ عیادت کیلئے ندوہ آئے۔

• ندوۃ العلماء میں ملکی سطح پر منعقد ہونیوالے تبلیغی اجتماع میں خطاب۔

• سلطان بروناٹی الحاج حسن البلقیہ کے نام سے بروناٹی حکومت نے ایوارڈ دیا۔

• ۳۰ر دسمبر ہندوستانی جہاز کے اغواکاروں سے مسافروں کی رہائی کی اپیل کی۔

• ۳۱ر دسمبر مطابق ۲۲ر رمضان جمعہ کی نماز سے پہلے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

●●●

امام العرب والعجم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحؒ کی شخصیت کے عناصر ترکیبی اور ان کا تعارف خود ان کے آئینہ میں

مولانا سید سلمان حسینی ندوی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ پر خود ان کی حیات میں جتنا لکھا گیا، ان کی خود نوشت سوانح حیات کے علاوہ ملک و بیرون ملک کی یونیورسٹیوں میں (ایم، اے) اور ان پر (پی، ایچ، ڈی) کے مقالات لکھے گئے، ترکی میں رابطہ ادب اسلامی کے ارکان کی طرف سے ان کے اعزاز و اکرام میں ان کے ادبی کارناموں پر ایک مستقل سیمینار منعقد کیا گیا، مشاہیر اہل قلم نے ان کی بعض کتابوں کے مقدمات اور مستقل مضامین یا ان کے کسی اہم خطاب کی تمہید میں بہت کچھ لکھا اور کہا، اور وفات کے بعد تو الحمد للہ مضامین مجلات و جرائد، خاص نمبرات، سیمیناروں اور جلسوں کا ایک سیلاب ہے، جو رواں دواں ہے، اور جس نے ہندوستان کے تمام اہم مراکز کا تقریباً احاطہ کرلیا ہے۔

حضرت شیخ الہند کے بعد سب سے زیادہ مقبولیت

مولاناؒ کی یہ مقبولیت، محبوبیت، شہرت، عظمت اور عام قلوب میں عقیدت ایک نادر مثال ہے، جس کی نظیر ہندوستان میں اس صدی میں اگر ہے تو شاید حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی ذات گرامی ہے، جن کو برصغیر کے تمام حلقوں نے قبول کیا تھا، اور یہ ان کی بے مثال قربانیوں کا ثمرہ تھا، اور ایسی ہی عمومی مقبولیت و عقیدت حضرت مولاناؒ کے حصہ میں آئی، جو ان کے خلوص، وسعت قلب اور حکمت و بصیرت کا ثمرہ ہے۔

اپنے دور میں عالم اسلام کی منفرد شخصیت

مولاناؒ کو عالم عربی میں جو مقام کئی دہائیوں سے حاصل تھا، وہ موجودہ دور کی اسلامی نشاۃ ثانیہ کے بانیوں میں ایک مخلص ترین، صاحب علم و ادب اور صاحب بصیرت داعی الی اللہ کا تھا، جن میں سرفہرست شیخ حسن البناؒ کو تسلیم کیا جاتا ہے، پھر مولانا مودودیؒ کو، ان کے بعد عالم اسلام میں حضرت مولانا کی شخصیت کلیتًا منفرد شخصیت تھی، جنکی سطح کی کوئی بھی دوسری شخصیت اس دور میں باقی نہیں رہ گئی تھی، اس کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ مراکش سے کویت و امارات تک، جہاں بھی کسی کانفرنس، کنونشن، اجتماع یا میٹنگ میں حضرت مولانا کی شرکت ہوتی تو ان کو سب سے زیادہ بزرگ، قابل احترام اور سرپرست شخصیت کی حیثیت دی جاتی تھی، برصغیر ہند و پاک میں ایک مفکر، مؤرخ، ادیب اور داعی کی حیثیت سے وہ اپنی جوانی کے ایام ہی سے پہچانے جاتے تھے، اور خانقاہوں سے لیکر مدارس اور ملی تنظیموں اور جماعتوں میں ان کا ایک وقار تھا، لیکن حضرت مولانا زکریا صاحبؒ، حضرت مولانا قاری طیب صاحبؒ اور پھر حضرت مولانا انعام الحسن صاحبؒ کے اٹھنے کے بعد مولاناؒ کی شخصیت محفل کے ایک تنہا چراغ کی تھی، مولاناؒ کے درجہ مقام اور مرجعیت میں ان حضرات کے بعد پورے برصغیر میں کوئی ان کا شریک و سہیم نہیں رہا تھا۔

امام العرب والعجم

اس لئے یہ کہنا بالکل برحق ہے کہ اپنے آخری دور میں وہ واقعتاً (امام العرب والعجم) تھے، اگرچہ یہ لقب ان کیلئے استعمال نہیں کیا گیا، لیکن بجا طور پر وہ اس کے مستحق تھے، ظاہر ہے کہ ائمہ حرمین اور ان سب کے بزرگ رئیس شئون الحرمین (صدر امور حرمین) جس کا اکرام ایک شاگرد اور محب اور متوسل کی حیثیت سے کرتا ہو،

اور مرکز اسلام میں جس کو سب سے زیادہ وقار و اعتبار حاصل ہو، وہ اگر امام المسلمین نہیں تو اور کون ہے؟!

مولانا کی رفعت اور عظمت کے اسباب

حضرت مولاناؒ کو یہ مقام اور رتبۂ بلند کیسے حاصل ہوا؟ اخلاص، علم، فضل، کمال، دینی بصیرت، عربی زبان و ادب پر نہایت اعلیٰ اور استادانہ قدرت، داعیانہ جذبہ، سوز دروں، ایمانی جذبۂ حرارت، حمیت و غیرت، زہد و اتقاء، استغناء و ترفع، تواضع و مروت، محبت و شرافت، رقت و رافت، حلم و دور اندیشی، وضع داری و خاکساری اور اس طرح کے نہ جانے کتنے اوصاف ہیں، جو حضرت مولاناؒ میں بدرجۂ اتم پائے جاتے تھے، اور ان کو ہی اس کا سبب گردانا جاتا ہے، ظاہر کی بنیاد پر حکم لگانے والے اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں، لیکن اصل حقیقت تو عالم الغیب و الشہادۃ ہی جانتا ہے، کہ اس کو کیا ادا پسند آجاتی ہے، جس کے بعد کن فیکونی تدابیر اور انتظامات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ظاہر بینوں کو عالم تحیر میں ڈالتا چلا جاتا ہے۔

تشکیل شخصیت کے بنیادی عناصر کی تلاش

بہر حال مجھے ان سطور میں اس کی کوشش کرنی ہے کہ پتا لگاؤں وہ بنیادی عناصر کیا ہیں، جنہوں نے مولانا کی شخصیت کی تشکیل و تکمیل میں اپنا کردار ادا کیا ہے اور کن عوامل کی یہ کارفرمائی ہے کہ ایک ایسی شخصیت وجود میں آسکی۔

ایک بڑے اور گھنے درخت کی سیکڑوں شاخوں، پتوں، پھولوں اور پھلوں کو دیکھ کر اندازہ لگانے والے جو بھی اندازہ لگائیں، اور اس کے مظاہر کی جن الفاظ و تعبیرات میں تعریف کریں، بہر حال اس کی جڑوں سے واقفیت رکھنے والوں کے حقیقی تجزیہ تک ان کا پہنچنا مشکل ہوتا ہے۔

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ کسی بھی شخصیت کی تشکیل میں اس کے خاندان، ماحول، اساتذہ، علوم و فنون اور مشغولیات کا بہت دخل ہوتا ہے، لیکن کسی دوا یا غذا میں شامل مختلف اجزاء اور ان کی مقدار کا تعین کسی لیبارٹری میں ہو سکتا ہے، لیکن کسی شخصیت پر پڑنے والے اثرات کا ایسا تجزیہ بہت دشوار گزار امر ہے۔

مجاہدین و مصلحین کا خاندان

حضرت مولاناؒ جس خاندان میں پیدا ہوئے، اسے ذات رسالت پناہ ﷺ کی نسبت خاندانی ہی بس تھی، تنہا اسی نسبت کے اثرات بھی اکثر و بیشتر شرافت و نجابت اور کریمانہ اخلاق کے سبب ہوتے ہیں، لیکن جس خاندان سے مولاناؒ کا نسبی تعلق ہے، وہ محمد ذو النفس الزکیہ الشہیدؒ کے توسط سے نواسہ رسول ﷺ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، ان کی بارہویں پشت میں شیخ الاسلام سید قطب الدین محمد المدنی جو سیدنا عبد القادر جیلانی کے بھانجے تھے، اور ۶۰۷ھ میں ہندوستان جہاد کے ارادہ سے آئے تھے، وہ پہلے غزنی آئے، پھر دہلی اور دہلی سے قنوج، پھر مانک پور اور کڑا آئے، جہاں جہادی کارروائیوں کے نتیجہ میں فتوحات حاصل کیں۔ ان کی پندرہویں پشت میں حضرت شاہ علم اللہؒ (۱۰۳۳-۱۰۹۶ھ) خلیفہ حضرت سید آدم بنوریؒ خلیفہ حضرت مجدد الف ثانیؒ ہیں، جنہوں نے تکیہ کی بستی آباد کی اور کعبہ مقدسہ کے نقشہ کے مطابق مسجد تعمیر فرمائی، اور اس کی بنیادوں میں آب زمزم ڈالا، اور جن کا اتباع سنت اپنے دور میں بے مثال تھا، اور جنکی چوتھی پشت میں حضرت سید احمد شہیدؒ ہیں، جن کی تحریک اصلاح و جہاد کے اثر سے برصغیر میں ایمان کی بادبہاری چلی اور اسلام کی سربلندی اور دشمنان اسلام کے قبضہ سے آزادی کا ایسا طاقتور جذبہ فروزاں ہوا، جس کی مثال ملکوں اور صدیوں میں مشکل سے ملے گی۔

وقت کے اصحاب ارشاد سے استفادہ

حضرت شاہ علم اللہ اور ان کے اخلاف میں اتباع سنت، دینی حمیت، شجاعت و سخاوت، زہد و اتقاء اور اصلاح و ارشاد کے عمل کا تسلسل قائم رہا، اور یہ روایت قائم رہی کہ اپنے دور کے مشاہیر علماء، ربانیین، مجددین و مصلحین سے استفادہ ہوتا رہے، بیعت و سلوک، تعلیم و تربیت اور دعوت و ارشاد کے ذریعہ ان کے فیوض کو عام کیا جاتا رہا، حضرت شاہ علم اللہؒ حضرت مجدد صاحبؒ کے سلسلہ سے وابستہ ہوئے، ان کے پوتے مولانا سید محمد صابرؒ حضرت مجدد صاحب کے پوتے شیخ محمد صدیقؒ سے منسلک رہے، اور حضرت شاہ محمد واضحؒ، حضرت شاہ ابو سعیدؒ، حضرت سید محمد معینؒ اور سید محمد نعمانؒ (عم حضرت سید احمد شہیدؒ) حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین میں تھے، اور مولانا سید قطب الہدیٰؒ اور مولانا سید محمد اسحاقؒ (برادر حضرت سید احمد شہیدؒ) اور خود حضرت سید صاحبؒ، حضرت شاہ عبد العزیزؒ اور حضرت شاہ عبد القادرؒ سے مستفیض ہوئے۔

مولاناؒ کا خاندان، علم و فضل میں ممتاز رہا، اور اس میں ادب، تاریخ و سوانح نگاری کا پہلو غالب رہا، تصوف و سلوک سے اس کا رابطہ بھی صدیوں پر محیط ہے، اور غالباً حضرت سیدنا عبد القادر جیلانیؒ سے خاندانی ربط نے اس رنگ کو اور گہرا کیا، لیکن اس خاندان میں تصوف کبھی بھی سجادگی اور خانقاہی روایات و آداب کا پابند اور تعطل وجمود کا قائل نہیں رہا، بلکہ اصلاح و ارشاد اور دعوت و جہاد ہمیشہ اس کا شیوہ رہا، غالباً اس میں

محمد ذوالنفس الزکیہؒ کی جہادی کوششوں اور خون شہادت کا اثر کارفرما ہے۔

مولانا پر والدین کا اثر

مولانا کی جس گھر میں پیدائش ہوئی، اس پر علم و ادب، تدین و تقویٰ، دینی تعلیمی، تربیتی اور تحریکی کوششوں کا سایہ تھا، والد ماجد پایہ کے ادیب و مؤرخ اور محدثانہ رسوخ علمی رکھنے والے خاموش مصنف و انشاء پرداز تھے، وہ ندوۃ العلماء کی تعلیمی و اصلاحی تحریک کے ناظم اور اس کے دارالعلوم کے ذمہ دار اعلیٰ تھے، وہ اپنے خاندانی روایات کے امین تھے، اویس زمانہ حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے تصوف و سلوک کا ربط رکھتے تھے، طلبات کا پیشہ معاشی ضرورت کے لئے اختیار کر رکھا تھا، تصوف و سلوک سے ربط، علمی رسوخ، انتظامی صلاحیت اور پیشۂ طلبات اور خاموش اصلاحی کوشش وہ نمایاں اوصاف تھے جو مولانا کے برادر اکبر ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی حسنیؒ میں اپنے والدؒ سے منتقل ہوئے، اور مولانا میں ان کا ذوق تصنیف، زبان و ادب پر قدرت، اور سوانح نگاری کی میراث منتقل ہوئی، ساتھ ساتھ تصوف و سلوک کا تعلق بھی۔ دوسری طرف والدہ ماجدہ ایک نہایت متقیہ، عابدہ، زاہدہ، اور اوراد و اذکار، تلاوت و نوافل کی بہت پابند، اور دعا و مناجات کا خاص ذوق رکھنے والی خاتون تھیں، ان کو دیکھ کر یہ خیال آتا کہ یہ اپنے دور کی رابعہ بصریہؒ ہیں، نرمی، مروت، دوسرے کا پاس و لحاظ، کسی کو ادنیٰ تکلیف دینے سے گریز، بے انتہا شرم و حیا، اور انقطاع و تبتل الی اللہ وہ اوصاف تھے جن میں مولانا کی والدہ خیر النساءؒ بہتر صاحبہ اپنے دور میں فرد فرید تھیں، اور ان سب اوصاف پر مستزاد، ادبی ذوق اور شعر و شاعری جو اسی للّٰہیت اور انابت کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی، مولانا میں بے انتہا مروت، نرمی، شرم و حیا اور کیفیت ابتہال اپنی والدہ محترمہؒ ہی کا عکس تھا، جو طبیعت میں گھلا ہوا اور مزاج میں رچا بسا تھا۔ مولانا کی شخصیت کی بنیادی تشکیل میں اور ان کے مزاج و طبعی خصائص میں والدین بالخصوص والدہ ماجدہ کے اثرات سب سے زیادہ نمایاں تھے، مولانا شکل و شباہت میں بھی اپنے والد کے مقابلہ والدہ سے زیادہ مشابہ تھے، جسمانی خصوصیات کے ساتھ، نفسیاتی اور طبعی خصوصیات میں جو عمر کے ساتھ اور زیادہ نمایاں اور روشن ہوتی چلی گئیں مولانا اپنی والدہ کے موروثی خصائص کے زیادہ حامل تھے۔

خاندان کے مجموعی اوصاف

مولاناؒ نے اپنے خاندان کی خوبیوں اور کمزوریوں کا ایک مختصر جائزہ "کاروان زندگی" کے شروع میں کیا ہے، اپنے ابتدائی دور کی بعض ناہمواریوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کا کہنا ہے کہ خاندان کی تاریخ کے مطالعہ اور اپنے دور میں اس کے مشاہدہ کے بعد چند باتیں قدر مشترک کے طور پر نظر آئیں۔

۱- خاندان نے اپنے نسب کی حفاظت غلو و مبالغہ کی حد تک کی ہے، جس سے بہت سے موروثی خصائص کی حفاظت ہوئی، تو بعض ذہنی و جسمانی صلاحیتوں میں کمزوری بھی آئی۔

۲- خاندان ہمیشہ خالص عقیدہ توحید پر قائم، مشرکانہ اثرات سے محفوظ، بدعات سے مجتنب اور تشیع کے اثرات سے دور رہا، توحید و اتباع سنت کی دعوت اس کا عام طور پر شعار اور خصوصیت رہی۔

۳- خاندان کا ایک امتیازی وصف جو اکثر عہدوں میں قائم رہا، مردانگی، حمیت دینی اور جذبۂ جہاد ہے، یہ وصف اس خاندان نے تیرہویں صدی ہجری کے وسط تک نمایاں طریقہ پر قائم رکھا، اور کچھ تعجب نہیں کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے ذہنی نشو ونما اور سیرت کی تشکیل میں اس کا بھی حصہ رہا ہو۔

۴- خاندان میں اکثر اور بالعموم اس صفت کی کمی نظر آتی ہے جس کو چالاکی، سیاسی ذہانت سے تعبیر کیا جاتا ہے، ان میں ایک طرح کی سادہ دلی یا بھولا پن پایا جاتا ہے، اور عام حالات میں ان میں ظالم بننے سے زیادہ مظلوم بننے، کسی کو نقصان پہنچا کر نفع حاصل کرنے سے زیادہ کھونے اور نقصان اٹھا لینے کی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔

۵- خاندان کے تذکروں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا رشتہ شریعت و طریقت سے ہر دور میں مربوط رہا اور اس میں ایک طرف علمائے ربانی پیدا ہوتے رہے تو دوسری طرف مشائخ روحانی۔

۶- اس خاندان میں کبھی دولت و ثروت کی فراوانی نہیں رہی، زیادہ تر مجاہدہ اور عسرت کا دور گزرا اور زیادہ سے زیادہ بقدر کفاف خاندان کے لوگوں کو حاصل ہوا، (کاروان زندگی ج ۱ ص: ۲۰-۲۹)

مولانا کی شخصیت سازی میں ماموں کا اثر

مولاناؒ کی شخصیت کی تشکیل، ان کی ابتدائی تربیت اور مزاج سازی میں ان کے ماموں مولوی حافظ سید عبید اللہ مرحوم کو بھی بڑا دخل ہے، مولانا کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کے بنیادی پتھر رکھنے میں ان کا بڑا حصہ ہے، وہ عجیب دلآویز

اور جامع شخصیت کے مالک تھے، اسلامی زندگی کا چلتا پھرتا نمونہ حضرت سید شاہ ضیاء النبیؒ کے فرزند ارجمند، حافظ قرآن، دلکش انداز میں پڑھنے والے، صرف و نحو بڑی پختہ، خط نہایت پاکیزہ، معاملات کے نہایت صاف، کاہلی و سستی سے کوسوں دور، جفاکش و پابند اوقات، چال سے بھی مستعدی و عزم کا اظہار ہوتا، تہذیب و شائستگی ان پر ختم تھی، چھوٹے اعزہ یا دوستوں کے لڑکے جوان کی اولاد کے برابر تھے، آجاتے اور وہ لیٹے ہوتے تو فوراً پاؤں سمیٹ لیتے، اور بیٹھ جاتے، نوکروں اور مزدوروں کو بھی کبھی کسی درشت لفظ سے یاد نہ کرتے، بالکل بے آزار انسان تھے، اور شاید ایذا رسانی اور دل شکنی کی صلاحیت فطری طور پر ان میں نہ تھی (کاروان زندگی، ج ۱ ص: ۴۳-۴۵)

جو حضرت مولاناؒ کے قریب رہے ہیں، اور خاص طور پر آخری دور میں، ان کو خاندان کے بزرگوں کے ان احوال کے پڑھنے کے بعد صاف محسوس ہوتا ہوگا کہ یہ تو خود مولاناؒ کی سیرت کے درخشاں پہلو ہیں۔ گویا "گفتہ آید در حدیث دیگراں" کے مصداق۔ مولاناؒ اپنی افتادِ طبع اور فطری صلاحیتوں کا تذکرہ کر رہے ہیں، مولاناؒ کی دینی تربیت میں ماموں حافظ سید عبید اللہ صاحبؒ کا جو نقش تھا، اس کا ہی یہ اثر تھا کہ مولاناؒ نے اپنی پہلی تصنیف سیرت سید احمد شہیدؒ کو انہی کے نام منسوب کیا تھا، جنکی کتاب کی اشاعت سے چند مہینے پہلے بتاریخ ۳۱ر مئی ۱۹۳۸ء وفات ہوگئی تھی۔

خاندان کی شاخ ٹونک کے امتیازی اوصاف

مولاناؒ کے خاندان کی وہ شاخ جو ٹونک میں رہی، جو حضرت سید احمد شہیدؒ کی شہادت کے بعد نواب وزیر الدولہ مرحوم والی ریاست ٹونک کی دعوت پر ٹونک منتقل ہوگئی تھی ۱۹۲۰ء میں یہ شاخ ٹونک سے پھر تکیہ رائے بریلی منتقل ہوگئی، یہ اس شاخ سے چند صفات میں نمایاں اور ممتاز تھی جو دائرہ شاہ علم اللہؒ میں پہلے سے آباد تھی، اس شاخ میں اگرچہ صحت عقائد، پابندی فرائض اور بہت سی خوبیاں تھیں، لیکن ٹونک کی شاخ اسلامی اخوت و مساوات، صلہ رحمی، تواضع، انکساری و سادگی، ملازمین اور ماتحتوں سے مساویانہ برتاؤ اور اکرام میں نمایاں طور پر فائق تھی، یہ حضرت سید صاحبؒ کی صحبت اور تربیت کا فیض اور مجاہدین و مہاجرین کے اخلاق کا اثر تھا (کاروان زندگی ج ۱ ص: ۴۸-۴۹)

افرادِ خاندان کا شوقِ کتب بینی

مولانا کے والد ماجد اور اجداد علم و ادب سے نہ صرف وابستہ رہے، بلکہ ان میں اکثر مصنف، انشاء پرداز، مؤرخ، تذکرہ نویس اور سوانح نگار تھے، ان کے اثر سے گھر کا ماحول خالص علمی ماحول تھا، گھر پر کتابی ذوق سایہ فگن تھا، کتب بینی کا ذوق، ذوق سے بڑھ کر لت اور بیماری کی حد تک پہونچ گیا تھا۔ کوئی چھپی ہوئی چیز سامنے آجائے تو اس کو پڑھے بغیر چھوڑ نہیں سکتے تھے، جو پیسے مل جاتے اس کا بہترین مصرف کتاب کی خریداری تھی، اور چونکہ یہ گھرانہ عقائد و مسلک میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کا سختی سے پیروکار تھا اس لئے غیر مستند چیزیں جن سے عقائد میں خلل پڑتا ہو، گھر میں جگہ نہیں پاتی تھیں، البتہ سیرت، بزرگوں کی حکایات اور بے ضرر دلچسپ کتابیں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھیں، اسی زمانہ کا سنا ہوا حضرت حلیمہ دائی کا قصہ مولانا لکھتے ہیں کہ آج تک دل پر نقش ہے۔

ایک عاشق تھی حلیمہ دائی
جس نے گھر بیٹھے یہ دولت پائی
وہ کچھ اس رمز سے آگاہ نہ تھی
اس کی قسمت میں یہ دولت تھی لکھی

اس سیدھی سادی نظم نے اس پاک محبت کے دل کی نرم سرزمین میں ابتدائی بیج ڈالے، پھر جب سیرت ابن ہشام میں یہ عزیز و لذیذ حکایت پڑھی تو وہ معصوم زمانہ جس پر اللہ کی ہزار رحمتیں ہوں یاد آگیا۔ (کاروان زندگی ج ۱ ص ۵۸-۵۹)

بچپن میں داعیانہ جذبہ

اسی ذوق اور اس کے نتیجہ میں بچپن ہی میں داعیانہ جذبہ نے ۸-۹ سال کی عمر میں گھر پر سیرت کا جلسہ کرنے کا شوق پیدا کیا، اپنے ہم سن بچوں کو مدعو کیا، بہن نے سر پر پگڑی باندھی، اور سیرت کی کوئی کتاب پڑھ کر سنانا شروع کی، گھر میں امیر مینائی اور محسن کاکوروی کی نعتیں خوب پڑھی جاتی تھیں، خاص طور سے حضرت محسن کی مشہور نظم ؎

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل

مسدس حالی تو گویا ورد زباں تھی۔

والد صاحب کے مواعظ کی نقل

"والد صاحبؒ جہاں ایک طرف ناظم ندوۃ العلماء تھے، وہیں دوسری طرف اپنے محلہ کی مسجد میں امامت بھی فرماتے تھے، اور جمعہ کی نماز کے بعد ان کا وعظ مسجد میں ہوتا تھا، عیدین کے موقع پر وہ ہنسوہ فتحپور جاتے، جہاں ان کا ننہال تھا، اور عید کی نماز پڑھاتے اور تقریر کرتے، والد صاحب کے احباب ان سے عقیدت و محبت میں مجھ سے وعظ کی فرمائش کرتے۔ عمر ۶-۷ سال کی تھی۔ وعظ کی فرمائش پر میں آیت

کریمہ "یا أیها الذین آمنوا قوا أنفسکم و أهلیکم نارا" (اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور گھر والوں کو دوزخ سے) پڑھ کر اس کا ترجمہ کرتا" مولانا فرماتے ہیں کہ "اب جب کبھی اس آیت کو دینی تعلیمی کونسل کے پلیٹ فارم سے دینی تعلیم کی ضرورت و اہمیت پر تقریر کرتے ہوئے پڑھتا ہوں تو بے اختیار وہ زمانہ یاد آجاتا ہے۔" (کاروان زندگی ج ا، ص: ۶۵)

ابتدائی اساتذہ اور نصاب

مولاناؒ کی تسمیہ خوانی رائے بریلی میں ہوئی تھی، پھر لکھنؤ میں محلہ کی مسجد کے امام و مؤذن حافظ محمد سعید صاحبؒ کے مکتب میں پڑھنا شروع کیا، ان کے پاس قرآن پاک ناظرہ ختم کیا اور اس موقع پر والد صاحبؒ نے ضیافت کا بھی انتظام کیا، پھر اپنے عم محترم مولوی سید عزیز الرحمٰن ندوی جو دفتر ندوۃ العلماء واقع گولہ گنج میں کام کرتے تھے کے پاس تعلیم کے لئے جانا شروع کیا۔ وہاں مولانا غلام محمد شمالوی کا جو بڑے وجیہ، خوش تقریر، سرگرم اور مخلص سفیر ندوہ تھے قیام بھی رہتا تھا، وہ شملہ کے بھاؤں سے خاطر فرماتے تھے۔

اردو بقدر ضرورت پڑھ لینے کے بعد جس کا نصاب مولوی اسماعیل میرٹھی کی کتابیں تھیں جن میں "سفینہ اردو" گویا بیاض اور وظیفہ کی کتاب تھی، اس کی بہت سی نظمیں زبانی یاد تھیں۔ انجمن حمایت اسلام کی فارسی کی پہلی، دوسری کتاب سے فارسی تعلیم کا آغاز ہوا۔ اس کے لئے ایک کہنہ مشق استاد مولوی محمود علی صاحبؒ کا انتخاب ہوا، والد صاحب کی تصنیف کردہ کتابیں "تعلیم الاسلام" اور "نور الایمان" پڑھیں، مولوی صاحب سے تختی اور کاغذ پر لکھنے کی مشق کی۔

والدہ کی تربیت

"والد صاحبؒ کی وفات کے بعد رائے بریلی میں عبوری قیام رہا، وہاں عم محترم سید محمد اسماعیل صاحب سے جو اچھے فارسی داں تھے بوستاں پڑھی، اوہانی پور کے ماسٹر محمد زماں خاں صاحب سے حساب اور اردو عبارت نویسی سیکھی، والدہ محترمہ قرآن مجید کی بڑی بڑی سورتیں یاد کراتیں تھیں، اور تربیت کی خاص طور پر انہیں بہت فکر رہتی تھی، نماز کا بہت اہتمام کراتیں، اور زیادتی یا غرور کسی ادنیٰ ملازم یا اس کے بچہ کے ساتھ بھی انہیں کسی حال میں گوارا نہیں تھا، ایسی غلطی ہوتی تو معافی مانگنے پر مجبور کرتیں، مشتبہ مال سے حفاظت کا اللہ نے انتظام فرمایا اور بدعات و رسوم کے کھانے سے ہمیشہ محفوظ رکھا۔" (کاروان زندگی ج ا ص: ۸۰-۸۱)

پھر جب لکھنؤ میں قیام کا اطمینان حاصل ہوا، تو بوستان پڑھنے کا سلسلہ یہاں اپنے چچا سید عبدالرحمٰن صاحب سے جاری ہوگیا۔

اس زمانہ میں مولانا جب کچھ لکھنے کے قابل ہوگئے تو والدہ محترمہ نے تاکید فرمائی کہ جب کچھ لکھو تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ساتھ یہ دعا لکھو "اللهم آتنی بفضلك أفضل ماتؤتی عبادك الصالحین"

یہ عادت عرصہ تک رہی، مولانا لکھتے ہیں کہ اب بھی دعا کرتے وقت اکثر یہ دعا یاد آجاتی ہے۔

دولت و امارت سے عدم تاثر کا ایک سبب

والد صاحبؒ کی وفات کے بعد جب تک لکھنؤ میں اپنے مکان کا انتظام نہ ہو سکا تھا، نواب نورالحسن مرحوم کی کوٹھی پر قیام رہا جو نواب سید صدیق حسن قنوجی کے صاحبزادہ تھے، اور مولانا کے والد سے ان کے بہت گہرے، گھریلو مراسم تھے، مولانا فرماتے ہیں کہ اس کوٹھی میں رہنے کا فائدہ یہ ہوا کہ آنکھوں کے زنگار چھٹ گئے اور دولت و امارت سے کبھی آنکھیں خیرہ نہیں ہوئیں اسلئے کہ اس کا اعلیٰ سے اعلیٰ مظہر اس کوٹھی میں دیکھ لیا تھا۔

برادر اکبر کی ابتدائی تربیت

اس دوران برادر اکبر ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ کو ان کی تربیت کے سلسلہ میں ایک تو اس کی فکر رہتی تھی کہ نماز میں غفلت نہ ہونے پائے، دوسرے یہ کہ کوٹھی کے ملازموں کے پاس زیادہ اٹھنا بیٹھنا نہ ہو، نیز یہ کہ کوئی ناول وغیرہ نہ پڑھوں، وہ خود کتابوں کا انتخاب کر کے دیتے تھے، پہلی کتاب جو انہوں نے پڑھنے کے لئے دی وہ "سیرت خیر البشر" پھر "رحمۃ للعالمین" مطالعہ میں آئی۔

ڈاکٹر صاحب کی ترتیب نصابی کتب

ڈاکٹر صاحبؒ نے فارسی تعلیم میں اپنی پسندیدہ کتاب "اصول فارسی" (مصنفہ مولانا فاروق چریاکوٹی) کی تعلیم کے بعد فارسی ختم کرادی، لیکن بقول مولانا "فارسی کی اس قدر تعلیم سے اتنی صلاحیت پیدا ہوگئی کہ 'مکتوبات امام ربانی' اور 'ازالۃ الخفاء' وغیرہ کا آسانی سے مطالعہ کر سکوں"۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے انگریزی کی ایک ریڈر شروع کرائی، اور دوسری طرف عربی زبان کی تعلیم کے لئے شیخ خلیل بن محمد بن حسین یمنی بھوپالی کے سپرد کر دیا کہ وہ اپنے نہج پر عربی زبان کی تعلیم دیں، عربی کی تعلیم کا آغاز اس طرح ہوا کہ شیخ خلیل عرب صاحب نے فعل، فعلا، فعلوا کی گردان لکھ کر دی کہ اسے یاد کرلو، اس کے چند دن کے بعد انہوں نے اپنی محبوب

کتاب "المطالعة العربية" (مصر کی وزارت تعلیم کی طرف سے تیار کردہ و منظور شدہ) شروع کرادی، وہ مدرس تھے اور طلباء صرف دو تھے، ایک مولاناؒ دوسرے شیخ کے صاحبزادہ حسین، اس طرح شیخ کی توجہ کا دونوں طالب علموں کو پچاس فیصدی حصہ رسدی مل رہا تھا۔

شیخ خلیل عرب کا پسندیدہ عربی نصاب

شیخ خلیل کے پسندیدہ نصاب میں مندرجہ ذیل کتابیں تھیں۔

الطریقة المبتکرة ۱-۴، مدارج القراء ۱-۳، کلیلة و دمنة اور مجموعة من النظم و النثر.

چند ہی دن کی تعلیم کے بعد شیخ نے عربی بولنا لازم کردیا، اردو بولنے پر جرمانہ عائد کیا جانے لگا، صرف و نحو میں زیادہ زور مشق، صحیح پڑھنے اور وجوہ اعراب سمجھنے اور بتانے پر تھا، انشاء کی مشق بھی تھی، سبق پڑھنے کا طریقہ یہ تھا کہ طلباء پورا سبق تیار کرکے لائیں اور ان کو سنادیں۔

نحو کے مسائل کے لئے انہوں نے ابوالحسن الضریر کی کتاب "الضریری" پڑھائی، جس میں تقریباً نحو کے سب مسائل آگئے ہیں، "میزان و منشعب، صرف میر، نحو میر، پنج گنج" مولاناؒ کے چچا مولوی سید عزیز الرحمٰن صاحبؒ نے پڑھائیں، "مجموعة من النظم و النثر" میں حصہ نثر کو بھی زبانی یاد کرنا اور سنانا پڑتا تھا۔

شیخ خلیل عرب کا طریقہ تدریس

ان ابتدائی کتابوں کے بعد مولانا کے عربی نصاب میں "نہج البلاغة" مقامات حریری، دلائل الاعجاز" اور "عشر قصائد" زیر درس رہیں۔ شیخ خلیل عرب کا طریقہ تدریس کتنا فطری، مؤثر اور کامیاب تھا، خود مولانا کے قلم سے اس کو سنئے:

"اپنے ذوق و نظر کو اپنے طلبہ تک منتقل کردینے اور ان کے رگ و ریشہ میں اتار دینے کی عجیب و غریب قابلیت، زیر درس کتاب میں جان ڈال دینے، فن کا صحیح ذوق پیدا کردینے اور مصنف کا ہم زبان و ہم مذاق بنادینے کی ان میں وہ بے نظیر قدرت تھی، جو ہزاروں میں سے کہیں کسی ایک استاد اور ماہر فن میں ہوتی ہے، یہ قابلیت کسبی نہیں وہبی ہے۔

عربی زبان و ادب کا ذوق سلیم و ذوق صحیح، پھر اس کے منتقل کرنے کی وہ قابلیت جو عرب صاحب میں دیکھی وہ نہ صرف ہندوستان (جو صدیوں سے عربی کے مذاق سلیم سے ناآشنا اور اور صحیح طریقۂ تعلیم سے محروم ہے) بلکہ ممالک عربیہ کے اعلیٰ علمی و عربی حلقوں میں بھی شاذ و نادر ہی شاید پائی جائے۔ (کاروان زندگی ج ۱ ص: ۸۸-۹۱)

اردو زبان میں مطالعہ کی ابتدائی کتابیں

جہاں تک اردو زبان و ادب کا تعلق ہے، مولانا نے ابتدائے عمر اور عربی تعلیم کے آغاز ہی کے زمانہ میں اردو زبان و ادب کی معیاری کتابیں پڑھ لی تھیں۔

علامہ شبلیؒ کی "الفاروق" کئی بار پڑھی، محمد حسین آزاد کی "آبحیات" بار بار پڑھی، یہاں تک کہ اسکے بہت سے مضامین مستحضر ہوگئے، اشخاص، شعراء اور ان کا کلام دماغ پر نقش ہوگیا۔

زبان و ادب کا ذوق ماموں زاد بھائی کا اثر

اردو زبان و ادب کا ذوق پیدا کرنے میں مولاناؒ کے ماموں زاد بھائی حافظ سید حبیب الرحمٰن کا بڑا حصہ ہے، وہ خاص طور پر مؤمن، غالب، ذوق، آتش اور امیر مینائی کے کلام سے ذوق رکھتے تھے، بچوں سے اشعار کا مطلب پوچھتے اور اردو میں تقریر و تحریر کے مقابلے کرواتے تھے، چنانچہ اساتذہ فن کے اشعار سننے اور ان کا مطلب بیان کرنے کے سلسلہ میں دماغ پر زور ڈالنے اور مشکل اشعار سمجھنے کی عادت پڑی۔

اسی طرح شعر فہمی اور ذوق آفرینی میں ان کے بڑے بھائی مولوی سید ابوالخیر صاحب برقؔ کا بھی حصہ ہے، وہ لکھنؤ کی زبان کے عاشق، محاورات اور الفاظ کی تذکیر و تانیث میں سند اور استاد کا درجہ رکھتے تھے، ان مجالس کا اثر مولانا کی طبیعت موزوں پر یہ پڑا کہ مشاعرے سننے کا بھی شوق پیدا ہوا، اور کچھ موزوں کرنے کی بھی کوشش کی لیکن برادر اکبر ڈاکٹر صاحب نے اس شغل سے سختی سے روک دیا۔

محمد حسین آزاد کی نثر کی تقلید

مولوی محمد حسین کی کتاب "آب حیات" اور "نیرنگ خیال" کا عمر کے اس ابتدائی دور میں اتنا اثر پڑا کہ ان کے اسلوب کی نقل کرنا شروع کردی اور صفحات کے صفحات ان کی تقلید میں سیاہ کرڈالے۔

الہلال کے گہرے نقوش

مولانا شبلیؒ، مولانا حالی، مولوی نذیر احمد، شرر مرحوم اور رتن ناتھ سرشار کی چند کتابیں پڑھیں۔ الہلال کے فائل ذوق و شوق سے پڑھے اور ان کے زور قلم اور جوش بیان کا طبیعت نے پورا اثر قبول کیا۔

مضمون نویسی میں والد کا رنگ

اردو مضمون نویسی میں ابتدائی اثر والد صاحب کی یاد ایام کا رہا اور اس طرز پر پہلا مضمون

اندلس پر لکھا۔

رحمۃ للعالمین نے ایک کرنٹ دوڑا دیا

اسی زمانہ میں "رحمۃ للعالمین" مصنفہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری کا اشتہار پڑھا، طبیعت میں شدید انجذاب پیدا ہوا، کتاب منگائی، پیسے نہ ہونے پر باصرار رو رو کر والدہ صاحبہ سے مطالبہ کیا، جنہوں نے قرض لے کر اس مطالبہ کو پورا کیا، پھر اس کتاب کو بہت ہی شوق و ذوق اور عقیدت و محویت کے ساتھ پڑھا، کم کتابوں نے دل و دماغ پر ایسا گہرا اثر ڈالا ہوگا جتنا اس کتاب نے، دل و دماغ میں ایک کرنٹ سا دوڑ گیا۔

۱۲ سال کی عمر میں بے تکلف عربی گفتگو

۱۲-۱۳ سال کی عمر ہوگی جب عربی بولنے کی اتنی مشق ہوگئی تھی کہ ندوۃ العلماء کے اجلاس کانپور بتاریخ ۵، ۶، ۷؍ نومبر ۱۹۲۶ء میں مولانا برادر اکبر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ گئے تھے، اور معزز مہمانوں میں اسکی شہرت تھی کہ ایک لڑکا ۱۲-۱۳ سال کا بے تکلف عربی بولتا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اور مولانا ابو عبداللہ محمد سورتی صاحب نے اپنے کمرے میں بلایا اور امتحاناً چند سوالات کئے۔

کھیلوں کا شوق

۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۸ء تک کا یہی زمانہ ہے جب مولاناؒ کو ہاکی کھیلنے کا شوق بلکہ ان کے ہی الفاظ میں لت لگ گئی تھی، اور مکان سے قریب کے ایک کلب میں کھیلنے کے لئے جانا شروع کردیا، ہاکی، فٹ بال کے میچ اور ٹورنامنٹ دیکھنے کا شوق بھی ہوا بلکہ ایک سودا پیدا ہوا، لیکن جلد ہی اس کا احساس ہوگیا کہ اس میں جس طبقہ کے لوگوں کے ساتھ واسطہ پڑ رہا ہے وہ ایک آزمائش ہے، اور تعلیمی انہماک اور ذہنی یکسوئی کے لئے مضر۔ اس آزمائشی مرحلہ کے بارے میں مولانا کا احساس یہ ہے۔

نشستم بانکویان فرنگی
ازاں بے سوزتر روزے ندیدم

مولانا عبید اللہ سندھی کے طرز تفسیر سے تعارف

اسی زمانہ میں برادر اکبر کے کہنے پر ان کے دوست خواجہ عبدالحی فاروقی استاد التفسیر جامعہ ملیہ اسلامیہ جب کہ لکھنؤ آئے تھے، اور ڈاکٹر صاحب کے گھر پر ہی قیام تھا، مولاناؒ کو آخری پارہ کی کچھ سورتیں پڑھائیں، مولانا کا کہنا ہے کہ یہ میرا مولانا عبید اللہ صاحب سندھیؒ کے طرز تفسیر اور فکر سے پہلا تعارف تھا، جس کی وجہ سے میں نے حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کے درس میں (جس کا شرف مجھے تین چار سال کے بعد حاصل ہونے والا تھا) اجنبیت محسوس نہیں کی۔

مولانا ظفر علی خاں کی نظموں کا سحر

خواجہ صاحب کی صحبت و مجلس بڑی معلومات افزا اور مفید تھی، اسی زمانہ میں مولانا ظفر علی خاں کے شہرہ آفاق اخبار "زمیندار" اور بالخصوص ان کے سنڈے ایڈیشن سے دلچسپی پیدا ہوئی، ہفتہ بھر اس کا انتظار رہتا تھا، اور مولانا کی نظم جو صفحہ اول پر ہوتی تھی مزے لے لے کر پڑھتا تھا، اور ان کی قادر الکلامی، خوش نوائی اور جوش کلام سے مسحور ہوتا تھا، بھائی آفتاب صاحب (جو حکیم عبدالقوی کے نام سے معروف تھے اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے بھتیجے تھے) مولانا محمد علی جوہرؒ کے مداح اور فدائی تھے اور میں مولانا ظفر علی خاں کا حامی و وکیل، دونوں میں خوب بحث و مباحثہ ہوتا تھا۔

صرف ونحو کی تعلیم میں مولانا طلحہ کا اثر

"اسی زمانہ میں عم محترم مولانا سید طلحہ صاحب سے بھی پڑھنے کی نوبت آئی، وہ صرف و نحو کے امام تھے، صحیح عبارت پڑھنے اور صرف و نحو کے ضروری مسائل کے جزو دماغ بن جانے میں ان کا بڑا دخل ہے، صرف و نحو کے علاوہ ان سے اور بہت سے علمی فوائد حاصل ہوئے، ذہنی تربیت ہوئی، تاریخی شعور پیدا ہوا، اور اس متنوع ثقافت میں سے کچھ حصہ ملا جس میں ان کو اپنے باکمال معاصرین میں بھی امتیاز حاصل تھا۔"
(کاروان زندگی ج ۱ ص: ۱۰۰-۱۰۲)

صرف تعلیمی انہماک

تعلیمی انہماک کا یہ ابتدائی دور خاص دینی اور روحانی تربیت اور کسی تحریکی عمل سے خالی تھا، مولانا لکھتے ہیں:

"یہ وہ زمانہ تھا کہ کسی قسم کا دینی ذوق اور کسی بزرگ کی صحبت حاصل نہ تھی، نہ زبان و ادب یا کھیل کے سوا کسی چیز سے ذوق یا دلچسپی تھی، نہ شہر میں کوئی دینی دعوت یا تحریک تھی جس سے کچھ اصلاح و تربیت اور دینی مشغولیت ہوتی۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ

۱۹۲۷ء میں شفیق استاد خلیل عرب صاحب کے اصرار پر جبکہ میری عمر تقریباً ۱۴ سال کی تھی ڈاکٹر صاحب نے لکھنؤ یونیورسٹی کے درجہ فاضل ادب میں میرا داخلہ کرادیا، شیخ خلیل عرب صاحب وہاں ایم۔اے۔ بی۔اے۔ کے کلاسز کو عربی پڑھاتے تھے، امتحان داخلہ کے موقع پر "رسائل أبي بكر الخوارزمي" کی عبارت پڑھوائی گئی، اور میں نے بڑی آسانی سے اس کی عبارت پڑھ دی، زیر درس کتابوں کا سبق

یونیورسٹی کے علاوہ شیخ خلیل عرب کے مستقر پر بھی جاری رہتا تھا۔

فاضل ادب اور فاضل حدیث کی سندیں

"یونیورسٹی میں عربی شعبہ کا نصاب شیخ خلیل عرب کے مشورہ سے رکھا گیا تھا۔ میرے لئے دو چیزیں مشکل تھیں، ایک فن عروض جس کی کتاب "محیط الدائرۃ" داخل درس تھی، دوسرے دقیق نحوی مسائل، حماسہ کے پرچے میں بعض ایسے نحوی سوالات کے باعث جو میری دسترس سے باہر تھے میں فیل ہو گیا، باقی مضامین میں فرسٹ نمبرات تھے۔

اگلے سال ۱۹۲۹ء میں اس کی تلافی ہو گئی، اور میں فرسٹ ڈویژن پاس ہوا۔ (کاروان زندگی ج ۱ ص ۱۰۲-۱۰۴)

اس کورس کی تکمیل کے بعد مولانا نے "فاضل حدیث" کے شعبہ میں داخلہ لیا اور بغیر مطالعہ و محنت کے اس کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔

سفر لاہور، علامہ اقبال اور مشاہیر ادباء سے تعارف

جون ۱۹۲۹ء میں مولانا کا لاہور کا سفر ہوا، اس وقت عمر ۱۵-۱۶ سال کی تھی، اس سفر میں علامہ اقبالؒ سے ملاقات ہوئی، حفیظ جالندھری سے نظمیں سنانے کی فرمائش کی اور انہوں نے بعض نظمیں سنائیں، مشاہیر علم و ادب میں حافظ محمود شیرانی، علامہ تاجور نجیب آبادی، پروفیسر شاداں بلگرامی، خواجہ دل محمد، پروفیسر عبد الباسط، خواجہ سلیم عبد الرحمٰن چغتائی، میر سید ممتاز علی وغیرہ سے ملاقاتیں ہوئیں، عم محترم مولانا طلحہ صاحب اس طرح تعارف کراتے تھے کہ یہ مصنف "گل رعنا" کے فرزند ہیں، اور یہ بچہ بے تکلف عربی لکھتا اور بولتا ہے، علامہ اقبالؒ کے یہاں تعارف میں یہ بھی بتایا گیا کہ انہوں نے آپ کی بعض نظموں کا عربی نثر میں ترجمہ کیا ہے، مولانا احمد علی لاہوریؒ سے عم محترم کے ذریعہ ہی تعارف و تعلق ہوا۔

پروفیسر شفیع کا مشورہ ایک سنگ میل

مولانا کا لاہور کا یہ سفر تعلیم کا رخ متعین کرنے کے سلسلہ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، مولانا کے عم محترم مولانا طلحہ صاحب نے اورینٹل کالج لاہور کے استاد عربی اور پرنسپل مسٹر محمد شفیع صاحب سے ملایا، اور مشورہ لیا کہ ان کی تعلیم کے بارے میں آپ کیا رائے دیتے ہیں، تو انہوں نے فرمایا، میری رائے ہے کہ یہ عربی کو اپنا موضوع بنائیں اور اسی میں ترقی کریں۔

دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ اور درس فقہ و حدیث

مولاناؒ لاہور سے جب واپس آئے تو انہوں نے دار العلوم ندوۃ العلماء میں ایک طالب علم کی حیثیت سے داخلہ لیا، پہلے فقہ کا درس مولانا شبلی صاحب جیراجپوری اعظمی سے لیا، پھر شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں صاحب کے حلقہ درس میں باقاعدہ داخل ہوئے۔

شیخ الحدیث سے مولانا نے صحیحین، سنن ابو داؤد اور سنن ترمذی حرفاً حرفاً پڑھی، کچھ حصہ بیضاوی کا بھی علیحدہ سے پڑھا، اور کچھ منطق کے اسباق بھی مولانا حیدر حسن خاںؒ نے اپنے شوق سے پڑھائے۔

شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں کا طرز تدریس

شیخ الحدیث کا طرز تدریس خالص محدثانہ و محققانہ تھا، محدثین کی خصوصیات کا حامل، درس میں طالب علموں سے مراجعت و تحقیق، تلاش و جستجو کا پورا کام لیا جاتا تھا، کتابوں میں سے حوالے نکالنے، کتب رجال اور جرح و تعدیل میں مواد تلاش کرنے اور مسئلہ لکھنے میں بھی شریک رکھا جاتا تھا، جس سے طلبہ کی نظر وسیع اور تجربہ عملی ہوتا تھا، مولانا حیدر حسن خاں پر رقت و خشیت بہت غالب اور آخر شب میں طویل نوافل اور طویل سجود کا معمول تھا، جس میں گریہ غالب ہوتا۔

ظاہر ہے کہ ایسے اساتذہ کے درس میں فنی تحقیق کے ساتھ، نور علم اور تزکیہ باطن کا بہت وافر سامان ہوتا تھا۔

والدہ کی نصیحت کا سوانحی ذوق پیدا کرنے میں بنیادی حصہ

والدہ کی نصیحت کے نتیجہ میں خاندانی کتب خانہ کی حفاظت اور دیکھ بھال کا کچھ مشغلہ شروع ہوا تو تاریخ ہند، تراجم علماء، تذکروں اور سوانح کی کتابوں پر سرسری نظر ڈالنے سے بہت نفع ہوا۔

اسپتال کے ماحول کا ایک گہرا اضداجی اثر

تعلیم کے اس تسلسل کے دوران روحانی تربیت اور اصلاح باطن کے بھی بعض مواقع آتے رہے، لیکن ۱۹۳۰ء میں مولانا کے بھانجے سید محمود حسن متوفی ۱۹۴۲ء کے گردہ کی تکلیف کے نتیجہ میں میڈیکل کالج لکھنؤ میں آپریشن ہوا، جبکہ ان کی عمر ۹ سال کی تھی، اور وہ مولاناؒ سے بہت مانوس تھے، اسپتال کے ماحول اور زندگی کی بے ثباتی کے مناظر نے مولانا پر بہت گہرا نفسیاتی اثر ڈالا، اسپتال کے اس قیام نے جو ایک طرح کا مجاہدہ بھی تھا، ایک خانقاہی ماحول اور بزرگوں کی صحبت کا کام دیا، طبیعت میں اپنی

اصلاح و ترقی اور تعلق باللہ کا ایک ہلکا سا شعور پیدا کیا، اور اس واقعہ نے جو بظاہر بہت بڑا نہیں تھا، زندگی کے لئے ایک موڑ کا کام کیا۔

علامہ تقی الدین ہلالی سے ادب و تفسیر میں استفادہ

اسی زمانہ کی بات ہے کہ شیخ خلیل عرب کے مشورہ سے علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی کو جو ملک عبد العزیز والی حجاز سے کسی بات سے اختلاف کی وجہ سے ہندوستان آگئے تھے اور بنارس میں اپنے دوست مولانا عبد المجید حریری کے پاس مقیم تھے، دار العلوم ندوۃ العلماء تدریس کے لئے بلایا گیا۔ ستمبر ۱۹۱۳ء میں ان کا باقاعدہ تقرر ہوا، مولانا نے ان سے ان کی مجالس کے ذریعہ بہت استفادہ کیا لیکن باقاعدہ طریقہ پر ان سے "دیوان نابغہ" پڑھا، ان کے افادات نوٹ کئے، "شرح شذور الذہب" کی جماعت میں شرکت کی، ان کی تصنیف کردہ ناتمام تفسیر ان سے پڑھی۔ (کاروان زندگی ج ۱ ص ۱۱۶-۱۱۷)

اسی زمانہ میں ہلالی صاحبؒ اور سید صاحبؒ کی سرپرستی میں دار العلوم سے عربی رسالہ "الضیاء" کا اجرا عمل میں آیا، جس میں مولانا اور مولانا کے دوست اور رسالہ کے ایڈیٹر مولانا مسعود عالم ندویؒ نے لکھنا شروع کیا۔

عربی میں سوانح نگاری کا فنی ذوق پیدا کرنے کیلئے برادر اکبر کی رہنمائی

یہ ذکر کیا ہی جا چکا ہے کہ مولانا کی تعلیم کا نظام ڈاکٹر صاحب کی سرپرستی اور نگرانی میں چل رہا تھا، اسی زمانہ کی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحبؒ نے مولانا کو مولوی محی الدین قصوری کا ایک مضمون "ہندوستان کا مجاہد اعظم یا مجدد اعظم حضرت سید احمد شہیدؒ" جو رسالہ توحید، امرتسر میں شائع ہوا تھا، عربی ترجمہ کے لئے دیا، اور یہ مشورہ دیا کہ پہلے عربی تاریخ و سیر کی مستند اور سلیس کتابیں دیکھ لوں اور خاص خاص مطالب اور طریق ادا جس کی تاریخ اور سوانح میں ضرورت پڑتی ہے نوٹ کرلوں، اس مقصد کے لئے مولانا نے ابن الاثیر کی "الکامل" کا مطالعہ کیا، اور خاص خاص الفاظ اور محاورے نوٹ کئے، اس کے بعد ترجمہ میں بڑی آسانی ہوگئی۔

اسی زمانہ میں ڈاکٹر صاحب نے اخبار "ام القری" کا ایک شمارہ دیا جس میں حجاج کے لئے انجکشن اور ٹیکہ لگوانے کے سلسلہ میں ہدایات تھیں، تاکہ ان کا ترجمہ کرکے شائع کرادیا جائے، یہ خاص خاص اصطلاحات سے واقفیت کی تعلیم و تربیت تھی۔

مولانا کی انگریزی تعلیم کے اساتذہ

مولانا کی انگریزی تعلیم کا آغاز خلیل الدین صاحب انصاری جو محلہ میں رہتے تھے سے ہوا، رائے بریلی میں اپنے بڑے ماموں سید احمد سعید صاحب سے انگریزی پڑھی، پھر دار العلوم میں ماسٹر محمد سمیع صاحب سے انگریزی پڑھی، پھر ۱۹۲۹ء میں محمد الفاروقی (ایم، اے، ایل، ایل، بی) (جو لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبہ فارسی کے استاد تھے) کے پاس انگریزی پڑھنے کے لئے جانے لگے۔

انگریزی کا شوق اور والدہ کی نصیحت

فاضل ادب پاس کرلینے کے بعد میٹرک پاس کرنے کا خیال پیدا ہوا، اور یہ وہ زمانہ تھا جب بقول مولانا "مجھ پر انگریزی پڑھنے کا دورہ پڑا، اور اس کا بخار چڑھا، میں نے میٹرک کے کورس کی کتابیں خرید لیں، ریاضی محلہ کے ایک استاد سے پڑھنی شروع کی، اور اپنے شوق سے انٹرمیڈیٹ کے معیار کی کتابیں ڈکشنری سے حل کرکے مطالعہ کرنے لگا، ابھی امتحان میں بیٹھنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ والدہ صاحبہؒ کو اس انہماک کا علم ہوا، اور انہوں نے بڑے مؤثر اور دردمندانہ لہجہ میں خطوط لکھ کر مجھے اس رخ سے باز رہنے کی تاکید کی۔

مولاناؒ کی تعلیمی زندگی میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات اور انگریزی سے حد سے بڑھی ہوئی دلچسپی کے بعد کس رخ پر جاتی عالم الغیب ہی اس کو جانتا ہے، لیکن بہر حال پھر وہ ابو الحسن علی ندوی نہ ہوتے جنکا ہم ان سطور میں تذکرہ کررہے ہیں۔

تعلیم کے ساتھ تربیت کا کتنا گہرا ربط ہے، اور تربیت و تزکیہ کے بغیر تعلیم کا دھارا کدھر بہہ سکتا ہے، مشاہیر علماء ہی نہیں عام اہل علم کی زندگی میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں، ماں کی تربیت اور ذہن سازی کا ایک نمونہ اس موقعہ پر ذکر کردینا ضروری ہے، تاکہ یہ اندازہ ہوجائے کہ بھائی صاحب اور والدہ صاحبہ انہیں کیا بنانا چاہتے تھے، اور الحمد للہ انہیں اس میں کس درجہ کامیابی حاصل ہوئی، والدہ صاحبہ خط میں لکھتی ہیں۔

میری سوا ولادیں ہوتیں تو میں یہی تعلیم دیتی

"علی! تم کسی کے کہنے میں نہ آؤ، اگر خدا کی رضامندی حاصل کرنا چاہتے ہو اور میرے حقوق ادا کرنا چاہتے ہو تو ان مردوں پر نظر کرو، جنہوں نے علم دین حاصل کرنے میں عمر گزار دی، ان کے مرتبے کیا تھے، شاہ ولی اللہ صاحبؒ، شاہ عبد العزیز صاحبؒ، شاہ عبد القادر صاحبؒ، مولوی محمد ابراہیم صاحبؒ (اس سے مراد مولانا

ابو محمد ابراہیم صاحب آروی مشہور اہل حدیث عالم ہیں جو مولانا کے نانا سید شاہ ضیاء النبی صاحبؒ کے مرید اور ربانی حقانی عالم تھے) اور تمہارے بزرگوں میں خواجہ احمد صاحبؒ (حضرت سید احمد شہیدؒ کے خلیفہ) اور مولوی محمد امین صاحب (حضرت شاہ ضیاء النبی صاحب کے خلیفہ) جن کی زندگی اور موت اس وقت قابل رشک ہوئی، کس شان و شوکت کے ساتھ دنیا برتی اور کیسی کیسی خوبیوں کے ساتھ رحلت فرمائی، یہ مرتبے کیسے حاصل ہو سکتے ہیں۔

انگریزی مرتبے والے تمہارے خاندان میں بہت ہیں اور ہوں گے، مگر اس مرتبہ کا کوئی نہیں۔

علی! اگر میری سو اولادیں ہوتیں تو میں یہی تعلیم دیتی، اب تم ہی ہو، اللہ تعالیٰ میری خوش نیتی کا پھل دے کہ سو کی خوبیاں تم سے حاصل ہوں اور میں دارین میں سرخ رو اور نیک نام ہوں اور صاحب اولاد کہلاؤں۔ آمین ثم آمین یا رب العالمین"۔

والدہ صاحبہ کے نصائح، اور ان کی دعاؤں کا یہ اثر ہوا کہ مولانا کی طبیعت انگریزی کی مزید تعلیم سے اچاٹ ہو گئی، لیکن اس غیر معتدل اور بحرانی مصروفیت نے اتنی استعداد پیدا کر دی کہ اسلامیات کے موضوع پر انگریزی کتابوں سے نہ صرف استفادہ کیا، بلکہ یورپ کے سفروں میں اس استعداد نے بڑا کام کیا۔ (کاروان زندگی ج ۱ ص: ۱۲۰-۱۲۳)

مولانا لاہوری کے درس "حجۃ اللہ" میں

مولانا ۱۹۳۰ء میں لاہور حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری کے درس میں استفادہ کیلئے حاضر ہوئے، لیکن وہ وقت ان کے منظم درس کا نہیں تھا، جو شعبان سے ذیقعدہ تک چلتے تھے، لیکن مولانا نے از راہ شفقت سورۂ بقرہ کا ابتدائی حصہ پڑھایا۔

دوبارہ ۱۹۳۱ء میں "حجۃ اللہ البالغۃ" کے درس میں شرکت کے لئے حاضر ہوئے، اور باقاعدہ شرکت کر کے امتحان دیا، اور کامیاب ہوئے۔

مولانا مدنیؒ کے درس حدیث میں

جولائی ۱۹۳۲ء میں برادر اکبر کی خواہش اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی ایماء پر ان سے استفادہ کے لئے تعلیمی سال کے درمیان میں ربیع الاول یا ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ میں مولانا دیوبند حاضر ہوئے، اور حضرت مدنیؒ کے درس بخاری اور درس ترمذی میں باقاعدہ شریک ہوئے، مولانا نے حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کا رسالہ "تقریر دلپذیر" اور مولوی سید طفیل احمد منگلوری کی کتاب "حکومت خود اختیاری" پڑھنے کے لئے دی، قرآن مجید کی بعض مشکل آیات کو سمجھنے کے لئے مولانا نے وقت مانگا، مولانا نے جمعہ کا وقت دیا، اس سلسلہ میں استفادہ بھی ہوا اور مولانا مدنیؒ کے تدبر قرآن کا اندازہ ہوا، درس حدیث کا حال یہ تھا کہ تعلیم کے اوقات کے علاوہ بعد عصر اور بعد عشاء بھی دیر رات تک جاری رہتا تھا۔

مولانا اعزاز علی دیوبندی سے استفادہ

اس زمانہ میں مولانا مدنیؒ کی ایماء پر مولانا اعزاز علی صاحبؒ سے ملا علی قاریؒ کی شرح "نقایہ" بھی پڑھی، اور مولانا کو اس درس سے بہت فائدہ ہوا۔

علامہ انور شاہؒ کی مجالس میں

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی مجالس میں بعد عصر شرکت کا موقع ملا، جب کہ وہ ڈابھیل سے تشریف لائے ہوئے تھے۔

کتابوں کے اختتام کے بعد امتحان سے پہلے مولانا دیوبند سے واپس تشریف لے آئے تھے۔

مولانا لاہوری کے درس تفسیر میں

دسمبر ۱۹۳۲ء میں مولانا مدرسہ قاسم العلوم لاہور کے باقاعدہ طالب علم بن گئے، مدرسہ کے شعبہ تفسیر میں مدارس کے فارغ طلبہ کو پورا قرآن مجید مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے طرز پر پڑھایا جاتا تھا۔

یہ درس بڑی محنت اور قوی حافظہ کا طالب تھا، ہر رکوع کا خلاصہ اور اس کا ماخذ یاد کرنا پڑتا تھا، اور نیا درس شروع ہونے سے پہلے پچھلے درس کا امتحان ہوتا تھا، اور جس کی باری آتی تھی، اس کو اس کا خلاصہ مولانا سندھی کے مقرر کئے ہوئے لفظوں میں اور اس کا قرآنی ماخذ بتانا پڑتا تھا، ۱۹۳۳ء میں امتحان ہوا، مولانا کو ۹۸ نمبر ملے۔ (کاروان زندگی ج ۱ ص: ۱۲۸-۱۳۳)

برادر اکبر کی رہنمائی میں عربی اخبارات سے استفادہ

مولانا کے برادر اکبر ڈاکٹر عبد العلیؒ کے نام ۱۹۲۶ء سے جب کہ وہ حج سے آئے تھے مکہ مکرمہ کا اخبار "ام القریٰ" آتا تھا، دوسری طرف انہوں نے مولوی سید سعید اشرف صاحب سے جو اردو اخبار "ہمدم" میں عربی سے اردو ترجمہ کا کام کرتے تھے، یہ طے کر لیا کہ وہ اخبارات سے کام لینے کے بعد انہیں پہونچا دیا کریں جو اخبارات ڈاکٹر صاحب کے پاس اس طرح آتے تھے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

فتیٰ العرب (دمشق)، الجامعۃ الاسلامیۃ (فلسطین)

ان کی عربی بڑی اچھی اور طاقتور ہوتی تھی۔

"الجامعۃ الاسلامیۃ" کے افتتاحیے

بڑے طاقت ور، فصیح و بلیغ اور آتشیں قلم کے لکھے ہوئے ہوتے تھے۔

مولانا عربی ادب کی آخری کتابیں پڑھ چکے تھے، لیکن اخبارات پڑھنے میں دقت پیش آتی تھی، ڈاکٹر صاحب ان کی رہنمائی کرتے، اور جدید تعبیرات اور اصطلاحات کی تشریح کرتے، اس سے انشاء و تحریر میں بڑی مدد ملی۔ دارالعلوم کی "جمعیۃ الاصلاح" میں اس وقت "المنار" الہلال، المقتطف" مجلہ "الزہراء" "المجمع العلمی" اور "العرفان" وغیرہ عربی رسائل آتے تھے، ہلالی صاحب نے محب الدین الخطیب کا رسالہ "الفتح" بھی جاری کرادیا، اور اس رسالہ سے جس میں اسوقت بلند پایہ اسلامی الفکر اہل قلم امیر شکیب ارسلان وغیرہ کے مضامین ہوتے تھے، اور جو ادب عالی اور فکر اسلامی کا جامع رسالہ تھا، مولانا کا کہنا ہے کہ ہم لوگوں کو بڑا فائدہ پہونچا۔ (کاروان زندگی ج ا ص: ۱۲۵-۱۲۶)

مولانا کے تدریسی مضامین اور ان کا مولانا کی ثقافت پر اثر

اس موقعہ پر مولانا کی ثقافت اور ٹھوس علمی بنیادوں کے سلسلہ میں اسکو بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ انہوں نے دوران تدریس کیا پڑھا پڑھایا، قرآن مجید کے ابتدائی دس پارے، ترمذی شریف کا نصف ثانی، خضری بک کی تاریخ "العلوم الإسلامیۃ" کا پہلا حصہ، حماسہ کا "باب الادب و النسیب و المراثی" 'القراءۃ الرشیدہ، حکایات الاطفال' تفسیر کے درس کے لئے "کشاف، معالم التنزیل، مدارک" تقریباً لفظاً لفظاً پڑھی، جدید تفاسیر میں "المنار" اور مولانا آزاد کی "ترجمان القرآن" سے پورا استفادہ کیا، طلبہ کے سوالات کے جواب میں علامہ آلوسی کی "روح المعانی" سے سب سے زیادہ مدد ملی، جدید معلومات اور تقابلی مطالعہ کے لئے مولانا عبدالماجد دریابادی سے مراسلت اور ملاقات کے ذریعہ استفادہ ہوتا رہا، ایک درجہ میں منطق بھی پڑھائی۔ جدید و قدیم منطقی اصطلاحات واصول کی مثالیں روزمرہ کی چیزوں اور مشاہدات سے دیتے تھے، ڈپٹی نذیر احمد کی "مبادی الحکمۃ" سے مدد اور رہنمائی لی، تاریخ الادب العربی کا درس دیا، یہ پسندیدہ اور مانوس موضوع تھا، بخاری کے ابتدائی ابواب "کتاب الإیمان" اور "کتاب العلم" کئی سال پڑھائے، ایک سال مکمل بخاری پڑھانے کا آغاز ہوا، لیکن سفروں کی کثرت اور نظر کی کمزوری کی وجہ سے سلسلہ قائم نہیں رہ سکا۔

۱۹۴۰ء تک داعیانہ اور اقدامی عنصر کی کمی

مولانا کی تعلیم اور تعلیمی دائرہ کی تربیت کی اس مرحلہ پر آکر تکمیل ہو جاتی ہے، دعوتی اور تحریکی جذبہ و عمل اور روحانی تربیت اور تزکیہ کے مراحل سے ابھی گزرنا نہیں ہوا تھا، مولانا خود تحریر فرماتے ہیں:

"اس وقت تک ہمارا مطالعہ اور رجحان ایسے ادبی دائرہ میں محدود تھا جس میں اسلامی خیالات کی جھلک اور دینی حمیت کی آمیزش تھی، لیکن قلم واسلوب کا رخ ابھی دعوت کی طرف نہیں ہوا تھا، نہ مطالعہ میں وسعت اور خیالات میں عمق پیدا ہوا تھا، "الضیاء" رسالہ نے قلم میں روانی اور فکر میں جولانی ضرور پیدا کی، لیکن اس وقت بھی تحریر میں داعیانہ اور اقدامی عنصر پورے طور پر شامل نہیں ہوا تھا، یہ ۱۹۴۰ء کے بعد کی بات ہے۔

مولانا کی ثقافت کی تشکیل جن بنیادی کتابوں اور جن اساتذہ و مدرسین کے ذریعہ ہوئی، میں نے اس کی کوشش کی ہے کہ اس کا مولانا ہی کے بیانات کی روشنی میں بڑی حد تک استقصاء ہو جائے، تاکہ جس تعلیم و تربیت اور ثقافت کے اثرات ہم ایک متوازن فکر اور جامعیت کی شکل میں دیکھتے ہیں اس کے اصل اسباب اور عناصر معلوم ہوں، ظاہر ہے کہ کوئی مجموعہ بغیر اجزائے ترکیبی کے تیار نہیں ہوتا، ہم مجموعہ پر اجمالی تبصرہ اور تاثر تو ظاہر کرتے ہیں، اس کی افادیت اور تاثیر کی تعریف اور قدر بھی کرتے ہیں، لیکن اس کی تقلید واتباع اور سابق نمونوں کو دہرانے کا کوئی واضح خاکہ نہیں بناتے، ہم جس طرح کے اثرات چاہتے ہیں ضروری ہے کہ اس کی مناسبت سے ہم اس طرح کے موثرات بھی فراہم کریں، جن اہل علم کے علم سے ہم متاثر ہیں اور ان کی جامعیت کے معترف، ان کے نصاب درس، اس کی ترکیب اور اس سے استفادہ کے طریقوں پر غور بھی کریں۔

قبل اس کے کہ ہم مولانا کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کی طرف بڑھیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی علمی و دینی ثقافت کی تشکیل میں جس نصاب اور مطالعہ کی جن کتابوں نے اہم رول ادا کیا بلکہ ثقافت کا بنیادی ڈھانچہ تیار کیا اس کا ایک نقشہ ذیل میں دے دیں۔

تسمیہ خوانی

تکیہ کلاں رائے بریلی کے کسی بزرگ کے ذریعہ

ناظرہ

ناظرہ قرآن شریف، لکھنؤ میں حافظ محمد سعید صاحب امام مسجد محمد علی لین، گوئن روڈ کے ذریعہ

اردو

اردو کی ابتدائی کتابیں، مولوی اسماعیل میرٹھی کی،

سفینۂ اردو مولوی اسماعیل میرٹھی کی

فارسی

فارسی کی پہلی، دوسری کتاب

شائع کردہ : انجمن حمایت اسلام

مدرس : مولوی محمود علی صاحب

دینیات

تعلیم الاسلام اور نور الایمان۔

مصنف: والد صاحب مولانا عبدالحی صاحب۔

یہ نصاب ۹ سال کی عمر تک تھا۔

والد صاحب کی وفات ۱۹۲۳ء کے بعد :

فارسی

بوستاں، عم محترم سید محمد اسماعیل صاحب رائے بریلی

اردو و حساب

ماسٹر محمد زماں خاں صاحب، رائے بریلی

حفظ سور

طوال مفصل یاد کرائی گئیں بذریعہ والدہ ماجدہ۔

مطالعہ

سیرت خیر البشر، سیرت رحمۃ للعالمین

پھر لکھنؤ میں تعلیم اس نہج پر رہی :

فارسی

اصول فارسی، مصنفہ مولانا فاروق چریاکوٹی

انگریزی

انگلش ریڈر برادر اکبر ڈاکٹر صاحب نے خود پڑھائی

انگریزی

انگلش ریڈر خلیل الدین صاحب انسوی،

سید سعید احمد صاحب (مولانا کے ماموں)

عربی

مشق گردان : شیخ خلیل عرب صاحب

المطالعة العربية // // //

الطريقة المبتكرة // // //

مدارج القراءة // // //

كليلة و دمنة // // //

مجموعة من النظم و النثر // // //

عربی بولنے کی مشق

قواعد

الضروری مولفہ ابو الحسن الضریری،

میزان منشعب، صرف میر، نحو میر، پنج گنج، شیخ خلیل عرب سے

اس کے بعد نصاب اس طرح رہا:

عربی زبان

نہج البلاغۃ، مقامات حریری، دلائل الاعجاز، عشر قصائد : شیخ خلیل عرب

عربی قواعد

عم محترم مولانا طلحہ صاحب

مطالعہ اردو

الفاروق، آب حیات، نیرنگ خیال، مومن، غالب، ذوق، آتش اور امیر مینائی کے اشعار۔

ماموں زاد بھائی، سید حبیب الرحمٰن صاحب سے۔

مولانا شبلی، مولانا حالی، مولوی نذیر احمد، شرر مرحوم، رتن ناتھ سرشار کی کتابیں پڑھیں۔

الہلال کے فائل دیکھے۔ "یاد ایام" مولفہ والد محترم پڑھی، "زمیندار" اخبار کے سنڈے ایڈیشن سے دلچسپی لی۔

تفسیر

آخری پارہ کی کچھ سورتوں کی تفسیر۔

خواجہ عبدالحی فاروقی سے ۱۹۲۷ء میں

عربی زبان

فاضل ادب، لکھنؤ یونیورسٹی کا نصاب۔

حدیث

فاضل حدیث، لکھنؤ یونیورسٹی کا نصاب ۱۹۲۹ء

انگریزی

محمد الفاروقی صاحب سے۔

ریاضی

محلہ کے استاذ سے۔

فقہ

۱۹۳۰ء مولانا شبلی جیراجپوری اعظمی سے۔

حدیث صحیحین و سنن ترمذی

مولانا حیدر حسن خاں

تفسیر

سورہ بقرہ کا ابتدائی حصہ۔ مولانا حیدر حسن خاں

منطق

مولانا حیدر حسن خاں

عربی ادب

دیوان نابغہ، قواعد، شرح شذور الذہب

علامہ تقی الدین ہلالی سے۔

اواخر ۱۹۳۰ء میں

تفسیر

سورہ بقرہ کا ابتدائی حصہ، مولانا احمد علی لاہوریؒ سے ۱۹۳۱ء میں،

حکمت شریعت حجۃ اللہ البالغۃ مولانا احمد علی لاہوری سے ۱۹۳۲ء میں

حدیث

بخاری و ترمذی کے ابواب

حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ سے۔

مطالعہ

"تقریر دلپذیر" مولانا قاسم نانوتوی،

"حکومت خود اختیاری" مولوی سید طفیل احمد منگلوری سے۔

تفسیر

حل مشکل آیات مولانا مدنی سے۔

فقہ

شرح نقایہ: مولانا اعزاز علی صاحبؒ سے۔ اواخر ۱۹۳۲ء میں۔

تفسیر

مکمل قرآن مولانا احمد علی لاہوریؒ سے۔

دوران تدریس جن کتابوں کو پڑھایا

عربی زبان

القراءۃ الرشیدہ، حکایت الاطفال، حماسہ کا باب الادب، حماسہ کا باب النسیب و المراثی

تفسیر

ابتدائی دس پارے۔ مطالعہ تفسیر کشاف، معالم التنزیل، مدارک، تفسیر المنار، ترجمان القرآن، روح المعانی، تفسیر ماجدی کے مختلف حصے۔

حدیث

ترمذی شریف، بخاری کے ابواب (کتاب الایمان، کتاب العلم)

تاریخ

خضری بک کی تاریخ العلوم الاسلامیۃ۔

منطق

مطالعہ مبادی الحکمۃ، ڈپٹی نذیر احمد صاحب۔

مطالعہ کی دیگر کتابیں

۱۹۳۶ء اردو : وقائع احمدی، وقائع حضرت سید احمد شہیدؒ، علامہ اقبال کی ضرب کلیم، بال جبریل، اسرار خودی، رموزے بے خودی، پیام مشرق وغیرہ، جاوید نامہ، زبور عجم

۱۹۳۸ء عربی: فجر الاسلام، ضحی الاسلام، ظہر الاسلام (ڈاکٹر احمد امین)، زعماء الاصلاح (ڈاکٹر احمد امین)، حاضر العالم الاسلامی (امیر شکیب ارسلان)، مؤتمر أم القریٰ (عبدالرحمٰن الکواکبی)

تراجم: معرکہ مذہب و سائنس (ڈریپر)، تاریخ اخلاقیات یورپ (لیکی)، سقوط و زوال روما (گبن)، تاریخ فلسفہ جدید (ہوفڈنگ)، ترکی میں مغرب و مشرق کی کشمکش (خالدہ ادیب خانم)، Islam at the Cross Road (طوفان سے ساحل تک) محمد اسد، تلاش حق (گاندھی جی)، میری کہانی (جواہر لال نہرو)، مسلمانوں کا روشن مستقبل (مولانا طفیل احمد)، ترجمان القرآن کے مضامین (مولانا مودودیؒ)

دعوتی اور تحریکی عناصر کی تلاش

بہر حال اس سرسری جائزہ کے بعد اب ہمیں دیکھنا ہے کہ مولانا میں دعوتی اور تحریکی عنصر کو کہاں کہاں سے غذا ملی، ان کے اندر فکری و موروثی جو خصائص موجود تھے، اور جن کو پروان چڑھانے میں گھر کا ماحول بہت اہم اور بنیادی لیکن خاموش عنصر کے طور پر کام کر رہا تھا، اس کو ترقی کے مواقع کس طرح میسر آئے۔

مولانا کے بچپن میں فتوح الشام کے منظوم ترجمہ کا رواج

مولانا نے بچپن میں اپنے خاندان کے ایک دستور کا ذکر فرمایا ہے کہ جب بھی کوئی غمناک واقعہ پیش آتا، دل دکھے ہوتے، یا کوئی پریشانی کی بات ہوتی تو واقدی کی "فتوح الشام" کا منظوم ترجمہ "صمصام الاسلام" (جو مولانا کے حقیقی پھوپھا منشی سید عبد الرزاق صاحب کلامی کے نظم کردہ پچیس ہزار اشعار پر مشتمل تھا) پڑھا جاتا، یہ مجموعہ جوش و خروش سے بھرا ہوا اور درد و اثر میں ڈوبا ہوا ہے۔ جنگ کا نقشہ ایسا کھینچتے ہیں کہ دل جوش سے اچھلنے لگتے، اور نبض تیز ہو جاتی، شہادت کا ذکر اس طرح کرتے کہ خود راہ خدا میں جان دینے کے لئے دل بے تاب ہو جاتا۔

مولانا کی بڑی خالہ صالحہ بی جو حافظہ قرآن بھی تھیں، اس کو بڑے پر اثر اور دلکش لہجہ میں پڑھتی تھیں، بچے کبھی کھیلتے کھیلتے، سننے کے لئے ٹھہر جاتے، کبھی مائیں بچوں کو اپنے پاس بٹھا کر سناتیں۔

ایمانی جوش کا پہلا بیج

دینی حمیت، ایمانی جوش و خروش، شوق شہادت، اسلام کی سربلندی کے لئے تحریک قربانی کا غالباً معصوم عہد طفولیت میں سب سے زیادہ مؤثر بیج یہیں سے پڑا ہوگا۔

دوسرا تحریکی نقش

دوسرا تحریکی نقش تحریک خلافت کا تھا، مولانا کی عمر اگرچہ اس وقت آٹھ سال کی تھی، لیکن اس تحریک کے شور، اور طوفان نے ان کی اندرون کی دنیا بھی ہلا دی تھی، مولانا لکھتے ہیں:

"میرے شعور کا آغاز ہی تھا اور میری عمر آٹھ سال کی ہو چکی تھی کہ تحریک خلافت کا لاوا ہندوستان میں پھوٹ پڑا۔

ہندوستان ایک کوہ آتش فشاں بنا ہوا تھا، بڑے چھوٹے، بوڑھے بچے، مرد و عورت کی زبان پر یہ شعر تھا ؎

بولی اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دیدو

شہر میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگریزوں کی حکومت اٹھ گئی ہے، امین الدولہ پارک میں ولایتی کپڑوں کو آگ لگائی جاتی تھی، جن لوگوں کو اعزازی یا امتیازی تمغے ملے تھے، اور ان پر انگریزی حکام کے نام یا انگریزی لکھی ہوئی ہوتی تھی ان کو پاؤں سے روندتے، اپنے عزیزوں اور محلہ والوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

والد صاحبؒ اگرچہ نہایت خاموش اور عزلت پسند تھے، لیکن تحریک خلافت کی تائید و حمایت میں انہوں نے بھی ایک اپیل شائع کی، جسکا مجھے اپنے بچپن میں دیکھنا یاد ہے، اسی جذبہ کے تحت انہوں نے اس زمانہ میں اس گورنمنٹ گرانٹ کو بند کرادیا جو ندوہ کو ملتی تھی، مولانا محمد

علی کی والدہ "بی اماں" جب اپنے دورہ کے سلسلہ میں رائے بریلی آئیں تو والدہ صاحبہ سے ملنے اور تعزیت کرنے "جو ایام عدت میں تھیں" تکیہ تشریف لائیں، خاندان کے بزرگوں کا ان کو تخت پر بٹھا کر اور خود اٹھا کر ہمارے گھر لانا ابھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ (کاروان زندگی ج ا ص: ۷۲-۷۴)

تعدیہ کی صلاحیت کا فقدان

مولانا جس وقت دارالعلوم میں مدرس مقرر ہوئے اس وقت وہاں کوئی دینی و دعوتی فضا موجود نہ تھی، اور اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ بقول مولانا "خود ہم اساتذہ کا ذوق و ذہن دعوتی نہیں بنا تھا، ہم میں سے جو لوگ دینی ذوق رکھتے بھی تھے، اور خوش اوقات اور معلومات کے پابند تھے، ان میں بھی تعدیہ کی صلاحیت اور طلبہ میں دینی و اصلاحی جذبہ پیدا کرنے کی طاقت نہ تھی، ساری فضا پر علمی و ادبی تحریری و تقریری ذوق سایہ فگن تھا۔" (کاروان زندگی ج ا ص ۱۵۲)

ڈاکٹر امبیڈکر کو دعوت اسلام

اکتوبر ۱۹۳۵ء میں شیخ خلیل عربؒ اور برادر اکبر ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ نے جن کو غیر مسلموں میں دعوت دین کی بڑی فکر رہتی تھی، اور وہ اس کی کوشش کسی نہ کسی طرح کرتے رہتے تھے، مولانا کو مامور کیا کہ وہ ڈاکٹر امبیڈکر کے پاس ممبئی جائیں اور ان کے سامنے دعوت اسلام پیش کریں، ڈاکٹر امبیڈکر اس وقت بمبئی کے لا (Law) کالج کے پرنسپل تھے، ان کے بارے میں اخبارات میں چرچہ تھا کہ وہ اپنے اور اپنی قوم کے لئے صحیح مذہب کی تلاش میں ہیں، مولانا کی عمر اس وقت اکیس سال کی تھی، مولانا انگریزی کی کچھ تبلیغی کتابیں، اور سیرت کمیٹی پٹی (جس کے "روح رواں" عبدالمجید قریشی صاحب تھے، اور ان کی جماعت بڑی مستعد کارکن اور دعوتی کاموں میں پیش پیش تھی) کے رسائل اور پکتھال صاحب کا ترجمۂ قرآن لیکر گئے، ڈاکٹر امبیڈکر سے مولاناؒ نے ملاقات کی اور یہ کہا کہ تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے اور شاید آخری، اگر یہ موقع نکل گیا تو پھر کبھی ہاتھ نہ آئیگا، پوری قوم کو آپ نجات دے سکتے ہیں، مسلمان اس گئی گزری حالت میں بھی بڑے سے بڑا امتحان دے سکتے ہیں، اسلام کی مساوات پر بھی گفتگو کی۔

علیگڑھ کا پہلا سفر

۱۹۳۶ء میں مولاناؒ نے وفد ندوہ کے ساتھ علی گڑھ کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کی، یہ علی گڑھ کا پہلا سفر تھا۔

تحریک شہیدین سے ربط اور زندگی کا نیا دور

تحریک شہیدین (جس کا خون مولاناؒ کی رگوں میں تھا، اور جس کی روایات خاندان میں سید قطب الدین مدنیؒ کے دور جہاد سے قائم رہیں) سے ۱۹۳۱ء میں پہلا ربط تو اس طرح ہوا کہ مولوی محی الدین قصوری کے مضمون "تیرہویں صدی کے مجدد اعظم" کا عربی ترجمہ "ترجمة الامام السید احمد الشهید" کے نام سے تیار کیا، جو بعد میں مصر سے شائع بھی ہو گیا، اس وقت مولانا کی عمر تقریباً ۱۶ سال تھی۔

پھر جس تحریر نے مولانا کو سید صاحب کی شخصیت سے سب سے زیادہ متاثر اور متعارف کیا وہ مولانا کے والد کی کتاب "دہلی اور اس کے اطراف" کا سفرنامہ اور روزنامچہ تھا جس کا نام انہوں نے "ارمغان احباب" رکھا تھا۔

مولانا کے رفیق مولانا مسعود عالم صاحب اپنے مسلک اور خیالات اور صادق پور پٹنہ کے اثر سے سید صاحب اور ان کی جماعت کے بڑے معتقد تھے، دونوں ساتھیوں کے درمیان طے ہوا کہ مولاناؒ ان کی سوانح اور تاریخ پر کام کریں اور مولانا مسعود صاحب ان کی تحریک اور جماعت کا تعارف کرائیں۔

۱۹۳۶ء میں مولانا نے اپنے مشفق استاد مولانا حیدر حسن خاں صاحب کے ساتھ ان کے وطن ٹونک کا سفر کیا، اور وہاں اپنی چچی (اہلیہ سید عبدالحفیظ صاحب مرحوم جو سید صاحبؒ کے پر نواسہ سید محمد یونس صاحب کی بیٹی تھیں) کے گھر سے سید صاحب کے حالات و واقعات کا سب سے زیادہ مستند و ضخیم مرقعہ "وقائع احمدی" کئی جلدوں میں ملا، اس سفر میں مولاناؒ نے بندوق کی بھی مشق کی۔

اسی سفر میں مئی ۱۹۳۶ء کی ایک صبح دریائے باس کے کنارے بیٹھ کر اور اس میں پیر ڈال کر "سید صاحبؒ کی سیرت پر ایک اجمالی نظر" کے عنوان سے سیرت سید احمد شہیدؒ کا مقدمہ لکھا، مولانا فرماتے ہیں کہ یہ بڑا مبارک آغاز تھا، اور اس سے میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے مجھے خود اندازہ نہ تھا کہ یہ اقدام خود میری زندگی میں انقلاب انگیز بلکہ عہد آفریں ثابت ہوگا۔

اقبال کی "ضرب کلیم" کا سحر

۱۹۳۵ء تک مولانا علامہ اقبالؒ کے کلام و پیام کے زیادہ گرویدہ و شیفتہ نہیں تھے لیکن ان کی نظر جب "ضرب کلیم" پر پڑی تو بقول مولانا آنکھیں کھل گئیں، اور ان کے کلام کی بلندی اور تاثیر سے مسحور ہو گیا، لیکن بال جبریل پڑھ کر اس سے زیادہ متاثر ہوا، اس میں خیالات کی رفعت و جدت کے ساتھ ترنم اور حلاوت جرس

زیادہ تھی، پھر اسرار خودی اور رموز بے خودی، مثنوی پس چہ باید کرد اے، اقوام شرق، پیام مشرق اور بعد میں "جاوید نامہ" اور "زبور عجم" کا مطالعہ کیا، اور ذہن و قلب نے ان کا وہ اثر قبول کیا جو کسی معاصر شخصیت (جہاں تک ادب و شاعری و فکر کا تعلق ہے) کا اثر قبول نہیں کیا تھا۔ (کاروان زندگی، ج ۱ ص ۱۷۴-۱۷۶)

اقبال سے تاثر کے اسباب

اقبال سے تاثر کا سبب یہ تھا کہ انکے خیالات و افکار، ان کے سوز و ساز کا سرچشمہ ہماری دسترس سے باہر تھا، اور اس کا تعلق، ذہانت، علم او روسعت مطالعہ سے نہیں، "فیضان" سے ہے۔

سب سے بڑی چیز جو مجھے ان کی طرف لے گئی، وہ بلند حوصلگی، محبت اور ایمان ہے، جس کا حسین امتزاج ان کے شعر اور پیغام میں ملتا ہے۔ اور جس کا ان کے معاصرین میں کہیں پتہ نہیں لگتا۔

مولانا کی فطرت کے تین عناصر

میں اپنی فطرت میں انہیں تینوں کا دخل پاتا ہو، میں ہر اس ادب اور پیغام کی طرف بے اختیارانہ بڑھتا ہوں، جو بلند نظری، عالی حوصلگی اور احیائے اسلام کی دعوت دیتا اور تسخیر کائنات اور تسخیر انفس و آفاق کے لئے ابھارتا ہے، جو محمد ﷺ کی عظمت اور ان کے پیغام کی آفاقیت و ابدیت پر ایمان لاتا ہے۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت

۱۹۳۵ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا ۱۹واں اجلاس پٹنہ میں منعقد ہوا تو مولانا نے اس میں ندوہ کی نمائندگی کی، اس موقعہ پر صادق پور کی زیارت کی جو سید صاحب کی شہادت کے بعد ان کی تحریک کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ (کاروان زندگی ج ۱ ص ۱۷۹-۱۸۰)

غیرت ایمان کا شعلہ

۱۹۳۹ء میں مولانا کی کتاب "سیرت سید احمد شہید" طبع ہو کر آئی، مولانا نے اس کتاب میں صرف حضرت سید احمد شہید کا تعارف ہی نہیں کرایا جن کو مسلمانان ہند کا حافظہ رفتہ رفتہ فراموش کر چکا تھا، اور جن کے بارے میں اچھے خاصے تعلیم یافتہ اصحاب کی معلومات بھی بہت سطحی تھیں، بلکہ اس کتاب میں مولانا نے سید صاحب کی دعوت و تحریک کے وسیع تر اور بلند تر مقاصد، ان کی جماعت کی ایمانی کیفیات، اخلاقی خصوصیات، ان کی حیرت انگیز تنظیم، جد و جہد اور قربانیوں کا تعارف کرایا، سید صاحب کی جماعت کی مجاہدانہ سرگرمیوں، اور انگریزوں کے ظلم و ستم اور انبالہ جیل اور انڈمان کے مظلومین کے صبر و استقامت کی داستان بھی سنائی، جو حد درجہ اثر انگیز، ایمان آفریں اور سبق آموز تھی، اور جس کو پڑھ کر سرد سے سرد دل میں حرارت ایمانی، غیرت اسلامی کا شعلہ بھڑکے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ (کاروان زندگی ج ۱ ص ۱۸۶-۱۸۹)

درس کی عدم تاثیر سے بے چینی

مولانا کا ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۹ء تک جو دور تدریس رہا اس میں ان کی سب سے بڑی لذت اور دلچسپی طلباء کو پڑھانے اور ان میں قرآن مجید اور ادب عربی کا ذوق پیدا کرنے میں تھی، لیکن آخری دنوں میں یہ احساس ستانے لگا کہ جس دل سوزی اور جانفشانی کے ساتھ تدریس کی خدمت انجام دی جاتی ہے، اس کے بقدر طلباء پر فائدہ مرتب ہوتا نظر نہیں آتا، بعض مرتبہ خیال ہوتا تھا کہ آج کے درس سے شاید در و دیوار پر بھی نشان پڑ گئے ہوں گے، لیکن نوجوان طلباء کے دل و دماغ پر اس کے نقوش مرتسم نظر نہیں آتے تھے۔

اسی کے ساتھ یہ احساس بھی ابھرنے لگا کہ کسی صالح تحریک و دعوت اور طلباء کی صحیح خارجی مشغولیت کے بغیر پند و موعظت کا کام اور تعلیمی و تربیتی کوششیں نقش بر آب ثابت ہوتی ہیں۔

تحریکی مطالعہ

دوسری طرف مولانا کا مطالعہ اس وقت ان کے بقول تفسیر و حدیث اور تاریخ و ادب کے دائرہ تک محدود تھا۔ ۳۷-۱۹۳۸ء سے یہ مطالعہ اپنے خول سے باہر نکل آیا۔

ڈاکٹر احمد امین کی فجر الاسلام، ضحی الاسلام (۱-۲-۳) ظہر الاسلام، زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث کے اسلوب اور تحلیل و تجزیہ نے بہت متاثر کیا، امیر شکیب ارسلان کی "حاضر العالم الاسلامی" کے پر از معلومات اور اسلامی روح سے معمور حواشی، عبد الرحمٰن الکواکبی کی فکر انگیز کتاب "مؤتمر القریٰ" اور "الفتح" رسالہ کے ولولہ انگیز مضامین نے فکر و نظر میں وسعت پیدا کی، اور عالم اسلامی اور اسکے مسائل اور تحریکات سے دلچسپی لینے کا سامان پیدا کیا۔

مطالعہ سیاسیات و سماجیات

جنگ آزادی اور سیاسی تحریکات کا اور اس کے ساتھ سیاسیات کے موضوع پر لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ بھی اسی دور میں شروع ہوا، اور بعض فکر انگیز اور معلومات افزا کتابیں جنہوں نے بعد کی تحریروں اور مضامین کے لئے مستحکم بنیادیں اور قیمتی مواد فراہم کیا، نیز مغربی تہذیب اور نظام حیات کے تشکیلی عناصر اور پس منظر کو

سمجھنے میں مدد دی۔ مثلاً ڈریپر کی کتاب Conflict Between Religion & Science کا ترجمہ معرکۂ مذہب و سائنس، مولانا ظفر علی خاں کے جادو نگار قلم سے لیکی کی کتاب History of European Morals کا شستہ ترجمہ، مولانا عبد الماجد دریابادی کے قلم سے گبن کی شہرۂ آفاق کتاب Decline & Fall of Roman Empire کے بعض حصوں کا براہ راست مطالعہ۔ ہوفڈنگ کی "تاریخ فلسفۂ جدید"، خالدہ ادیب خانم کی کتاب "ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش"۔ اسی زمانہ میں نو مسلم فاضل محمد اسد کی معرکۃ الآرا کتاب Islam at the Cross Road تقریباً سبقاً سبقاً پڑھی، اور ان کے پر از اعتماد، اقدامی طرز تحریر، مغربی تہذیب کے پوسٹ مارٹم اور اس کے اور اسلامی تہذیب کے تضاد، پھر سنت کی طاقتور حمایت سے دل و دماغ متاثر ہوئے۔

اسی زمانہ میں گاندھی جی کی "تلاش حق" جواہر لال نہرو کی سرگذشت "میری کہانی" مولانا طفیل احمد کی کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" دیکھی، جس سے جزوی طور پر ذہن نے فائدہ اٹھایا، اور معلومات میں اضافہ ہوا۔

اسی زمانہ میں مولانا مودودیؒ کے رسالہ "ترجمان القرآن" میں ان کا مضمون "آنے والا انقلاب" پڑھا، اور ذہن نے اس کا تاثر قبول کیا۔

ان سب چیزوں نے ذہن کی ساکن فضا پر ایک تموج پیدا کر دیا، اور فطرت کی بعض خوابیدہ صلاحیتوں کے بیدار ہونے میں مدد دی۔

مولانا مودودیؒ سے تاثر

ہندوستان کے مسلمان اس وقت دعوت و اقدام اور قوت و شوکت کے پیغام سننے کے لئے بیتاب تھے، ان میں ہر ایسی تقریر تحریر سے متاثر ہونے کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی، جو بلند سطح سے ان کو خطاب کرے۔ ان کی ملی خودی کو غذا پہونچائے، مغربی تہذیب اور ہندوستان کی قومیت متحدہ میں تحلیل ہو جانے کی دعوت پر ضرب لگائے، مسلمانوں کو ان کے قائدانہ مقام سے آگاہ کرے اور ثابت کرے کہ اسلام ہی میں زندگی کے تمام مسائل کا حل اور انسانیت کے تمام مصائب کا علاج ہے۔

اس ضرورت اور اس خلاء کو اس وقت اور اس ماحول میں سب زیادہ مولانا مودودیؒ نے پورا کیا، مولانا کے مضامین و رسائل "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" "پردہ" "سود" جیسے مضامین جو ترجمان القرآن میں شائع ہو رہے ہیں ملت کے باشعور طبقہ کے دل کی ترجمانی کر رہے ہیں اور اس طبقہ کیلئے اس میں بڑی کشش تھی، مولانا کے پاس طاقتور قلم اور زوردار زبان تھی۔

اس زمانہ تک مولانا مودودیؒ کی وہ تشریح و تفہیم دین بھی سامنے نہیں آئی تھی جس پر سیاسی تصور غالب ہو، نہ قدیم اصلاحی تجدیدی شخصیتوں پر تنقید سامنے آئی نہ بعض معاصر مقتدر علماء پر طنزیہ تبصرے آئے تھے۔

مولانا منظور نعمانی سے مناسبت و ربط

مولانا کی مولانا مودودی سے اسی زمانہ میں مراسلت شروع ہوئی، یہی وہ زمانہ ہے کہ جب مولانا نے اپنی کتاب "سیرت سید احمد شہیدؒ" کا ایک نسخہ مولانا منظور صاحب نعمانی کو بھیجا جن سے لکھنؤ میں متعدد ملاقاتیں ہو چکی تھیں، اور مناسبت و ربط پیدا ہو چکا تھا۔

مولانا منظور نعمانی نے کتاب کی رسید بھیجتے ہوئے یہ سوال کیا کہ آپ کی یہ تصنیف برائے تصنیف ہے یا کچھ کرنے کا بھی ارادہ ہے۔

مولانا کا اس پر جو رد عمل تھا، وہ ان ہی کے الفاظ میں پڑھئے:

"جہاں تک مجھے یاد آتا ہے، میں نے شرما حضوری میں لکھ دیا کہ کیوں نہیں؟ اگر مجھ سے کوئی خدمت بن آئے تو میں تیار ہوں، میرا مزاج فطرتاً و وراثتاً تحریکی نہیں تھا، لیکن بہر حال خاندانی اثرات، اور سید صاحبؒ کی نسبت سے دینی حمیت و غیرت کا کچھ حصہ ضرور ملا تھا، اور عملی طور پر تو نہیں لیکن نظری طور پر "خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات" پر "وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل" کی فضیلت و برتری قلب و دماغ کا ایک حصہ بن چکی تھی۔"

قیادت سے معذرت

مولانا منظور نعمانی کے ذہن و دماغ پر اس وقت خاکسار تحریک کے مقابلہ میں اور اس کے متوازی ایک تنظیم قائم کرنے کا خیال غالب تھا، ان کے نزدیک اسکے بغیر حوصلہ مند نوجوان کو خاکسار تحریک کے مضر اثرات سے بچانے کی کوئی صورت نہیں تھی، ان کی نظر مولانا کی کتاب کے مطالعہ کے بعد مولانا پر پڑی کہ وہ اس تحریک کی قیادت کریں، لیکن مولانا نے بقول خود اپنی جسمانی کمزوری، قائدانہ صلاحیت سے محرومی اور غیر تحریکی مزاج کی وجہ سے صاف لفظوں میں معذرت کر دی، اور طلب پر یہ مشورہ دیا کہ حاجی عبد الواحد صاحب ایم اے اس کے لئے موزوں ہیں۔

تحریک کی تلاش

اس مشورہ کے بعد دونوں رفقاء اگست ۳۹ء میں حاجی صاحب سے ملنے کے لئے بلوچستان کے فورٹ سنڈیمن جانے کے لئے تیار

ہوگئے۔ سفر کی پہلی منزل لاہور تھی، جہاں مولانا احمد علی لاہوریؒ کے ہاں قیام رہا، اور مولانا کے صاحبزادہ مولانا حبیب اللہ صاحبؒ کے ساتھ مولانا مودودیؒ سے ملنے گئے، لاہور سے کوئٹہ جانا ہوا، وہاں ایک دن ٹھہر کر فورٹ سنڈیمن (Fort Sandeman) پہونچے، وہاں ایک اسکول میں حاجی صاحب ہیڈ ماسٹر تھے ان سے مل کر یہ طے ہوا کہ تینوں کسی تنظیم و تحریک کی تلاش میں نکلیں، چند ماہ پیشتر مولانا مودودیؒ کا ایک طاقت ور اور مؤثر مضمون "ایک اہم دینی تحریک" کے عنوان سے حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی تحریک و دعوت کے سلسلہ میں نکل چکا تھا اور تینوں رفقاء اس کو پڑھ کر بہت متاثر ہوئے تھے۔

تبلیغی جماعت سے تاثر

۱۹۳۹ء کی آخری تاریخوں میں تینوں رفقاء نے ضلع سہارنپور اور دہلی کے دورہ کا پروگرام بنایا، پہلے سہارنپور پہونچے، پھر رائے پور گئے، حضرت مولانا عبد القادر رائے پوریؒ کی خدمت میں حاضری ہوئی، انہوں نے پرتپاک خیر مقدم کیا، اور اس کام میں ممکن تعاون کا یقین دلایا، اور یہ بھی فرمایا کہ یہ جگہ بھی حاضر ہے اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رائے پوریؒ سے اس نو مسلم کو بھی ملایا جو بعض تنظیمی کوششیں کر چکے تھے، لیکن یہ مشورہ دیا کہ حضرت دہلی (مولانا الیاس صاحبؒ) کے عظیم الشان تبلیغی کام کو دیکھیں، رائے پور سے دہلی حاضری ہوئی، میوات جانا ہوا، مولانا نے اس کام کا جو کچھ اس پہلے سفر میں مشاہدہ کیا اس کے تاثرات ان کی زبانی سنئے:

"اس سفر میں ہم نے جو حیرت انگیز چیز دیکھی اور جس سے ہم کو لازوال مسرت اور شادمانی ہوئی وہ میوات کے علاقہ میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کا تبلیغی کام اور نظام ہے، ہم نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ بیسویں صدی عیسوی کا منظر نہ تھا بلکہ پہلی صدی ہجری کا نقشہ معلوم ہوتا تھا، عہد بعثت کی اصلاح او رانقلاب حال اور قرن اول کے نو مسلموں کے جوش و جذبہ اور تبلیغ کے ذوق و شوق کے جو قصے ہم نے سیرت اور تاریخ اسلام میں پڑھے تھے، گوڑ گانواں کی جامع مسجد اور قصبہ نوح اور شہا پوری کی گلیوں میں اس کا نمونہ دیکھا، واقعہ یہ ہے کہ یہ چشتی درویش اور مجددی عالم، قدیم غیاث پور (حال بستی نظام الدین) میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے پہلو میں بیٹھ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی "اشاعت اسلام" اور حضرت مجدد سرہندیؒ اور حضرت شہید رائے بریلویؒ کی "حفاظت اسلام" کی سنت زندہ کر رہا ہے۔" (کاروان زندگی، ج ا ص ۲۲۷-۲۴۱)

جماعت اسلامی کی رکنیت اور انقطاع

یہ نقش اول جو مولانا کے دل پر حضرت دہلی کی تحریک کے مشاہدے سے قائم ہوا، بتدریج گہرا ہوتا گیا، لیکن مولانا مودودیؒ جن کے مضمون سے متاثر ہو کر یہی یہ دورہ کیا گیا تھا، ان کے قلم اور فکر کا جادو ایسا تھا کہ مولانا ۱۹۴۱ء کے شروع میں جماعت اسلامی کے باقاعدہ رکن بن گئے، اور جماعت لکھنؤ کے ذمہ دار۔ ۴ یا ۵ر جنوری ۱۹۴۱ء میں مولانا مودودیؒ کی لکھنؤ اور ندوہ آمد کے موقع پر انتظام مولانا کے ہاتھ میں ہی رہا، دوبارہ جب ان کی آمد لکھنؤ ہوئی تو انہوں نے جمعیۃ الاصلاح ندوہ میں اپنا مقالہ "نیا تعلیمی نظام" اور لکھنؤ یونیورسٹی میں "نوع انسانی کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل" کے عنوان سے پڑھا۔ فروری ۴۲ء میں مولانا نے جماعت کی مجلس عاملہ کے جلسہ لاہور میں بھی شرکت کی، اور جماعت کے اختلاف کے موقع پر مولانا نے مولانا مودودیؒ کے حق ہی میں ووٹ دیا، اکتوبر ۴۲ء میں جماعت کی دوسری مجلس انتظامیہ دہلی میں بھی مولانا کی شرکت ہوئی، اور علی گڑھ بھی سفر ساتھ ہوا، جہاں دونوں کا اولڈ بوائز لاج میں ساتھ قیام رہا اور وہاں مولانا کی مقبولیت دیکھی۔

لیکن تین سال جماعت کی ذمہ داری نباہنے کے دوران مولانا کے اندر تین احساسات پیدا ہوئے:

۱- مولانا کے بارے میں جماعت کے افراد کے اندر غلو پیدا ہوتا جارہا ہے اور یہ تاثر عام ہو رہا ہے کہ انہوں نے ہی دین کو سمجھا۔

۲- ان میں تنقید کا عنصر بڑھتا جارہا ہے۔

۳- ان کے اندر دین کے ذوق و عمل کی کوئی ترقی، اصلاح نفس کا کوئی نمایاں جذبہ، اور تعلق مع اللہ میں ترقی کی کوئی سنجیدہ کوشش نظر نہیں آتی۔

ان احساسات کے نتیجہ میں مولانا کی طبیعت افسردہ رہنے لگی، تحریریں پڑھ کر جو تاثر ہوتا تھا، ملاقات اور زیادہ دیر ساتھ رہنے میں اس انجذاب اور وابستگی میں کمی محسوس ہوتی تھی۔

شاید یہ خاندانی اثر تھا کہ طبیعت کسی نمایاں باطنی اور روحانی کشش کے بغیر کسی شخصیت کی زیادہ گرویدہ نہیں ہوتی، اس کے برعکس مولانا کا تعلق مولانا الیاس صاحبؒ سے جتنا بڑھتا گیا، (جو مولانا کو مزاج نبوت، سیرت نبوی، اور دین کی دعوت کی روح سے قریب تر نظر آئے) تو ذہنی کشمکش بڑھتی چلی گئی اور بالآخر مولانا، مولانا مودودیؒ کو اپنی اس کشمکش کی اطلاع دے کر ادھر سے یکسو ہو گئے۔

مولانا الیاس صاحبؒ سے تاثر کی جذبی کیفیت

مولانا کا جو سفر دہلی جنوری ۱۹۴۰ء میں حاجی صاحب کے ساتھ ہوا تھا اس وقت مولانا الیاس صاحبؒ سہارنپور گئے ہوئے تھے، مولانا احتشام الحسن کاندھلویؒ نے دونوں کو قصبہ نوح ضلع گوڑگانواں کے ایک تبلیغی اجتماع میں بھیج دیا تھا۔ جس کے تاثرات ابھی آپ پڑھ چکے ہیں، مولانا کے ذہن و دماغ پر تحریک اور صاحب تحریک کا اتنا گہرا، طاقتور اور کیفیت جذب والا اثر پڑا تھا کہ حاجی صاحب کے ساتھ نئی دہلی کچھ دیر کے لئے جانا ہوا، اور مولانا کو ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنا پڑا، تو کیفیت یہ تھی "میرے اندر بے چینی کی ایک مبہم، لیکن طاقتور کیفیت پیدا ہوئی اور میں اس سے ایسا مغلوب ہوا کہ قریب تھا کہ دیوانہ وار دروازہ کھول کر نظام الدین کی طرف دوڑوں، اسی کے ساتھ دعا و انابت کی بھی ایک ایسی حالت پیدا ہوئی جو کبھی برسوں میں اور خاص روحانی فضا میں پیدا ہوتی ہے، میں نے اپنے کو بہت سنبھالا کہ کہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ مجھ پر دماغی دورہ پڑا ہے۔

"سب سے پہلے جس چیز نے ہم لوگوں کو متاثر کیا اور جس کا کم سے کم اپنی عمر میں پہلا تجربہ ہوا وہ مولانا کی شفقت اور جذب دل کی خاص کیفیت تھی۔

پھر مولانا نے روانگی کے وقت ایسی طویل اور اثر میں ڈوبی ہوئی دعا کی جس سے دل و دماغ متاثر ہوئے۔

میں لکھنؤ واپس آگیا، لیکن دل کا حال وہ تھا، جو شاعر نے بیان کیا ہے ؎

دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے"

مولانا الیاسؒ صاحب کی ملاقات اور ان کی تحریک و جماعت سے تاثر اور کیفیت جذب وانجذاب کے تجربہ نے ضرور مولانا میں یہ احساس پیدا کیا ہوگا کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے یہی اثرات تھے جن کو انہوں نے ان کی سیرت میں نظری طور پر لکھا تھا اور اب وہ عملی طور پر اپنے باطن میں ان کا تجربہ کر رہے ہیں۔

تبلیغی محنت کا آغاز

اس کا ہی یہ اثر تھا کہ لکھنؤ واپس آکر مولانا نے اپنے چند سعادت مند اور تعلق والے طلبہ کو لے کر لکھنؤ کے نواحی محلہ کا دورہ کیا، اور دوروں کی روداد لکھ کر بھیجنے لگے، جوابات نہایت ہمت افزائی، دلجوئی اور قدر افزائی کے آنے لگے۔

مولانا کا بیان ہے کہ یہ خطوط جب ملتے تو میں ان کو اتنی بار پڑھتا کہ اس سے بہت سا حصہ یاد ہو جاتا اور عرصہ تک جیب میں پڑے رہتے اور لوگوں کو سنانے کی وجہ سے گل دل جاتے۔

مولانا ندوی کو حضرت دہلوی کے ساتھ جو مناسبت اور انجذاب محسوس ہوا اس میں اسکو دخل تھا کہ مولانا "مکتوب امام ربانی، ازالۃ الخفاء، صراط مستقیم اور منصب امامت" پڑھ چکے تھے، اور ذہانت مطالعہ وسعت علم، اور کسی خاص فلسفہ و تحریک یا صورت حال کے رد عمل اور کثرت عبادت و انابت و دعا قرآن مجید میں عمیق تدبر، سیرت نبوی کا عاشقانہ مطالعہ اور مخلصانہ تتبع اور ہدایت ربانی کے فرق کو خوب سمجھ چکے تھے، مولانا الیاس صاحبؒ کو دیکھ کر اور ان کی صحبت میں رہ کر عارف شیرازی کے اس شعر کی تصدیق ہوئی ؎

این ہمہ مستی و مدہوشی نہ حد بادہ بود
باحریفاں انچہ کرد آں نرگس مستانہ کرد

دوسری طرف حضرت سید احمد شہیدؒ کی نسبت کی وجہ سے خصوصی عنایت۔ اور قرب و اختصاص کا وہ معاملہ رہا جس کا تجربہ مولانا کو کہیں اور نہیں ہوا تھا، تیسری وجہ یہ تھی کہ اس وقت علماء فضلاء اس کام کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے، ایسے وقت دار العلوم ندوۃ العلماء کے ایک مدرس اور طلباء کا متوجہ ہونا قابل قدر تھا۔

دار العلوم میں نیا دینی رنگ

تبلیغی تحریک سے اس ربط اور اس کے شدید تاثر اور صاحب تحریک کی بے انتہا عقیدت اور ان کی طرف بے اختیارانہ انجذاب نے مولانا کو پورے جوش و خروش اور ایمان و احتساب کی کیفیت کے ساتھ اس کام میں لگا دیا، اسکا اثر مجموعی طور پر دار العلوم ندوۃ العلماء کے طلباء اور ماحول پر کیا پڑا خود مولانا کے الفاظ میں :

"دار العلوم میں ایک نیا دینی رنگ پیدا ہوا، بلکہ ایک نیا دور شروع ہوا جس کو ندوۃ العلماء کی تحریک کا کوئی مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔

(کاروان زندگی ج ا ص ۲۸۳-۲۸۵)

اس نقل و حرکت سے دینی و اصلاحی فوائد نمازوں میں ترقی، ذکر و شب بیداری کی توفیق کے علاوہ طلباء کو اور بیش قیمت فوائد پہونچے، جن میں سادگی اور جفاکشی، ربط و تعارف، اساتذہ سے ذاتی تعلق، اپنی کمزوریوں کا علم، عوام کی دینی پسماندگی اور جہالت کا علم اور دینی ذمہ داری کا احساس پیدا ہوا، اور اسی نقل و حرکت میں بعض طلباء سے ایسا ربط و تعلق پیدا ہوا جو بعد میں دینی کاموں اور دار العلوم کی ترقی میں بے حد ممد و معاون ثابت ہوا۔ (ایضاً ج ا، ص : ۲۸۶-۲۸۷)

دار العلوم کی ملازمت سے علیحدگی

اس تحریک سے تاثر اور اشتغال اور اس

میں روز افزوں انہماک کا ہی یہ اثر تھا کہ مولانا نے ۵ر نومبر ۱۹۴۵ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء کی ملازمت تدریس سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا تاکہ دعوتی کاموں کے لئے اپنے کو فارغ کر لیں۔

عالم عربی کا تبلیغی دورہ

۱۹۴۶ء میں مولانا الیاس صاحبؒ کی وفات ہو چکی تھی، اور اب جماعت کی امارت حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے کاندھوں پر تھی، ان میں حضرت دہلوی کی نسبت پوری طرح منتقل ہو چکی تھی، ان کی امارت میں تحریک عالم عربی اور یورپ تک پہونچی، مولانا یوسف صاحبؒ نے جون ۱۹۴۷ء میں مولانا کا سفر حجاز دعوتی مقاصد کے لئے طے کر دیا، اور پھر سفر ہوا جو چھ ماہ پر مشتمل رہا، جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ حجاز کے اہل علم طبقہ میں کام کا تعارف کرایا جائے، اور انہیں اس کی تائید و شرکت کے لئے جوڑا جائے۔

جماعت کے نہج میں تبدیلی کی ضرورت

لیکن بایں ہمہ، تحریکی جد و جہد اور دعوتی کاموں میں بھرپور شرکت کے باوجود مولانا کا ذہن جماعت کے نظام اور موضوعات و دعوت کے سانچہ میں مکمل طور پر نہیں ڈھلا تھا، ان کی متنوع ثقافت اور ان کا خاندانی، تاریخی اور تعلیمی پس منظر صرف ان نکات اور عمل پر قانع نہیں تھا، مولانا نے اپنے اس تاثر کا یوں اظہار کیا ہے۔

"واقعہ یہ ہے کہ میرے ذہن کے سانچے کی مکمل شکست و ریخت عمل میں نہیں آئی تھی، اور اس کی جگہ کسی دوسرے ذہنی اور فکری سانچہ نے نہیں لی تھی۔"

مولانا نے تاریخ اسلام کی اصلاحی و تجدیدی تحریکات اور کوششوں کا نہ صرف مطالعہ کیا تھا بلکہ ان پر بہت کچھ لکھا بھی، وہ منصوصات و غیر منصوصات اور مقاصد و وسائل میں ہمیشہ فرق کرتے رہے، ان کے نزدیک ہر تحریک و دعوت کے لئے نمو دار نقاء، زندگی کے مسائل سے واقفیت اور ان کی تکمیل اور تطبیق ضروری ہے، ورنہ تحریک نمو اور زندگی کی صلاحیت سے محروم ہو جاتی ہے۔

مولانا کا کہنا ہے کہ حضرت دہلوی کی حیات میں بھی میں کبھی کبھی تنہائی میں اقبال کا یہ شعر پڑھتا تھا ؎

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

مولانا دہلوی کی وفات کے بعد مولانا یوسف صاحبؒ کی امارت میں کام کی وسعت اور نئے حالات کے تقاضوں کی بناء پر مولانا کا یہ احساس تھا کہ اصول دعوت اور موضوعات چھ نمبروں میں کم تبدیلیوں اور زیادہ اضافوں کی ضرورت ہے، مولانا نے اس موضوع پر مولانا یوسف اور اہل شوریٰ سے متعدد بار گفتگو کی، مگر انہیں یہ اندازہ ہوا کہ ان حضرات کا ذہن اسکا ساتھ نہیں دیتا، اور کئی بار توجہ دلانے کے بعد مولانا اس نتیجہ پر پہونچے کہ جب تک خود مسلسل داعی کے ذہن میں کسی ضرورت کا احساس اور کسی تبدیلی کا تقاضا پیدا نہ ہو باہر سے مشورہ دینا مفید اور مؤثر نہیں ہوتا، اور بار بار کی کوششوں کے غیر مفید ہونے کے بعد اس سلسلہ کو وہیں روک دینا پڑا۔ البتہ اپنے ذہن کے کام کرتے رہنے کو روکنا قدرت میں نہیں تھا اور یہ فیصلہ کیا کہ جماعت اور اصحاب جماعت سے (جن کے اخلاص، للّٰہیت، اور دعوتی عمل کی افادیت پر پورا یقین تھا) تعلق باقی رکھتے ہوئے اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے زیادہ مفید بنانے اور حالات و ماحول کا لحاظ رکھنے اور دعوت و تفہیم کی اپنی زبان استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (کاروان زندگی ج ۱ ص ۳۱۲-۳۱۶)

تحریکی عمل کا نیا رخ

تحریکی عمل کا یہی وہ مرحلہ تھا جہاں مولانا نے اپنے لئے ایک ایسا پروگرام طے کیا جو تعلیمی، دعوتی، اصلاحی اور ملی کاموں کا میدان بن سکے۔

مولانا جس وقت دعوتی سفر کے سلسلہ میں حجاز میں تھے، ملک کی تقسیم کا عمل ہو چکا تھا، وہ حجاز سے منقسم ملک میں واپس آئے، مولانا کا خاندان جمعیۃ العلماء سے وابستہ تھا، اور حضرت مدنیؒ کا بہت گرویدہ و معتقد۔ اتفاق کی بات یہ ہوئی کہ جس وقت مولانا لکھنؤ پہنچے اسی دن ۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء گاندھی جی کا قتل ہوا۔

ملک میں تعصب و تنگ نظری کی فضاء ایک طرف تھی تو دوسری طرف مایوسی و احساس کمتری کی۔ واپسی کے بعد مولانا کی طبیعت پر اس کا شدید غلبہ ہوا کہ مختلف اداروں اور مکاتب خیال کے ذمہ داروں کو دعوت دے کر ان کے سامنے موجودہ حالات کے مقابلہ کی بات رکھی جائے اور مذاکرہ کیا جائے۔ ۲۶ر اگست ۱۹۴۸ء کو ندوۃ العلماء میں مشاورتی اجتماع منعقد ہوا اور مولانا نے اپنا مقالہ "نشان راہ" انکے سامنے پڑھا جس میں مخلوط مجمعوں میں حکیمانہ طرز پر خطاب، ہندی و انگریزی میں دعوتی و تعارفی لٹریچر کی تیاری ساتھ ہی ساتھ عمومی تبلیغ اور آزاد اسلامی درسگاہوں کی ضرورت پر توجہ دلائی

عربوں میں دعوتی کام

مولانا نے حجاز کے قیام کے دوران عربوں کے جو حالات دیکھے، دین سے غفلت و مادہ پرستی کے جو مناظر دیکھے ان سے ان کا دل

بہت دکھا، اور عربوں میں کام کرنے اور داعیانہ کردار ادا کرنے پر جو اثرات دیکھے وہ بڑے امید افزا بھی تھے، اس سفر سے واپسی پر سعربوں میں دعوت کا کام مولانا کے دل و دماغ پر چھا گیا، اور اعصاب پر اس طرح مستولی اور حاوی ہو گیا کہ اس کو اپنی زندگی کا مقصد و موضوع بنا لینے کا خیال آنے لگا۔

مولانا کے اس جوش و جذبہ کا اندازہ اس خط سے کیجئے جو انہوں نے اپنے دوست مولانا مسعود عالم ندویؒ کو ۶ر شوال ۱۳۶۸ھ مطابق ۳ر اگست ۱۹۴۹ء کو اس وقت لکھا جب وہ عراق میں تھے۔

"دین کی تخم ریزی کے لئے اس کشت ویراں میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھئے، محنت تمام کر دیجئے، دن و رات ایک کر دیجئے، دل کو جلایئے اور بدن کو گھلایئے، دیدہ و خون جگر بہایئے اور اس طرح بہایئے کہ دجلہ و فرات اپنی تنگ ظرفی اور کم مائیگی پر ماتم کریں، ایک ایک کا گریبان تھام کر کہئے کہ اے صحرائے عرب کے بھٹکے ہوئے آہو، عالم کی آبرو، اے ابراہیم و محمد ﷺ کی آرزو! تو کہاں گم ہے؟ کیا سیدنا عمرؓ کی دعائے نیم شبی اور آہ سحر گاہی، مثنیٰ بن حارثہؓ کے خون شہادت، ابو عبید الثقفیؓ کی پامالی اور استخوان شکنی، سعد بن ابی وقاص کی علم برداری، علی بن ابی طالبؓ کی جگر سوزی، اشک ریزی اور خطابت و تاثیر کی طوفان خیزی، آبروئے شہیداں، جگر گوشۂ رسول کی تشنگی، اور خاندان رسالت کے خون کی ارزانی، ابو حنیفہؒ کی دماغ سوزی، احمد بن حنبلؒ کی تعذیر جرم عشق، ابن جوزیؒ کی حمایت سنت، عبد القادر جیلانیؒ کی درد مندی کا حاصل صرف یہ ہے کہ تو ائمہ ضلالت کا ادنیٰ غاشیہ بردار اور اسکی راہ کا غبار ہے، عراق کے اس مقبرہ میں صور پھونک دیجئے اور شور قیامت بپا کیجئے کہ۔

گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا

شیخ حسن البنا کی شخصیت و تحریک

عالم عربی کی طاقتور تحریک "الاخوان المسلمون" کے بانی و قائد شیخ حسن البناء سے مولانا کی ملاقات نہ ہو سکی، مولانا کا پہلا و آخری سفر مصر ۱۹۵۱ء میں ہوا جبکہ شیخ ۱۹۴۹ء میں شہید کئے جا چکے تھے لیکن مولانا کے اندر یہ شوق تھا کہ اس تحریک کو سمجھا جائے اور اسکے قائد کے حالات معلوم کئے جائیں جو کچھ ان کے اصحاب اور تلامذہ و مسترشدین سے معلوم ہوا اس سے اس کا یقین پیدا ہوا کہ اصلاح کیلئے اللہ تعالیٰ نے ان کا انتخاب فرمایا تھا، وسیع و روشن دماغ، گرم و پر محبت و درد مند دل، فصیح و بلیغ زبان، تسخیر کرنے والے اخلاق، دل آویز شخصیت یہ ان کے عناصر ترکیبی تھے، اور اقبال کی زبان میں

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کیلئے

مولانا کا یہ کہنا ہے کہ میں جب بھی یہ شعر پڑھتا ہوں تو بے ساختہ شیخ حسن البناء کی شخصیت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

مولانا اس تحریک کے جن پہلوؤں سے متاثر ہوئے وہ یہ تھے:

۱- اس تحریک نے ایک بگڑی ہوئی سوسائٹی میں ایسی قوت عمل، جذبہ سرفروشی، سادگی و جفاکشی پیدا کر دی جس کی نظیر ملنی اس زمانہ میں مشکل ہے۔

۲- دوسری چیز ان کی محبت اور گرم جوشی اور آپس کے تعلقات ہیں، اتنا مستحکم رشتہ، اخلاق و مودت اور احساس اخوت و رفاقت میں نے کم دعوتوں و جماعتوں میں دیکھا ہے۔

۳- تیسری چیز اس تحریک کا زندگی سے قریبی تعلق ہے اور اس کی کامیابی اور مقبولیت اور تاثیر میں اسکو بڑا دخل ہے۔

۴- اس کا چوتھا و روشن پہلو یہ ہے کہ اس نے دینی و علمی اختلافات سے بچ کر اپنا کام کیا۔

۵- اخوان کی تحریک کا سب سے کامیاب اور روشن پہلو یہ ہے کہ اس نے الحاد و لادینیت کے دھارے کو روکا، اور غیور نوجوانوں اور صاحب حمیت مسلمانوں کا ایک ایسا لشکر پیدا کر دیا کہ ملحدین کو اپنے ملحدانہ خیالات و تصنیفات کی اشاعت اور اخبارات و رسائل کو دین اور اسلامی تہذیب کے ساتھ تمسخر و استہزاء کی جسارت باقی نہیں رہی۔

مولانا نے انہیں مشاہدات کی بنیاد پر اپنی ایک تقریر میں آخری بات یہ کہہ دی تھی کہ اخوان سے اسی کو محبت ہو سکتی ہے جس کے دل میں ایمان ہے اور اسی کو نفرت ہوگی جس کے دل میں نفاق ہے۔ (کاروان زندگی ج ۱ ص ۳۸۱-۳۸۲)

مولانا کا مزاج اصلاً تحریکی اور تنظیمی نہیں تھا، اور یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے کسی تحریک کا تنظیمی طور پر آغاز نہیں کیا، انہوں نے تحریکات میں شمولیت اختیار کی، تائید کی، سرپرستی فرمائی، ان کی ذات خود ایک تحریک و دعوت تھی، لیکن انہوں نے کسی تحریک کی باقاعدہ بنا نہیں ڈالی، عام طور پر لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال ہے کہ "پیام انسانیت" مولانا کی قائم کردہ تحریک ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۶ء تک مولانا اور مولانا منظور نعمانی نے مل کر تبلیغی سفروں اور اجتماعات میں ایک نئے رخ اور شعبہ کا اضافہ کیا، یہ وہ مخلوط اجتماعات تھے جن میں غیر مسلموں، بالخصوص تعلیم یافتہ حضرات کو اہتمام سے دعوت

دی جاتی اور ان کو اور ان کے ذہن کو سامنے رکھ کر اس زبان میں تقریر کی جاتی جو ان کے لئے زیادہ سے زیادہ قابل فہم اور پر کشش ہو اور یہ اقدام اس خیال پر مبنی تھا کہ اکثریت کو نظر انداز کرنا درست نہیں، ان تک پہونچنے کا راستہ مشترک مسائل اور اخلاق ہیں اسی سے ان کا ذہن مطالعہ اسلام کے لئے بھی آمادہ ہو سکتا ہے، لیکن یہ کام بڑا نازک تھا، ذرا سی بے احتیاطی سے یہ دعوت "وحدت ادیان" کے لئے راستہ ہموار کر سکتی ہے۔ لیکن ۱۹۵۶ء سے یہ کام رک گیا، پھر اسی تجربہ اور اقدام نے ۱۹۷۴ء میں "پیام انسانیت" کی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ تحریک کی شکل دینے کا نام اصلاً مولانا اسحاق جلیس ندوی کا کارنامہ ہے جنہوں نے مولانا محمد الحسنی کے مشورہ سے مولانا کی تقاریر کی روشنی میں سوالات و جوابات مرتب کئے، اور تحریک کا ایک خاکہ مرتب کیا۔

بہر حال مولانا نے جو کچھ بھی تحریکی کام کئے، جن ملی پلیٹ فارموں پر انہوں نے اپنی جد وجہد صرف کی اس کے پیچھے کیا بنیادی عناصر کام کر رہے تھے، اور کہاں سے ان کو اس کی چنگاری ملی، کہاں سے اس عمل کی قوت اور دعوت کا توازن اور جامعیت ان کو میسر آئی، اس جائزہ سے اس کا کسی قدر اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

روحانی تربیت کا پس منظر

تعلیم و تربیت اور دعوت و تحریک کے بعد جس چیز کا مولانا پر گہرا اثر رہا اور زندگی کے ہر موڑ پر جس کا ساتھ رہا، اور جس نے دماغ کے تقاضوں پر اکثر و بیشتر دل کے تقاضوں کو غالب رکھا، وہ مولانا کی روحانی تربیت اور اس کا مخصوص پس منظر ہے، جس سے جدا کر کے ان کی شخصیت کا مطالعہ کسی طرح درست نہیں ہو سکتا ہے۔

آئندہ سطور میں ہمیں دیکھنا ہے کہ مولانا کی روحانی زندگی کے تانے بانے کس طرح تیار ہوئے، اور کن عناصر نے مجتمع ہو کر اس "عطر مجموعہ" کی تیاری کا کام کیا۔

سلاسل تصوف سے خاندانی ربط و تعلق

مولانا کا خاندان جب سے ہندوستان منتقل ہوا اور دعوت جہاد کے ساتھ ساتھ وہ روحانی سلسلوں سے بھی وابستہ رہا، خاندان کے مورث اعلیٰ امیر کبیر سید قطب الدین مدنیؒ (۵۸۱ھ - ۶۷۷ھ) حضرت سیدنا عبد القادر جیلانیؒ کے سلسلہ سے مربوط اور صاحب ارشاد و تلقین بزرگ تھے، پھر ان کے اخلاف میں سب سے زیادہ نامور حضرت سید شاہ علم اللہؒ (۱۰۳۳ھ - ۱۰۹۶ھ) تھے جو حضرت سید آدم بنوریؒ خلیفۂ اجل حضرت مجدد الف ثانیؒ کے تربیت یافتہ اور خلیفہ تھے، ان کے اخلاف میں مشہور عالم امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہیدؒ ہوئے جو حضرت شاہ عبد العزیزؒ و حضرت شاہ عبد القادرؒ کے تربیت یافتہ اور اول الذکر کے خلیفہ تھے، مولانا کے والد محترم مولانا سید عبد الحئی حسنی مورخ ہند، حضرت شاہ فضل رحمٰن صاحب گنج مراد آبادیؒ کے تربیت یافتہ اور انکے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے اجازت یافتہ تھے۔

مولانا کے نانا حضرت شاہ سید ضیاء النبیؒ حضرت خواجہ احمد نصیر آبادیؒ کے تربیت یافتہ اور ان کے ایک واسطہ سے خلیفہ تھے جن کا تعلق حضرت سید احمد شہیدؒ سے تھا، اور تکیہ رائے بریلی میں سلوک و ارشاد کے امام تھے۔ (صاحب نزہۃ الخواطر نے آپ کو لب لباب العرفان اور سراو جود کے القاب سے یاد کیا ہے۔)

مولانا کی والدہ ماجدہ اپنے والد مخدوم کی تربیت یافتہ تھیں، پھر ۱۹۴۳ء میں حضرت مولانا الیاس صاحبؒ سے بیعت ہو گئیں، بعد میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بیعت کی تجدید کی، مولانا کے ماموں مولوی حافظ سید عبید اللہ صاحب مرحوم (جنکا تذکرہ آچکا ہے) کہ جن کا مولانا کی ابتدائی تربیت میں بڑا حصہ ہے اپنے والد حضرت شاہ سید ضیاء النبی صاحبؒ کے تربیت یافتہ تھے۔ مولانا کے برادر اکبر ڈاکٹر سید عبد العلی صاحبؒ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بیعت تھے، اور غالباً اجازت یافتہ تھے۔

احسان و تزکیہ، تصوف و سلوک، روحانی تربیت اور اصلاح باطن کا یہ خاندانی پس منظر تھا۔

مولانا کے اساتذہ میں رنگ تصوف

مولانا کی ابتدائی تعلیم کے دوران ہی بزرگوں کے تذکرے اور سوانحی کتابوں کے مطالعے، پھر مکتوبات امام ربانی، صراط مستقیم، منصب امامت وغیرہ کتابوں نے اس رنگ کو اور پختہ کیا۔

مولانا کے مشفق استاد شیخ خلیل عربؒ اگرچہ کسی سلسلۂ تصوف سے وابستہ تو نہیں تھے، لیکن رقت اور خشیت الٰہی اور نماز میں گریہ ان کے تزکیہ قلب کا ہی نتیجہ تھا، اور ان کی صحبت تصوف کا عملی درس تھی۔

مولانا کے دوسرے مشفق و مربی استاد جن سے مولانا نے ابتدائی درس حدیث لیا، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے مجاز تھے، نماز میں ان پر رقت و خشیت کا غلبہ رہتا تھا، آخر شب میں طویل نوافل اور طویل سجود کا معمول تھا۔

۱۹۲۸ء میں حضرت مدنیؒ جب لکھنؤ میں مولانا کے برادر اکبرؒ کے مکان پر قیام پذیر رہے، اس وقت مولانا کی عمر ۱۴ سال کی تھی، مولانا کا احساس ہے کہ حضرت مدنیؒ کے قیام سے ایک خاص رونق و برکت محسوس ہوتی تھی، جس کو

(نورانیت) سے تعبیر کر سکتے ہیں، ان کی شخصیت میں ایسی کشش معلوم ہوتی اور دل اس طرح کھینچتا کہ بے اختیار پاؤں پکڑ لینے اور ہاتھوں کو بوسہ دینے کو جی چاہتا، بعد میں کچھ عرصہ تک تلمذ و صحبت کا شرف حاصل ہوا تو اس میں مزید اضافہ و استحکام ہوا۔

حضرت غلام محمد صاحب بہاولپوریؒ سے بیعت

۱۹۳۰ء میں مولانا جب مولانا احمد علی لاہوریؒ سے تفسیر پڑھنے کے لئے گئے تو مولانا سے بیعت و ارادت کا شوق ظاہر کیا، لیکن مولانا نے اپنے شیخ حضرت خلیفہ محمد صاحب بہاولپوری کی خدمت میں دین پور (ضلع خان پور) بھیج دیا، حضرت خلیفہ صاحب کی عمر اس وقت ۹۰ سال کی تھی۔ حضرت نے بیعت کیا اور ذکر قلبی کی تلقین فرمائی۔ مولانا کا بیان ہے کہ وہ بڑے عالی مرتبہ شیخ اور صاحب نسبت بزرگ تھے، مجھے یاد نہیں کہ میں نے اپنے عرب و عجم کے سفروں میں کسی کا چہرہ اتنا پر نور دیکھا ہو۔ (کاروان زندگی ج ۱ ص: ۱۲۸)

مولانا لاہوریؒ کی تربیت میں

۱۹۳۴ء میں مولانا تیسری بار اپنے شیخ مولانا احمد علی لاہوریؒ کی صحبت و تربیت میں رہنے اور ذکر و شغل کرنے کے لئے لاہور حاضر ہوئے، مولانا نے ہدایت فرمائی کہ شاہی مسجد کے کسی حجرہ میں علیحدہ رہیں، مطالعہ اور علمی اشتغال سے بھی حتی الامکان احتراز کریں۔ (کاروان زندگی ج ۱ ص: ۱۳۲)

سنوسی خانقاہ کا نمونہ

۱۹۳۹ء میں مولانا جب اپنے دو رفیقوں کے ساتھ دینی مراکز کے دورہ پر نکلے تو پہلی منزل رائے پور (ضلع سہارنپور) تھی، جہاں حضرت مولانا شاہ عبد القادرؒ (خلیفہ حضرت شاہ عبد الرحیم رائے پوریؒ) کی خانقاہ تھی، وہاں دو تین بڑے حظ و کیف کے ساتھ اس گمنام خانقاہ میں گزارے، اور ان زندہ خانقاہوں کا نمونہ دیکھا جو اس عہد انقلاب میں بھی مسلمانوں کے لئے مفید اور بعض دینی و اصلاحی وجوہ سے ضروری ہیں، مولانا نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا "مولانا شاہ عبد القادر صاحبؒ ایک باخبر، اور روشن دماغ، جامع عالم، اور شیخ طریقت ہیں اور زمانہ حاضر کے ان مخصوص بزرگوں اور روحانی پیشواؤں میں سے ہیں جن کے انفاس و برکات اور رہنمائی کی مسلمانوں کو ضرورت ہے، مولانا کی حالات زمانہ سے مکمل باخبری، سیاسی فہم و فراست، دینی و دنیوی جامعیت اور جذبہ علم نے اس خانقاہ میں سنوسی خانقاہوں کی جھلک پیدا کر دی ہے، اور مولانا کے کریمانہ اخلاق، بزرگانہ شفقت، تواضع اور مسافر نوازی نے مشائخ سلف کے اخلاق کریمانہ کی (جن میں صاحب خلق عظیم کا پرتو ہوتا ہے) یاد تازہ کر دی۔"

مولانا نے اس سفر میں تبلیغی کام بھی دیکھا، اور اس کے بانی کے اثرات دیکھے اور یوں اپنے تاثر کا اظہار کیا۔

"یہ چشتی درویش اور مجددی عالم قدیم غیاث پور (حال بستی نظام الدین) میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے پہلو میں بیٹھ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی اشاعت اسلام اور حضرت مجدد سرہندیؒ اور حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی کی حفاظت اسلام کی سنت زندہ کر رہا ہے۔"

(کاروان زندگی ج ۱، ص: ۲۴۰-۲۴۱)

حضرت شیخ الحدیث کی قوت نسبت

۱۹۴۶ء میں حضرت شیخ الحدیث کے تقاضہ پر مولانا نے مرکز نظام الدین دہلی میں ان کے ساتھ رمضان گزارا، مولانا نے حضرت کی صحبت میں کیا محسوس کیا، فرماتے ہیں۔

"میں نے ان کی قوت نسبت اور برکت صحبت کے وہ واقعات اور اثرات دیکھے جو کتابوں میں پڑھے اور بزرگوں کے حالات میں سنے تھے۔"

عید کے بعد حضرت شیخ الحدیث مولانا کو لے کر حضرت شاہ عبد القادر رائے پوری کے پاس گئے جن سے مولانا کو پہلے ہی سے عقیدت و مناسبت تھی، لیکن اس حاضری کے بعد اس تعلق میں استحکام و استقلال پیدا ہوا۔

مولانا لاہوری کی طرف سے اجازت و خلافت

۱۹۴۶ء کی بات ہے کہ مولانا، مولانا احمد لاہوریؒ کی طلب پر ان کی خدمت میں لاہور حاضر ہوئے، مولانا ہی کے الفاظ میں، "مولانا نے ایک روز تنہائی میں مجھے اپنے سلسلۂ قادریہ میں اجازت مرحمت فرمائی، اور اس کے لئے استخارہ اور دعا کا انہوں نے جو غیر معمولی اہتمام مسجد خیف میں کیا تھا، اس کا ذکر فرمایا۔ (کاروان زندگی، ج ۱ ص: ۳۲۱-۳۲۵)

حضرت رائے پوریؒ کی خصوصیات

حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوریؒ کی خدمت میں مولانا کی پہلی حاضری کے بعد جو نقش دل پر قائم ہوا تھا وہ گہرا ہوتا گیا، تعلق میں مرور ایام سے اضافہ ہی ہوتا گیا، مولانا کو حضرت رائے پوری کی تین باتوں نے بہت متاثر کیا، وہ

مولانا ہی کے الفاظ میں درج ذیل ہیں :

۱- ایک فنائیت و بے نفسی جس کی نظیر کم سے کم میں نے نہیں دیکھی۔

۲- دوسرے ذہن کی وسعت و حقیقت پسندی جو بڑے بڑے میدانی کام کرنے والے اور زمانہ کے سرد و گرم چشیدہ علماء اور سیاسی قائدین میں بھی (اس درجہ کی) نہ دیکھی۔

۳- تیسری خصوصیت حضرت کی بے پایاں شفقت تھی، جس کے لئے شفقت مادری سے بڑھ کر کوئی تشبیہ نہیں ہو سکتی۔

حضرت رائے پوری کی طرف سے چاروں سلسلوں کی اجازت

۲۶/ اپریل ۱۹۴۸ء کی بات ہے کہ حضرت رائے پوری تکیہ رائے بریلی تشریف لائے تھے، مسجد سے باہر نکلتے ہوئے مولانا نے فرمایا "میں آپ کو چاروں سلسلوں بالخصوص حضرت سید صاحب کے سلسلے میں اجازت دیتا ہوں۔ (کاروان زندگی ج ۱ ص: ۳۵۳-۳۵۴)

مولانا عبد القادر رائے پوری کے بعد حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب سے مولانا کا تعلق مسترشدانہ اور حضرت شیخ الحدیث کا مشفقانہ رہا، تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد مولاناؒ کی حاضری حضرت کے پاس ہوتی رہتی تھی۔

حضرت شاہ محمد یعقوب مجددیؒ کی خدمت میں

شیخ الحدیث کے بعد مشائخ عصر میں مولاناؒ کو سب سے زیادہ مناسبت بھوپال کے حکیم و عارف شیخ حضرت شاہ محمد یعقوب مجددیؒ سے تھی، حضرت کے یہاں حاضری دینی شروع کی اور حضرت کی بہت جلد توجہ خاص ہوگئی، مولانا فرماتے ہیں :

"ایک مرتبہ از راہ شفقت مجھے نہ پاکر اور مجھ کو نہ دیکھ کر ایک مکتوب میں یہ شعر تحریر فرمایا۔

ہمہ شہر پر ز خوباں منم و خیال ماہے
چہ کنم کہ چشم بدبیں نکند بہ کس نگاہے

دل مرا بدل رہیست، مجھے بھی حضرت کے ارشادات و ملفوظات میں تصوف و احسان کے لطیف نکتوں، نادر تحقیقات کے ماسوا بھی زندگی کے عمیق مطالعہ، مسلمانوں کے مختلف طبقوں سے گہری واقفیت اور ان کی کمزوریوں، اور مغالطوں کی نشاندہی اور اصلاح باطن کی ضرورت کو اس زمانہ کے طبائع و اذواق کے مطابق بیان کرنے اور اسکو ایک بدیہی حقیقت اور ضرورت ثابت کرنے، شکستہ دلوں کی تسکین اور مثالوں اور چھوٹی چھوٹی حکایتوں کے پیرایہ میں عمیق و دقیق حقائق کو بیان کردینے کا ایسا خداداد ملکہ اور کمال اور اس کے ایسے دلآویز نمونے نظر آئے، جن کی مثال کم سے کم اس دور مادیت اور رسمیت میں نہیں دیکھی۔

حضرت شاہ وصی اللہ فتحپوری سے ربط و عقیدت

حضرت شاہ یعقوب صاحب کے بعد حضرت شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری خلیفہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ سے سب سے زیادہ ربط اور عقیدت رہی، ان کی خدمت میں حاضری ہوتی رہی۔

حاجی عبد الغفور جودھپوریؒ کی تربیت و صحبت کی برکات

تھانوی سلسلہ کے ایک اور بزرگ حاجی عبد الغفور صاحب جودھپوریؒ سے بھی عقیدت و مناسبت رہی، ان کی سادگی، بے نفسی، شفقت اور ماحول و خاندان میں ان کی تربیت و صحبت کے برکات دیکھے، تھانوی سلسلہ اور اس کے مزاج و مذاق کی متعدد بہترین خصوصیات کو انہوں نے اپنے اندر جذب کرلیا تھا۔

بقیۃ السلف مولانا محمد احمد پھولپوری کی خدمت میں حاضری

ان حضرات کے بعد بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پھولپوری کی خدمت میں حاضری ہوتی تھی، اور بقول مولانا ذکر الٰہی، فکر آخرت، اور تواضع و اخلاص کے وہ نمونہ تھے اور وہ مناظر دیکھنے کو مل جاتے ہیں جو صرف کتابوں کے اندر ملتے ہیں۔

شاہ وارث حسن کی زیارت اور مولانا عبد الشکور فاروقی سے عقیدت

لکھنؤ میں مولانا شاہ وارث حسن مجاز حضرت شیخ الہندؒ کے یہاں ابتدائی مدرسی کے دور میں حاضری ہوئی۔ اور مولانا عبد الشکور صاحب فاروقی کی خدمت میں بھی اور بقول مولانا :

"مجھے خاص طور پر ان کی جس ادا نے فریفتہ کیا اور ان کا معتقد بنایا وہ اولاً ان کی سادگی، تواضع، بے نفسی تھی دوسرے ان کا حقانی و ربانی وعظ جو علماء سلف کی طرح ہر طرح کی لفاظی اور تصنع سے پاک، عقائد کی اصلاح، فرائض کی پابندی اور تذکیر بالآخرۃ پر مشتمل تھا۔" (کاروان زندگی ج ۱ ص: ۴۴۲-۴۴۶)

مولانا نے کاروان زندگی کے سولہویں باب میں مستقل عنوان "مشائخ عصر کی خدمت میں" جو باب کا پہلا عنوان ہے، بزرگوں کی

خدمت میں حاضری اور ان سے تعلق کا حاصل یوں لکھا ہے:

"ملک و بیرون ملک کے اسفار، مطالعہ و تصنیف اور 'پیچ و تاب رازی' کے ساتھ دوائے دل بیچنے والوں اور عشق و اخلاص کی دوکانوں سے برابر تعلق و رابطہ رہا کہ اس دور مادیت اور ادعائے علم میں یہی چیز کسی درجہ میں حفاظت کرنے والی ہے، بقول اقبال۔

می نہ روید تخم دل از آب و گل
بے نگاہے از خداوندان دل

خاندانی ماحول، تعلیم و تربیت، تحریک و دعوت، اور تزکیہ و روحانیت کے یہ وہ عناصر تھے جنہوں نے اس شخصیت کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا، جس کی مقبولیت و محبوبیت کے اثرات کا ہم آج مشاہدہ کر رہے ہیں اور جس کو عالم کا عالم خراج عقیدت پیش کر رہا ہے، اور جو دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے علمی و روحانی امامت کے اس منصب پر فائز ہو چکا تھا جس کی دعا حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں "و من ذریتی" کہہ کر جب کی تھی تو اس میں سید الاولین و الآخرین کے بعد ان کی نسل کے وہ ائمہ حق بھی مراد تھے جو قیامت تک ظہور میں آتے رہیں گے۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

"غالباً ۱۹۶۴ء تھا، رابطہ کے اجلاس ہو رہے تھے، ہم لوگ رابطہ کے مرکز (مکہ معظمہ) میں بیٹھے ہوئے تھے کہ دروازے سے ایک شیعہ عالم داخل ہوئے، میں چونکہ لکھنؤ کا رہنے والا ہوں، اس لئے فوراً پہچان لیا کہ کوئی شیعہ مجتہد ہیں، مفتی سید امین الحسینی صاحب مرحوم (جو کچھ دن ایران میں رہے تھے) بڑھے اور ان کا استقبال کر کے لائے، اور ایک ایک سے تعارف کرانا شروع کیا، یہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ہیں، یہ فلاں ہیں یہ فلاں ہیں، میری باری جب آئی تو انہوں نے کہا کہ ھٰذا شیخ ابو الحسن الندوی، یہ نووارد وزائر (آیت اللہ) روح اللہ خمینی صاحب تھے، میرا نام سن کر بولے، ہاں ہاں! میں نے آپ کا رسالہ "ردۃ و لا أبا بکرؓ لھا" پڑھا تھا۔ میرے خیال میں اس کا نام "ردۃ و لا أباحسنؓ لھا" ہونا چاہئے تھا (مراد حضرت علیؓ ہیں) میں نے کہا جی نہیں! عربی کا محاورہ یہ نہیں ہے، عربی کا محاورہ ہے "قضیة و لا أبا حسن لھا" (مشکل مسئلہ ہے اور اس کے حل کے لئے حضرت علیؓ نہیں ہیں) اس رسالہ کے لئے "ردۃ و أبا بکرؓ لھا" ہی کا عنوان موضوع تھا، اس پر وہ خاموش ہو گئے۔" (کاروان زندگی، اول ص ۴۵۳)

حضرت مولانا کی شخصیت سازی میں

والدہ کے خطوط کا حصہ

• مولانا سید محمد واضح رشید ندوی

دل کی گہرائیوں سے نکلے سچے جذبات و احساسات کا جیسا اظہار خطوط میں ہوتا ہے، وہ دوسری تحریروں میں کم ہوتا ہے۔ خطوط میں بے تکلفی اور بے ساختگی اور تعبیر کی سچائی، کامل طور پر پائی جاتی ہے، اس میں بھی ماں باپ کے خطوط امتیازی حیثیت رکھتے ہیں جو وہ اپنی اولاد کو لکھتے ہیں، جس میں بچہ کے ذہن کی پوری رعایت رکھی جاتی ہے اور بچہ کی ذہنی و فکری ترقی کے ساتھ یہ اسلوب بھی اس کے مطابق بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ علوم و معارف، حکایتوں قصوں میں زندگی کے متعلق ہدایات، مسرت اور رنج کا بیان، انعام و محرومی کا ذکر، حوادث و واقعات کا تذکرہ، اور جو کچھ گھر میں بھلا برا، مفید اور غیر مفید پیش آتا ہے، اور زندگی کے جو مسائل ہوتے ہیں ان کا بے تکلف بیان ہوتا ہے۔ پھر یہ خطوط قاری پر دو قسم کے خاص اثر ڈالتے ہیں، ایک تو یہ کہ قاری کے اندر خوشی کے جذبات موجزن ہوتے ہیں، دوسرا اس کے برعکس تاثر غم یہ ہوتا ہے۔

چنانچہ علماء و مشائخ، قائدین و عمائدین کے تذکرے ان ماؤں کے ذکر کے بغیر ادھورے رہتے ہیں، جن کا ان کی تربیت اور نشو نما میں اہم کردار رہا ہے اور ان کی شخصیت سازی میں اہم عنصر رہا۔ ماں کی ممتا اور شفقت، اس میں اہم کام آتی ہے جب باپ اپنی تمام تر کوششوں کو بے اثر دیکھ رہا ہوتا ہے، اس وقت ان کی محبت اور تڑپ اپنا کام دکھاتی ہے ..... اس لئے بڑی شخصیات کی شخصیت سازی کا اہم اور بنیادی سبب تلاش کرنے پر وہی عنصر نمایاں نظر آتا ہے جو ماں کے نصائح اور توجیہات سے متعلق ہے حالانکہ یہ نصائح اور توجیہات استاد، مرشد و مربی کی نصائح وارشادات سے مختلف اور الگ ہیں لیکن دل کی تپش اور آنسوؤں کی تاثیر کو زخمی کر کے قاری کو بے خود بنا دیتی ہے۔ اسی چیز نے خطوط کی اس قسم کو ادبی حلاوت اور فنی جمال کا رنگ دے کر، ادب کی اہم قسم بنا دیا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تربیت اور ان کی شخصیت سازی کے بنیادی عناصر و عوامل میں جہاں ان کے ماہرین فن اساتذہ، اور بلند پایہ مشفق مربیوں اور مشائخ کرام پر نظر جاتی ہے جن کی زمانہ اور اس کے حالات اور تقاضوں پر نظر تھی اور جو مزاج شناس اور نباض تھے، وہیں ان کی والدۂ ماجدہ کی دعائیں اور تربیت وارشاد کا اہم عنصر ہے جنھوں نے ابتدائے طفولیت سے لے کر زمانۂ طالب علمی اور جوانی تک پوری نگہداشت رکھی اور فکر کی اور دعاؤں کو اپنا لازمی اور بڑا وظیفہ بنایا وہ خطوط کے ذریعہ وقتاً فوقتاً جھنجھوڑتی اور زندگی میں انقلاب برپا کر دینے والے جملوں کا استعمال کرتیں، چونکہ وہ شاعرہ بھی تھیں اور قادر الکلام تھیں مناجات کہتیں اور اس ہدایات و رہنمائی کا وہ کام لیتیں، جو ایک واعظ اور مصلح اپنے وعظ و بیان سے کم لے پاتا ہے،، والدہ ماجدہ کی آہ سحر گاہی اور نالۂ نیم شبی ہی ہے کہ جس نے ان کو ان بلند اوصاف و کردار کا حامل بنایا جس کے حامل کم ہی ہوتے ہیں۔

یہ شب بیدار اور برگزیدہ خاتون مخدومہ سیدہ خیر النساء، بہتر صاحبہ بنت مصلح کبیر حضرت شاہ ضیاء النبی حسنیؒ رائے بریلوی ہیں۔ دائرہ حضرت شاہ علم اللہؒ میں ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئیں اور ایک خاص علمی، دینی، روحانی ماحول میں پروان چڑھیں، یہ اس خاندان کی بی بی تھیں، جو ایک چھوٹا خاندان ہونے کے باوجود شعراء، ادباء مصلحین اور علماء و مشائخ کی جماعت ہر زمانہ کو دیتا رہا ہے، اس نامور خاندان کے بزرگوں کی میراث، آپ میں مجموعی طور پر منتقل ہوئی جس نے آپ کی مناجات اور شعر و نثر کی کتابوں میں وہ بلا کی تاثیر اور کشش پیدا کی جس سے آپ کی مناجاتوں اور کتابوں کو بڑی قبولیت حاصل ہوئی، آپ کو قرآن کریم سے والہانہ تعلق تھا، اور اپنے ذوق و شوق سے قرآن مجید پورا یاد کر لیا تھا، تلاوت کا خاص معمول تھا، بہنیں اور سہیلیاں بھی حفظ قرآن کریم کی دولت سے بہرہ ور تھیں

دعائیں خوب آپ کو یاد تھیں اور بزرگوں کے واقعات اور حکایتیں ذہن نشین تھیں، جن سے وہ ارشاد و تربیت میں کام لیتی تھیں اور معاشرے پر گہری نظر رکھتیں، مشورے دیتیں، اور خود بھی شرکت فرماتیں، چنانچہ سلائی پکائی، صفائی، تمام امور، مہارت اور سلیقہ کے ساتھ انجام دیتیں، اور یہ مصروفیات کبھی بھی ذکر تلاوت اور دعا و مناجات میں مانع اور حارج نہ بنیں، ادبی ذوق اور تربیتی مزاج، جو کہ ایک خاندانی خصوصیات اور امتیاز رہا ہے، ان میں منتقل ہوا تھا، جس کو انھوں نے اپنی خوبیوں سے اور جلا بخشا، نظم و نثر دونوں میں اچھی قدرت رکھتی تھیں، قلبی کیفیات اور دینی جذبات کو نظم میں ڈھالتیں، اور ان توقعات و آرزوؤں کو بھی نظم کرتیں جو انھوں نے اپنے فرزند گرامی سے باندھ رکھی تھیں، چونکہ وہ ایک درد مند اور فکر مند خاتون تھیں، اس لئے وہ ایک لڑکی کو مثالی عورت دیکھنا چاہتی تھیں جو شوہر کے لئے باعث راحت و سکون بنے اور بیٹے کے لئے محبت نچھاور کرنے والی اور اس کے ساتھ اس کی تربیت سے غفلت نہ برتنے والی ماں بنے اور اپنی حد تک گھریلو معاشرہ کو صحیح اسلامی معاشرہ میں ڈھال دینے والی خاتون بنے، اس کے لئے کتابیں بھی لکھیں، "حسن معاشرت" اور "ذائقہ" کو نثر میں اور نظم میں "کلید باب رحمت" کو بڑی مقبولیت ملی۔

ادب و تربیت دونوں اعتبار سے آپ کے خطوط میں وہ دینی جذبہ اور حکیمانہ اسلوب ملتا ہے جو اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتا، اس میں زندگی ہے، تحریک ہے، حساسیت ہے اور درد و سوز ہے، دنیا کا وصف بھی اور اس کے کھوٹ کا اظہار بھی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانہ کی خرابیوں اور فتنوں سے کس باریک بینی سے واقف تھیں اور ایک نوخیز کے جذبات کو سمجھنے میں کس درجہ حساس تھیں، ان خطوط میں جو انھوں نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے لکھنؤ میں تعلیم کے دوران لکھے تھے، جہاں نرمی، گرمی، صراحت اور کنایہ نظر آئے گا وہیں کبھی لچکدار لہجہ اور کبھی طاقتور اسلوب میں واقعات، مثالوں کے ذکر کے ساتھ مخاطب ہوتی ملیں گی، یہ خطوط ان سخت حالات میں تحریر کئے گئے ہیں جب ان کے عظیم المرتبت شوہر مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب حسنیؒ کا حادثۂ ارتحال پیش آیا تھا اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی عمر صرف نو سال کی تھی، ایسے حالات میں ایک ہوشمند اور غیور و باحمیت خاتون کو جو کرنا چاہیئے تھا اس سے زیادہ وہ کرتی نظر آتی ہیں، انھوں نے اپنی جو ذمہ داری محسوس کی اس کا کچھ اندازہ ان کے خطوط سے کیا جا سکتا ہے جو محفوظ رہ گئے، ایک خط میں جب انھوں نے مولانا کا انگریزی کی طرف رجحان کو زور پکڑتے دیکھا تو تحریر کیا

"مجھے تو انگریزی سے بالکل انسیت نہیں، بلکہ نفرت ہے، مگر تمھاری خوشی منظور ہے، علی! دنیا کی حالت نہایت خطرناک ہے، اس وقت عربی حاصل کرنے والوں کا عقیدہ ٹھیک نہیں، تو انگریزی والوں سے کیا امید؟"

دینی علم اور دنیوی علم کے سلسلے میں ان کی غیرت و حمیت کا کچھ اندازہ ان کے خط کے ایک اقتباس سے بڑی حد تک ہو سکتا ہے، وہ ملاحظہ ہو:

"علی! اگر لوگوں کا عقیدہ ہے کہ انگریزی والے مرتبے حاصل کر رہے ہیں کہ کوئی ڈپٹی، اور کوئی جج، کم از کم وکیل اور بیرسٹر

ہونا تو ضروری ہے، مگر میں بالکل اس کے خلاف ہوں، میں انگریزی والوں کو جاہل، اور اس کے علم کو بے سود اور بالکل بے کار سمجھتی ہوں"۔

ساری نصیحتوں کے بعد اس عمل پر انعام کا ذکر کرتے ہوئے خط کو یوں ختم کرتی ہیں:-

"بہت جلد خیریت کی اطلاع دو، اور اگر دیر کروگے تو میں سمجھوں گی کہ میری نصیحت تمھیں ناگوار ہوئی، انشاء اللہ تعالیٰ رمضان شریف میں تم سے وعظ کہلاؤں گی، اللہ تعالیٰ میری خواہش سے زیادہ تمھیں توفیق دے کہنے کی، اور تمھارا کلام پر اثر اور خدا کی خوشی ورضامندی کے قابل ہو آمین۔ **اللهم آتنی بفضلك افضل ماتؤتی عبادك الصالحين**. تم خدا کی رحمت سے تیار رہو، تم نے وعدہ بھی کیا ہے"۔

ایک مکتوب میں تعلیم میں انہماک، جفاکشی اور قدیم طالبعلمانہ صفات کی تلقین کرتے ہوئے لکھتی ہیں:-

"تمام باتوں کا شوق بے کار سمجھو، شوقین مزاج والوں سے دلچسپی نہ رکھو، طالب علموں کو صرف پڑھنا چاہیے، کپڑے پھٹے ہوں یا جوتا، کچھ شرم کی بات نہیں، بلکہ فخر کرنا چاہیے، یہ حالت فلاح و بہبودی کا باعث ہوتی ہے، انھیں تکلیفوں میں علم کی قدر ہوتی ہے، عقلمند اور خوش نصیب وہ ہے، جو نایاب چیز حاصل کرے، وہ کیا ہے؟ شریعت کی پابندی۔

اس وقت کا علم عام ہے، اور ہر کسی کو میسر ہے، دو چار کتابیں لے لیں بس قابل ہوگئے، ہزاروں خطرے پیش نظر رہتے ہیں، یہ خط اگر دل چاہے غور سے دیکھنا اور اکثر اس پر نظر ڈالتے رہنا"۔

ایک مکتوب میں بزرگوں کے طریقہ کی طرف متوجہ کرتی ہوئی لکھتی ہیں:-

"......... اور جہاں تک ممکن ہو، اگلے علماء کی سی لیاقت پیدا کرو، وہی معلومات حاصل کرو کہ کوئی بات شریعت کے خلاف نہ ہو، اور تمام مسئلوں سے بخوبی واقف ہو جاؤ، اس وقت اسی علم کی ضرورت ہے، اس وقت کے علماء کچھ نہیں جانتے، اور فتنے پیدا کرتے ہیں، میری دلی تمنا ہے کہ تم علم میں وہ مرتبہ حاصل کرلو جو بڑے بڑے علماء نے حاصل کیا، جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی ہیں، کان مشتاق ہیں، دل شوق میں مٹا جاتا ہے، علی! اس سے زیادہ کوئی خواہش نہیں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ تمھیں تمام خوبیاں عطا کرے کہ جو اس کی رضا کا باعث ہوں، وہی وقت آجائے، آمین"۔

حضرت مولا رحمۃ اللہ علیہ خود اپنی والدہ صاحبہ کی تربیت اور نگرانی کا حال بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"گھر میں کسی بڑے مرد کے نہ ہونے کی وجہ سے والدہ صاحبہ ہی میری نگرانی، اخلاقی و دینی تربیت کی ذمہ دار تھیں، مجھے قرآن مجید کی بڑی بڑی سورتیں انھوں نے اسی زمانہ میں یاد کرائیں، باوجود اس کے کہ ان کی شفقت خاندان میں ضرب المثل تھی، اور والد صاحب کے انتقال کی وجہ سے وہ میری دلداری اور ایک حد تک ناز برداری، قدرتاً دوسری ماؤں سے زیادہ کرتی تھیں لیکن دو باتوں میں بہت سخت تھیں، ایک تو نماز کے بارے میں مطلقاً تساہلی نہیں برتتی تھیں، میں عشاء کی نماز پڑھے بغیر سو گیا خواہ کیسی ہی گہری نیند ہو اٹھا کر نماز پڑھواتیں، اور نماز پڑھے بغیر ہرگز نہ سونے دیتیں، اسی طرح فجر کی نماز کے وقت جگا دیتیں، اور مسجد بھیجتیں، اور پھر قرآن مجید کی تلاوت کے لئے بٹھا دیتیں، دوسری بات جس میں وہ قطعاً رعایت نہ کرتیں اور اس میں ان کی غیر معمولی محبت و شفقت حارج نہ ہوتی یہ تھی کہ اگر میں خادم کے لڑکے یا کام کاج کرنے والے غریب بچوں کے ساتھ کوئی زیادتی ناانصافی کرتا یا حقارت اور غرور کے ساتھ پیش آتا تو وہ نہ صرف مجھ سے معافی منگواتیں بلکہ ہاتھ تک جڑواتیں اس میں مجھے کتنی ہی اپنی ذلت، اور خفت محسوس ہوتی مگر وہ اس کے بغیر نہ مانتیں، اس کا مجھے اپنی زندگی میں بہت فائدہ پہنچا اور ظلم و تکبر و غرور سے ڈر معلوم ہونے لگا اور دل آزاری اور دوسروں کی تذلیل کو کبیرہ گناہ سمجھنے لگا، اس کی وجہ سے مجھے اپنی غلطی کا اقرار کرلینا ہمیشہ آسان معلوم ہوا۔ (ترجمہ محمود حسن حسنی ندوی)

رمضان کی مبارک ساعتیں
زندگی کے آخری ایام

محمود حسن حسنی ندوی

علماء و مشائخ کے یہاں رمضان کا اہتمام خصوصیت سے رہا ہے، اس کے لئے وہ ایک ماہ پہلے سے تیاری شروع کر دیتے ہیں۔ اور اس کا انتظار گیارہ ماہ سے کیا کرتے ہیں، حضرت مولانا علی میاں قدس سرہ بھی انہیں ربانی علماء و عالی نسبت مشائخ میں تھے جو اپنی پوری زندگی اس کا پورے شوق و دار فگی کے ساتھ اہتمام فرماتے رہے۔ شروع میں مشائخ عصر کی خدمت میں گئے۔ حجاز مقدس بھی اللہ نے ان کو پہونچایا اور وہاں پورا رمضان گزارا، حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری ان کے مرشد اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب ان کے مربی و سرپرست تھے۔ ان کی خدمت میں رمضان کو حاضری ضروری سمجھتے تھے۔ حضرت رائے پوری کی وفات کے بعد اپنے وطن دائرہ شاہ علم اللہ میں رمضان میں مستقل قیام فرمانے لگے۔ اور رمضان کی مبارک ساعتوں سے استفادہ کے لئے قرب و جوار کے لوگ وہاں آنے لگے۔ لیکن اس کے باوجود حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ نے جب جب اپنے وطن میں رمضان گزارا آپ نے وقت نکال کر چند روز کے لئے وہاں حاضری دی اور قیام کیا۔ شیخ کی وفات کے بعد سے چند روز کا استثنائی سلسلہ بھی ختم ہوا مگر وہ ۱۴۱۹ھ کے رمضان میں نئے طریقہ سے سامنے آیا جب حکومت دبئی نے سال کی عظیم دینی شخصیت کا ایوارڈ حلقۂ مسابقہ قرآن کریم کے موقع پر پیش کرنے کے لئے خصوصی چارٹر پلین لکھنؤ بھیجا اور آپ ۱۶ر رمضان کو جاکر ۲۰ر رمضان کو اپنے ان چند رفقا کے ساتھ واپس آئے جو آپ کے ساتھ گئے تھے۔ اور وہ رمضان جو زندگی کا آخری ثابت ہوا، معالجین کے پیہم اصرار کی وجہ سے تکیہ کے بجائے ندوہ میں گزارنا پڑا، جس کے دو عشرہ ندوہ کے حصہ میں آئے اور دو دن تکیہ کو ملے۔ مختصر تفصیلات اس طرح ہیں:

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا اس بیماری کے بعد سے جو ۱۸ر مارچ ۱۹۹۹ء کو جسم کے داہنی جانب فالج کے ایک حملہ سے شروع ہوئی تھی، قیام زیادہ تر لکھنؤ میں رہنے لگا بلکہ تین چار بار وطن جو چند روز کے لئے جانا ہوا اس کے علاوہ سارا قیام ندوہ میں ہی علاج وغیرہ کی آسانی اور ایمرجنسی کی سہولت کی وجہ سے رہا۔ جیسے جیسے رمضان قریب آتا گیا حضرت کو وطن کا خیال بڑھتا گیا، اور یہ رجحان زور پکڑتا گیا کہ رمضان وطن میں ہی جاکر گزاریں اس لئے بستی والوں اور خاندان والوں کے لئے تسکین کا اسی میں سامان ہے۔ اور قرب و جوار کے لوگوں کے لئے اسی میں آسانی ہے۔ مستزاد یہ کہ وہ جگہ اپنی الگ خصوصیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹروں کے اصرار پر محض ان کی دلداری کے لئے لکھنؤ میں رمضان گزارنے کا فیصلہ تو فرمالیا لیکن دو تین روز کے لئے وطن تشریف لے گئے اور ۲۹ تاریخ کو واپس تشریف لائے۔ یہ دن بڑی بہار کے اور پر کیف تھے۔ تکیہ شاہ علم اللہ کی مقناطیسیت کا اثر سبھی پر پڑ رہا تھا اور حضرت کو اندر سے تقاضا وہیں رمضان گزارنے کا ہو رہا تھا جس کا ایک زمانہ سے معمول چلا آرہا ہے۔ مستورات سے جلد واپس آنے اور یہیں قیام کرنے کا وعدہ کیا، بچوں کو تسلی دی، گھر والوں کی دلجوئی کی کہ ڈاکٹروں کا اصرار ہے اس لئے مجبور ہیں۔ درمیان درمیان آتے جاتے رہیں گے۔ روانگی کے دن مسجد گئے اور یہ جانا ہر مرتبہ سے مختلف تھا۔ چاشت کا وقت تھا۔ دو رکعت تحیۃ المسجد صحن مسجد میں اور دو رکعت اندرون مسجد میں ادا فرمائی، اور دیر تک دعا کی پھر جانب دریا آئے اور اس پر وداعی نظر ڈالی۔ اسے دیکھتے جارہے تھے، اور اس میں پیرنا، کودنا اور پانی سے کھیلنا جو بچپن کے شوق ہوا کرتے ہیں سب یاد کرتے جارہے تھے۔ فرمایا

چڑھے دریا کو ہم پار کرتے تھے۔ ادھر مسجد کی وسعت کو دیکھ کر شاہ علم اللہ صاحب کے اخلاص و تقویٰ اور ساحل دریا کو دیکھ کر حضرت سید احمد شہید اور ان کی جماعت مجاہدین کی ریاضتوں، مجاہدوں کا خیال امنڈ رہا تھا۔ زیادہ کھڑا رہنا مشکل ہو رہا تھا ورنہ اور بھی بہت کچھ فرماتے۔ روضۂ شاہ علم اللہ کی طرف بڑھے جو مسجد کے مشرقی جانب ہے، اسی روضہ میں حضرت شاہ صاحب اور ان کے خاندان کے چیدہ افراد، اور حضرت کے والدین ماجدین بلکہ پورا گھر آرام فرما ہے۔ مسجد کی منڈیل پر ہاتھ رکھ کر کھڑے دیر تک ایصال ثواب کرتے رہے۔ اور وہاں مدفون اپنے بزرگوں و متعلقین کو یاد کرتے رہے، اور ان پر سلام و رحمت بھیجتے رہے۔ پھر چاروں طرف نظر ڈالی چونکہ چہار جانب خاندانی بزرگ مدفون ہیں۔ ہر طرف جانا مشکل تھا وہیں سے سلام کیا اور ایصال ثواب کیا، قیام گاہ سے ڈاکٹر عبد المعبود خاں صاحب کی گاڑی سے آئے تھے۔ وہی پھر قیام گاہ لے گئے۔ گھر تشریف لے گئے جہاں خاندانی مستورات جمع تھیں۔ اور کچھ دیر وہاں بیٹھ کر اخلاق و ملاطفت سے پیش آئے، بچوں پر دست شفقت پھیر کر اور سبھوں کی خیر و سلامتی کی دعا دے کر (جو آپ کے معمولات میں داخل تھا) باہر تشریف لائے، جہاں عرصہ سے آپ قیام فرما رہے ہیں۔ حضرت عصر کے وقت لکھنؤ روانگی سے پہلے گھر گئے، برادر زادی (اہلیہ مولانا محمد واضح حسنی صاحب) سے دم کرایا، جو صرف لکھنؤ کے سفر کے لئے ہی نہیں سفر آخرت کے لئے بھی دم تھا کہ پھر اس کے بعد کوئی دوسرا رخصتی دم نہیں پڑھا گیا۔

میر کارواں اپنے کارواں کے ساتھ عصر کو چل کر عین مغرب کے وقت ندوہ پہونچے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ندوہ کی فضا میں رمضان کے ایام گزارنے کے جو اثرات مرتب ہونے چاہئے تھے، وہ ہوئے۔ حضرت کی طبیعت صاف نہیں تھی۔ دل اور گردہ کے متاثر ہونے کی وجہ سے احتیاطیں کرنی پڑ رہی تھیں۔ معالجین کا مشورہ تو روزہ اور تراویح میں رخصت پر عمل کا تھا۔ لیکن حضرت اس پر تیار نہ ہوئے۔ روزے الحمد للہ سارے ہی رکھے۔ یہاں تک کہ روزے کی ہی حالت میں جان جان آفریں کے سپرد کی۔ تراویح میں سلف صالح کے طریقہ اور ائمہ اربعہ کے مسلک کے مطابق ۲۰ ہی پڑھتے رہے۔ صرف ایک دن ۸ پڑھی تھی۔ پھر کسی طرح اس پر تیار نہ ہوئے۔ رمضان کی آمد سے حضرت بڑے مسرور نظر آرہے تھے۔ پہلا روزہ پورا کرنے اور تراویح کے بعد فرمایا جو کام دوائیں نہ کر سکیں وہ رمضان نے کر دیا۔ پھر رمضان کی اس پہلی مجلس میں رمضان کی برکتوں اور حفظ قرآن کی نعمت، اور کثرت تلاوت کا ذکر دیر تک فرماتے رہے۔

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ ایسا دیکھا جاتا ہے کہ لوگ سال بھر غفلت سے دن گزار کر ساری کسر رمضان میں ہی پوری کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں ایسا کچھ نہیں تھا، حضرتؒ کے لئے پورا سال رمضان تھا۔ اور پورے سال میں دو ڈھائی گھنٹہ یومیہ قرآن کریم کے ساتھ گزرتے تھے، رمضان میں اس میں اور اضافہ ہو جاتا تھا۔ استحضار ایسا قوی تھا کہ ایک لحظہ بھی غفلت نہیں ہوتی تھی۔ جود و سخا آپ کا خاص وصف تھا۔ وہ ایسا بڑھ گیا تھا کہ جیسے دریا بہہ رہا ہو، اور چشمہ پھوٹ چکا ہو۔ بیعت و ارشاد کا سلسلہ جاری تھا۔ اور لوگ جوق جوق آرہے تھے اور اس چشمۂ صافی سے فیض اٹھا رہے تھے، عوام و خواص بیعت سے مشرف ہوئے اور بعض مجاز طریقت ہوئے۔

ہفتہ عشرہ کا پروگرام بنا تھا، دو عشرے لکھنؤ کے تعلیمی فکری، دعوتی مرکز ندوۃ العلماء میں گزرے، عصر کے بعد کا منظر ناقابل فراموش ہے کہ حضرت اندر قیام گاہ میں خاموش ذکر میں مصروف ہوتے تھے، اور باہر تک لوگ آپ کے انوار سے محظوظ ہو رہے ہوتے تھے۔ پھر افطار کا وقت جس کے قریب لوگ ذکر و تلاوت اور دعا میں اپنا اپنا کونہ پکڑے مشغول ہوتے تھے اور موذن کی ندا لگاتے ہی لوگ افطار کی سنت کو ادا کرنے کے لئے اس تیزی سے لپکتے تھے کہ اب یہی اہم اور بڑی عبادت ہے۔ حضرت خود تو برائے نام نوش فرماتے لیکن دوسروں کے لئے اہتمام پسند فرماتے۔ تراویح کے بعد مجلس ہوتی اور آس پاس کے کمرے بھی کھچا کھچ بھر جاتے۔ اور آپ کی زبان سے نکلے کسی بھی لفظ کو سننے کے لئے لوگ مشتاق رہتے۔ تراویح اس بار برادرم معاذ کاندھلوی سنا رہے تھے چونکہ مستقل سنانے والے مولانا جعفر حسنی اور مولانا عمار حسنی صاحب رائے بریلی میں یہ خدمت انجام دے رہے تھے۔ اور بھی کچھ خاص معمولات تھے، ایک تو قرآن مجید سننے کا جو ایک وقت سید شارق حسینی سلمہٗ اور دوسرے وقت سعید احمد

بھٹکلی سلمہٗ بعض مخصوص سورتیں سناتے تھے۔ ڈاک کا معمول اور سندوں پر دستخط کا عمل برابر جاری رہا۔

رمضان کے دو عمومی معمولات تھے جس کی آپ ہمیشہ تاکید فرماتے رہے۔ درس قرآن کریم کا، جو رائے بریلی میں آپ خود دیا کرتے تھے، ندوہ میں مولانا برہان الدین صاحب کے سپرد فرمایا۔ اور درس حدیث کا جو مولانا عبداللہ حسنی صاحب کے سپرد تھا۔ ایک مصری قاری نے جو رمضان کی مناسبت سے آئے ہوئے تھے، اپنی قرأت سے محظوظ کیا، اس رمضان میں صرف ایک بار ۱۰ منٹ کا وعظ آپ نے فرمایا جس میں تصحیح نیت اور استحضار پر خصوصیت سے زور دیا۔ اور ایمان واحتساب کی اہمیت کو واضح کیا۔ جمعہ کی مناسبت سے مختصر تقریر کی بھی تاکید ہوتی۔ مرکز نظام الدین دہلی سے وقت گزارنے مولانا احمد لاٹ صاحب تشریف لائے تو ان کی تقریر کرائی۔ حضرت کی خواہش وایماء پر ظہر کے وقت "زاد سفر" مرتبہ سیدہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ اور سیرت رسول اکرم ﷺ مرتبہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اور عصر بعد شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی کی "فضائل رمضان" اہتمام سے پڑھی جاتی۔ رات کو نوافل میں قرآن مجید دیر تک پڑھا جاتا اور پوری رات یہ عمل الگ الگ طور پر جاری رہتا۔ رمضان المبارک کے اس نظام کاندہ کے احاطہ میں یہ پہلا موقع تھا، جس کا اثر پوری فضا پر صاف طور پر محسوس کیا جارہا تھا۔ ۲۰ رمضان المبارک کو بدھ کے دن معالجین کے مشورہ سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے وطن کا قصد فرمایا۔ جہاں باقی دو دن گزارنے مقدر تھے۔ اعزہ وافراد خاندان اور وطن والوں کو اس پر جو خوشی حاصل ہوئی وہ محتاج بیان نہیں، اور شام ہوتے ہوتے مسجد کا اندرون معتکفین سے پُر ہو گیا۔ ہر ایک فرحاں و شاداں نظر آرہا تھا۔ دوسرے دن گھر تشریف لے گئے۔ اور دیر تک وہاں تشریف فرما ہوئے۔ اور ملاقات کر کے باہر تشریف لائے۔ اگلے روز جمعہ کے دن اپنے معمولات پورے فرماکر اور جمعہ کی پوری تیاری کر کے اپنے رب کے کلام سے زبان کو تر کر کے اپنے رفیق اعلیٰ سے جاملے۔

خطرناک رُجحان

● تاریخ بتاتی ہے کہ کسی قوم کا اخلاقی زوال پہلے شروع ہوتا ہے، سیاسی زوال بعد میں آتا ہے۔ ہندوستان آج اسی منزل سے گزر رہا ہے، وہ شدید اخلاقی زوال سے دوچار ہے، اس سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ اتنے لمبے چوڑے ملک میں کنیا کماری سے لے کر سری نگر تک کوئی آواز بلند کرنے والا نہیں کہ اخلاق درست کرو، انسانیت کا سبق پڑھو، ملک کو بچاؤ، یہ کہنے والے ہزار ہیں کہ ہماری پارٹی میں آؤ، فلاں کی قیادت تسلیم کرو، اس کا شکوہ نہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے غلط ہو رہا ہے، سب کا مطالبہ ہے یہ کہ جو کچھ غلط صحیح ہوتا ہے، ہمارے جھنڈے کے نیچے اور ہمارے زیر اقتدار ہو، کوئی خدا لگتی سچی بات کہنے والا، دُکھی رگ پکڑنے والا، بیماری کی جگہ پر اُنگلی رکھنے والا، اپنے فرقہ اور اپنی جماعت پر بے باک تنقید کرنے والا، اس کو غلطی پر ٹوکنے والا موجود نہیں، جو کھڑا ہوتا ہے، دوسرے فرقہ یا جماعت یا حلقہ کو بڑی فیاضی سے مشورہ دینے لگتا ہے، ہر ایک اپنے طبقہ کے بارہ میں ہوشیار، اور لائق وکیل (Advocate) اور دوسرے طبقہ یا فرقہ کے بارہ میں تھانہ دار اور خدائی فوجدار (Public Prosecutor) نظر آتا ہے۔

میں ایک مذہبی انسان اور تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ ہمارے گناہ اور ظلم کے نتیجہ میں آسمانی آفتیں آتی ہیں، خدا یہ دِکھاتا ہے کہ مارنے کا سامان ہمارے پاس تمسے زیادہ ہے، جب بھی ظلم کا کوئی واقعہ ہوتا ہے تو میں ڈر جاتا ہوں کہ کوئی قدرتی تازیانہ انسانوں کی طرف نہ بڑھے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

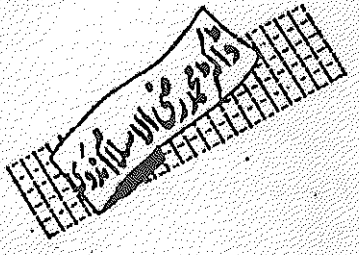

مولانا علی میاں

اور مفرداتِ قرآنی کی لغوی تحقیق

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (۱۹۱۴_۱۹۹۹ء) کو عربی زبان و ادب پر کامل دستگاہ حاصل تھی، اس کے اسرار و رموز، نحو و بلاغت اور فنی باریکیوں پر گہری نظر رکھتے تھے، آپ کی عربی دانی کا خود عربوں نے لوہا مانا ہے، انھوں نے آپ کی زبان کی سلاست، شگفتگی، روانی اور جاذبیت کو عقیدت و تحسین کی نظروں سے دیکھا ہے اور اس کے ادبی محاسن کا برملا اعتراف کیا ہے۔ مولانا کی خدمات کا ایک درخشاں پہلو میرے نزدیک یہ ہے کہ انھوں نے اپنی یہ غیر معمولی صلاحیت خدمت قرآن میں لگادی اور اس کے ذریعے قرآن کا پیغام عام کرنے اس کا اعجاز آشکارا کرنے اور اس کے دقائق و نکات سے پردہ اٹھانے میں زندگی کی آخری سانس تک مصروف رہے، مولانا کی کسی بھی موضوع پر کوئی بھی تحریر ہو قرآنی آیات سے مرصع و مزین ہوتی ہے، مولانا نے قرآن سے فیض اٹھانے کا بارہا تذکرہ کیا ہے، ایک موقع پر فرماتے ہیں:

”میں قرآن مجید کا ایک حقیر طالب علم ہوں اور واقعہ یہ ہے کہ میری تمام فکر، تحریر و تقریر اور اظہار خیال کا مظہر اور مرکز بلکہ اس کا سرچشمہ قرآن مجید کا محدود مطالعہ ہے، چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی لیکن میں کہہ سکتا ہوں کہ ؎

آنچہ کردم ہمہ از دولت قرآں کردم

اللہ تعالیٰ نے جو کچھ لکھنے پڑھنے کی توفیق دی اور اپنے مطالعہ کا حاصل پڑھنے والوں کے سامنے رکھ دیا وہ سب قرآن مجید ہی کا فیضان ہے“۔(۱) مولانا کی خدمت قرآن کے متعدد پہلو ہیں، وہ اپنی تحریروں میں جن آیات سے استدلال کرتے ہیں۔ یا اپنی تقریروں میں جو آیات پڑھتے ہیں، ان کی تفسیر و تشریح کرتے ہیں، قرآنی اسالیب کی وضاحت کرتے ہیں، قرآنی بیانات کا اعجاز آشکارا کرتے ہیں، اور نحو، بلاغت اور معانی کے اسرار حل کرتے ہیں لیکن اس سلسلے میں انکا سب سے اہم کام میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ مفردات قرآنی کی لغوی تحقیق، انکے معانی کی تعیین اور اردو زبان میں انکے صحیح متبادل کی تلاش بھی کرتے ہیں، اس چیز کو مولاناؒ کی ایک امتیازی خصوصیت قرار دیا جاسکتا ہے، استاد گرامی مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی فرماتے ہیں:

”مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو عربی زبان کے الفاظ و تعبیر کو سمجھنے کا اعلیٰ ادبی ذوق حاصل ہے، وہ قرآن مجید کی آیات کی تشریح کرتے ہوئے انکے بعض الفاظ کی ایسی دل نواز و دل گداز تشریح و وضاحت کرتے ہیں کہ قرآن مجید کا اعجاز کھل کر سامنے آجاتا ہے اور اس کیفیت سے آشنائی ہوتی ہے جو لفظ کے

(۱) قرآنی افادات حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، جمع و ترتیب۔ احمد حقانی ندوی، ناشر محمد الحسنی ٹرسٹ رائے بریلی طبع اول ۱۴۲۰ھ / ۱۹۹۹ء ص ۷ ۔ ۲۔ اس کتاب میں مولانا کی مختلف تحریروں اور تقریروں سے قرآنی افادات جمع کیے گئے ہیں۔ پیش نظر مقالہ کی تیاری میں اسی سے فائدہ اٹھایا گیا ہے اور اسی کے حوالے دیے گئے ہیں۔ (۲) افادات: ص ۲۴ (تقدیم)

ساتھ وابستہ ہوتی ہے اور انسانی زندگی کی نفسیاتی کیفیت سے بڑی مطابقت رکھتی ہے، مولانا کی یہ خصوصیت بڑی امتیازی خصوصیت ہے جو کم اہل علم میں پائی جاتی ہے"۔(۲)

لغوی تحقیق: الفاظ قرآنی کی لغوی تحقیق کا بڑا سرمایہ مولانا کی تحریروں میں موجود ہے، لفظ کا مادہ کیا ہے؟ اس کے قرآنی استعمال میں کتنی بلاغت پائی جاتی ہے اس کے معنی میں کتنی وسعت، گہرائی اور جامعیت ہے؟ اور اس کے ہم معنی یا قریب المعنی دیگر الفاظ کے بجائے اسی لفظ کو کیوں لایا گیا ہے؟ یہ اور اس جیسے دیگر سوالات کے جوابات مولانا بہت خوبصورتی سے دیتے چلے جاتے ہیں جس کے نتیجے میں قرآن کریم کا اعجاز بیان اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتا ہے۔

سورہ توبہ کی آیت ہے: فلولا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين (۱۲۲) لفظ تفقہ" میں کتنی جامعیت ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں "تفقہ" بہت جامع لفظ ہے، اس میں احکام ومسائل، ان کی حکمتیں، مواقع استعمال ان کی تطبیق کے مواقع، خطاب کے طریقے سب اس کے اندر آجاتے ہیں، تفقہ کا لفظ ایسا اللہ تعالی نے استعمال کیا ہے کہ اس سے جامع لفظ ہو ہی نہیں سکتا، عربی زبان میں "سمجھنے" کے لئے بیسیوں الفاظ ہو سکتے ہیں، فہم، معرفت، تعقل، لیکن تفقہ کا لفظ خاص معنی رکھتا ہے، اس کے معنی میں دین میں گہری سمجھ حاصل کرنا، دین کے ذخیرہ پر عمیقانہ نظر رکھنا، زمانہ کی ضرورت کو سمجھنا اور بدلتے ہوئے زمانہ اور دائمی دین کے درمیان رشتہ پیدا کر سکنا"۔(۳)

سورہ بقرہ میں ہے: یا ایہا الذین آمنوا ادخلو فی السلم کافة (۲۰۸) مفسرین نے عموماً بیان کیا ہے کہ اس آیت میں لفظ "سِلم" اسلام کے معنی میں ہے، انہوں نے اسطرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے کہ "اسلام" کے بجائے "سِلم" استعمال کرنے میں کیا مصلحت ہے؟ مولانا نے اس کی وضاحت کی ہے، فرماتے ہیں:

"بظاہر ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ فی السلم کے بجائے فی الاسلام کہا جاتا یعنی اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ، مگر نہیں یہاں "سلم" میں داخل ہونے کو کہا گیا یعنی خدا کے ساتھ تمہارا معاملہ فرماں بردارانہ، مطیعانہ، مصلحانہ اور مکمل ہونا چاہئے، عقائد میں بھی، فرائض وعبادت میں بھی، طرز معاشرت اور طریقہ زندگی میں بھی، تمہیں اللہ تعالی کی تعلیمات اور سید المرسلین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے اور بتائے ہوئے احکام کا پابند ہونا چاہئے اور تعلقات میں اس کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ اللہ کے دشمن سے وفاداری اور اطاعت و فرماں برداری کا تعلق نہ ہو، "اسلام" کا لفظ "سلم" ہی سے نکلا ہے، عربی زبان ولغت کے لحاظ سے اسلام کے معنی ہیں اپنے کو حوالے کردیا، سرینڈر کردیا اور اپنی ہر چیز سے دست بردار ہو گیا"۔(۴)

سورۂ نساء کی پہلی آیت ہے: واتقوا الله الذی تساء لون به والارحام اس میں "سوال" کو باب تفاعل سے لاکر قرآن کس اہم حقیقت کی طرف اشارہ کررہا ہے؟ مولانا فرماتے ہیں:

"قرآن مجید میں انقلابی طور پر پہلی مرتبہ پیش کیا گیا ہے کہ انسانی سوسائٹی کا ہر فرد ایک دوسرے کا محتاج ہے، ہر ایک سائل ہے، اور ہر ایک مسئول ہے۔ پھر تقسیم اس طرح نہیں کہ سائلین ایک طرف ہیں اور مسئولین دوسری طرف بلکہ جو سائل ہے وہ مسئول بھی ہے اور جو مسئول ہے وہ سائل بھی ہے، "تساؤل" (مشترکہ سوال وجواب) ایک ایسی زنجیر ہے جس میں ہر ایک بندھا ہوا ہے، ہماری تمدنی زندگی ایک جال ہے جس میں ہر ایک دوسرے کا ضرورت مند ہے' (۵)

سورہ انفال کی آیت ہے: یا ایہا الذین آمنوا إن تتقوا الله يجعل لكم فرقانا

(۳) افادات ص۔۲۵۹ (۴) افادات ص۔۲۸۱ (۵) ایضاً ص ۲۰۵۔۲۰۶ (۶) ایضاً ص ۲۹۹

(۲۹) فرقان کے معنی کیا ہیں؟ مولانا فرماتے ہیں:

"الفارق بین الحق والباطل، الفارق بین النور والظلام، الفارق بین الخیر والشر"(۶)

سورہ بقرہ میں ہے: ام کنتم شھداء اذ حضر یعقوب الموت اذ قال لبنیه (۱۳۳)

مولانا فرماتے ہیں:

"اس میں بیٹے پوتے، نواسے، بھانجے، ان سب کو شامل سمجھتے۔ عربی کا لفظ "لبنیه" ان سب پر مشتمل ہے"(۷)

معنی کی تعیین: عربی زبان کے بہت سے الفاظ اردو میں مستعمل ہیں لیکن اردو میں انکے وہ معانی نہیں ہیں جن میں انکا عربی میں استعمال ہوا ہے۔ مولانا کو اس نزاکت کا پورا احساس ہے، فرماتے ہیں:

"جو الفاظ دوسری زبانوں میں مستعمل ہوئے ہیں بعض اوقات انکی طاقت اور ان کے اپنے مفہوم کے ادا کرنے میں فرق واقع ہو گیا ہے، الفاظ کا بھی تاریخی سفر ہوتا ہے جیسے انسانی قافلوں، تہذیبوں اور افکار کا تاریخی سفر ہے، جب وہ سفر طے کرتے ہیں تو اپنی بہت سی تازگی کھو دیتے ہیں اور بہت سے خارجی ومقامی اثرات قبول کر لیتے ہیں، اردو میں بھی عربی کے بہت سے الفاظ ہیں جن کو اپنے صحیح مفہوم ومعنی میں سمجھنا مشکل ہو گیا ہے اور ان میں وہ زور وقوت باقی نہیں رہی جو اصل زبان میں تھی"۔(۸)

یہی معاملہ قرآن کریم کے ان الفاظ کا بھی ہے جو اردو زبان میں مستعمل ہیں کہ ان کا وہ مفہوم لوگوں کے ذہنوں میں نہیں ہوتا جس مفہوم مین قرآن میں انکا استعمال ہوا ہے، مولانا ایسے الفاظ کی بہت تفصیل سے تشریح کرتے ہیں جس سے انکا حقیقی مفہوم پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ قرآن میں لفظ جاھلیة" متعدد مواقع پر آیا ہے، مولانا اس کے معنی کی تعیین کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"جاہلیت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ صرف جاہلیت عربیہ مراد ہے اور جاہلیت عربیہ سے مراد ہے بت پرستی کا دور، دختر کشی کا دور، شراب نوشی کا دور، اور رہزن کا دور، ان کے سامنے صرف یہ آتا ہے، لیکن معاشرت، طرز معیشت، طرز زندگی، فیصلے کرنے کے معیار واصول اور رغبات اور نفرتیں، یہ چیزیں جاہلیت کے تصور کے ساتھ ذہن میں نہیں آتیں حالانکہ جاہلیت ان سب پر مشتمل ہے.....اس سے مراد وہ دور ہے جو نبوت کی روشنی اور ہدایت سے محروم رہا ہے، قوم کا وہ دور جو نبوت کی روشنی اور ہدایت سے محروم رہا ہے چاہے وہ یورپ ہو یا ساسانی مملکت ہو، چاہے وہ ہندوستان ہو، چاہے وہ عرب ہو"(۹)

سورۂ توبہ میں ہے: لینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون (۱۲۲)

مولانا لفظ "قوم" کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

"قوم کے معنی ہیں انسانوں کا مجموعہ انسانی جماعتیں، تو اپنی قوم کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہندوستانیوں کو جاکر سمجھائیں، عرب عربوں کو سمجھائیں، نہیں بلکہ جہاں سے آئے ہیں اپنے اپنے خاندانوں کو، محلے والوں کو، گاؤں والوں کو، قصبے والوں کو، برادری والوں کو جاکر سمجھائیں۔"(۱۰)

قرآن میں لفظ "تقوی" اور اس کے مشتقات کا کثرت سے استعمال ہوا ہے، مولانا اس کے رائج مفہوم اور حقیقی مفہوم دونوں پر روشنی ڈالتے ہیں:

"ہمارے یہاں متقی کے معنی ہیں بڑا عبادت گزار، راتوں کو بہت کم سوتا ہو اور نہ سوتا ہو تو اور زیادہ متقی ہے، اور نہ کھاتا ہو، اور اگر وہ مسلسل عبادت کرتا ہو تو وہ اور بڑا متقی ہے اور کثرت سے نماز پڑھتا ہو، نماز ہی میں اسکا دل لگتا ہو، جب دیکھو نماز پڑھ رہا ہے تو اور بڑا متقی ہے اور ذرا ذرا سی چیز میں شبہ سے بچتا ہو، متقی ہے، لیکن عربی میں جہاں سے یہ لفظ آیا ہے، تقویٰ کے معنی زیادہ عبادت گزار

(۷) افادات ص ۵۳۹ (۸) ایضاً ص ۱۷۱، ۱۷۲ (۹) ایضاً ص ۵۰۶۔۵۰۷ (۱۰) ایضاً ص ۲۵۹۔۲۶۰ (۱۱) ایضاً ص ۱۲۲

ور زیادہ شب بیدار کے نہیں ہیں۔ عربی زبان
یں تقویٰ ایک مستقل صفت کا نام ہے،
تقویٰ عبادت کا نام نہیں، تقویٰ خوف کا نام
ہے، تقویٰ تلاوت یا تسبیح کا نام نہیں، تقویٰ
یک مستقل صفت ہے تقویٰ ایک مزاج
ہے، تقویٰ ایک ملکہ ہے، تقویٰ ایک طبیعت
ہے"(۱۱)

سورہ آلِ عمران کی آخری آیت ہے:
یاایھا الذین آمنوا اصبروا(۲۰۰) مولانا
'صبر" کی تشریح میں فرماتے ہیں:

"جب کوئی لفظ کسی زبان میں جاتا ہے اور
سافر طے کر کے کسی زمانہ میں پہنچتا ہے تو
س کے معنی میں کچھ فرق آجاتا ہے، یا معنی
حدود ہو جاتے ہیں، "صبر" بھی انہی لفظوں
ین سے ہے، صبر کے معنی یہ ہو گئے کہ اگر
وئی صدمہ پڑ جائے، کوئی حادثہ پیش آجائے
وئی نا انصافی ہو، کوئی تکلیف ہو تو زیادہ رو
دھو نہیں، زیادہ شکایت نہ کرو، لیکن عربی
یں "صبر" کے معنی اس سے بہت وسیع ہیں،
صبر کے معنی ہیں جم جانا، پختہ رہنا اور مقابلہ
رنا اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنا، اپنے اصولوں کو نہ
چھوڑنا"(۱۲)

الفاظ کا ترجمہ: ایک زبان سے
دوسری زبان میں ترجمہ دشوار کام ہے، خاص
طور سے جب معاملہ قرآن کا ہو تو اس کی
نزاکت دوچند ہو جاتی ہے، مولانا قرآن کے
معاملے میں بہت حساس اور محتاط تھے،
مفردات قرآنی کے سلسلے میں وہ جابجا اظہار
خیال کرتے ہیں کہ اس لفظ کا صحیح ترجمہ کسی
زبان میں نہیں ہو سکتا، ساتھ ہی وہ مفہوم ادا
کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آیت: جعل
اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیاما للناس
(مائدہ ۹۷) کی تشریح میں فرماتے ہیں:

"میں اسکے باوجود کہ عربی اردو دونوں
سے واقف ہوں اور دونوں کا ذوق رکھتا ہوں
اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ قیاما للناس کا
صحیح ترجمہ نہیں کر سکتا، میں نے جو اردو کے
تراجم دیکھے ہیں میں اس سے بھی مطمئن نہیں
ہوں کہ قیاما کا اردو میں صحیح ترجمہ ہوا ہے لیکن
میں اسکا مفہوم ادا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے
کعبہ کو لوگوں کی زندگی کا دار و مدار بنایا
ہے"(۱۳)

سورہ نساء کی آیت ہے: لا خیر فی
کثیر من نجواھم الا من امر بصدقۃ او
معروف (۱۱۴)

مولانا فرماتے ہیں:

"معروف بھی قرآن مجید کا ایک ایسا لفظ
ہے کہ اس کا ترجمہ نہیں ہو سکتا، یعنی معقول
و مستحسن بات، جو چیز عرف میں داخل ہے
اور جس کو فطرت سلیم رکھنے والے سب
بالاتفاق اچھا کہتے ہیں"(۱۴)

اصحاب کہف کے بارے میں قرآن
کہتا ہے: انھم فتیۃ آمنوا بربھم وزدنا ھم
ھدیٰ (کہف، ۱۳) مولانا لفظ "فتیۃ" کی یہ
تشریح کرتے ہیں:

"فتیہ" کے لفظ میں عمر کی جوانی کے
ساتھ دل و دماغ اور حوصلوں اور عزم و ارادہ
کی جوانی کی طرف بھی اشارہ آگیا ہے، اسلئے کہ
ترجمہ میں میں نے جواں مرد کا لفظ اختیار کیا،
فتیہ فتی کی جمع ہے، فتی کی جمع فتیان بھی آتی ہے
لیکن فتیہ جمع قلت کے لئے استعمال ہوتا ہے،
اس طرح قرآن اشارہ دیتا ہے کہ وہ گنتی کے
چند نوجوان تھے"(۱۵)

حضرت صالح علیہ السلام نے جب اپنی
قوم کے سامنے دعوت حق پیش کی تو اسنے
کہا: یا صالح قد کنت فینا مرجوا قبل
ھذا۔ (ھود ۶۲) مولاناؒ اس کا ترجمہ یہ
کرتے ہیں" تم تو ہماری امیدوں کا مرکز
تھے"۔

پھر فرماتے ہیں:

"مرجو کا تقریبا وہی مفہوم ہے جو
انگریزی میں لفظ Promissing کا ہے جو کسی
ایسے ہونہار طالب علم یا نوجوان کے لئے بولا
جاتا ہے، جس کا مستقبل درخشاں نظر آتا
ہے"(۱۶)

بعض مقامات پر مولانا نے الفاظ قرآن
کے متبادل کے طور پر جو الفاظ استعمال کئے

(۱۲) افادات: ص۔ ۱۲۲ (۱۳) ایضاص ۴۲۷۔۴۲۸ (۱۴) ایضاص ۲۳۷ (۱۵) ایضاص ۱۰۱ (۱۶) ایضاص ۱۰۶

ہیں انہیں ترجمہ تو نہیں کہا جاسکتا ہے البتہ مفہوم کی وضاحت اور اس کی صحیح تصویر کشی کی قابل قدر کوشش ضرور قرار دی جاسکتی ہے، اسے ترجمہ کے بجائے ترجمانی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

سورۂ مائدہ میں ہے: یا ایھا الذین آمنوا کونوا قوامین للہ شھداء بالقسط (۸) "قوامین للہ" کے بعض ترجمے ملاحظہ ہو:

"کھڑے ہو جایا کرو اللہ کے واسطے" (شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ)

"اللہ تعالیٰ کے لئے پوری پابندی کرنے والے (مولانا اشرف علی تھانویؒ)

"خدا (کی سچائی) کے لئے مضبوطی سے قائم رہنے والے" (مولانا ابوالکلام آزادؒ)

"اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے (مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

عدل کیلئے علمبردار بنو اللہ کیلئے (مولانا امین احسن اصلاحی)

"مولانا علی میاںؒ" قوامین اللہ کا ترجمہ خدائی فوج دار کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

"ہماری زبان اور محاورہ میں "خدائی فوج دار" ایک طنز کا لفظ ہے کہ آپ خدائی فوجدار ہیں لیکن "قوامین" سے خدائی فوج دار ہی کی شان ظاہر ہوتی ہے، اگر "قائمین للہ" ہوتا تو شاید یہ بات نہ پیدا ہوتی، کوئی پوچھے نہ پوچھے کوئی بلائے نہ بلائے کوئی کہے نہ کہے آپ اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔ آپ ہر جگہ پہونچ رہے ہیں"۔ (۱۷)

سورہ نمل میں اللہ تعالیٰ مشرکین کے بارے میں فرماتا ہے: بل ادّٰرک علمھم فی الآخرۃ، بل ھم فی شک منھا بل ھم منھا عمون (۶۶) ادّٰراک اصل میں تدارک ہے جو ادغام سے ادّٰراک ہوگیا ہے، تدارک القوم کے معنی ہیں لوگوں کا ایکدوسرے سے مل جانا، یہیں سے اس میں اختلاط اور گڈمڈ ہونے کا مفہوم پیدا ہوگیا۔ چند مترجمین قرآن کے ترجمے ملاحظہ ہوں:

بلکہ تھک کر گر گیا ان کا فکر آخرت کے بارے میں (مولانا محمود حسنؒ)

بلکہ آخرت کے بارے میں ان کا علم نیست ہوگیا (مولانا تھانویؒ)

بلکہ آخرت کا تو علم ہی ان لوگوں سے گم ہوگیا ہے (مولانا مودودیؒ)

بلکہ آخرت کے بارے میں ان کا علم الجھا ہوا ہے (مولانا اصلاحی)

اب مولانا علی میاں کا دلچسپ ترجمہ اور تشریح ملاحظہ کیجئے:

"قرآن کی بلاغت اور قرآن کے اعجاز سے معذرت کے ساتھ میں بل ادّٰراک علمھم فی الآخرۃ کا ترجمہ کرتا ہوں، کہ ان کا علم پنکچر ہوگیا ہے آخرت کے بارے میں اور مجھے مغرب کی صورت حال اور اس کے علمی واختراعاتی سفر کی اس سے بہتر تشبیہ نظر نہیں آتی کہ جیسے کوئی کار چل رہی ہو اور اچانک اس میں کوئی نقص پیدا ہو جائے کہ اس کی تمام توانائیاں ختم ہو جائیں، اس کے پہلے پنکچر سے بہتر کوئی لفظ نہیں، ذرا دیکھئے اور غور کیجئے کہ وہ علم خاصا چل رہا تھا، اطمینان سے سفر طے کر کے آیا تھا جس نے عقلیات پر طبعیات پر، ریاضیات پر اور مابعد الطبعیات تک میں اپنی فکر کی جولانی اور ذہن کی تابانی دکھائی، وہی علم جب واجب الوجود کی ذات وصفات تک پہونچا اور آخرت یعنی اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کے مرحلہ تک پہونچا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اچانک پہیہ سے ہوا نکل گئی" (۱۸)

الفاظ کا صوتی آہنگ: مولانا مفردات قرآنی کی تشریح کرتے ہوئے ان کے صوتی آہنگ کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں، وہ واضح کرتے ہیں کہ الفاظ قرآن کے حروف ہی سے نہیں بلکہ ان سے نکلنے والی آواز سے بھی اس کا جلال نمایاں ہوتا ہے، فرماتے ہیں:

"لسانیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جیسے اشیاء اور خارجی موجودات کا درجہ حرارت Temperature ہوتا ہے ویسے ہی الفاظ کا

(۱۷) افادات ص، ۳۶۵ (۱۸) ایضاً ص ۴۴۶۔۴۴۷ (۱۹) افادات ص، ۱۷۲

بھی ایک ٹمپریچر ہوتا ہے اور جیسے اجسام کا ایک سائز ہوتا ہے الفاظ کا بھی ایک سائز ہوتا ہے۔(۱۹)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"کہیں صوتی طور پر بھی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ جلال اور جو تاثر ہے وہ ظاہر کرے یعنی حرفی بناوٹ کافی نہیں ہوتی بلکہ صوت کی بھی اس میں ضرورت ہوتی ہے"(۲۰)

مثال کے طور پر سورۂ اعراف میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے ساتھ کچھ ایسے لوگوں کے پاس سے گزرے جو اپنے بتوں کے سامنے جھکے ہوئے تھے، بنی اسرائیل نے بے اختیار کہا کہ ہمارے لئے بھی کوئی ایسا معبود تجویز کر دیجئے جو آنکھوں سے نظر آتا ہو جیسے معبود انکے پاس ہیں حضرت موسیٰؑ نے انکی سخت سرزنش کرتے ہوئے فرمایا: انکم قوم تجھلون ان ھؤلاء متبر ماھم فیه (آیت ۱۳۹)اس کی تشریح میں مولانا فرماتے ہیں:

"یہاں متبر" کا جو لفظ ہے کوئی دوسرا لفظ اسکی جگہ نہیں لے سکتا، اس میں جو تشدید ہے اور اسمیں جو زور پیدا ہوا ہے وہ ان ھو لاء ھالك، ان ھو لاء فاسد، ان ھؤلاء فان، میں نہیں ہو سکتا، غصہ سا معلوم ہو رہا ہے، ان ھؤلاء متبر"، ارے اس پر جھاڑو پھرنے والی ہے جھاڑو کا لفظ ہم قصداً لائے کہ اس میں بھی ثقیل حروف ہیں اور کسی حد تک وہ صوتی طور پر بھی (ہم آہنگ ہے)(۲۱)

مولانا علی میاںؒ کے تفسیری انداز اور خاص طور پر مفردات قرآنی کی تحقیق کے یہ چند نمونے ہیں جن سے مولانا کی قرآن فہمی پر روشنی پڑتی ہے اور آپ کی امتیازی خصوصیت نمایاں ہوتی ہے، اگرچہ مولانا نے کوئی تفسیر نہیں لکھی لیکن آپ کی تصانیف میں اس موضوع پر جو قابل قدر مواد بکھیر ہوا ہے اس سے بخوبی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

شعور و تربیت

عالم اسلام کی سب سے بڑی ضرورت

عالم اسلام کی ایک بہت بڑی ضرورت اور اس کی ایک بڑی خدمت یہ ہے کہ اُمت کے مختلف طبقات اور عوام میں صحیح شعور پیدا کیا جائے اور جمہور کی عقلی...... اور سیاسی تربیت کی جائے، یاد رہے کہ تعلیم کی اشاعت اور تعلیم یافتہ اشخاص کی کثرت سے یہ لازم نہیں آتا کہ قوم میں شعور بھی موجود ہے، اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ تعلیم کے عموم اور علوم کی اشاعت سے شعور کے بیدار کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے لیکن شعور پیدا کرنے کے لئے بہر حال مستقل جدوجہد کی ضرورت ہے۔ مسلمان رہنماؤں اور مسلمانوں میں اصلاحی کام کرنے والوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ جس قوم میں شعور کی کمی ہے وہ قوم اعتماد کے لائق نہیں، خواہ اس کو اپنے قائدین پر کتنا ہی اعتماد ہو اور وہ ان کی پیروی اور اطاعت میں کیسی ہی چستی اور سرگرمی دکھائے اور ان کی دعوت پر کتنی ہی عظیم قربانیاں پیش کرے، اس لئے کہ جب تک اس کا شعور تیار نہیں اور وہ بالغ نظر اور پختہ خیال نہیں ہوئی ہر آن اس کا خطرہ ہے کہ وہ کسی دوسری دعوت اور تحریک کا آلۂ کار بن جائے گی اور آن میں سالہا سال کی محنت پر پانی پھر جائے گا، جس قوم کا شعور بیدار نہیں ہوا اور جس میں خود سوچنے اور اچھا بُرا سمجھنے کی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی اُس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پر میدان میں پڑا ہو اور مختلف سمت کی ہوائیں اس کو اِدھر سے اُدھر اُڑاتی پھرتی ہوں۔

——— حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

مولانا علی میاں اور علم حدیث

مولانا ابو سحبان رُوح القدس ندوی

مولانا علی میاں کے خانوادہ کی علمی خصوصیات میں حدیث شریف سے شغف اور مدرسہ ولی اللّٰہی سے وابستگی ہے، صاحب "نزھۃ الخواطر" کے بیان کے مطابق سید ابو سعید بن محمد ضیاء بن آیۃ اللہ بن علم اللہ الحسنی (ت ۱۱۹۳ھ) نے شاہ ولی اللہ سے اکتساب فیض کیا، شاہ صاحب کی وفات کے بعد محمد عاشق بن عبداللہ البھلتی (ت ۱۱۸۷ھ) کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے، مدینہ طیبہ میں ابوالحسن السندی (ت ۱۱۸۷ھ) سے امام بغوی کی "المصابیح" کا درس لیا۔(۱)

تیرھویں صدی ہجری کے نابغۂ روزگار میں سید قطب الھدیٰ بن محمد واضح (ت ۱۲۲۶ھ) نے شاہ عبدالعزیز سے فقہ وحدیث کا علم حاصل کیا، اور ان کے ذخیرۂ کتب سے اہم کتابیں نقل کیں، صحیح بخاری اور جامع ترمذی پر ان کے حواشی ہیں۔(۲)

اس عصر کے فضلاء میں اسحاق بن محمد عرفان (ت ۱۲۳۴ھ) شاہ عبدالقادر کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوئے، اور شاہ عبدالعزیز سے سند حدیث لی۔(۳)

اس عہد کے علماء میں ایک اور فاضل مولانا علی میاں کے پردادا سید عبدالعلی بن علی محمد النصیر آبادی (ت ۱۲۶۹ھ) نے محمد علی رامپوری المحدث (ت ۱۲۵۸ھ) سے حدیث پڑھی۔(۴)

چودھویں صدی کے مشاہیر میں مولانا علی میاں کے دادا "مہر جہانتاب" کے مؤلف علامہ سید فخرالدین بن عبدالعلی (ت ۱۳۲۶ھ) مولانا محمد نعیم بن عبدالحکیم الانصاری (ت ۱۳۱۸ھ) کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے، اور "مشکاۃ المصابیح"، تفسیر جلالین ان سے پڑھی، سید خواجہ احمد بن محمد یٰسین النصیر آبادی (ت ۱۲۸۹ھ) نے اپنی تمام مرویات ومقروءات کی سند دی، شاہ یعقوب بن محمد افضل دہلوی (ت ۱۲۸۲ھ) نواسۂ شاہ عبدالعزیز اور مولانا سخاوت علی جونپوری (ت ۱۲۷۴ھ) نے انہیں اجازت حدیث عطا فرمائی۔(۵)

مولانا علی میاں کے والد علامہ سید عبدالحی بن فخرالدین حسنی (ت ۱۳۴۱ھ) نے حدیث کی بیشتر کتابیں شیخ حسین بن محسن الانصاری الیمانی (ت ۱۳۲۷ھ) سے پڑھیں، علاوہ ازیں مولانا عبدالحی کو مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی (ت ۱۳۱۳ھ) قاضی محمد بن عبدالعزیز مچھلی شہری (ت ۱۳۲۰ھ) میاں سید نذیر حسین (ت ۱۳۲۰ھ) مولانا رشید احمد گنگوھی (ت ۱۳۲۳ھ) قاری عبدالرحمٰن پانی پتی (ت ۱۳۱۴ھ) مولانا محمد نعیم بن عبدالحکیم الانصاری (ت ۱۳۱۸ھ) سے اجازت حاصل ہے۔(۶)

سید قطب الھدیٰ کے "ترمذی" کے قلمی نسخہ پر مولانا عبدالحی کے قیمتی حواشی ہیں، نیز "تلخیص الأخبار" المعروف بہ "تھذیب الأخلاق" مولانا کا انتخاب کردہ احادیث کا مجموعہ ہے، ابواب عبادات میں خاص طور پر مولانا نے حسن انتخاب، سلامتی

فکر،اور وسعت قلبی کا ثبوت دیا ہے، انداز انتخاب خالص محدثانہ و مجتہدانہ اختیار کیا ہے، جس میں شیخ حسین یمانی کے درس کا عکس جلوہ گر ہے،" منتھی الأفکار " کے نام سے دو کاپی میں اس کی شرح بھی فرمائی ہے۔

مولانا علی میاں کے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی (ت ۱۳۸۰ھ) نے مولانا انور شاہ کشمیری (ت ۱۳۵۲ھ) اور مولانا محمود حسن دیوبندی (ت ۱۳۳۹ھ) سے کتب صحاح و سنن پڑھی، اور شیخ حسین یمانی سے لکھنؤ میں "کتاب الأولیات" للشیخ سعد سنبل پڑھی، اور ان سے سند حدیث بھی لی۔(۷)

مولانا علی میاں کی بہن امۃ اللہ تسنیم (ت ۱۳۹۶ھ) نے امام نووی کی شہرہ آفاق کتاب "ریاض الصالحین" کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا، جو "زادِ سفر" کے نام سے مشہور و متداول ہے، اور علامہ سید سلیمان ندوی کے مقدمہ اور مولانا محمد منظور نعمانی کے تعارف سے آراستہ ہے۔

اس خانوادہ کے گوہر نایاب مولانا سید ابوالخیر برق حسنی (ت ۱۳۹۰ھ)۔۔ مولانا علی میاں کے ماموں زاد بھائی۔۔ کو حفظ حدیث سے بڑا شغف تھا، صحیح مسلم اور موطا کی ہزاروں حدیثیں مع سند انھیں یاد تھیں، شرح و تطبیق احادیث سے بھی ذوق رکھتے تھے، "مشکلات الحدیث" کے نام سے انھوں نے ایک کتاب لکھی تھی، وہ حدیث میں مولانا عبدالرحمان بن محمد یعقوب بستوی کے شاگرد ہیں، اور ان کے اثر سے مسلک اہل حدیث اختیار کر لیا تھا۔(۸)

اس سلسلۃ الذھب کی آخری کڑی سادات حسنی اور خانوادۂ شاہ علم اللہ کے وارث وامین مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (۱۳۳۳۔۱۴۲۰ھ) کی ذات گرامی ہے۔

مولانا اپنے مطالعۂ حدیث کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

" میں جب اپنے استاد شیخ خلیل عرب سے ادب کی کتابیں پڑھتا تھا اس وقت انہوں نے ادب کے نصاب کے علاوہ دو اور سبق شروع کرا رکھے تھے، ایک قرآن مجید کی چند سورتیں جن میں سورہ زمر خاص اہمیت رکھتی تھی، دوسرے مسلم کی کتاب الجہاد، یہ میرا حدیث سے پہلا تعارف ہے۔"(۱۰)

مولانا کی کتب حدیث سے واقفیت اور مطالعہ کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے لکھتے ہیں:

"اپنے گاؤں میں اصلاح و وعظ کے سلسلہ میں حافظ منذری کی "کتاب الترغیب والترھیب" کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت پیش آئی، اس کو بار بار پڑھ کر سنایا، اسی زمانہ میں محمد بن نصر المروزی کی کتاب "قیام اللیل" دیکھنے کا اتفاق ہوا"۔(۱۱)

"اسی زمانہ میں اپنے ضلع کے مشہور مردم خیز قصبہ سلون جانا ہوا جہاں شاہ حلیم عطا صاحب کا کتب خانہ دیکھنے کا موقع ملا، اس کتب خانہ سے بعض علماء و محدثین کی تصنیفات کا شوق پیدا ہوا، جس میں علامہ ابن جوزی اور حافظ ابن رجب حنبلی خاص طور پر قابل ذکر ہیں"۔(۱۲)

مولانا کی حدیث کی تعلیم کا باقاعدہ سلسلہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں شروع ہوا، فرماتے ہیں:

"میری مکرر خوش قسمتی تھی کہ حدیث میں مولانا حیدر حسن خاں صاحب جیسا متبحر استاد نصیب ہوا، جو مولانا غلام احمد صاحب لاہوری، مولانا لطف اللہ صاحب کوپلی، مولانا احمد حسن صاحب کانپوری اور شیخ الاسلام شیخ حسین یمنی کے شاگرد اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے مجاز تھے"۔(۱۳)

"اور حدیث براہ راست میاں نذیر حسین سے پڑھی تھی"۔(۱۴)

مولانا علی میاں نے ایک ایک فن کی تعلیم علیحدہ علیحدہ حاصل کی، فرماتے ہیں:

"یہ بھی خوش قسمتی تھی کہ حدیث کی تعلیم شروع ہوئی تو کوئی دوسرا فن اور موضوع مزاحم نہ تھا صرف حدیث کے اسباق تھے" (۱۵)"میرا قیام اکثر مولانا کے ساتھ رہتا اور میں ان کے کتب خانہ کا مہتمم اور ان کے مسودات کا ناقل اور مرتب بھی تھا، اور ان کے حکم سے رجال کی کتابوں سے مواد بھی فراہم کرتا، اس سے مجھے بڑا علمی فائدہ پہونچا، اور مجھے علمی ترقی کا میدان ہاتھ آگیا"

(۱۶) "میں نے مولانا سے دارالعلوم میں صحیحین (بخاری و مسلم) اور ابوداؤد، ترمذی حرفاً حرفاً پڑھی، میری حدیث کی تعلیم سرتاپا ان کی شفقت اور مہارت فن کی رہین منت ہے"۔(۱۷)

مولانا علی میاں کے علم حدیث میں استفادہ کے سلسلہ میں ان کے قیام دیوبند اور مولانا حسین احمد مدنی کے حلقۂ درس میں شرکت کا تذکرہ اگر نہ کیا جائے تو علمی امانت کا حق ادا نہ ہوگا، بلکہ یہاں تو اس کا ذکر کرنا یوں بھی ضروری ہوگیا کہ مولانا حسین احمد اور مولانا حیدر حسن دونوں کے طریقۂ درس کا کیا انداز تھا؟ اور مولانا علی میاں نے ان میں سے کس کا اثر قبول کیا؟ اور ان کے نزدیک کس کا طریقۂ درس مفید اور ترقی یافتہ ہے؟

مولانا مدنی کے طریقۂ درس کا حال خود مولانا علی میاں کے بیان کے مطابق:

"ایک مسئلہ پر بعض اوقات تین تین چار چار دن مسلسل (۶۰ منٹ کے تعلیمی گھنٹہ میں) تقریر جاری رہتی، اور مسئلہ کا مالہ وماعلیہ ائمہ کے اختلاف و مذاہب، اور ان کے دلائل و مآخذ، متن واسناد و رجال کی بحثیں برجستہ، اس سب پر مولانا کا مخصوص دلکش لہجہ اور داد الحدیث کی روحانی و پرسکینت فضا ابھی تک آنکھوں میں ہے، اور گویا اس وقت بھی بالسند المتصل إلی أمیر المؤمنین فی الحدیث ..... کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے، درمیان میں طلبہ کے سوالات کا (جن میں غیر متعلق بھی ہوتے) تحمل کیساتھ جواب دیتے، آخر سال میں درس کی مصروفیت اتنی بڑھ جاتی کہ عصر کے بعد بھی درس، عشاء کے بعد بھی دیر رات تک درس، صبح کی نماز کے بعد بھی درس، اچھے اچھے مستعد طالب علموں کی ہمت جواب دے جاتی، لیکن مولانا کی مستعدی، نشاط اور قوت میں فرق نہ آتا"۔(۲۹)

مطالعۂ حدیث مولانا علی میاں کا پسندیدہ موضوع و مشغلہ رہا ہے، ایک عرصہ تک دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ابواب بخاری (کتاب الایمان، کتاب العلم) کا درس دینے کا معمول رہا ہے، ادھر چند سالوں سے عالمیت کے طلبہ کو ترمذی اور فضیلت کے طلبہ کو صحاح ستہ بشمول موطا امام مالک اور مسند احمد کی سند عطا فرماتے، نیز حجاز و شام اور ہندوستان کے متعدد علماء و مشائخ کو اجازت حدیث عنایت فرمائی۔

مولانا کی سند حدیث کا ذکر آگیا ہے تو یہ عرض کرتا چلوں کہ مولانا کو سند حدیث دو جلیل القدر محدث سے حاصل ہے ان میں ایک مولانا حیدر حسن خاں (ت ۱۳۶۱ھ) اور دوسرے صاحب "تحفة الأحوذی" مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری (ت ۱۳۵۳ھ) اور ان دونوں کی سند حدیث شیخ حسین بن محسن یمانی کے طریق سے علامہ شوکانی صاحب "نیل الأوطار"، اور شیخ الاسلام عبدالرحمٰن بن سلیمان الاحدل کے واسطہ سے علمائے حرمین تک پہونچتی ہے، اور میاں سید نذیر حسین بہاری ثم دہلوی (ت ۱۳۲۰ھ) کے طریق سے مولانا ٹونکی اور مولانا مبارکپوری کی سند شاہ ولی اللہ عن ابی طاہر محمد بن ابراہیم الکردی ائمہ حرمین سے مل جاتی ہے، اس طرح مولانا علی میاں یمنی اور حجازی دونوں طرز تحدیث کے تلمیذ و خریج ہیں۔(۳۰)

یہاں یہ بھی واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ گو مولانا علی میاں نے مولانا حسین احمد کے درس بخاری و ترمذی میں چار ماہ ضرور شرکت کی، لیکن ان سے اجازت حدیث کا ثبوت مولانا علی میاں کی کسی تحریر وبیان اور ان کی سند حدیث میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔

مولانا موصوف نے اپنے تین قیمتی رسالہ میں حدیث کے موضوع پر مختلف زاویہ نگاہ سے روشنی ڈالی ہے، وہ تینوں رسالے جو کہ عربی میں ہیں، حسب ذیل ہیں: (۱) المدخل إلی دراسات الحدیث النبوی الشریف (۲) دور الحدیث فی تکوین المجتمع الإسلامی (۳) محمد بن إسمعیل البخاری وکتابه الجامع الصحیح۔

اول الذکر رسالہ میں حدیث سے متعلق نہایت قیمتی اور اچھوتی بحث ہے، ساتھ ہی صحاح ستہ کی خصوصیات، اصول حدیث، فن جرح و تعدیل، اسماء الرجال،

تدوین حدیث جیسے موضوعات پر ایک نیا زاویہ فکر پیش کیا ہے، طالبان علوم حدیث کے لئے یہ رسالہ بہت مفید ہے۔

ثانی الذکر رسالہ جو خود صاحب مضمون کے بیان کے مطابق: "اس مقالہ میں ایک نئے زاویہ نگاہ اور ایک نئے اسلوب سے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ حدیث مسلمانوں کی زندگی میں کیا مقام رکھتی ہے؟ امت کو سنت کی کس قدر ضرورت ہے؟ اور اس امت کے سنت مطہرہ سے رشتہ منقطع ہو جانے اور حدیث نبوی کے سرمایہ سے محروم ہو جانے میں امت کا کتنا بڑا خسارہ ہے؟ اور وجود اسلامی کے لئے کتنا بڑا خطرہ مضمر ہے؟ حدیث کے سند و حجت ہونے کے بارے میں شک و شبہ و بے اعتمادی پیدا کرنے کی عالم اسلام کے بعض گوشوں میں جو تحریک چل رہی ہے وہ اسلام کے خلاف کتنی گہری اور خطرناک سازش ہے؟ اور اسکے پیچھے کون سے مقاصد و محرکات سرگرم عمل ہیں"۔ (۴۴)

دراصل یہ رسالہ جس کا اردو ترجمہ "اسلامی مزاج و ماحول کی تشکیل و حفاظت میں حدیث کا بنیادی کردار" اور انگریزی ایڈیشن (Role of Hadith in the promotion of Islamic climate and attitudes) مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے، رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے توسیع خطبات کے موقع پر عالم اسلام کی اہم شخصیات کے سامنے پڑھا گیا، اور قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

آخر الذکر مولانا کا وہ مقالہ ہے جسے اکتوبر ۱۹۹۳ء میں سمرقند میں امام بخاری پر منعقد دو روزہ سمینار میں عالم اسلام کے مشاہیر اور فضلائے حدیث کی موجودگی میں پیش کیا گیا، جس میں امام بخاری اور ان کی کتاب "الجامع الصحیح" سے متعلق قیمتی نکات و مباحث آگئے ہیں۔

محدث جلیل مولانا محمد زکریا کاندھلوی (ت ۱۴۰۲ھ) کے حدیث شریف سے شغف کا تذکرہ اور ان کی شروح و تعلیقات پر مولانا علی میاں کا تبصرہ ہے:

"حدیث و علوم حدیث شیخ کا اصل ذوق، موضوع، اور محنت و تحقیق کا میدان تھا، اور اس کو وہ تقرب الی اللہ و تقرب الی الرسول کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتے تھے، اور اس کو انہوں نے اپنا شعار و دثار بنا لیا تھا، یہاں تک کہ "شیخ الحدیث" کا لقب ان کے نام کا قائم مقام اور اس سے زیادہ مشہور ہو گیا تھا"۔ (۴۲)

شیخ کے رسالہ "حجۃ الوداع" کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں:

"علمی، معنوی اور اپنے مواد و معلومات کے لحاظ سے "بقامت کہتر و بقیمت بہتر" کا مصداق ہے، اور اس کے اندر اس موضوع پر اتنا محدثانہ و محققانہ مواد آگیا ہے، جس کو دیکھ کر یہ خیال بھی نہیں گذر سکتا کہ یہ ایک دن ڈیڑھ رات میں پورا ہوا ہے، اس موقع پر عمرات نبوی کی بحث، ان کی تعداد اور تحدید کی تحقیق، اور ان سے فقہی احکام کا استخراج بھی فرمایا، اس طرح یہ رسالہ اس موضوع پر کافی وشافی بن گیا، اور اس کو اس موضوع پر ایک چھوٹا سا دائرۃ المعارف کہا جاسکتا ہے"۔ (۴۳)

شیخ کی مہتم بالشان کتاب "اوجز المسالک شرح موطأ الإمام مالك" کا تعارف کراتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:

"اوجز کے شروع میں نوے صفحے کا ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں فن حدیث کے تعارف و تاریخ اور تدوین حدیث پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، پھر کتاب اور صاحب کتاب امام مالک کا مفصل تعارف، اور ان دونوں کی خصوصیات و امتیازات کا مفصل تذکرہ ہے، نیز اس کے شروح اور عہد بعہد خدمات، اس کے ساتھ امت کے اعتناء کا ذکر ہے، پھر اپنے مشائخ اور سلسلہ ولی اللہی کے اسانید کی تفصیل، پھر اس سب کے بعد امام ابو حنیفہ کا تذکرہ اور ان کی محدثانہ حیثیت و درجہ، اور ان کے اصول و مسلک کا تذکرہ ہے، پھر متفرق فوائد و قواعد اور ہدایات و توجیہات ہیں"۔ (۴۴)

"لامع الدراری": جو اصلاً مولانا گنگوہی کی تقریرات بخاری اور مولانا محمد یحیی

کے حواشی کا مجموعہ ہے شیخ کے اضافے و حواشی سے شائع ہوئی ہے، مولانا علی میاں کی نگاہ میں:

"حدیث کے طالب علموں اور مدرسین کے لئے معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ بن گیا ہے، اس سے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جن کی قدر اہل درس ہی کر سکتے ہیں، کتاب کے شروع میں ایک سو باون صفحے کا فاضلانہ مقدمہ ہے، جس میں نہ صرف امام بخاری اور ان کی نادر روزگار "الجامع الصحیح" کے مختلف گوشوں، مباحث و مسائل پر مبسوط کلام ہے، اور اس میں وہ معلومات، فوائد و نکات جمع کر دیئے گئے ہیں، جو اصول و رجال اور تذکروں کے ہزاروں صفحات میں منتشر ہیں، بلکہ مراتب کتب حدیث، ابواب حدیث، تقلید و اجتہاد، اور احناف کے دفاع کے سلسلہ کی وہ تحقیقات بھی جمع کر دی گئی ہیں، جن سے یہ مقدمہ طالبین حدیث بالخصوص حنفی المسلک علماء کے لئے ایک اچھی بیاض بن گیا ہے"۔(۴۵)

اسی طرح شیخ کے رسالہ "الأبواب والتراجم للبخاری": کو مولانا علی میاں ان کے تحقیقی ذوق، اپنے مشائخ سے محبت اور ان کے علوم کی حفاظت کا نمونہ قرار دیتے ہوئے قمطراز ہیں

"یہ رسالہ شاہ ولی اللہ دہلوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمود حسن دیوبندی کے رسائل و تحقیقات کا مجموعہ ہونے کے علاوہ، ابواب و تراجم کے سلسلہ میں ان اصول و قواعد پر حاوی ہے، جو حافظ ابن حجر، قسطلانی، حافظ عینی کے شروح میں آئے ہیں، پھر ان میں ان اصول و قواعد کا اضافہ کیا ہے، جو ان کے ذوق و تحقیق اور طویل اشتغال و غور و تامل کا نتیجہ ہیں، اس طرح ان اصول و قواعد کلیہ کی تعداد ستر تک پہونچ گئی ہے، ہمارے علم میں اتنا احتواء کسی کتاب میں نہیں کیا گیا، جو لوگ جانتے ہیں کہ بخاری کے ابواب و تراجم میں کتنے لطائف و نکات اور دقائق شامل ہیں اور اساتذہ و مدرسین کو اس سلسلہ میں کیا ہفت خواں سر کرنا پڑتا ہے، وہ اس کتاب کی افادیت و اہمیت کو سمجھ سکتے ہیں"۔(۴۶)

شیخ کی ان چار کتابوں کا تعارف کرانے کے بعد مولانا علی میاں اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں:

"یہ چار کتابیں جو سب فن حدیث اور اس کے امہات کتب سے تعلق رکھتی ہیں شیخ کو اپنے عہد کا (کم از کم علوم حدیث میں) عظیم مصنف بنانے اور اس کے محققین میں شامل کرنے کے لئے کافی ہیں"۔(۴۷)

شیخ کی ان کتابوں پر مولانا علی میاں کا مبسوط مقدمہ ہے جس میں ان کتابوں کی خصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

محدث کبیر مولانا خلیل احمد سہارنپوری (ت ۱۳۴۶ھ) کی ابوداؤد کی شرح "بذل المجهود" پر مولانا علی میاں کا بڑا قیمتی مقدمہ ہے، جس میں مولانا نے ابوداؤد کی اہمیت اور خطابی (ت ۳۸۸ھ) کی "معالم السنن" سے لیکر "بذل المجهود" تک عہد بعہد اسکی شروح کا جائزہ لیا ہے، "بذل المجهود" کی خصوصیات اور اس کی تالیف کے اسباب و محرکات سے بھی بحث کی ہے، ابوداؤد پر کام کرنے والوں کے لئے کافی مواد جمع ہو گیا ہے۔

"الكوكب الدرى على جامع الترمذى": جو دراصل مولانا رشید احمد گنگوہی کی تقریر ترمذی کا مجموعہ ہے، جسے ان کے ایک لائق شاگرد مولانا محمد یحیی کاندھلوی (ت ۱۳۳۴ھ) نے قلمبند کیا ہے، مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے تحقیق و تعلیق کے بعد مولانا علی میاں کے مقدمہ کیساتھ ۱۹۷۵ء میں ندوہ پریس لکھنؤ سے ٹائپ پر چار جلدوں میں شائع کیا۔

مولانا علی میاں نے اپنے مقدمہ میں ابن صلاح، ابن اثیر، اور شاہ ولی اللہ کے حوالے سے ترمذی کی فنی اور تصنیفی خصوصیات پر بڑی فاضلانہ بحث کی ہے، جس میں مولانا نے کتب حدیث سے گہری واقفیت اور مراتب کتب پر دقت نظر کا ثبوت دیا ہے، ترمذی کے سلسلہ میں مولانا نے محدثین کے سرمایہ کا "كشف الظنون" اور مقدمہ "تحفة الأحوذى" کے استثناء کی طرف ریفر کرنے کے بعد گواس بارے میں علمائے احناف

کی تعلیقات وحواشی، افادات و تقریرات کی مختصر فہرست درج کی ہے، تاہم محدثین احناف کی ترمذی سے بے اعتنائی (باستثناء مولانا یوسف بنوری کی معارف السنن) کا گلہ کیا ہے، حیرت کی بات ہے کہ اس مقدمہ میں مولانا مبارکپوری کی شہرہ آفاق شرح ترمذی "تحفة الأحوذی" کا ذکر کیسے رہ گیا؟ جب کہ مولانا نے اپنی کتاب "المسلمون فی الهند" میں ہندوستانی شروح حدیث کے ضمن میں "تحفہ" کا ذکر کیا ہے (۴۸) اور "المدخل إلی دراسات الحدیث النبوی" میں "تحفہ" کی اہمیت اور زمانہ تدریس میں اس سے استفادہ کا اعتراف بھی ہے (۴۹) اسے الإنسان مرکب من النسیان اور قلمی فرد گذاشت پر محمول کیا جاسکتا ہے۔

"کوکب" پر مولانا محمد زکریا کی تحقیق و تعلیق کا ذکر کرتے ہوئے مولانا علی میاں تحریر فرماتے ہیں:

"اس طرح حضرت گنگوہی کی ترمذی کی تقریرات پر ان مزید فوائد کا اضافہ کیا جو دوسری شروح حدیث میں پائے جاتے تھے، اور کتاب پر مفید حواشی چڑھائے، جن میں بہت سی نادر علمی تحقیقات و تنقیحات آگئی ہیں، جو طویل عرصہ تک درس حدیث اور اشتغال بکتب الحدیث سے ان کے ذہن میں آئے"۔ (۵۰)

"معارف الحدیث": حدیث کے اردو لٹریچر میں مولانا محمد منظور نعمانی (ت ۱۴۱۷ھ) کا زبردست کارنامہ اور ان کا علمی و دینی شاہکار ہے، حصہ دوم مولانا علی میاں کے بیش بہا مقدمہ سے آراستہ ہے، مولانا نعمانی کے قلم سے اس مقدمہ کی اہمیت پڑھئے:

"اس دوسری جلد پر مقدمہ رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے، جس میں انہوں نے حدیث وسنت کی اہمیت پر ایک بالکل نئے انداز میں گفتگو کی ہے، اور اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ایک نئی راہ کھولی ہے، ان چند صفحات کے مطالعہ سے یہ یقین انشاء اللہ ضرور ہو جائیگا کہ حدیث کی محفوظیت کا انکار اور اس کے بارے میں بے اعتمادی پھیلانے کی کوشش اسلام کے ساتھ بدترین دشمنی ہے"۔ (۵۱)

مولانا علی میاں اپنے مقدمہ کے آغاز میں بعثت نبوی کے مقاصد: (۱) تلاوت (۲) تعلیم کتاب (۳) تعلیم حکمت (۴) تزکیۂ نفوس، کے تذکرہ کے بعد نئے معاشرہ، اور نئی امت کی تشکیل کے عناصر وارکان ان تین چیزوں کو قرار دیتے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

(۱) رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی، آپ کی زندگی، سیرت واخلاق (۲) قرآن مجید (۳) آپ کے ارشادات و ہدایات، مواعظ ونصائح اور تعلیم و تلقین۔

نیز معاشرت واخلاق کی تعمیر اور سیرت سازی میں حدیث کے بنیادی کردار پر حدیث ہی سے مثالیں پیش کرکے بڑی تفصیل سے روشنی ڈالنے کے بعد فرماتے ہیں

"حدیث زندگی کے مختلف شعبوں میں کیسی رہنمائی کرتی ہے؟ اور کیسا علم عطا کرتی ہے؟ اور انسانیت کے لئے کیسا بیش بہا خزانہ ہے؟"۔ (۵۲)

حدیث کی آفاقیت اور اس کے ذریعہ اس امت کی بقاء و ہدایت پر مولانا روشنی ڈالتے ہیں:

"قرآن مجید کے ساتھ عہد نبوی کی اس تصویر کا باقی رہنا اور نبوت کے کلام اور ماحول کا محفوظ رہنا، اسلام کا اعجاز اور اس کا ایسا امتیاز ہے جس میں کوئی مذہب اور کوئی امت اس کی شریک و سہیم نہیں، ایک ایسا مذہب جس کو قیامت تک باقی رہنا اور تمام آنے والی نسلوں کو عملی نمونہ اور عمل کے جذبات ومحرکات اور قلب ودماغ کی غذا فراہم کرتا ہے، ماحول کے بغیر نہیں رہ سکتا، یہ ماحول حدیث کے ذریعہ محفوظ ہے۔" (۵۳)

مولانا کی تحقیق کے مطابق شیخ عبدالحق (ت ۱۰۵۲ھ) نے سب سے پہلے "مشکاة المصابیح" کا فارسی میں ترجمہ وتشریح کی جو "اشعة اللمعات" کے نام سے شائع ہوا، پھر فارسی کا دور ختم ہو جانے کے بعد مولانا خرم علی بلہوری (ت ۱۲۰۷ھ) نے امام صغانی (ت ۶۵۰ھ) کی "مشارق الأنوار" کا ترجمہ مع تشریح اردو میں "تحفة الأخیار"

کے نام سے کیا، اس کے بعد نواب قطب الدین خاں (ت ۱۲۸۹ھ) نے "مشکاۃ" کا اردو ترجمہ ضروری تشریح کے ساتھ "مظاہر حق" کے نام سے کیا، اس دور کے ختم ہو جانے کے بعد اردو میں حدیث کے متعدد نئے مجموعے شائع ہوئے، جن میں مولانا ابراہیم آروی (ت ۱۳۱۹ھ) کا مجموعہ "طریق النجاۃ فی ترجمۃ الصحاح من المشکاۃ" خاص طور پر قابل ذکر ہے، پھر اردو میں حدیث کی خدمت کا کام اعلیٰ معیار اور وسیع پیمانہ پر مولانا بدر عالم میرٹھی (ت ۱۳۸۵ھ) کا ہے، جو "ترجمان السنۃ" کے نام سے مشہور و متداول ہے، اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی "معارف الحدیث" ہے۔

اس کی پانچویں جلد مشتمل بر "کتاب الأذکار والدعوات" بھی مولانا علی میاں کے وقیع مقدمہ سے آراستہ ہے، جس میں مولانا نے خاتم النبیین ﷺ کی نبوت کے اعجاز اور کارنامے کو دو شعبوں میں تقسیم کیا ہے: (۱) عبد و معبود کے رشتہ کی تصحیح و تنظیم (۲) عبد و معبود کے رشتہ کا استحکام و دوام۔

اور ان دونوں شعبوں کی مولانا نے بڑی دلنشین و ایمان افروز تشریح فرمائی ہے، انداز بیان اچھوتا اختیار کیا ہے، جس سے علوم نبوت اور اس کے اسرار و حکم پر ان کا احتواء، اور اس کی ترجمانی و تشریح پر قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

پھر مولانا نعمانی کے دعاء سے شغف کا اعتراف کرتے ہوئے اس کتاب کے محاسن ان الفاظ میں اجاگر فرماتے ہیں:

"اس کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ کی تحقیقات کو قول فیصل کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، اور اکثر مقامات پر ان سے استفادہ کیا گیا، شاہ صاحب کے ماسوا، انھوں نے حافظ ابن قیم، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن حجر، بالخصوص ان کی بے نظیر کتاب "فتح الباری" سے پورا استفادہ کیا، اس طرح یہ کتاب ان لوگوں کو جن کا مطالعہ اردو تک محدود ہے، ائمہ سلف اور محققین امت کے نتائج تحقیق سے متعارف کراتی ہے، اور اس نسل اور علمائے متقدمین کے درمیان علمی رابطہ کا کام دیتی ہے"۔ (۵۷)

"محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے": تالیف ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری، پر مولانا علی میاں کے مقدمہ میں "مستشرقین اور علم حدیث" کے موضوع پر بڑی اہم اور کام کی باتیں آگئی ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ استشراق کی تاریخ اور مستشرقین کی چابک دستی پر مولانا کی گہری نظر ہے، اس سلسلہ میں آپ مولانا ہی کے قلم سے پڑھئے:

"یورپ کے مستشرقین اور ان کے مشرقی تلامذہ و مقلدین کی ذہانت اور حسن انتخاب کی داد نہ دینا ظلم ہے کہ انھوں نے عالم اسلام میں ذہنی انتشار، تعلیم یافتہ مسلمانوں میں بے عملی، تعطل، اخلاقی انارکی اور شک و ارتیاب پیدا کرنے کے لئے حدیث و سنت کا انتخاب کیا، اور اسکی حجیت، حفاظت، تاریخیت پر ایک منظم حملہ کیا، اور اس پورے شعبہ اور جدید اصطلاح کے مطابق پورے ادارہ (Institution) کو علمی و تاریخی حیثیت سے نہایت مشکوک و مشتبہ اور کمزور و بے بنیاد عمارت کی حیثیت سے پیش کیا۔" (۵۸)

پھر اساتذۂ حدیث کی مستشرقین کے حدیث کے بارے میں اعتراضات، شبہات سے بے خبری کا مولانا شکوہ کرتے ہیں، اور عالم عربی اور برصغیر ہند و پاک میں علماء کے طبقے میں جو بیداری کی لہر آئی ہے اس کا تذکرہ فرماتے ہیں:

"ہمارے قدیم اساتذہ و مدرسین حدیث کو ان مستشرقانہ اعتراضات و تشکیکات کی بہت کم خبر ہے، ان کی زیادہ تر توجہ حدیث سے اپنے مذہب کے اثبات اور فنی تحقیقات پر مرکوز رہتی ہے، لیکن اب خدا کے فضل سے مصر و شام اور ہندوستان و پاکستان میں ان مستشرقین کی علمی تلبیسات کا جائزہ لینے کا کام، محدثین کے کارناموں کو علمی و تحقیقی انداز میں پیش کرنے کا سلسلہ

شروع ہو گیا ہے۔"(۶۰)

اس زریں سلسلہ تصنیف میں مولانا نے دو کتابوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے ان میں ایک شام کے مشہور عالم ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کی "السنة ومكانتها فى التشريع الإسلامى"، اور دوسری تصنیف مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی "تدوین حدیث"، اس سلسلہ بحث کو مولانا جاری رکھتے ہوئے مقدمہ "لامع الدراری" اور مقدمہ "تحفة الأحوذی" کے اندر حجیت حدیث اور اس پر جدید اعتراضات اور ان کے تشفی بخش جوابات اور قیمتی مواد جمع ہو جانے کی طرف اشارہ فرماتے ہیں، اور ڈاکٹر تقی الدین کے کام کی قدردانی کیساتھ اپنے مقدمہ کو اختتام کی منزل تک پہونچا دیتے ہیں۔

مذکورہ بالا کتب حدیث کے علاوہ اور بھی حدیث کی متعدد کتابیں مولانا علی میاں کے مقدمہ سے آراستہ ہیں، گو ان میں مولانا کے قلم کی جولانی، مواد کی فراہمی اور جس موضوع سے ان مقدموں کا تعلق ہے اس کے مالہ وماعلیہ کے احاطے اور تحلیل و تجزیہ کی کمی دکھائی دیتی ہے، تاہم اس احساس کے باوجود ان مقدموں میں کچھ نہ کچھ کام کی باتیں آگئی ہیں جو یکسر فائدہ سے خالی نہیں، مثلاً :

"روائع الأعلاق شرح تهذيب الأخلاق" تالیف ابو سحبان روح القدس ندوی: جو فی الواقع استاد گرامی علامہ ابو محفوظ الکریم معصومی کی نگرانی و رہنمائی کی رہین منت ہے، مولانا علی میاں نے اپنے حوصلہ افزا مقدمہ میں مسلم کی مرفوع حدیث "إن من أبرالبر صلة الرجل أهل ود أبيه بعد أن يولّى" (لڑکے کا باپ کیساتھ حسن سلوک ووفاداری کا بہترین درجہ یہ ہے کہ اپنے والد کے انتقال کے بعد ان کے دوستوں اور اہل محبت کے ساتھ سلوک کرے) سے یہ نکتہ پیدا کیا کہ لڑکے کا اپنے والد کے انتقال کے بعد ان کے دوستوں کیساتھ حسن سلوک والد کیساتھ سلوک کے مرادف ہے تو لڑکے کا والد کے علمی آثار اور ان کے میدان عمل سے تعلق و وابستگی والد کے ساتھ سلوک میں بدرجہ اولیٰ شامل ہے۔

"الروائع والبدائع فى البيان النبوى" تالیف محمد نعمان الدین ندوی : کے مقدمہ میں مولانا نے علمائے معانی وبیان کی حدیث کے "جمالِ ادبی" سے بے اعتنائی کا شکوہ کیا ہے، اور فاضل ندوی نوجوان کے کام کی قدر کی ہے۔

"التعليق الممجد على موطأ الإمام محمد" تالیف عبد الحی فرنگی محلی، تحقیق ڈاکٹر تقی الدین ندوی : کے مقدمے میں مولانا نے اپنے زمانۂ تعلیم حدیث میں اس کتاب سے اپنی واقفیت اور ایام تدریس میں اس کی سلامتی فکر اور وسعت قلبی سے اپنی وارفتگی کا اظہار کیا ہے۔

"ظفر الأمانى شرح مختصر الجرجانى" تالیف عبد الحی فرنگی محلی، تحقیق ڈاکٹر تقی الدین: کے مقدمہ میں مولانا نے اس بات کو پوری قوت کیساتھ اٹھایا ہے کہ حدیث کی بقاء اور اس کی حفاظت اور علماء وباشین کا اس سے شغف دراصل یہ خاتم النبیین ﷺ کی ان خصوصیات میں سے ہے جس سے سابقہ شریعتوں کی تاریخ یکسر خالی ہے۔

نتیجہ بحث: مذکورہ بالا معروضات مولانا علی میاں کی حدیث فہمی، رسوخ فی الحدیث اور معرفت حدیث میں ان کی علو مرتبت، اور صناعت حدیث میں کامل مہارت کی غمازی کے ساتھ ساتھ اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ مولانا علی میاں عصر حاضر کے محدثین کی صف میں بلند مقام رکھتے ہیں، گرچہ ان کی شہرت اس حیثیت سے نہیں ہوئی، حالانکہ مولانا کی بیشتر تصانیف، حدیث کی شرح وترجمان، اور ان کی پوری زندگی حدیث کی عملی اور جیتی جاگتی درخشاں تصویر تھی۔

نیز مولانا کے معاصر فضلائے حدیث کا اپنی حدیث کی کتابوں پر ان سے باصرار مقدمہ لکھوانا درحقیقت ان کی طرف سے سند وشہادت کے مرادف، اور ان محدثین وفضلائے حدیث کے اخلاص اور علمی تواضع اور عالی ظرفی کی روشن دلیل ہے۔

وما توفیقی إلا بالله وصلى الله وسلم على نبينا محمد وعلى آله وصحبه أجمعين۔

❁❁❁❁❁

حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ

بحیثیت سیرت نگار

محمد وسیم صدیقی ندوی

سیرت نگاری کا فن نازک و دشوار ہے ہر شخصیت کو اس کے معیار و سطح کے مطابق القاب و آداب عطا کرنا اور اس کی حیثیت، قدر و قیمت کو اجاگر کرنا، اس کے مرتبہ و مقام کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کے اوصاف و کمالات کا بیان جس میں نہ حد سے تجاوز، غلو مبالغہ آرائی، بیجا عقیدت و محبت کا اظہار ہو، اور نہ ہی اس کے مقام سے اس کو گرا دینا کہ جس مرتبہ کا وہ مستحق ہے اس سطح سے بھی گھٹا دیا جائے اس لئے یہ دشوار بھی ہے اور نازک بھی، مولانا نے اپنی سیرت نگاری میں ان امور کا خاص طور پر لحاظ رکھا ہے، اور مولانا کو یہ چیز جہاں اپنی ذاتی صلاحیت واستعداد اور مطالعہ کی گہرائی و گیرائی، اور ذہانت و فطانت سے حاصل تھیں وہیں آپ کو موروثی و خاندانی طور پر بھی یہ ملکہ حاصل تھا کیونکہ آپ کے والد ماجد علامہ عبدالحی صاحب حسنی رحمۃ اللہ علیہ "نزھۃ الخواطر" جیسی عظیم الشان کتاب (بلکہ اگر انسائیکلو پیڈیا کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا) آٹھ جلدوں میں تصنیف کر چکے تھے جو پہلی صدی سے چودھویں صدی ہجری کے (ساڑھے چار ہزار سے زائد) تمام ہندوستانی علماء کے حالات و سوانح پر مشتمل ہے۔

سیرت کا موضوع اپنی ہمہ گیریت و جامعیت و تنوع کی وجہ سے بہت ہی وسیع و مختلف ہے اگر اس موضوع کو عام کر کے لکھا جائے تو سیکڑوں صفحات کی ضرورت ہوگی اور مختلف کتابوں کا ہر پہلو سے جائزہ، اس کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالنے کے لئے بہت ہی تفصیل درکار ہے اسلئے کہ آپ نے مختلف المنوع شخصیات سیرت و سوانح عمریاں لکھی ہیں مثلاً سیرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ (دو جلدوں میں) جو آپ کے ابتدائی زمانہ کی شاہکار ہے اس کے علاوہ تاریخ دعوت و عزیمت پانچ جلدوں میں، پرانے چراغ تین جلدوں میں، سیرت فضل رحمٰن گنج مرادابادی، سیرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ اور ان کی دینی دعوت، شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہم، یہ سب سیرت کا ہی ذخیرہ ہیں، سیرت و تاریخ کا موضوع مولانا کا ایک مخصوص فن تھا بلکہ ایک امتیازی وصف تھا آپ اکثر موقعوں پر فخر سے فرماتے تھے "میں تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ بات کہہ سکتا ہوں، ان حضرات کی جامعیت، ان کی تاثیر ان کا مرتبہ و مقام، انکی عالمگیریت، ان کا روحانی و باطنی فیض، ظاہری کمالات و عظمت کا احاطہ کرنا بہت ہی مشکل تھا اس لئے میں نے صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہی کو موضوع بنایا، اور اسی پر اکتفا کیا اور آپ کی مرتبہ سیرت کی ہی خصوصیات کا ہر پہلو سے جائزہ لینے کی ایک حقیر کوشش کی۔

حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت نگاری عام سیرت نگاروں سے مختلف و ممتاز ہے آپ نے ایسی سیرت لکھنے کی کامیاب کوشش فرمائی ہے، جو قدیم و جدید

مصادر و مآخذ کی جامع ہو اور ذاتی ذوق ور جحان، فکر و نظر سے آزاد کو فلسفہ آرائی ورنگ آمیزی سے اوپر اٹھ کر زندہ اور منھ بولتی ہوئی صداقتوں کو اپنے حقیقی واصلی رنگ میں پیش کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہو، عام طور پر سیرت کے مصنفین جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت لکھنے بیٹھے تو یا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے نظریۂ فکر کے مطابق اسی عکس و تصویر میں پیش کیا ہے یا پھر بڑی مبالغہ آرائی اور تکلف و تصنع سے کام لیا ہے جس کی آپ کی سیرت قطعا محتاج نہیں، یا پھر اس وقت کے رائج علمی نظریات کا تابع بنا کر ہر طرح کا رطب ویابس بھر دیا تحقیق و تدقیق کی ضرورت ہی نہ سمجھی خواہ مزاج نبوت سے میل کھاتا ہو یا نہ کھاتا ہو یا جدیدیت کے غلبہ سے مغلوب ہو کر اس میں جدت پسندی و طبع آزمائی کی بیجا کوشش کی ہے، یا صرف قدیم مصادر پر انحصار کر کے جدید مصادر کو قطعا نظر انداز کر دیا گیا ہے جس سے اس کی صحت مشکوک ہو گئی، نئی نسل کی فہم اس نئی نفسیات اس کے ذوق اس کے علمی و دینی معیار و سطح کو سامنے رکھ کر مرتب نہیں کی گئی۔

اس کے علاوہ ان واقعات وحالات کو جو دل کو گرمائے روح کو تڑپائے، اور شوق و جذبہ کو ابھارے اور ایمانی جذبات، دینی حمیت و غیرت کو بیدار کرنے میں مدد دیتے ہیں ان سے صرف نظر کیا گیا جو سیرت کی اساس ہیں اور ایسے انمٹ نقوش دل پر ثبت کرتے ہیں جو رہتی دنیا تک قائم رہیں حالانکہ وہی واقعات وحقائق ایک مومن کی معراج اور امت کا اصل سرمایہ ہیں۔ جو واقعات انسان میں اخلاق کریمانہ، معاملات کی درستگی، اخوت وبھائی چارگی، تہذیب وشرافت کو جنم دینے والے اور ابھارنے والے ہیں ان کا بالکل خیال نہیں رکھا گیا ہے۔

لیکن حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی طرف خصوصی توجہ فرمائی ہے تاکہ محسن انسانیت کے اعتبار سے اور مکارم اخلاق کے داعی کی حیثیت سے آپ کو جو امتیاز ہے وہ کھل کر سامنے آئے خاص طور پر دعوتی پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے مدعوئین کو آپ کی سیرت اور زندگی سے کیا سبق ملتا ہے کہ لافانی نقوش ہیں جس کی روشنی میں چل کر ایک انسان رشد و ہدایت حاصل کر سکتا ہے۔

پھر مولانا نے جاہلیت اور اس دور کی جاہلی تاریخ کی بھرپور تصویر کشی کی ہے، انسانی زندگی کس تاریکی و پستی، اخلاقی زوال و گراوٹ اور سیاسی و سماجی انحطاط سے گذر رہی تھی اسوقت کے جغرافیائی و تاریخی حالات کیا تھے، انسانیت کس کرب و بے چینی کے عالم میں تھی، زمانہ کو ایک محسن، غمگسار، ہمدرد، مصلح و خیر خواہ، نجات دہندہ کی شدید ضرورت تھی، زبان حال سے پوری روئے زمین ایک چارہ ساز فکر مند محسن انسانیت کی تلاش میں تھی بلکہ چیخ چیخ کر پکار رہی تھی کہ اب اگر کوئی ہادی، رہبر ورہنمانہ آیا تو انسانیت بے موت مر جائیگی، اور تباہی وبربادی کے گڑھے میں گرنے میں کوئی دیر نہیں، قرآن کریم نے کیا خوب منظر کشی کی ہے جس سے بہتر انداز، اور جس سے زیادہ فصیح وبلیغ تعبیر نہیں ہو سکتی "واذکروا نعمة الله عليكم إذ كنتم أعداء فألّف بين قلوبكم فاصبحتم بنعمته إخوانا، وكنتم على شفاحفرة من النّار فأنقذ كم منها (سورہ آل عمران ۱۰۳)

ایسے حالات، ایسے تاریک ونازک دور میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اب آیئے آپ کے ان امتیازی اوصاف وخصوصیات کا ذکر کروں جن کا سیرت نگار نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی تصنیف میں لحاظ رکھا ہے۔

(۱) ایک ایسی کتاب جو عصری عملی اسلوب میں ہو جس میں قدیم وجدید دونوں مآخذ سے پورا استفادہ کیا گیا ہو تاکہ زمانہ کا ساتھ دینے کے ساتھ قابل اعتماد و اعتبار ہو۔

(۲) اسکے ساتھ دینی مسلمات

وحقائق کے ساتھ ہم آہنگ ہو جن کی رہبری وروشنی کے بغیر آسمانی کتابوں، انبیاء کرام کی سیرت، معجزات اور غیبی واقعات وحقائق کو صحیح طور پر سمجھنا مشکل ہے۔

(۳) سیرت کے اولین اور اصل مآخذ پر اس کی بنیاد ہو قرآن وحدیث سے ذرا بھی انحراف نہ ہو۔

(۴) سیرت خود اپنی زبان سے بولے اور پڑھنے والے کے دل ودماغ اور ذہن وفکر میں خود اپنا راستہ بنائے، اس کے لئے رنگ آمیزی، تاویلات، طویل وعریض مضمون باندھنے کی کوشش نہ ہو کیونکہ سیرت میں خود اپنا حسن وجمال، لطافت وموزونیت، اور اثر انگیزی ودل آویزی پائی جاتی ہے، جو کسی رنگینی بیان کی محتاج نہیں۔

اب آپ خود مصنف کی زبان سے سنئے نبی رحمت ۳۱، ۳۲ ص پر مولانا فرماتے ہیں:

میں نے اس بات کی کوشش کی کہ کتاب علمی وتربیتی ودعوتی دونوں پہلوؤں کی جامع ہو، اور ان میں سے کوئی ایک پہلو دوسرے پہلو پر غالب نہ آجائے، نیز اس میں کوہ زندہ، منہ سے بولتے ہوئے اور زندگی وحرارت سے بھرے ہوئے اقتباسات زیادہ پیش کئے جائیں جن سے اسوۂ نبوی کے اتباع اور پیروی کا جذبہ پڑھنے والے میں خود بخود پیدا ہوتا ہے اور جنکی نظیر کسی انسان کی سیرت، کسی عظیم سے عظیم شخصیت کی سوانح کسی نسل اور قوم کی تاریخ، کسی دعوت وتحریک اور دین ومذہب کے نقشہ میں نہیں ملتی یہ سب کسی رنگ آمیزی، داستاں طرازی اور تزئین وآرائش کے بغیر قاری کے سامنے رکھ دیا جائے کہ جمال فطرت اور حسن حقیقت کو ظاہری رنگ وروغن اور مہکتے ہوئے تازہ پھولوں کی مصنوعی رنگ وبو کی ضرورت نہیں ہوتی۔ روئے دل آرام راجاجت مشاطہ نیست" (نبی رحمت ۳۱، ۳۲ ص)

(۵) عقل وجذبات دونوں کی ایک ساتھ جلوہ گری وکار فرمائی ہو، ایسی عالمانہ ومنطقی بحث نہ ہو جو جذبہ شوق وذوق کی کیفیت کو افسردہ کردے اور سیرت کا حقیقی جمال جاتا رہے نہ خالص جذبات وعقیدت سے بھر پور ہو کہ قوی الایمان، راسخ العقیدہ مسلمان ہی اس کو تسلیم کریں، کیونکہ سیرت اگر جذباتی وایمانی عنصر سے خالی ہوگئی تو اس کی مثال چوب خشک کے مصنوعی ڈھانچہ کی سی ہے جس میں زندگی کی حرارت ونمی موجود نہ ہو۔

(۶) اس بات کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے کہ آپ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا گیا ہے لہٰذا آپ کی سیرت سے تمام بنی نوع انسان کو فائدہ پہونچے خالص پشتینی مسلمان باعقیدت ومحبت سے سرشار لوگوں کا ہی فائدہ ہو بلکہ غیر مسلموں اور تمام مذاہب کے لوگوں کو یکساں فائدہ پہونچے۔

(۷) اس عہد اور ماحول کی پوری عکاسی وتصویر کشی ہو جس میں نبوت محمدیؐ کا آفتاب طلوع ہوا اس زمانہ کا فساد، اخلاقی بگاڑ، اور انسان کی بے چینی واضطراب، اخلاقی وسماجی، معاشی وسیاسی حالات، تخریب وفساد کے عوامل، ظالمانہ حکومتیں مسخ شدہ مذاہب، انتہا پسندانہ خیالی فلسفے، تباہ کن تحریکیں اور دعوتیں جو اس وقت اپنا کام بعثت محمدیؐ کی عظمت دوست، منصب نبوت کی نزاکت واہمیت اور نبوت کے عظیم الشان کارناموں کی مکمل تصویر سامنے آسکے۔

عربوں کا مزاج ان کی نفسیات، جنگی وفوجی طاقت کی نوعیت، تہذیب وتمدن کی سطح، اقتصادی وسیاسی معیار زندگی جو اسلام کی ترقی میں حائل تھیں۔ اگر یہ باتیں معلوم نہ ہوں تو سیرت محمدی کی آفاقیت وہمہ گیری اور اسکا فائدہ واضح نہ ہو سکے گا۔

(۸) عام مصنفین کے طریقہ کار سے ہٹ کر آپ نے ذوق وفکر، اپنے ذاتی رجحان یا اپنے نقطۂ نظر کے تابع سیرت کو نہیں بنایا ہے۔ بلکہ ایسی سیرت ترتیب دینے کی کوشش فرمائی ہے جو پوری نوع انسانی کیلئے مفید وکارآمد اور سچی وحقیقی تصویر ہو جیسا کہ

یک جگہ آپ نے فرمایا" اگر ایسا ہوتا کہ کسی
صنف پر کوئی خاص رجحان یا ذوق غالب
جاتا ہے، پھر وہ اپنے ممدوح کو (کبھی شعوری
غیر شعوری طور پر) اپنے اس ذوق ورجحان
کے تابع کر دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ
س کی یہ تصنیف اور تحریر صرف اس ذوق
ر رجحان کی نمائندگی کرتا ہے جو اس وقت
صنف پر حاوی تھا کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ
پنے ممدوح کی تصویر کشی کے ارادہ سے قلم
ٹھاتا ہے لیکن بجائے اس کے خود اپنی تصویر
نار دیتا ہے۔ وہ اس کے حالات وسوانح
معروض اور بے لاگ طریقہ سے روشنی
النا چاہتا ہے لیکن اس کو اپنے ذاتی میلانات
تجربات اور اپنے نقطۂ نظر کی عینک سے دیکھنے
ران حالات وواقعات کو اپنے مخصوص
یمانوں سے ناپنے لگتا ہے۔"

(۹) اس کے علاوہ آپ کے
لات زندگی، آپکے شب وروز، آپ کے
صولات، امت کے لئے بیقراری آہ سحر گاہی
یہ نیم شبی، نفس انسانی کی مختلف حالتوں کا
اطہ واستیعاب، خلوت وجلوت کی پوری
جمانی وسچی تصویر کشی کی ہے جیسا کہ ایک
ہ مولانا رقمطراز ہیں: آپ کی زندگی اور
ارم اخلاق کی صحیح تصویر اور آپ کے ان
زات کا استیعاب، تفصیل جن کی جلوہ
زی، آپ کی سیرت ودعوت اور انفرادی
واجتماعی زندگی میں نظر آتی ہے اللہ اور اللہ کے
بندوں کے ساتھ آپ کا معاملہ آپ کا حسن
صورت وسیرت کمال ظاہر وباطن آپ کی
محبت وشفقت اور دل داری ودل نوازی، آپ
کی دعائیں اور خدا سے عرض حال، بنی نوع
انسانیت کے مستقبل کے لئے آپ کی بے
قراری ودل سوزی، آپ کی فصاحت وبلاغت،
علم وحکمت اور کمال وجامعیت کی ان روشن
وجان نواز نشانیوں اور زندہ ولافانی معجزوں کا
مفصل ومکمل بیان قریب قریب ناممکن ہے،
سیر وشمائل کی کتابوں نے اس سلسلہ میں جو
کچھ پیش کیا ہے وہ ان کے کمال دیدہ وری
وعرق ریزی کے ساتھ آپ کے جمال
سیرت، کمال نبوت کا صرف ایک ہلکا سا عکس
ہے جو اللہ تعالی نے آپ ہی کے ساتھ
مخصوص فرمایا تھا۔ (نبی رحمت ۲۹ ص)

(۱۰) مصنف کا صاحب سیرت
سے عشق ومحبت، قلبی وفکری لگاؤ، بے انتہا
عقیدت وپیار سیرت کے مصنفین میں شامل
ہونے کی سعادت کے حصول کا جذبہ، یہ
اسباب بھی سیرت نگاری میں کار فرما تھے،
چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں "مصنف کو ان
تمام باتوں کا احساس تھا اور سیرت نگاروں کی
ناقابل فراموش خدمات اور مختلف زبانوں میں
ان کے قلم سے نکلنے والی تحریروں کی قیمت
وافادیت کا پورا اعتراف بھی! اس نے اپنی
سعادت سمجھ کر یہ کوشش کی کہ وہ بھی سیرت
نبوی ایک نئی کتاب لکھ کر اس محبوب وجلیل
القدر موضوع کے مصنفین کی نورانی فہرست
میں شامل ہو جائے"

شادم از زندگی خویش کہ کارے
کردم

سیرت ہی کے ذریعہ انکے قلم
میں تازگی اور دل میں سوز وساز کی کیفیت
موجود تھی مولانا کا ذہن وفکر سیرت ہی کے
سانچہ میں ڈھلا تھا آپ کے دل ودماغ کی
آبیاری اس چشمۂ صافی کے فیض سے تھی آپ
کے رگ وریشہ میں سیرت محمدی کا خون
دوڑ رہا تھا آپ اسی کے تربیت یافتہ وفیض یافتہ
تھے چنانچہ مولانا کے الفاظ میں خود ہی ملاحظہ
فرمایئے، "یہی وجہ ہے کہ سیرت اس کی
کتابوں اور تحریروں کی ہمیشہ سب سے بڑی
بنیاد رہی اسی کے دم قدم سے اس کا سارا
سوز وسامان اور آب ورنگ تھا اور اسی کے نقش
قدم کے طفیل اس کے نقوش قلم میں تازگی
تھی، اپنے مقاصد ومطالب کی وضاحت کے
لیے اس کو قوی سے قوی تر دلائل اور بلیغ سے
بلیغ مثالیں سیرت کے جمال وکمال ہی سے ملتی
تھیں۔ اور سیرت ہی سے اس کی طبع میں
روانی وجولانی پیدا ہوتی تھیں، اور اس کی
خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوتی تھیں، اسکی کوئی
قابل ذکر تحریر ایسی نہیں، جس پر اس جمال

محمدی کا کوئی پرتو اور سیرت نبوی کے گہرے مطالعہ اور فکر و تدبر کا کوئی عکس نہ ہو۔

(۱۱) نقشوں کا خاص اہتمام فرمایا ہے، تاکہ بعض جغرافیائی و تاریخی حالات بآسانی سمجھ میں آجائیں کیونکہ بعض اوقات طویل عبارتوں سے وہ چیز سمجھ میں نہیں آتی جو نقشے سے آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہیں، یہ نقشے، تاریخی معلومات اور اس عہد کی تاریخ کے مطالعہ کی روشنی میں تیار کئے گئے ہیں اور یہ کوشش کی گئی ہے کہ فنی و علمی حیثیت سے ہر طرح مکمل ہوں اور عصر حاضر کے مطابق ہوں۔

(۱۲) ایسے واقعات کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا ہے جو دل میں شوق و محبت کی چنگاری بھڑکائے، نبی رحمت کی سیرت مطہرہ سے قلبی لگاؤ، آپ سے سچی محبت اور اسلام سے عشق و شیفتگی کا جذبہ بیدار کرنے میں معاون و مددگار ہوں وہ مؤثر واقعات جو دل میں ایمانی حرارت، اسلام کی عظمت و اہمیت، جان نثاری و فدائیت کا جذبہ بیدار کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں ان کو خاص طور پر ذکر کیا ہے اس کی بے شمار مثالیں ہیں صرف نمونہ کے طور پر چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔

فتح مکہ کے روز ایک شخص نے آپ سے گفتگو کی تو اس پر کپکپی طاری ہو گئی آپ نے فرمایا ڈرو نہیں! اطمینان رکھو میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں میں تو قریش کی ایک عورت کا لڑکا ہوں جو گوشت کے سوکھے ٹکڑے کھایا کرتی تھی۔

معافی و رحم کا دن:

جب سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ جو انصار کے دستہ کے امیر تھے، ابوسفیان کے پاس سے گذرے انہوں نے کہا کہ "الیوم یوم الملحمہ الیوم تستحلّ الکعبۃ، الیوم اذلّ اللہ قریشا" (آج گھمسان کا دن ہے اور خونریزی کا دن ہے آج کعبہ میں سب جائز ہوگا، آج اللہ تعالیٰ نے قریش کو ذلیل کیا ہے) جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دستہ میں ابوسفیان کے پاس سے گذرے تو انہوں نے آپ سے اس کی شکایت کی اور کہا کہ یا رسول اللہ آپ نے سنا! سعد نے ابھی کیا کہا ہے انہوں نے وہ سب دہرا دیا سعد کے جملے کو آپ نے ناپسند فرمایا اور فرمایا؟ "الیوم یوم المرحمۃ، الیوم یعزّ اللہ قریشا ویعظم اللہ الکعبۃ" (آج تو رحم و معافی کا دن ہے، آج اللہ تعالیٰ قریش کو عزت عطا فرمائیگا اور کعبہ کی عظمت بڑھائیگا (نبی رحمت ۴۵۲ ص)

قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کا انوکھا واقعہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں کے ساتھ اچھا معاملہ کرنے کی نصیحت فرمائی اور ارشاد ہوا کہ "استوصوا بھم خیرا" (ان سے اچھا معاملہ کرنا) ابو عزیز کہتے ہیں کہ جب انکے سگے و حقیقی بھائی مصعب بن عمیر بدر سے ان کو قیدی بنا کر لائے تو مجھے انصار کے ایک خاندان میں جگہ ملی وہ دونوں وقت اپنے کھانوں میں سے روٹی مجھے دیتے اور خود کھجور پر اکتفا کرتے یہ رسول اللہ کی نصیحت و ہدایت کا اثر تھا، کسی کو کہیں سے روٹی کا ایک ٹکڑا بھی مل جاتا تو مجھے لاکر دیتا مجھے شرم محسوس ہوتی اور میں اسے لوٹا دیتا، لیکن وہ زبردستی مجھے دیتا اور خود اسے ہاتھ بھی نہ لگاتا۔ (سیرت ابن کثیر ج ۲ ص ۴۷۵، بحوالہ نبی رحمت ۳۰۵ ص)

ایمان کا رشتہ خون کے رشتہ سے بالاتر

جنگ بدر میں مصعب بن عمیر مسلمانوں کے پرچم بردار، اور ان کے بھائی لشکر کفار کے پرچم بردار تھے۔

واقعہ یہ پیش آیا کہ جب مصعب بن عمیر ان کے پاس سے گذرے تو اسوقت ایک انصاری انکے ہاتھ باندھ رہے تھے، مصعب بن عمیر نے کہا کہ ذرا اچھی طرح کسنا اس کی ماں بڑی مالدار ہے اس سے فدیہ کیا اچھی رقم ہاتھ آئیگی ابو عزیز نے یہ سن کر اپنے بھائی کی طرف رخ کر کے کہا کہ بھائی! تم بھائی ہو کر

اس طرح کی صلاح دے رہے ہو؟ مصعب بن عمیر نے کہا کہ تم میرے بھائی نہیں! میرا بھائی وہ ہے جو تمہاری مشکیں کس رہا ہے۔ (سیرت ابن کثیر بحوالہ نبی رحمت ۳۰۴ ص)

بعثت نبوی کا کمال :

آپ کی بعثت کے بعد دنیا کی رت بدل گئی، انسانوں کے مزاج بدل گئے، دلوں میں خدا کی محبت کا شعلہ بھڑکا، خدا طلبی عام ہوئی، انسانوں کو ایک نئی دھن (خدا کو راضی کرنے اور خدا کی مخلوق کو خدا سے ملانے اور اس کو نفع پہونچانے کی) لگ گئی جس طرح بہار یا برسات کے موسم میں زمین میں روئیدگی، سوکھی ٹہنیوں اور پتیوں میں شادابی اور ہریالی پیدا ہوجاتی ہے، نئی نئی کونپلیں نکلنے لگتی ہیں۔ اور درودیوار پر سبزہ اگنے لگتا ہے، اسی طرح بعثت محمدیؐ کے بعد قلوب میں نئی حرارت دماغوں میں نیا جذبہ اور سروں میں نیا سودا سما گیا، کروڑوں انسان اپنی حقیقی منزل مقصود کی تلاش اور اس پر پہونچنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے، ہر ملک اور قوم میں، طبیعتوں میں، یہی نشہ اور ہر طبقہ میں اس میدان میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کا یہی جذبہ موجزن نظر آتا ہے، عرب وعجم، مصر وشام، ترکستان اور ایران، عراق وخراسان، شمالی افریقہ اور اسپین اور آخر ہمارا ملک ہندوستان اور جزائر مشرق الہند سب اسی صحابائے حرم کے متوالے اور اسی مقصد کے دیوانے نظر آتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے انسانیت صدیوں کی نیند سوتے ہوئے بیدار ہوئی ہو، آپ تاریخ وتذکرے کی کتابیں پڑھتے تو آپ کو نظر آئیگا کہ خدا طلبی اور خداشناسی کے سوا کوئی کام ہی نہ تھا۔ شہر شہر، قصبہ قصبہ، گاؤں گاؤں، بڑی تعداد میں ایسے خدامست، عالی ہمت، عارف کامل، داعی حق اور خادم خلق، انسان دوست ایثار پیشہ انسان نظر آتے ہیں جن پر فرشتے بھی رشک کریں، انہوں نے دل کی سرد انگیٹھیاں گرمادیں، عشق الٰہی کا شعلہ بھڑکادیا، علوم وفنون کے دریا بہائے، معرفت ومحبت کی جوت جگادی اور جہالت ووحشت، ظلم وعداوت سے نفرت پیدا کردی، مساوات کا سبق پڑھایا دکھوں کے مارے اور سماج کے ستائے ہوئے انسانوں کو گلے لگایا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بارش کے قطروں کی طرح ہر چپہ زمین پر ان کا نزول ہوا ہے اور ان کا شمار ناممکن ہے۔ (نبی رحمت ۶۴۲۔۶۴۳ ص)

یہ ہے کہ آپ کی سیرت نگاری کا کمال ایسی سحر آفریں عبارت کہ دلوں میں ایمان ویقین کی کیفیت پیدا کردے، عشق ومحبت کا جذبہ ابھار دے۔

صحابہ کرام اور امت محمدیہ کا نسل انسانی پر احسان

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین اور آپ کی پیدا اور تربیت کی ہوئی امت کے پوری نسل انسانی پر ناقابل فراموش احسانات ہیں اور اس تہذیب، تمدن کی بقاء وترقی کے عمل میں اس کا عظیم الشان کردار رہا ہے۔

مختصر یہ کہ آپ کی سیرت کو پڑھنے سے کشش وجاذبیت، روح کو تڑپانے اور دل کو گرمانے، ایمان ویقین کی چنگاری بھڑکانے اور نبی رحمت ومحسن انسانیت سے محبت وعشق کا لافانی جذبہ جو اس کتاب سے پیدا ہوتا ہے شاید ہی کسی دوسرے مصنف کی کتاب پڑھنے سے پیدا ہوتا ہو البتہ علامہ شبلی نعمانیؒ کی سیرت النبی اور قاضی محمد سلیمان منصورپوری کی مقبول کتاب رحمۃ للعالمین، ابن ہشام کی "السیرۃ النبویۃ" ابن القیم کی زاد المعاد وغیرہ کتابوں کی افادیت وتاثیر کا انکار نہیں کیا جاسکتا اور مصنف "نبی رحمت" کی زندگی پر اس کے گہرے اثرات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا، بلکہ انہیں کتابوں کی بدولت مصنف کا دماغ بچپن ہی سے ایمان ویقین کی حرارت وحلاوت سے لذت آشنا ہوا!

حضرت مولانا سے تعلق اور گہری وابستگی وعقیدت اور طویل زمانہ سے مولانا کے معمولات شب وروز سے واقفیت

کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ کتاب کی مقبولیت وشہرت میں روحانیت، للّٰہیت، اخلاص نیت، جذبہ صادق کو بڑا دخل ہے، حسن بیان، حسن انتخاب، حسن زائد، زبان وادب کی چاشنی، انداز بیاں کی شیرینی وشگفتگی، تحریر میں ایمان ویقین کی طاقت وقوت تعبیر پر قدرت ومہارت، باطنی استقامت وپختگی یہ وہ امتیازی خصوصیات ہیں جو سیرت پڑھنے پر قاری کو خود مصنف کی عظمت اس کے اخلاص وسوز دروں کے اعتراف پر مجبور کر دیگا۔ علامہ اقبال کے اس شعر پر اس مقالہ کو ختم کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں ؎

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

میں ان لوگوں میں ہوں.....

آج ایسے علمی ادارے (Academies) عالم اسلامی کی بڑی اہم ضرورت ہیں جو ایسا طاقتور اسلامی ادب پیدا کریں جو ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو دوبارہ کھینچ کر اسلام..... وسیع معنی میں اسلام..... کی طرف لاسکے جو انہیں مغرب کے ان فلسفوں کی ذہنی غلامی سے نجات دلا سکیں، جنہیں ان میں سے کچھ نے سوچ سمجھ کر اور زیادہ تر نے محض وقت کی ہوا سے متاثر ہو کر حرزِ جان بنالیا ہے..... وہ اب..... جو ان کے دماغوں میں ازسر نو اسلام کی بنیادیں اٹھائے اور قلب وروح کی غذا بنے..... اس کام کے لئے عالم اسلام کے ہر گوشے میں آج ایسے اربابِ عزیمت درکار ہیں جو معرکے کے اختتام تک اس علمی محاذ پر جمے رہیں۔

میں اپنے بارے میں صراحت کے ساتھ بتادینا چاہتا ہوں کہ زندگی کے کسی لمحے اور کسی وقفے میں بھی ان لوگوں میں نہیں رہا ہوں، جو دین وسیاست کی تفریق کے قائل ہیں، نہ میں ان لوگوں میں ہوں جو دین کی ایسی تعبیر کرتے ہیں، جس سے وہ زندگی کے ہر نظام اور حالات کے ہر سانچے میں (خواہ وہ اسلام سے کتنا ہی ہٹا ہوا ہو) فٹ ہو جائے اور ہر رنگ کی سوسائٹی میں جڑ جائے اور نہ میرا تعلق کبھی اس گروہ سے رہا ہے، جو سیاست کو قرآن کے شجرۂ ملعونہ "والشجرۃ الملعونۃ فی القرآن" کا مصداق سمجھتا ہے، میں ان لوگوں کی اگلی صف میں ہوں جو مسلمان قوموں میں صحیح سیاسی شعور کے داعی ہیں، اور ہر اسلامی ملک میں صالح قیادت کو بروئے کار دیکھنا چاہتے ہیں، میں ان لوگوں میں ہوں جن کا اعتقاد ہے کہ دینی معاشرہ اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک دین کو اقتدار حاصل نہ ہو، اور حکومت کا نظام اسلامی بنیادوں پر استوار نہ ہو، میں اس کا داعی ہوں اور زندگی کی آخری سانس تک رہوں گا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور اسلامی ادب میں ان کا بلند مقام

مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

ہندوستان کی اسلامی تاریخ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی مختلف الجہات اور ہمہ گیر شخصیت سے درخشاں و تاباں ہے، عمیق علم، وسیع فکر، تدبر، حزم اور دور اندیشی، اصابت رائے، زندگی، انسان، اور کائنات کے بارے میں جامع ترین نظریہ۔ اسلام کا صحیح و معتدل فہم، مقبولیت عامہ اور محبوبیت، دین کی راہ میں ایثار و قربانی اور فدائیت کا عجیب و غریب شوق، عقیدۂ حقہ کی ترویج، فکر سلیم کی ترویج، اسلام کے ابدی پیغام کی طرف انسانوں کی رہبری، اور پورے اخلاق و یقین کے ساتھ عملی زندگی میں اس کے نفاذ کی جد و جہد، یہ وہ اعلیٰ صفات ہیں جنہوں نے عالم اسلام کی جلیل القدر شخصیات کے درمیان آپ کو مرکزیت کا درجہ عطا کیا اور میر کارواں کا تاج آپ کے سر پر رکھا، آپ بیک وقت مفکر و مدبر، داعی إلی اللہ، مربی و سرپرست، دین و دنیا کی جامعیت کا مکمل نمونہ، قرطاس و قلم اور زبان و ادب کے ایک عظیم شہسوار تھے۔

اسی کے ساتھ آپ عالمی سطح پر اسلامی ادب کے علمبردار بھی تھے، محض آپ کی کاوشوں کی بدولت "عالمی رابطہ ادب اسلامی" کا قیام عمل میں آیا، جس نے آفاقیت کو اپنا نصب العین بناکر اسلامی ادب سے عالم اسلام کو روشناس کرایا، اور تمام ادبی حلقوں میں اس کا تعارف کرایا، پھر اسلام پسند ادباء کی ایک جماعت نے آگے بڑھ کر رابطہ کے اس آفاقی فکر کو قبول کیا، جس کے نتیجہ میں انہیں زبان و بیان، ادب و انشاء اور با مقصد تالیف و تصنیف کا ایک وسیع میدان ہاتھ آیا، اور وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں اسی ادبی فریضہ کی انجام دہی اور عقیدہ و ایمان کی ضیا بار کرنوں سے زندگی کو منور کرنے میں مشغول ہوگئے۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ادب، طاقت و قوت کا ایک عظیم سرچشمہ ہے۔ یہ وہ طاقت ہے جو لوگوں کے دلوں اور ان کی عقلوں پر حکمرانی کرتی ہے، اسی وجہ سے آپ نے ادب کو اپنی تمام علمی سرگرمیوں کا اہم ذریعہ بنایا۔ دعوت اسلامی کی خدمت، با مقصد انسانی زندگی، ایمانی شخصیت اور پاکیزہ سیرت و کردار کی تعمیر میں آپ نے اپنی ادبی طاقت کو استعمال کرکے انسانی سعادت کا وہ پل تعمیر کیا جس سے آج کا انسان محروم ہے، یعنی عبد و معبود کے درمیان ایسا مضبوط تعلق پیدا کیا جس میں طاعت و بندگی اور الوہیت و ربوبیت کی کامل تصویر نظر آتی ہے، اور اس عظیم مقصد کی تکمیل کی راہ میں آپ نے جوہر ادب کو نکھارنے اور اس سے زندگی کو سنوارنے کا بے مثال فریضہ انجام دیا۔

آپ کا اسلوب بیان نہایت پاکیزہ ہے اس کے اندر اعلیٰ ادبی ذوق کے ساتھ طاقت و قوت اور فصاحت و بلاغت کا حسن پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے، جیسا کہ مشہور شامی نژاد ادیب اور معروف انشاء پرداز شیخ علی طنطاوی نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "برادرم ابوالحسن! میرا اعتماد ادب کے اوپر متزلزل ہوگیا تھا کیونکہ ادباء کی تحریروں میں مجھے وہ آسمانی نغمہ نظر نہیں آیا جو اس کی روح ہے، لیکن میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے ادب پر میرا یہ اعتماد بحال کردیا۔" اسی طرح رابطہ ادب اسلامی کے اہم رکن و معروف ادیب ڈاکٹر عبد الباسط بدر صاحب یوں رقمطراز ہیں "۱۴۰۹ھ میں رابطۂ ادب اسلامی عالمی کے پہلے جلسہ میں جو شہر لکھنؤ میں منعقد کیا گیا مجھے حاضری کا شرف حاصل ہوا، اس موقع پر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصی مجلسوں میں بھی شرکت کی سعادت نصیب ہوئی، اس وقت میں نے آپ کی ادبی شخصیت میں بہت سی نمایاں جھلکیاں دیکھیں، اسلامی ادب کے متعلق آپ کی فکر اور خیالات کے سننے کا موقع ملا، آپ کی بلند نگاہی اور مسائل و مشکلات سے واقفیت نے ہمیں حیران و ششدر کردیا، اس وقت آپ کی گفتگو کا موضوع مغربیت زدہ عربی ادب تھا، جس نے ایک طویل مدت سے مشرق کے دیار میں اپنا پنجہ جما رکھا ہے، اس دن مجھے اور

سامعین کو معلوم ہوا کہ یہ وہ ادیب ہے جو اپنی تالیف و تصنیف اور بات چیت میں اسلامی ادب کا خاص رنگ بھر دیتا ہے، اور یہاں بیٹھ کر عربی زبان کے دور دراز نخلستانوں میں عربی سرمایہ کی حفاظت کر رہا ہے، اور ندوۃ العلماء جیسے عظیم ادارہ میں مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی بنیاد ڈال کر اسلامی ادب کے اس عظیم سرمایہ کی نشر و اشاعت میں مصروف ہے۔"

ڈاکٹر صاحب آگے چل کر مزید تحریر فرماتے ہیں "ان عظیم ذمہ داریوں کو وہی شخص انجام دے سکتا ہے جو کلمہ کی قدر و منزلت سے واقف ہو اور انسانی زندگی میں زبان و بیان کے رتبہ سے آگاہ ہو، اور عربی زبان و ادب کی محبت اسکے رگ و ریشے میں سرایت کر گئی ہو، بلا شبہ مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ کے اندر ایک عالمی اسلامی ادیب کی تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں، عربی، اردو اور فارسی تینوں زبانوں کے آپ ماہر ہیں، حق تعالیٰ شانہ نے آپ کے اندر ان تمام خوبیوں کو اسلئے جمع کیا تاکہ آپ آگے چل کر اس قافلے کے میر کارواں بنیں جس کے لئے دنیا ہمہ تن انتظار تھی اور جس پر ادب اسلامی کو ناز کرنے کا حق حاصل ہے، اور آپ ادب کے محافظ اور پاسبان بن کر اُس وقت میدان عمل میں اترے، جب محدود قومیتوں کا نعرہ بلند کیا جارہا تھا، اور دین کو فکر و ادب، سیاسیات و اقتصادیات اور زندگی کے عملی شعبوں سے جدا کرنے کی ناپاک کوششیں ہو رہی تھیں، چنانچہ آپ نے اپنی ایمانی فراست سے بلا تفریق رنگ و نسل اور زبان و ادب، اسلامی ادباء کا پہلا کنونشن منعقد کیا، جس میں ہندی، عربی، ترکی اور انڈونیشیائی سارے ادباء ایک متحد ادبی پلیٹ فارم پر علمی اور ادبی مقصد کی تکمیل کے لئے جمع ہوئے، اسلامی اقوام کی تاریخ میں میرے نزدیک اپنی نوعیت کا یہ ایک منفرد کنونشن تھا۔ ادبی انجمنوں کا قیام گرچہ پوری دنیا کے لئے ایک نئی شئی تھی لیکن رابطہ ادب اسلامی کے قیام سے پہلے اسلامی ادباء کے کسی کنونشن کا پتہ نہیں چلتا۔"

ملیشیا کی "الجامعۃ الاسلامیۃ" کے شعبہ عربی کے استاذ ڈاکٹر منجد مصطفیٰ بہجہ اسلامی عربی زبان و ادب کے سلسلہ میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے نظریات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "میرا خیال ہے کہ شیخ ندویؒ نے زبان و ادب کے سلسلہ میں دو کامل نظریات پیش کئے، پھر تیسرا نظریہ پیش کیا جس کا تعلق زبان کی تدریس و تعلیم سے ہے، آپ نے ایسے اصول و آداب کا استنباط کیا جو ادب اور زندگی پر اس کے اثرات کو پوری طرح بے نقاب کرتے ہیں، اکثر محققین نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ تمام نظریات کے موجدین مغرب کے فلاسفہ اور اس کے ناقدین ہیں، لیکن حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے میدان عمل میں اتر کر اس تصور کو مسترد کر دیا، اور عربی زبان و ادب کے حسن و جمال کو آشکارا کرنے اور اس کی جڑوں کو مضبوط کرنے پر زور دیا، آپ کے اس عظیم کارنامہ پر ہمیں فخر ہے۔"

"ہندوستان میں اسلامی عربی ادب کے ارتقاء کی تاریخ میں مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ کا حصہ" کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اگر ہم دار العلوم ندوۃ العلماء کو مولاناؒ کی زندگی اور سرگرمیوں سے جدا کر دیں تو بات تشنہ رہ جائے گی، کیونکہ آپ کو اسی ادارہ سے یہ فکری رہنمائی ملی تھی، ندوۃ العلماء نے یہ صدا لگائی کہ عربی زبان کتاب و سنت کے خزانوں کی شاہ کلید ہے، اور ہندوستانی مسلمانوں کو ان دونوں سے واقفیت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ عربی زبان کو ایک زندۂ جاوید زبان کی حیثیت سے نہ پڑھیں، اس احساس کی بنا پر حضرت مولاناؒ نے عربی زبان میں کتابوں کے لکھنے کا سلسلہ شروع کیا، اور ادب اطفال سے لے کر بہت سے ادبی و علمی موضوعات پر خالص علمی، تحقیقی اور تاریخی مطالعہ کی روشنی میں ہزاروں صفحات سیاہ کر ڈالے چنانچہ آپ کی سرپرستی میں دار العلوم ندوۃ العلماء کی جانب سے بہت سی ایسی گرانقدر کتابیں منصۂ شہود پر آئیں جو تعلیم و تربیت، اسلامی تہذیب و تمدن کی وضاحت، مقاصد دین اور اسلامی زندگی کی تشریح، بحث و تحقیق کے معیار کی تصحیح، اور شریعت اسلامیہ کی حقانیت کو آشکارا کرنے میں بنیادی کردار ادا کر رہی ہیں، آپ نے اس راہ میں عربی ادب کو ایک مؤثر ترین ذریعہ کے طور پر استعمال کیا، اور یہ کام ایسے نامساعد حالات میں انجام دیا جب لوگ عربی زبان کو از کار رفتہ شمار کر رہے تھے اور اسے ایک مردہ اور زندگی سے محروم زبان سمجھ کر صرف فقہی و اصولی کتابوں کے تنگ دائرے میں محدود کرنے پر زور صرف کر رہے تھے، مگر آپ نے محض توفیق ربانی اور اپنی بلند حوصلگی کے ذریعہ اس زبان کے دائرۂ کو وسیع کیا، حتی کہ اس کو زندگی کے مسائل، بحث و نظر، علم و فکر، تاریخ و تذکرہ، تہذیب و تمدن، سماج و سائنس، سیاسیات و اقتصادیات اور عالمی مجالس سے مربوط کر کے دکھایا، اس راہ میں آپ نے زبان و قلم دونوں کا سہارا لے کر سلیس عربی زبان اور واضح اور فصیح اسلوب میں کتابوں کی تصنیف فرمائی، چنانچہ دار العلوم ندوۃ العلماء آپ کے مبارک دور میں اگر ایک

طرف علم و ادب، اور دین و شریعت کا روشن مینار تھا تو دوسری طرف قلب و قلم، ریشم و فولاد، وسیع علم اور پختہ ایمان کی جامعیت کا یکتائے روزگار نمونہ تھا۔

اسی جامع و معتدل تخیل کی بنیاد پر حضرت مولاناؒ نے فکر، ادب اور تمدن و ثقافت کے مراکز میں آئے دن تبدیلیوں، اور مادی افکار و نظریات والے ممالک کی جدید تہذیبوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نصاب درس میں قدیم صالح اور جدید نافع کے اصول کی بنیاد پر تبدیلیاں کیں، تاکہ ایک عالم دین اپنے گرد و پیش کی دنیا، اور آئے دن کی فکری و علمی و تہذیبی تبدیلیوں اور چیلنجوں سے باخبر ہو کر اللہ کی شریعت کی جانب سے دفاع کا فریضہ انجام دے سکے اور اس پر لوگوں کا مکمل اعتماد بحال کر سکے، اور اسے دنیا و آخرت کی سعادتوں کے درمیان ایک رابطہ بنا سکے، چنانچہ آپ نے اسلامی ممالک کی دیگر یونیورسٹیوں کے طرز پر عربی زبان و ادب کی تعلیم کے لئے کتابوں کو تصنیف کر کے اپنا مستقل تربیتی کورس تیار کروایا۔ "قصص النبیین، القراءۃ الراشدۃ، مختارات من ادب العرب، منثورات من ادب العرب" جیسی مایہ ناز کتابیں زبان و ادب اور بہترین اسلوب بیان کی ایسی عدیم النظیر مثالیں ہیں جنہوں نے ہندوستان کے دور آخر کے مصنفین کے لئے مشعل راہ کا کام کیا، اور عربی زبان کے زندۂ جاوید زبان ہونے کا بین ثبوت دے کر ان کے ایمان و یقین میں اضافہ کا سامان فراہم کیا۔

آپ کے عظیم ادبی کارناموں میں یہ بھی ہے کہ آپ نے عربی ادب کو یاس کو قنوطیت اور گمنامی کی فضا سے نکال کر زندگی کے متحرک شعبوں میں داخل کیا، اور ادب و انشاء کے بہترین نمونوں کو یکجا کر کے اس کے متعدد گلدستے پیش کیے، اور عربی ادب کی ہر صنف کے اصول و ضوابط متعین فرما کر اس کی فنی و تعبیری خوبیوں سے لوگوں کو روشناس کرایا جس کی وجہ سے ہندوستان میں اسلامی عربی ادب کی دنیا میں ایک انقلاب آیا، کیونکہ کچھ عرصہ قبل یہ چیز یہاں کے علمی حلقوں کے لئے نامانوس شئی اور ان کے تصور سے باہر تھی، آپ کی بڑی خواہش تھی کہ لوگ ہندوستان میں عربی زبان و ادب کو سیکھیں، اور یہاں کے اسلامی تعلیمی مدارس و مراکز صرف اصول، فقہ اور نحو و صرف وغیرہ کی محدود اور تنگ فضا اور خالص نصابی کتابوں کی سطح سے بلند ہو کر کتابت و خطابت اور صحافت کے آفاقی حدود میں داخل ہوں، اور عربی زبان کو ایک طاقتور ذریعہ بنا کر اس کے ذریعہ زندگی کے تمام حساس میدانوں میں نمایاں طور پر حصہ لیں، تاکہ اس راہ سے قرآن مجید اور احادیث رسول ﷺ سے ان کا رابطہ مضبوط ہو، اور اس میں کوئی شک نہ باقی رہ جائے کہ یہ دونوں سرچشمے فصیح عربی زبان، ادب و انشاء، فنی جمال، حسن تعبیر، بہترین اسلوب اور اعلیٰ طرز بیان کے شاہکار ہیں۔

اس احساس کی بنا پر آپ نے ادب اطفال سے لے کر درجات عالیہ و علیا تک کے طلبہ کے لئے نہایت مفید ادبی لٹریچر تیار کیا، جو نئی نسل کے دلوں میں عربی زبان کی مقبولیت و محبوبیت کا سامان فراہم کرنے میں بڑا اہم رول ادا کرتے ہیں، چنانچہ آپ کی شہرۂ آفاق کتاب "مختارات من ادب العرب" (دو جلدوں میں) اعلیٰ ادبی ذوق پیدا کرنے میں قدیم و جدید ادبی کتابوں کے مابین اپنے موضوع کی بہت ہی معتمد علیہ کتاب ہے جو فنی نثر اور ادبی سرمایہ کے اعلیٰ نمونوں سے پر ہے۔

آپ نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اسلامی عربی صحافت کی طرف بھی ایک کامیاب انقلابی قدم اٹھایا، چنانچہ اپنے بعض شاگردوں اور عزیزوں کو عربی زبان میں ایک اسلامی ادبی و دعوتی مجلہ شائع کرنے کی ترغیب دی، اللہ عزوجل نے اس اقدام کو توفیق سے نوازا، جس کے نتیجہ میں اکتوبر ۱۹۵۵ء میں "البعث الاسلامی" نامی ایک علمی، فکری و دعوتی مجلہ ماہنامہ کی شکل میں عالم اسلام کے افق پر طلوع ہوا، اور پھر اس کے چار سال بعد جون ۱۹۵۹ء میں "الرائد" نامی ایک پندرہ روزہ جریدہ شائع ہوا، ان دونوں پرچوں نے خالص اسلامی عربی صحافت کی بھرپور نمائندگی کی، چنانچہ ہند و بیرون ہند کے علماء و فضلاء ادباء اور مشاہیر نے اس اقدام کی بہت تعریف کی، ان دونوں پرچوں کے شائع ہونے سے قبل دار العلوم ندوۃ العلماء ہی کی طرف سے "الضیاء" نام کا عربی اسلامی ماہنامہ مجلہ منصۂ شہود پر آیا تھا، اور اس نے ہندوستان میں عربی اسلامی صحافت کا بیج ڈال کر پوری دنیا کے علمی ادبی اور صحافتی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کیا تھا۔

ہندوستان میں عربی زبان و ادب کی ترویج کیلئے حضرت مولاناؒ کی یہ کوششیں انتہائی سنجیدگی کے ساتھ مقصدیت کی روح سے معمور تھیں اور اگر یہ کہا جائے تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہوگا کہ ہندوستان میں عربی زبان و ادب کی جو بھی، جس شکل میں بھی، اور جہاں کہیں بھی کوئی متاع پائی جا رہی ہے وہ مفکر اسلام حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور دار العلوم ندوۃ العلماء اور اسکے مخلص مروان حق کا فیض اور انہیں کے آفتاب علم و عمل کا پرتو ہے۔

داعی انسانیت

مولانا عبدالکریم پاریکھ

مرشد محترم، عالی ربانی، مجدد ملت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ مضطرب روح رکھتے تھے اور انسانیت کا درد ان کے دل میں تھا، ان کی سوچ بلند تھی ان کا ذہن آفاقی تھا، اور وہ اپنے اندر اعلیٰ درجہ کی مقناطیسیت اور جاذبیت رکھتے تھے، تعلیم یافتہ طبقہ کو اپنی طرف کھینچا، عورتوں کے حقوق کے لئے تحریک چلائی۔

مسلکی اختلاف کو ختم کیا، امت جو مختلف طبقات اور گروہوں میں بٹی ہوئی تھی اس کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا، کہ جو ارشاد ربانی ہے "إن هذه أمتكم أمة واحدة" اس وحدت میں جو دراریں پڑ رہی تھیں انھیں دور کیا، مسلک کی کشمکش کو کبھی برداشت نہیں کیا، دین پر جب آنچ آئی آپ شمشیر براں ہوئے اور أينقص الدين وانا حی کے صدیقی پرچم کو بلند کیا، اور صاف کہا میرے جیتے جی دین میں کتر بیونت ہو یہ ہم سے دیکھا نہیں جائے گا۔ اور انھوں نے صرف کہا نہیں عمل سے کر دکھایا، قومیت عربیہ کی تحریک ہو، یا لسانی عصبیت کا مسئلہ ہو، پرسنل لا میں مداخلت کی بات ہو، مسجد و مدرسہ کو نشانہ بنایا جارہا ہو، شعائر اسلامی کی اہمیت کو کم کیا جارہا ہو اسلامی تہذیب و ثقافت پر سے اعتماد کو اٹھایا جارہا ہو، اس عالم ربانی نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، اور مخالفین کے تمام اشکالات کا علمی طور پر بھی اور عقلی طور پر بھی جواب دیا، آخر کیا بات ہے کہ عالم عرب میں وہ گھر پڑھا لکھا نہیں سمجھا جاتا جہاں مولانا کی کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين" نہ ہو، یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم نے اس عالم ربانی کو دیکھا، ان کی تقریریں سنیں، ان کے ارشادات و ہدایات سے روشنی حاصل کی، وہ ایسی ہستی تھی جو صدی کی نہیں ہزارہ کی کہی جائے گی، قرن اول کی ہستی کو اللہ نے اس زمانہ میں پیدا کیا، اور پھر وہ کام لیا جو وہ اپنے منتخب بندوں سے لیتا ہے اور جب لے چکا تو پھر اپنے پاس بلالیا، اب ہمارا اور آپ کا امتحان ہے کہ ہم آپ کیا کرتے ہیں، وہ تو شریعت و سنت کی روشنی میں اس دور میں زندگی گزارنے کے خطوط مقرر کر گئے اور ہمارے لئے راستہ صاف کر گئے۔ ظلم سے ان کو اس قدر نفرت تھی کہ انھیں یہ بھی پسند نہیں تھا کہ جو ان کو نقصان پہنچا رہا ہے اس کو ان سے کوئی نقصان پہنچ جائے۔ اور یہ بات اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ خود ہم سے کہا: اپنے مخالفین کے لئے بھی دعا کرنے کی عادت ڈالو، ایسے ہی اللہ نے ان کو مقبولیت اور محبوبیت کے اس مقام پر فائز نہیں کیا، انھوں نے عزیمت کی راہ اختیار کیا، احتیاط کی زندگی گزاری، اصلاح و دعوت کو اپنا مقصد حیات بنایا، اور ذکر و عبادت میں کبھی کوتاہی نہیں کی، اپنے رب سے رشتہ مضبوط رکھا اور ہر معاملہ میں اسی سے لو لگائی، اور ہر انعام اور فضل کو خدا کی ہی دین جانا، اور اس پر انھیں ایسا یقین کامل تھا کہ کبھی انھیں اپنے سلسلہ میں دھوکہ نہیں ہوا۔

عرب سربراہان کو جھنجھوڑا، یاسر عرفات ہوں یا اردن کے شاہ ہوں ان سے بے باکانہ خطاب کیا، سعودی حکومت کے رخ کو بدلا، شام، ترکی، ایران، مصر، یمن اور مراکش کے فرمانرواؤں کو سوچنے پر مجبور کیا، اندرا کو للکارا، راجیو کو خاموش کیا، نرسمہاراؤ کو بے خود کیا، اٹل جی کو پیغام دیا، دیوگوڑا خود نصیحت لینے پہنچے، پڑوس کی بھی خبر لی، اور صحیح رخ پر لانے کی کوشش کی، کیا یہ کوئی معمولی کارنامہ ہے کہ مسلم بل کو ہندو اکثریت والی پارلیمنٹ میں پاس کرایا، ہم سے خود آر ایس ایس کے سربراہ بالا صاحب دیورس نے کہا ہم مسلمانوں کو مان گئے کہ پارلیمنٹ میں اکثریت نہ ہوتے ہوئے بھی، اور ملک میں اقلیت ہوتے ہوئے اپنا بل پاس کرالیا، اس ملک میں جہاں بار بار ہندو راشٹر بنانے کی بات کی جارہی ہو دینی تعلیمی مکاتب کا جال بچھا دینا، اور وہائٹ ہاؤس جاکر امریکہ اور یورپ کی تہذیب کی دھجیاں اڑانا اور وہاں کے باشندوں سے کھل کر صاف صاف باتیں کہنا، کوئی معمولی بات نہیں ہے، اللہ نے ہمارے مولانا کے اندر جرأت ایمانی اور دینی حمیت و غیرت اور حکمت کے ساتھ دعوت کا جو وصف رکھا تھا، وہ اب ناپید ہے، مولانا جیسی دلآویز محترم اور آفاقی شخصیت، کم از کم ہماری نظر سے نہیں گذری، ہم اپنے اوپر یہ اللہ کا فضل جانتے ہیں کہ اس نے ہم کو مولانا کے زمانہ میں پیدا کیا، اور ان کی قدر کی توفیق عطا فرمائی۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

اور

دعوت و خطابت

مولانا سید شرافت علی ندوی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت بیسویں صدی کی ان عبقری شخصیات میں سب سے زیادہ ممتاز ہے جنہوں نے اپنے علم و فن، تصنیف و تحقیق، اپنے وجود و کردار سے مکمل طور پر دعوت اور شہادت حق کا فریضہ انجام دیا۔ حضرت کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ کسی خاص جماعت، تنظیم، یا مکتب فکر کی حدود و مصالح سے بالاتر ہو کر خالص دعوت اسلامی کا علمبردار رہے، ندوہ تحریک ان کی فکر و نظر کا ماخذ ضرور تھی لیکن اپنی خدمات و کمالات سے وہ اس تحریک کے ماضی میں متعین مقاصد سے بھی کہیں آگے بڑھ گئے تھے حقیقت یہ ہے کہ وہ خود ایک مستقل مکتب فکر، ایک نظریہ دعوت، ایک اسلامی تحریک سے عبارت تھے۔

قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے کہ "ومن أحسن قولا ممن دعا الی اللہ وعمل صالحا وقال انني من المسلمين" بھلا اس سے بہتر کس کا قول و بیان ہو سکتا ہے جو دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام دے اور جس کا عمل و کردار صالح و پاکیزہ ہو اور جو اپنے اسلام کا اعتراف و اظہار کرے۔ داعی کی یہ خوبیاں اور کمالات مقام نبوت سے مخصوص ہیں اور داعیان حق کو وراثت میں نصیب ہوتی ہیں۔ جوش عقیدت کا سہارا لئے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ برصغیر ہندو پاک میں یہ وراثت جن خوش نصیبوں کی ملی ہے ان میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ بھی ہیں۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے جس خاندان میں آنکھیں کھولیں، سادات حسنی کا یہ خاندان، علم و معرفت، جہاد و شہادت، کی ایک زریں تاریخ کا حامل تھا اور ہے، گھر کا ماحول خالص دینی اور دعوتی تھا، مخلصین کے زیر سایہ جو تربیت حاصل ہوئی اس نے نوعمر علی میں سن رشد پہنچنے سے پہلے داعیانہ خو، بو سید اکردی تھی، خاندان کے بڑوں بزرگوں نے نہ جانے کیا محسوس کیا تھا کہ تکیہ شاہ علم اللہ میں قدیم مسجد کے علاوہ ایک نئی مسجد کی بنا کیلئے ایک درویش کی فرمائش پر چودہ سالہ علی کا انتخاب کیا گیا، یہ مسجد اب قدیم مسجد سے زیادہ وسیع و عریض اور اسی کے جلو میں دار العلوم ندوۃ العلماء کی ایک شاخ مدرسہ ضیاء العلوم قائم ہے۔

پھر بھی خاندان، تعلیم و تربیت و دینی ماحول ہی سب کچھ نہیں ہوتا، ہزاروں علمی و دینی خاندانوں کے چشم و چراغ بے نور و بے فیض ثابت ہوئے ہیں۔ انسان کے اندر بھی طلب، حوصلہ اور زرخیزی ضروری ہے۔ کلام الٰہی کے بعد جس کتاب نے مولانا علی میاں کو بچپن میں متاثر کیا اور دلیری کی، وہ رحمۃ للعالمین (مولانا سلیمان منصور پوری) تھی، کتاب نے اس عمر میں اور صاحب کتاب صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری عمر پر اثر ڈالا اس کتاب کے حصول میں پیسوں کی کمی رکاوٹ بن رہی تھی۔ ڈاکیہ وی پی سے آئی ہوئی کتاب واپس لے جا رہا تھا اور یہ بچہ رو رہا تھا۔ ماں سے بھلا اپنے بچے کا رونا کیسے دیکھا جا سکتا تھا۔ ادھر

ادھر سے انتظام کیا اور مطلوبہ رقم سپرد کی، کچھ ہی لمحوں میں روتا ہوا بچہ ہنس رہا تھا اس کے ہاتھ میں رحمۃ للعالمین آچکی تھی۔ نبی رحمت، النبوۃ والانبیاء، الطریق الی المدینۃ کے اس مصنف کے بارے میں آپ ہی فیصلہ کریں کہ اس عمر میں یہ کتاب کی طلب تھی؟ علم کی تلاش تھی یا اپنے رسولؐ صادق کی طلب صادق تھی؟

مولانا مرحومؒ کی داعیانہ شخصیت اور مقام کا اندازہ زندگی کی سب سے پہلی تصنیف سیرت سید احمد شہیدؒ اور اس کے بعد ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین، سے لگایا جاسکتا ہے، سید احمد شہیدؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ اور ان کے رفقاء کے احوال زندگی، مجاہدانہ کارنامے اور شوق شہادت نے مولانا کو جرأت و حوصلہ اور اولوالعزمی بخشی اور لادینیت و محکومیت کی سرزمین میں دعوت حق کے لئے مجاہدانہ و قائدانہ عزم کا حامل بنایا۔ بعض کور بصیرت نظروں نے سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کے بہ ظاہر ناکام انقلاب کو بے وقت کی شمشیر زنی قرار دیا ہے لیکن شہادت کو مطلوب و مقصود مومن سمجھنے والوں کے لئے اسلامیان ہند کی طرف سے یہ جہاد فرض کفایہ کے طور پر ادا کیا گیا، اس جہاد نے مستقبل کے لئے یہ بھی ثابت کیا کہ اسلامی تشخص اور ایمانی تعارف کے بغیر اس سرزمین میں جینا موت کے مرادف ہوگا۔ اسی روح اور ایسی جذبہ کی کارفرمائی تھی کہ 1931ء میں یہ تصنیف منظر عام پر آئی اور مصنف کی شخصیت کا علمی و دعوتی حلقوں میں سرگرم تعارف ہوا۔

کاروان کے دل سے احساس زیاں نہ چلا جائے، ایک محروم اور مرحوم ملت کو اپنے نقصانات اور محرومین کا شعور بھی نہ رہے، یہ ایک داعی، قائد اور میر کارواں کی بنیادی فکر ہوتی ہے۔ آفاقی نظر رکھنے والا مصنف، مومن، کے ملک و وطن کو جغرافیائی حدود سے آزاد رکھنے والا مفکر، تاریخ انسانی اور تاریخ اسلامی کا، وتلك الأيام نداولها بين الناس کے پس منظر میں مطالعہ کرنے والا رہبر جب اپنا دل ودماغ اور خون جگر صفحہ قرطاس پر نقش کرتا ہے تو ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین وجود میں آتی ہے، داعیان حق وصداقت کے لئے تعلق مع اللہ پاکیزہ قلب و نظر صفائے باطن وہ باطنی اسباب ہوتے ہیں جو ان کو بجانب اللہ طلب صادق پر عطا کئے جاتے ہیں اس کے لئے اصحاب معرفت اور سالکان طریقت سے ارادت اور نسبت ضروری ہوتی ہے، حقیقۃً یہی دعوت کی روح اور داعی کا زاد سفر ہوتا ہے۔ اس کے بغیر بول بے مول اور تحریر بے توقیر ہوتی ہے، حضرت مولانا علی میاں ندویؒ ابتدا سے ہی روحانی مرکز سے مربوط رہے، پھر شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کے ایماء سے شیخ کامل مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ سے تزکیہ قلب اور باطنی استفادہ کا موقعہ ملا۔ حضرت رائے پوریؒ کی بے نفسی، حقیقت پسندی اور شفقت نے خاص طور پر متاثر کیا، حضرت نے ہی آپ کو چاروں سلسلوں میں بیعت کی اجازت بھی دی، حضرت رائے پوریؒ کے علاوہ سلسلہ مجددیہ کے پیر و مرشد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مجددی کی خانقاہ میں کئی کئی بار بھوپال پہنچ کر حاضری دی، مجالس سے استفادہ کیا اور جذب شوق کی تکمیل فرمائی، دونوں بزرگوں سے تاثر، کسب فیض اور ارادت کی تفصیلات، ملفوظات واحوال، سوانح مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ اور صحبتے با اہل دل میں مذکور ہیں۔

ادع الی سبیل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة کے دعوتی واصلاحی اصول پر اولیاء اللہ ہمیشہ بے لوثی، بے نفسی اور درد مندی سے قائم اور عامل رہے۔ اسی سوز دل نے ان کو وطن سے بے وطن کیا، فقر و فاقہ ان کا ہم سفر رہا، ترک لذات و خواہشات ان کا شعار بنا، تب کہیں جاکر بوریہ نشینی شہنشاہیت کے مترادف بنی، بالخصوص اس سرزمین میں جہاں خدا، گمراہ بندوں کو شجر و حجر، حیوانات و جمادات، زمین و آسمان، چاند، سورج

کی شکل و صورت میں نظر آتا ہو، ان اولیاء کو حکمت و موعظت، محبت و شفقت، سے بھی کام لینا تھا۔ جہاں غزنوی اور غوری شمشیر و سناں سے اقتدار کی مسند بچھاتے ہیں وہیں معین الدین چشتیؒ اور نظام الدین اولیاءؒ عزیمت و محبت سے دلوں پر اپنا سکہ بٹھا دیتے ہیں، تاریخ دعوت و عزیمت، دعوت و تبلیغ، دین کی تاریخ ہی نہیں بلکہ دعوت الی اللہ کی ایک ایسی دستاویز بھی ہے جو مصنف کے قلبی رجحانات و ترجیحات کے اظہار کے ساتھ ساتھ حال و مستقبل کے لئے اعلاء کلمۃ اللہ کا ایک منشور بھی ثابت ہو سکتی ہے۔

اپنے معاصرین کے مقابلہ میں مولانا علی میاں ندویؒ دعوت و فکر اسلامی کے سلسلہ میں صرف ایک رخ پر ہی گامزن نہیں رہے بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں، عصری تقاضوں اور ملی ضرورتوں کے تحت دین و شریعت کے محرک و متحرک داعی بنے رہے، اور ہمیشہ لیظھرہ علی الدین کلہ کے جذبہ و عزم سے کام فرماتے رہے۔

جماعت اسلامی، جماعت تبلیغی، ندوۃ العلماء، مسلم مجلس مشاورت، دینی تعلیمی کونسل، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ، پیام انسانیت، رابطہ عالم اسلامی، رابطہ ادب اسلامی، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، دار المصنفین، آل انڈیا اسلامک اسٹیڈیز کانفرنس، ہر جماعت اور ادارہ سے آپ کی وابستگی اور سرپرستی اسی جذبہ کی بنیاد پر رہی کہ دین و شریعت کے واجبات کی ادائیگی ہر حال اور ہر نوع سے ہوتی رہے اور ملت اسلامیہ دین سے آشنائی حاصل کر کے اپنے ملی اور وطنی مسائل کا حل تلاش کر سکے۔ اسی مستقل اور مسلسل دعوتی انہماک اور مصروفیت کا نتیجہ تھا کہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں مولانا علی میاںؒ کی آواز پر دینی و ملی ادارہ و جماعت کے لئے تقریباً ناگزیر بن گئی تھی۔ اور وہ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر ایک متفق علیہ شخصیت اور حق و صداقت کی واضح علامت بن گئے تھے۔

دعوت کے سلسلہ میں ان کا ایک نصب العین یہ بھی تھا کہ انفرادی جدوجہد کے مقابلہ میں اجتماعی اقدام زیادہ موثر ہوتا ہے، اس لئے اپنی شخصی انفرادیت کے باوجود وہ مختلف دینی، علمی اور سیاسی مکاتب فکر کے افراد کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کے لئے کوشاں رہے، کبھی مسلم مجلس مشاورت کی شکل میں مختلف اور متضاد نظریات رکھنے والے مسلم رہنما و علماء کو آپ نے اکٹھا کیا، کبھی شریعت اور مسلم پرسنل لاء کے تقاضوں کے پیش نظر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تشکیل میں سرپرستی فرمائی جس میں ملکی و فقہی اختلاف کے باوجود ملک بھر کے علماء اور مذہبی پیشوا ایک صف میں کھڑے ہو گئے، کبھی وطنی اور ملکی اتحاد و مفاہمت کے پیش نظر پیام انسانیت کو موضوع بنایا اور اپنی قیادت سے ملک کے گوشہ گوشہ میں اس کو ایک مقبول تحریک بنا دیا۔

ادب و فن کے تقاضوں کو معدوم کئے بغیر اصلاحی و انسانی ادب کو منظر عام پر لانے اور اس کو الٰہی نظام سے مربوط کرنے کے لئے رابطہ ادب اسلامی کی تشکیل فرمائی، یہ سب اسی فکر کے تحت کیا گیا کہ کسی بھی طرح ملت کا رشتہ دین حنیف سے جڑا رہے اور وہ ہر موسم میں سرسبز و شاداب رہے۔

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ شاعر نہیں تھے لیکن شعر و شاعری کا عالمانہ اور ادیبانہ ذوق رکھتے تھے۔ میں نے ندوہ میں طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے آپ سے سنا، فرمایا "جی چاہتا ہے کہ مفتی صدر الدین آزردہ کا یہ شعر کسی خوشنویس سے لکھوا کر اپنے سامنے آویزاں کرالوں تاکہ ہمیشہ اس پر نظر رہے

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جاں کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

اقبالؒ سے ان کی ذہنی و ملی وابستگی، ان کی آفاقی شاعری کے علاوہ اس "فیضان" کی

بنا پر تھی جس کا تعلق ذہانت، علم اور وسعت مطالعہ سے نہیں بلکہ خدا کی بخشش سے ہوتا ہے، تحریر فرماتے ہیں کہ "مری پسند اور توجہ کا مرکز وہ (اقبال) اسی لئے ہیں کہ وہ بلند نظری، محبت اور ایمان کے شاعر ہیں۔ ایک عقیدہ، دعوت اور پیغام رکھتے ہیں اور مغرب کی مادی تہذیب کے سب سے بڑے ناقد اور باغی ہیں وہ اسلام کی عظمت رفتہ اور مسلمانوں کے اقبال گذشتہ کے لئے سب سے زیادہ فکر مند، تنگ نظر، قومیت ووطنیت کے سب سے بڑے مخالف اور انسانیت واسلامیت کے عظیم داعی ہیں، نقوش اقبال صفحہ ۳۳۔

اسی قدر مشترک کی بنا پر مولانا کے فکر ونظر، زبان وبیان پر اقبال کا بڑا گہرا اثر ہوا اور انہوں نے دعوت وفکر اسلامی کے اظہار واعلان میں بارہا کلام اقبال سے استشہاد کیا، انہوں نے محسوس کیا کہ اقبال صرف برصغیر ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کے شاعر اور پیامبر ہیں۔ ان کے مقام وپیغام سے عالم اسلام کا واقف ہونا بھی ضروری ہے۔ ڈاکٹر عبدالوہاب عزام اگرچہ اس سلسلہ میں پیش قدمی کر چکے تھے لیکن ان کے تراجم "فکر اقبال" کی واضح نقش آرائی" کا حق ادا نہ کر سکے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے "روائع اقبال" کی صورت میں "اسلام کی نئی نسل اور اٹھتے وابھرتے ہوئے جوانان عرب کو بہترین فکر یہ ھدیہ پیش کیا اور یہ آرزو کی اس سے "عزم وارادہ کو حرکت میں لانے، طبیعتوں کا جمود توڑنے، سوئی ہوئی غیرت وحمیت کو جگانے کا کوئی سامان اور فکر وادب کو نیا موڑ دینے کا کوئی رجحان ضرور پیدا ہوگا۔ نقوش اقبال ص ۳۴۔

ایک مخلص داعی کے لئے ضروری ہوتا ہے، اور اسلامی تاریخ دعوت وتبلیغ بھی اس پر گواہ ہے کہ وہ جس دعوت، مشن اور تحریک کا علمبردار ہے اس کے لئے افراد کی تربیت وپرورش بھی کرتا رہے تاکہ خود اس کی زندگی میں اور زندگی کے بعد دعوتی تسلسل قائم رہے، مولانا مرحوم اس سلسلہ میں برصغیر کے دعاۃ ومبلغین میں سب سے زیادہ خوش نصیب ثابت ہوئے کہ ان کے زیر سایہ دعوت وتبلیغ، رشد وہدایت، تصنیف وتحقیق، درس وتدریس ودیگر مذہبی، دینی وملی جذبات انجام دینے والے ایسے نامور ندوی وغیر ندوی علماء وفضلاء پروان چڑھے جن میں سے بعض کے زبان وقلم پر خود مولانا علیہ الرحمہ کو اپنی تحریر وتقریر کا شبہ ہوتا تھا اور جن کے بارے میں وہ فرما سکتے تھے۔

اولئك ابنائی فجئنی بمثلهم
اذا جمعتنا یا جریر المجامع

ایسے سچے جانشینوں کی فہرست اگرچہ زیادہ طویل نہیں ہے، لیکن یقین ہے کہ ان کے حقیقی وارث اپنے خلوص، تدبر، نظم وضبط سے دعوت وقیادت کا ملی فریضہ انجام دیتے رہیں گے اور انشاء اللہ کاروان علی غبار راہ میں گم ہو کر نہیں رہ جائیگا۔

ہر داعی کا اسلوب نگارش اور انداز بیان جداگانہ ہوتا ہے، مولانا علی میاںؒ کا دعوتی اسلوب خطابی ہے، جس میں علم وفن، زبان وادب اور شعور ووجدان کے امتیازات بھی ہیں، ان کی تحریر پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی بلند مقام پر کھڑے ہیں اور کسی مجمع کو دل ودماغ کی پوری قوت سے خطاب کر رہے ہیں۔

جن لوگوں کو براہ راست مولاناؒ کو سننے کا موقعہ ملا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ موضوع اور مخاطب مجمع کی پوری پوری رعایت رکھنے والا خطیب مولاناؒ کی شخصیت میں مکمل آب وتاب کے ساتھ موجود تھا۔ ایجاز واختصار آپ کو بہت محبوب تھا، تبلیغی تقاریر اور کانفرنسوں کے استقبالیہ وصدارتی خطبات کو چھوڑ دیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ آپ کا خطاب بالعموم ایک گھنٹہ سے زائد نہیں ہوتا تھا، بیان میں اس طرح تسلسل قائم فرماتے تھے کہ کبھی ایسا محسوس نہیں ہوتا تھا کہ سوچ سوچ کر بول رہے ہیں، عام طور پر بیان الہامی اور تصنع وتکلف سے پاک ہوتا تھا جس میں مضامین کی آمد ہی آمد رہتی

تھی، الفاظ کی ترتیب و زبان کی ترکیب اور اس کا صحیح و مؤثر استعمال آپ کی خطابت کی اہم ترین خصوصیات تھیں جن سے جو علم و ادب کا حسین امتزاج ظاہر ہوتا تھا۔

معمول تھا کہ خطاب کا آغاز قرآن کی آیات سے فرماتے تھے اور پورے بیان میں قرآنی آیات سے استفادہ فرماتے کہ بنیادی طور پر قرآن ہی آپ کی دعوت و فکر کا ماخذ و مرکز تھا۔ سب سے پہلے تبلیغ و دعوت کا کام بھی درس قرآن سے ہی شروع فرمایا تھا ادارۂ تعلیمات اسلام اور تبلیغی مرکز لکھنؤ میں یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔

قرآنی آیات سے برمحل استدلال و استشہاد کی جو مثالیں اور آیات قرآنیہ کی عصر حاضر کے مطابق تفسیریں آپ کی تقاریر میں ملتی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ کے کلام، مفہوم و معانی اور مقاصد پر آپ کی کتنی گہری نظر تھی، موضوع کچھ بھی ہو حاضرین جلسہ جیسے بھی ہوں، اہل عرب ہوں، یا اہل عجم، دینی مدارس کے طلباء ہوں یا کالج کے اسٹوڈنٹ، علم و تحقیق کے اجلاس ہوں یا تبلیغی اجتماعات، دین و ادب کی مجلسیں ہوں یا سیاسی جلسے، آپ قرآن اور اس کے اسلوب دعوت سے کبھی منحرف نہیں ہوتے تھے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آغاز میں قاری نے قرآن کی آیات تلاوت کیں اور مولانا نے انہیں آیات کو یا ان میں سے کسی آیت کو اپنی تقریر کا ذریعہ اور مقصد بنالیا اور اسی پر اختتام بھی فرمادیا۔ یہ اللہ ہی کی دین تھی کہ مولانا کو دوران تقریر آیات کا ایسا استحضار رہتا کہ جید حافظوں کو تعجب ہوتا۔ اسی طرح نصوص نبوی، سیرت نبوی اور اقوال صحابہ کے متون و عبارات کا برمحل استعمال فرماتے رہتے، انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والتسلیم کی دعوتی قصص اولیاء اللہ کے اقوال و حکایات، سلاطین اسلام کی مجاہدانہ خدمات و فتوحات اور اسلامی تاریخ کی تعلیمات آپ کی خطابت کا اہم رمز ہوتے تھے۔

جہاں تقاضہ اور ضرورت ہوئی، عربی، فارسی اور اردو اشعار سے خطابت کو مزین اور مدلل فرماتے اور اسی تناسب سے اشعار کا استعمال فرماتے کہ معلوم ہوتا کہ یہ اشعار اسی مضمون کے لئے موزوں کئے گئے ہیں۔

آپ کی خطابت میں ہیجان اور اشتعال نہیں ہوتا تھا، مجمع کے جوش اور اشتعال کے باوجود آپ خود مشتعل نہیں ہوتے تھے، ملت سے متعلق حساس اور نازک موضوعات۔ جیسے فرقہ وارانہ فسادات، مسلم پرسنل لاء، اور بابری مسجد وغیرہ مسائل پر ہزاروں اور لاکھوں افراد کے مجمعوں کو آپ نے خطاب فرمایا لیکن حلم، تحمل اور عالمانہ وقار کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور کبھی مجمع کا غلط استعمال نہیں فرمایا۔

ملک و بیرون ملک میں آپ کے بیان و خطاب سے مستفید ہونے کی عوام و خواص میں جو بے تابی اور دلچسپی دیکھی اور سنی گئی وہ آپ ہی کا نصیب تھی، ہر طبقہ علم و فکر کے لوگ آپ کو دیکھنے اور سننے کے منتظر رہتے اور یقین کرتے کہ اس عظیم شخصیت کے ارشادات و ملفوظات سے قلب و دماغ کے دریچے وا ہوں گے۔ فیض حاصل ہوگا، فکر و نظر کو جلا نصیب ہوگی۔

آپ کی خطابت میں نکتہ بیانی ایک اہم خصوصیت تھی، مختصر الفاظ و جملوں میں حکمت و موعظت کی باتیں بیان فرمادیتے تھے جو ہمیشہ کے لئے دلوں میں نقش ہو جائیں۔ اور غور و فکر کا باعث بنیں، جو بات بھی زبان سے نکلتی وہ دل کی آرزو اور سوز دروں سے عبارت ہوتی، اپنے وسیع مطالعہ کا نچوڑ اور زندگی کے تجربات لوگوں کے سامنے رکھ دیتے۔

مسلم مجلس مشاورت کا ایک جلسہ بھوپال میں منعقد ہوا۔ اس میں آپ نے برادران وطن کی نفسیات اور مسلم ملت کے فرض کو یوں واضح فرمایا۔ آپ لوگوں کا جس قوم سے واسطہ ہے وہ نفع کی زبان سمجھتی ہے یا نقصان کی۔ اب یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ

اپنے عقیدہ وعمل وکردار سے نفع رساں ثابت ہوں۔

پیام انسانیت کے ایک مشترکہ مجمع کو صدر منزل بھوپال میں دل کی حقیقت اور مقام سے کچھ اس طرح روشناس کرادیا "جس دل میں رحم وکرم نہیں وہ دل دل نہیں پتھر کی سل ہے"۔

علماء اور دانشوروں کے ایک جلسہ میں جامع الفاظ میں تعمیر وترقی کا یہ راز بتلایا "انسانی ارادوں سے انسانی ادارے تعمیر ہوتے ہیں، بھوپال کے سالانہ تبلیغی اجتماع میں فرمایا، "مسلمان ہدایت کا بیج ہے جس بیج میں گھن لگ جاتا ہے اور وہ سل جاتا ہے وہ بارآور نہیں ہوسکتا"۔

۱۹۵۴ء میں طلبہ دارالعلوم دیوبند کو تحریری خطاب کرتے ہوئے فرمایا "دنیا میں ہر ادارہ، ہر مرکز ہر فرد کو راحت وفراغت کا حق ہے، اسکو اپنے کام سے چھٹی مل سکتی ہے مگر مدرسہ کو چھٹی نہیں، دنیا میں ہر مسافر کے لئے آرام ہے لیکن اس مسافر کے لئے راحت وآرام حرام ہے۔ اگر زندگی میں ٹھہراؤ ہو، سکون اور وقوف ہو تو حرج نہیں کہ مدرسہ بھی چلتے چلتے دم لے لے، لیکن جب زندگی رواں اور دواں ہے تو مدرسہ میں جمود وتعطل کی گنجائش کہاں؟ اس کو قدم قدم پر زندگی کا جائزہ لینا ہے، بدلتے ہوئے حالات میں احکام دینے ہیں۔ نئے نئے فتنوں کا مقابلہ کرنا ہے، جس اسلوب سے مدرسہ کا حقیقی منصب ومقام اور اس کے وسیع وعمیق مفہوم اور اس کی ذمہ داریوں کو واضح کیا گیا ہے وہ صرف مولانا مرحوم کا ہی حق اور مقام تھا جو فضلائے مدارس دینیہ کو احساس کمتری سے نکال کر ملت اسلامیہ کی دینی وفکری قیادت سونپنا چاہتے تھے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ کو ایک مرتبہ (۲۸ر جنوری ۱۹۶۷ء) یوں خطاب فرمایا، تم ایسے بن سکتے ہو کہ تمہارا شہر ہی نہیں پورا ملک بلکہ پوری امت اور ملت کی تقدیر بدل سکتی ہے، تم وہ پارس بن سکتے ہو اگر تم سے خدا کا باغی اور سرکش چھو جائے تو ولی کامل بن جائے، جس بستی میں تم جاؤ وہاں بہار آجائے وہاں کا موسم اور فضا بدل جائے یہ تاثیر آج بھی تمہارے اندر پیدا ہوسکتی ہے، تمہاری وجہ سے نہ جانے کتنی قومیں جنتی ہو سکتی ہیں، بے شک نبوت تو ختم ہوچکی لیکن تم آیة من آیات اللہ بن سکتے ہو"

۲۸ر دسمبر ۱۹۷۲ء کو آل انڈیا مسلم پرسنل لاء کنونشن منعقدہ بمبئی کے جلسہ عام میں اسلامی تشخص اور شریعت کے تحفظ کا اسطرح اعلان فرمایا۔

"جب سے خدائے تعالیٰ نے انہیں (مسلمانوں کو) اس سرزمین پر قدم رکھنے کا شرف بخشا، خدا کی کتاب اور رسول کی سنت کو ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے رہے اور صرف یہی نہیں کہ حوادث وطوفان میں اسکی حفاظت اور اس کو مٹنے نہیں دیا، بلکہ اپنی محنتوں، مشقتوں اور دیانتوں سے اس میں اضافہ کیا، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ سے ہمیں جو قانون ملا ہم اسکو اب بھی اپنے سینوں سے لگائے ہوئے ہیں اور قیامت تک سینوں سے لگائے رہیں گے اور اس کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی کے لئے تیار ہیں۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خطابت کے مختلف انداز اور اسلوب کے نمونے ہمیں ملتے ہیں، اس نعمت خداداد پر یقیناً معاصرین کو رشک آتا ہوگا، اور آپ کے تلامذہ ومریدین آپ جیسا بولنے اور مافی الضمیر ادا کرنے کی اللہ سے دعا مانگتے ہوں گے کہ ہر قسم کے موضوع، مقام اور شرکاء مجلس کے مبلغ علم وفہم کے لحاظ سے جب آپ لب کشا ہوتے تھے تو کسی بخل سے کام نہ لیتے تھے، سننے والوں کی توقعات کی تکمیل فرماتے، ان کو تشنہ نہیں رہنے دیتے، ہر خطاب میں دعوت کی روح کارفرما ہوتی اور ایمان واخلاص کا جذبہ مقدم ہوتا، خود ستائی، خود نوازی اور خود پسندی سے بیگانہ اس عظیم داعی نے اپنا حق، اپنا فرض ادا کردیا، اب باری اور ذمہ داری آپ کی اور ہماری ہے۔ ☆☆☆☆☆

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
اور
تبلیغی جماعت

مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی ندوی

یہ موضوع جو اس ہیچمداں کے سپرد کیا گیا ہے، اس کی حیثیت دراصل چودھویں صدی ہجری میں ہندوستان میں رقم کئے گئے دعوت و عزیمت کی تاریخ کے ایک اہم باب کی ہے۔ میری کوشش ہوگی کہ مؤرخانہ دیانتداری کیساتھ اس موضوع پر اپنے معلومات و مشاہدات کا حاصل پیش کروں۔ السعی منی والاتمام من اللہ۔

پہلے میں حضرت مولانا علیہ الرحمۃ کی شخصیت کے ان پہلوؤں کا تذکرہ کروں گا جن کی وجہ سے انہیں داعی الی اللہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ اور ان کی برپا کردہ دینی جدوجہد سے خصوصی مناسبت ہوئی۔

حضرت مولاناؒ کا سنہ ولادت ۱۹۱۴ء ہے۔ مشیت خداوندی نے ان کے لئے جس خانوادے کا انتخاب فرمایا تھا وہ ہندوستان ہی نہیں پورے عالم اسلام میں نہ صرف عالی نسبی بلکہ علمی، تہذیبی، روحانی اور اخلاقی ہر لحاظ سے غیر معمولی صلاحیت و استعداد کا حامل ہے، چنانچہ بہت سے اوصاف و کمالات انہیں فطری طور پر اپنے آباء و اجداد سے وراثۃً ملے ان کے والد ماجد کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ ان کی شخصیت کے علمی، ادبی اور تصنیفی پہلو اظہر من الشمس ہیں سن و سال کے اعتبار سے بزرگی کے مرحلے میں داخل ہونے سے بہت پہلے وہ حضرت سید شاہ ضیاء النبی رحمۃ اللہ علیہ سے جو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے الفاظ میں "اپنے زمانہ کے اہل اللہ اور عارفین میں تھے" اور جن کے بارے میں خود حضرت مولانا عبدالحئی صاحبؒ نے یہ شہادت دی ہے کہ وہ "معرفت کا لب لباب اور دنیا کے لئے زینت و برکت کا باعث تھے" اس وقت صلاح و تقوی کی سند پاچکے تھے جب انہوں نے (یعنی سید شاہ ضیاء النبی رحمۃ اللہ علیہ) اپنی صاحبزادی محترمہ خیر النساء صاحبہ کے لئے دوسرے رشتوں پر ان کو یہ کہہ کر ترجیح دی تھی کہ:

"سید جوان صالح، عالم اور ہونہار ہیں۔ میں ان پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا، میرے نزدیک غربت اور امارت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اصل دیکھنے کی چیز صلاحیت اور علم ہے۔" "حضرت مولانا" ابھی ۹۔۱۰ سال کے کمسن بچے ہی تھے کہ ان کے سر سے ایسے باکمال باپ کا سایۂ عاطفت اٹھ گیا اس حادثہ کے بہانے ان کی عظیم المرتبت والدۂ ماجدہ کو جو شروع سے اعلیٰ روحانی استعداد اور غیر معمولی ذوق دعا سے بہرہ ور تھیں، مشیت الٰہی نے جو بے چینی و اضطراب بخش دیا۔ جو دعا کی جان ہے۔ اور پھر جس طرح ہر طرف سے کٹ کر وہ صرف مالک حقیقی سے لو لگانے اور اپنے نور نظر کے لئے دعا و مناجات اور اس کی تربیت و نگرانی کے لئے یکسو ہوگئیں اس سب پر غور کرنے سے "ان ربی لطیف لما یشاء" کی ایک اور عملی تفسیر سامنے آتی ہے۔ خود حضرت مولانا نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب خدا کا کسی پر فضل خاص ہونے والا ہوتا ہے اور خدا کسی کو اپنی طرف کھینچنا چاہتا ہے تو کسی نہ کسی سبب سے اس کے اندر بے کلی اور بے چینی اور اضطراب و پریشانی پیدا کر دیتا ہے، ہزاروں سکون قربان اس بے چینی پر جو سب سے ہٹا کر خدا کے آستانے پر کھڑا کر دے اور سب سے توڑ کر اس سے جوڑ دے۔"

حضرت مولاناؒ کی والدۂ ماجدہ کا یہ حال خود انہی کی زبانی سنئے، وہ لکھتی ہیں :

"دعا گویا مری غذا تھی، بغیر دعا کئے مجھے سیری نہ ہوتی، دعا کی مشغولیت اتنی بڑھی کہ تمام مشاغل چھوٹ گئے۔ اگر بات بھی کرتی تو دعا کے ساتھ کرتی، کوئی گھڑی دعا سے خالی نہ گذرتی، جمعہ گویا روزِ عید تھا اور فی الحقیقت عید کا دن بھی ہے، تمام دن دعا کرتی، خاص کر عصر سے غروب آفتاب تک تنہا بیٹھ کر دعا میں ایسی مشغول رہتی کہ کسی طرف آنکھ نہ اٹھاتی، مرغ کی آواز پر اور ہر اذان کے ساتھ دعا کرتی، حتی الامکان کوئی وقت دعا کا ضائع نہ کرتی، اور کوئی بات نہ چھوڑتی، ہر خوف سے امان مانگتی، اور ہر خوبی طالب ہوتی، یہ اس مالک حقیقی کی رحمت وعنایت تھی کہ جو جو معاملات زندگی پیش آنے والے تھے، دعا کے وقت سب پیش نظر ہو جاتے اور اس قدر جوش پیدا ہو جاتا کہ بے خودی ہو جاتی اور تمام جگہ آنسوؤں سے تر ہو جاتی اور اس کی شانِ قدرت پر نظر کر کے تڑپ جاتی، جس طرح مرغ ذبح تڑپتا ہے مگر بے خودی میں بھی دعا جاری رہتی اور ہر وقت اپنے قیانے پر نظر کرتی اور کہتی ۔

جو عیب قسمت کے ہیں مٹا دے ترا ہی عالم میں نام ہوگا

اس کی عنایت و شفقت پر مجھے اس قدر ناز تھا کہ یہ کہتی تھی کہ "یا ارحم الراحمین، اگر تو مجھے میری کوشش میں کامیاب نہیں کرے گا تو ایسی چیخ ماروں گی کہ آسمان وزمین ہل جائیں گے اور تیرے در سے ہرگز سر نہ اٹھاؤں گی۔

نہ اٹھوں گی میں اس در سے کوئی مجھ کو اٹھا کر دیکھے
مجھے ہے آرزو جسکی، اٹھوں گی میں وہی لے کر

یہ اس کی محبت اور عنایت ورحمت تھی کہ اتنی بڑی سرکار میں مجھے ایسا ڈھیٹ کر دیا تھا اور بے حجاب کہ میں کہتی اور کہہ کر اپنی بات پر اڑ جاتی۔ اور اتنا بڑا بادشاہ مالک الملک ہو کر مجھ ادنٰی فقیر کی ناز برداری کرتا۔

ان کی تمام تر تمناؤں اور امیدوں کا مرکز ان کے واحد لخت جگر "حضرت مولانا" ہی تھے۔ چنانچہ مولانا محمد الحسنی مرحوم کی شہادت ہے کہ :

"ان کی ساری زندگی دعا تھی اور ان کی ساری دعا چچا میاں (یعنی حضرت مولانا علی میاں) کے لئے تھی، وہ جس وقت بھی دعا کرتیں اور جس کیلئے بھی دعا کرتیں وہ دراصل ان ہی کے لئے ہوتی (ذکر خیر ص۱۱۶)

ان کی منظوم دعاؤں کے چند نمونے ملاحظہ فرمایئے :

"مری اولاد کو تو یا الٰہی اتنی ہمت دے
کہ ہو کر قوت بازو خبر لیں ہم ضعیفوں کی
انھیں کے علم اور اقبال کی شہرت جہاں میں ہو
ہے شہرت جیسی عالم میں نبی کے ہمنشینوں کی
ابوبکر و عمر عثمان علی میں جتنے جوہر تھے
وہی جوہر ہوں ان میں اور وہی فطرت کریموں کی
ترے دربار سے بہتر کی بھی امید بر آئے
علی ٹھنڈک ہو آنکھوں کی علی راحت ہو سینوں کی"

ایک اور مناجات کے چند اشعار ہیں :

دُعا مقبول ہو میری ہو اور میرا مدعا حاصل
میری اولاد پر ہوں رحمتیں اور برکتیں نازل
تو کر فضل و کرم پر رہے میرا اکرم شامل
انھیں اسلام کی خدمت میں تو کر ماہر و کامل
انھیں کے ہاتھ سے اسلام کا اب بول بولا ہو
انھیں کے نور ایمان سے دو عالم میں اجالا ہو

اور حضرت مولانا کے لئے ان کی یہ دعا سنئے کہ

رہے زندہ باقی جہاں میں علی
رہے ترے حفظ و امان میں علی
ہو آباد کون و مکان میں علی
ہر سرسبز باغِ جہاں میں علی
علی سے ہو روشن چراغ جہاں
علی سے ہو سرسبز باغ جہاں

اپنے بارے میں ان کی تمناؤں کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت مولانا نے لکھا تھا :

"میرے لئے ان کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ مجھ سے دین کی تقویت اور اسلام کی اشاعت ہو، کبھی کبھی مجھ سے پوچھتیں، علی! تمہارے ہاتھ پر کبھی کوئی مسلمان بھی ہوا ہے؟ میں کہتا کہ ہاں! اکا دکا کبھی کسی نے کلمہ پڑھا ہے۔ فرماتیں کہ یہ آرزو ہے کہ جماعت کی جماعتیں تمہارے ہاتھ پر مسلمان ہوں، ایک روز بڑی ٹھنڈی سانس لے رہی تھیں۔ چھوٹی ہمشیرہ نے کہا کہ آخر آپ کی خواہش ہے کہ علی نبی ہو جائیں فرمایا کہ کیا میں نہیں جانتی کہ نبوت ختم ہو گئی، میری آرزو ہے کہ ان کے ہاتھ پر جماعتوں کی جماعتیں اسلام لائیں، اور دنیا میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک اسلام کا ڈنکا بج جائے۔ (ذکر خیر ص ۷)

والدۂ ماجدہ کے بعد حضرت مولانا کی شخصیت پر براہ راست سب سے زیادہ اثر ان کے بڑے بھائی مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کا پڑا۔ ان کی بزرگی، عالمانہ وقار وسنجیدگی، حلم وبردباری اور جدید وقدیم کا

جامعیت جیسے اوصاف محتاج بیان نہیں۔ انکو دعا و مناجات اور عبدیت کا جو ذوق ملا تھا اس کا ایک ثبوت ان کا وہ مضمون ہے جو انہوں نے والدہ ماجدہ محترمہ خیرالنساء صاحبہ کی منظوم مناجاتوں کے مجموعہ باب رحمت کے دیباچے کے طور پر اپنے چھوٹے بھائی مولانا سید ابوالحسن علی کے نام سے کہا تھا۔ صرف ۲۶ سال کی عمر میں سائنس سے گریجویشن کرنے کے بعد انہوں نے اپنے والد ماجد کے نام اپنی آئندہ زندگی کا لائحہ عمل طے کرنے کے لئے جو خط لکھا تھا، اس سے ان کے دین کی پختگی اور دین کی گہری سمجھ اور فطری حقیقت پسندی اور عملیت واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ نیز آگے چل کر انہوں نے جس طرح مولانا کو جب کہ ان کی عمر صرف ۲۱ سال کی تھی ڈاکٹر امبیڈکر کے پاس اسلام کا پیغام لے کر بھیجا، اور پھر ۱۹۵۰ء ۱۹۵۱ء میں جبکہ مولانا شرق اوسط کے ایک طویل دعوتی دورے پر گئے ہوئے تھے ان کو جس طرح کے خطوط لکھے ان کے مطالعہ سے اشاعت اسلام کے سلسلے میں ان کی بے پناہ فکر مندی اور ملکی و عالمی حالات سے گہری واقفیت کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔

صرف ایک خط کا اقتباس یہاں نقل کرتا ہوں : کہتے ہیں :

"اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہتا ہوں کہ افریقہ کو اللہ تعالیٰ نور اسلام سے منور فرمادے اور تمہیں اس کا ذریعہ بنا کر اپنے شان و کرم کے مطابق اجر عطا فرمائے" بہت سے ملک ایسے ہیں جہاں قدیم زمانہ سے تمدن رہا ہے، مثلاً ہند ایسے ملکوں کے غیر مسلموں میں استکبار قبول حق سے بڑا مانع ہے۔ افریقہ میں مصر کے علاوہ تمام ملک تمدن سے خالی رہا ہے اور اب تک بڑا حصہ بالکل ابتدائی جاہلانہ بت پرستی کے سوا متمدن مذہب سے ناآشنا ہے۔ گویا تقریباً پورا براعظم سادہ تختی ہے۔

قرین عقل یہ ہے کہ حق کے قبول کرنے کی ان میں ایسی صلاحیت ہو جیسی عرب جاہلیت اور بربر اور ترکوں میں تھی اور تمہاری کوششوں کو اللہ عزوجل قبول فرمالیں اور اہل افریقہ کے قلوب کو قبول حق کے لئے کھول دیں۔ مصر افریقہ کا دروازہ ہے اگر اہل مصر کو اس کی ذمے داری کا احساس ہو جائے اور اپنے ملک میں بیٹھے ہوئے بھی ہر موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں اور مغرب صحراء اعظم اور صحرا کے جنوب کے علاقوں سے جو حجاج جن میں اکثر پیادہ ہوتے ہیں، مصر ہو کر گذریں تو ان کو دینی جد و جہد میں مشغول ہونے پر آمادہ اور اپنے اپنے ملکوں میں اور قرب کی غیر مسلم آبادی میں تبلیغ کیلئے نکلنے پر تیار کریں تو ان شاء اللہ ایک دن پورا افریقہ اسلام سے منور ہو سکتا ہے۔ مصری سوڈان کا تعلق ایک طرف مصر سے ہے اور جنوب میں یوگینڈا کینیا اور کانگو سے ہے۔ سوڈان کے لوگ بہ نسبت مصر کے تمدن جدید سے دور اسلام سے زیادہ قریب ہیں۔

مصر میں جو سوڈانی مقیم ہیں ان میں بھی کام ہونا چاہئے، ازہر کے سوڈانی طلبہ کے ذریعہ سے تمام سوڈانیوں کو جمع کیا جاسکتا ہے اور ان لوگوں کا علم حاصل کیا جاسکتا ہے جو سوڈان کی رائے عامہ پر اثر رکھتے ہیں اور قاہرہ میں مقیم ہیں۔"

حضرت مولانا نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ :

میں نے گوشہ نشیں زندگی اور انفرادی فرائض کی مشغولیت کے ساتھ عالم اسلام کی اتنی فکر مندی، اتنی وسیع اور گہری واقفیت اور اس کے حالات و تغیرات کے تتبع کا ایسا ذوق نہیں دیکھا، فلسطین کا جہاد ہو یا الجزائر کی جنگ ان کا دل اس سے متعلق تھا....."

اہل نظر جانتے ہیں کہ شخصیت کے بننے بگڑنے میں شروع کے یہ سال کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جتنا بھی رشک کیا جائے کم ہے حضرت مولانا کی قسمت پر جن کے لئے قسام ازل نے بہترین ماحول اور تربیت کا اعلیٰ ترین انتظام شروع ہی سے مقدر کر دیا تھا۔ شباب نشانی عبادۃ اللہ شاید ایسے ہی خوش نصیب نوجوانوں ہی کے لئے کہا گیا ہے۔ خدا چنانچہ سلامت طبع اور اعلیٰ استعداد کی جو دولت انہوں نے فطرۃً وراثت میں پائی تھی اسے اس ماحول اور اس انداز تربیت سے کتنی جلا ملی ہوگی اس کا اندازہ کرنا بہت زیادہ مشکل نہیں ہے۔

اب آیئے ذرا ایک اجمالی نظر اس دور کے ہندوستان پر ڈالیں جو شکست و ریخت کے عمل سے گذر رہا تھا۔

انگریزوں نے ایک طرف تو منظم منصوبہ بند اور پیہم اقدامات کے ذریعہ ہندوستان کے مسلمانوں کو جن سے انہوں نے اقتدار چھینا تھا اور جو ان کی آمد سے پہلے اس ملک میں قائدانہ مقام رکھتے تھے ذلت و پستی، پسماندگی و انحطاط اور غربت و افلاس کی عبرتناک مثال بنا دیا اور دوسری طرف اس کی بھی کوشش کی کہ ہندوستانی قوم کے ایک

مخصوص طبقے کو وہ اس لائق بنادیں کہ اگر انہیں اس ملک کو چھوڑ کر جانا پڑے تو وہ طبقہ اسی راہ پر گامزن رہ کر اور انہی کی سکھائی ہوئی تدبیروں کے ذریعہ ان کے چھوڑے ہوئے ادھورے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں۔ اور اسلام اور مسلمانوں کو بالکل کچل کر رکھ دیں۔

وہ زمانہ ہمارے ممدوح ریحانۃ العصر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے عنفوان شباب کا ہے، یہ وہی دور ہے جب یہ سارے خطرات نوشتہ دیوار کی طرح سامنے آگئے تھے۔ اس وقت ان خطروں کو محسوس کرنے والے مسلمان دو گروہوں میں منقسم تھے۔ کہا جاسکتا ہے کہ اصولی واجمالی طور پر مولانا کا رجحان اس گروہ کی طرف تھا جسے علماء کی اکثریت کی تائید حاصل تھی۔ انہوں نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں لکھا ہے:

میں کچھ اپنے خاندانی ماحول اور کچھ تاریخی مطالعہ کی بنا پر ان علماء کے طرز عمل اور مسلک کو نہ صرف پسند کرتا تھا۔ بلکہ ضروری سمجھتا تھا جو جنگ آزادی میں برادران وطن کے نہ صرف دوش بدوش بلکہ جہاں تک قربانیوں اور اپنی ملت کے افراد کے غیظ وغضب اور مخالفت ومقاطعہ کا ہدف بننے کا سوال ہے ان سے آگے ہے۔ میں نو عمری کے باوجود یہ سمجھتا تھا کہ ہندوستان کو ضرور ایک دن آزاد ہونا ہے، غیر ملکی اقتدار کی یہ صورت حال غیر فطری، غیر انسانی اور زیادہ دنوں تک باقی رہنے والی نہیں، اگر مسلمانوں نے اپنے ملک کی تحریک آزادی میں حصہ نہیں لیا، تو ملک کے آزاد ہونے کے بعد مسلمان اس کی سرزمین پر سر اٹھاکر چلنے کے قابل نہیں رہیں گے اور ان کا اپنے ملی تشخص کو برقرار رکھنے کا مطالبہ عزت وہمدردی کی نظر سے نہیں دیکھا جائے گا.....

(کاروان زندگی ص ۲۵۱)

یہاں پر ایک بہت اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ خود جمعیۃ علماء ہند کے اندر صف اول کے لوگوں میں ایسے حضرات تھے جو کانگریس کے ساتھ غیر مشروط اشتراک کر کے اور اپنی الگ شناخت بنائے بغیر مسلمانوں کی تمام تر طاقت کو اس کے اندر جھونک دینے اور ضم کردینے کے حق میں نہیں تھے۔ بلکہ ان کا احساس تھا کہ کانگریس کے پیش نظر ہندوستانی اقوام کی جمہوریت متحدہ کی تشکیل کے بجائے ہندوستان کی قومیت متحدہ کا جو نصب العین ہے اسے زیادہ گہرائی سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ان کے نزدیک اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ ہندوستان کی ساری قوموں یا فرقوں کو توڑ پھوڑ کر ایک قوم بنادیا جائے جس سے ہر ایک کے قومی یا فرقہ وارانہ امتیازات مٹ جائیں، میری محدود معلومات کے مطابق ان علماء میں دو نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں ایک مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب اور دوسرے علامہ سید سلیمان ندوی، باہر کے لوگوں میں دو حضرات ان احساسات میں شریک تھے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور راقم کے والد ماجد مولانا محمد منظور نعمانی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان خطرات واحساسات کو سب سے زیادہ طاقتور، مدلل اور مفصل انداز سے منظر عام پر لانے کا کام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ہی انجام دیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کے ان دونوں گروہوں پر تنقید کے طویل سلسلے سے فارغ ہو کر احیاء دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کو اصل نصب العین بناکر خالص دینی بنیاد پر ایک جماعت کی تنظیم اور ایک ہمہ گیر اصلاحی ودعوتی تحریک کی آواز لگا چکے تھے۔

اس عرصہ میں حضرت مولانا اپنی پہلی مایہ ناز تصنیف سیرت سید احمد شہیدؒ کی تصنیف میں مصروف ومنہمک تھے، انہوں نے ۱۹۳۶ء میں اس کام کا آغاز کیا تھا۔ اور ۱۹۳۹ء میں یہ کتاب شائع ہوئی۔ مصنف کتاب نے اس کا ایک نسخہ والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کو بھی بھیجا، اس کتاب پر ان کا تاثر نقل کرنے سے پہلے یہاں یہ تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۳۶ء ہی سے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں وہ شدید فکر مندی اور اضطراب میں مبتلا تھے۔ اور ۱۹۳۹ء تک پہنچتے پہنچتے ان کا اضطراب آخری حدوں کو پہنچ گیا تھا، جو انکے اس معرکۃ الآراء مضمون میں صاف نظر آتا ہے جو جنوری فروری ۱۹۳۹ء (ذیقعدہ ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ) کے الفرقان میں ہمارا نصب العین اور طریق کار کے زیر عنوان شائع ہوا تھا۔

"ایسی شدید اضطرابی کیفیت میں انہیں یہ کتاب ملی اس کے بعد کیا ہوا؟ انہی کی زبانی سنئے:

"یوں تو ہر مجاہد فی سبیل اللہ کی زندگی میں غافلوں اور کم ہمتوں کے لئے قربانی کا درس اور عزیمت کا پیام ہوتا ہے لیکن آج جو ہندوستانی مسلمان اپنے کو فتنوں کی دنیا اور بگڑے ماحول میں گھرا دیکھ کر سر پکڑ کے بیٹھ گیا ہے۔ اس یاس وقنوط نے اس کو زندہ درگور کردیا

سید ابوالاعلیٰ مودودی کے طاقتور قلم سے نیوات کے ایک دورے سے واپسی پر ان کا مضمون "ایک اہم دینی تحریک" کے عنوان سے اگا تو میں نے اس کو بارہا پڑھا، یاد آتا ہے کہ دارالعلوم سے جو سڑک یونیورسٹی کی طرف جاتی ہے اس پر پرچہ کھولے ہوئے ایک استغراق کی حالت میں مضمون میں پڑھ رہا تھا، اور آنے جانے والی سواریوں کا بھی ہوش نہیں تھا۔"

اس سفر میں مولانا کی حضرت مولانا محمد الیاسؒ سے جو پہلی ملاقات ہوئی اس کا حال خود انہی کی زبانی سنئے۔

"ہمارے (نظام الدین) پہونچنے کے کچھ دیر بعد مولانا تشریف لائے، اور اس شفقت اور گرم جوشی سے ملے جیسے برسوں کی جان پہچان تھی، یا انتظار ہی میں تھے، خاص طور پر جب ان کو معلوم ہوا کہ میں سیرت سید احمد شہیدؒ کا مصنف ہوں اور میرا صاحب سیرت سے خاندانی تعلق ہے تو شفقت محبت اور یگانگت میں اور اضافہ ہوا، سب سے پہلی چیز جس نے ہم لوگوں کو متاثر کیا اور جس کا کم سے کم مجھے اپنی عمر میں پہلا تجربہ ہوا، ان مولانا کی شفقت اور جذب دل کی خاص کیفیت تھی، پہلی ملاقات کے باوجود کہیں سے بھی کوئی اجنبیت، تکلف اور اپنی ذات اور مرتبے کا احساس نظر نہیں آتا تھا، دوسرے دن صبح کی مجلس میں بھی وہی دل نوازی کی شان تھی، جو روبہ ترقی تھی.....

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پہلی ملاقات میں حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی ذات سے تو ہمارے مولانا کو کافی یگانگت اور مناسبت محسوس ہوئی، مگر ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کہ وہ ان کی دعوت کو گہرائی اور تفصیل سے سمجھتے اور ہندوستانی مسلمانوں کو درکار ایک ایسی جدوجہد کی حیثیت سے اسے منتخب کرتے جس کی انہیں تلاش تھی..... البتہ اس ملاقات سے اتنا ضرور ہوا کہ وہ ربط و تعلق ہو گیا جس کی بنا پر آئندہ ان کی جدوجہد کو سمجھنے اور وقت آنے پر فیصلہ کرنے کی راہ کھل گئی۔

اس عرصہ میں پیش آنیوالے واقعات بتاتے ہیں کہ جس قسم کی ہمہ گیر اور جامع جدوجہد کی ان دونوں کو تلاش تھی، باوجود کچھ تحفظات اور سابقہ تجربوں کے اس کیلئے انکی نگاہ انتخاب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ہی پر پڑی۔

چنانچہ والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے ایک طویل گفتگو کے بعد مولانا مودودی سے کہا کہ "اب آپ کوئی تاریخ مقرر کر کے جماعت کی تشکیل کے لئے ہم خیالوں کو دعوت دیجئے اس کے بعد کیا ہوا، یہ بھی ان کی زبانی ہی سنیئے: وہ لکھتے ہیں:

"مقررہ تاریخ پر ہم خیال حضرات اچھی خاصی تعداد میں جمع ہو گئے اور جماعت اسلامی کی تشکیل عمل میں آئی (یہ شعبان ۱۳۶۰ھ اگست ۱۹۴۱ء کا مہینہ تھا).....

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ مرا جو رابطہ اور تعلق تھا اور خیالات وجذبات میں جو ہم آہنگی تھی اس کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے وہ لاہور کے اس اجتماع میں شریک نہیں ہوئے تھے جس میں جماعت اسلامی کی تشکیل ہوئی تھی لیکن اس اجتماع کی اور جماعت کی تشکیل کی ساری تفصیلات مولانا موصوف کو بعض ان رفقائے جماعت سے معلوم ہو چکی تھیں جو لکھنؤ سے لاہور پہنچ کر اس تاسیسی اجتماع میں شریک ہوئے تھے، نیز اس سلسلے میں میری ان کی خط و کتابت برابر ہوتی رہتی تھی۔

بہر حال انھوں نے جماعت میں شرکت کا فیصلہ کر لیا تھا اور مجھے اس کی اطلاع دے دی تھی، میں نے ایک سفر لکھنو کا کیا، جن حضرات کے ذہن ترجمان کے مطالعہ سے جماعت اسلامی کی دعوت کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو چکے تھے، ان کا ایک مختصر سا اجتماع ایک رفیق کے مکان پر ہوا۔ میں نے تفصیل سے دعوت کا تذکرہ کیا اور لاہور کے تاسیسی اجتماع کی کارروائی اور اس کے بارے میں اپنے تاثرات ذکر کئے اور پھر جماعت میں شرکت کے شرائط وغیرہ بیان کئے، مولانا علی میاں اور چند اور دوستوں نے اسی اجتماع میں کلمہ شہادت کے اعادہ کیساتھ باقاعدہ جماعت کی رکنیت قبول کی۔

جماعت اسلامی سے اس وابستگی کے باوجود مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی آمد ورفت حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کے یہاں جاری رہی..... ادھر مختلف اسباب سے مولانا کو جماعت اسلامی سے وابستگی جاری رکھنے کے سلسلے میں خلجان بڑھنے لگا..... مولانا نے اپنی مختلف تحریروں میں وہ اسباب بیان کر دیئے ہیں۔ یہاں صرف اقتباس نقل کرنے پر اکتفاء کیا جارہا ہے:

"میرا شعور جس قدر پختہ اور میرا مطالعہ اور تجربہ جتنا وسیع ہوتا گیا، میری ذہنی کشمکش میں اضافہ ہوتا گیا، اس کا نقطہ ارتقاء وہ تھا، جب میری ہندوستان کی مشہور تبلیغی

تحریک کے داعی و بانی مولانا محمد الیاس صاحب کی خدمت میں آمد و رفت زیادہ ہوئی، میں جب ان کی زندگی، ان کی باطنی کیفیات اور ان کی ایمان و احتساب کی دعوت سے گہرے طور سے متاثر ہوا تو یہ ذہنی خلیج عمیق اور وسیع ہونے لگی، اور مجھے احساس ہوا کہ دعوت نبوت اور اس کے حال کا مزاج اور اس کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں اور وہ ایک ایسی تحریک و دعوت سے کتنی مختلف ہوتی ہیں جس کی بنیاد خالص مطالعہ، ذہانت اور کسی فلسفہ و نظام کے ردّ عمل پر ہوتی ہے۔ میں نے ایک بار لکھنؤ سے جب مولانا مودودی کو اپنی اس ذہنی کشمکش کا حال کہا اور ان کو مولانا محمد الیاس صاحب سے مرے گہرے تاثر اور تبلیغی کام میں روز افزوں انہماک کا حال بطور خود بھی معلوم ہوا تو انہوں نے مجھے اس بارے میں یکسو ہو جانے کی اجازت بلکہ مشورہ دیا۔"

حضرت مولانا خود نوشت سوانح کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ ہو پرانے چراغ ص ۳۱۴ ج ۲ مولانا کی طرف انجذاب اور ان کے مقام سے ہلکی سی شناسائی میں اس کو بڑا دخل تھا کہ میں ان سے ملنے سے پہلے "مکتوبات امام ربانی "ازالۃ الخفاء" صراط مستقیم" اور " منصب امامت" پڑھ چکا تھا۔ اور (اپنے تاریخی ادبی مطالعہ و ذوق کے باوجود) اس کی صلاحیت پیدا ہوگئی تھی کہ میں یہ سمجھ سکوں کہ ان دو دعوتوں اور کوششوں، قیادتوں اور طرز فکر وتفہیم میں کیا فرق ہوتا ہے جن میں سے ایک کا سرچشمہ ذہانت مطالعہ، وسعت علم اور کسی خاص فلسفہ اور تحریک یا صورت حال کا ردعمل ہوتا ہے اور دوسرے کا سرچشمہ کثرت عبادت و انابت و دعا، قرآن مجید میں عمیق تدبّر سیرت نبوی کا عاشقانہ مطالعہ اور مخلصانہ تتبع اور اجتباء اور ہدایت ربانی ہوتی ہے، مولانا محمد الیاس صاحب کو دیکھ کر اور انکی صحبت میں رہ کر عارف شیرازی کے اس شعر کی تصدیق ہوئی۔

این ہمہ مستی و مدہوشی نہ حد بادہ بود
با حریفاں انچہ کرد نرگس مستانہ کرد

اس حقیقت کا اعتراف کیا جانا چاہئے کہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی دعوت کی علمی و فکری بنیادوں اور اس کے بنیادی اصول و مبادی کے سمجھنے اور ان کی مرتب علمی انداز میں تفہیم و تشریح کرنے کا جو ملکہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو حاصل تھا وہ انہی کا حصہ تھا۔ اور اس وجہ سے بھی انہیں انکا خصوصی التفات حاصل تھا اسی سلسلہ کے چند واقعات ذکر کرنے کے بعد حضرت مولانا نے لکھا ہے:

"اسی مناسبت و اعتماد کی بناء پر حضرت زیادہ سے زیادہ قرب اور مجالس میں میری شرکت پسند فرماتے تھے، ایک مرتبہ شہر کے کسی گشت یا قرب و جوار کے کسی نظام میں ذمے داروں نے مجھے بھی بھیج دیا، مولانا کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ ایک آدمی میری باتیں سمجھنے والا تھا، تم نے اس کو بھی بھیج دیا، اب میں کس سے بات کروں؟" (کاروان زندگی ص ۲۶۳ ج ۱)

سنہ ۴۴ء میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی وفات ہوگئی، تاہم حضرت مولانا کا تعلق ان کی شروع کی ہوئی دعوتی جدوجہد سے قائم رہا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تعلق کی خصوصی نوعیت، اور اس کے مختلف مراحل کے بارے میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے حضرت مولانا ہی سے ان کی آپ بیتی سنی جائے، انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں میرا موقف اور طریق فکر کے زیر عنوان لکھا ہے:

'حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی ذات سے گہری عقیدت، انکے فہم دین واخلاص پر کامل اعتماد، اس کام کی ضرورت اور افادیت پر یقین اور نہ صرف عملی شرکت بلکہ ایک داعی اور ترجمان کے فرائض انجام دینے کے ساتھ (جو مولانا کے لئے بھی مسرت اور اطمینان کا موجب تھی) واقعہ یہ ہے کہ میرے ذہن کے سانچہ کی جو ایک خاص علمی ماحول اور مطالعہ سے تیار ہوا تھا، مکمل شکست و ریخت عمل میں نہیں آئی تھی، اور اس کی جگہ کسی دوسرے ذہنی اور فکری سانچے نے نہیں لی تھی، یہ صورت حال ان لوگوں کو اکثر پیش آتی ہے جن کا ذہنی ان فکری سانچہ پہلے سے تیار ہوگیا ہو اور انہوں نے اپنے ذہن و مطالعہ سے کام لینا نہ چھوڑا ہو، زیادہ صحیح الفاظ میں انھوں نے دماغی سپر اندازی اور ماضی سے مکمل علیحدگی اختیار نہ کی ہو، اس لئے تحریکوں اور دعوتوں کے لئے وہ لوگ زیادہ دیندار کار آمد ہوتے ہیں جن کا سانچہ انھیں تحریکوں اور دعوتی کام میں آنے کے بعد بنتا ہے اور ان کو کوئی فکری ہجرت یا سفر نہیں کرنا پڑتا۔

میرا معاملہ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اس سے مختلف تھا، میرا ایک فکری و عملی پس

منظر تھا، اصلاحی اور تجدیدی تحریکوں اور ان کی مرکزی شخصیتوں کا میں نے نہ صرف مطالعہ کیا تھا بلکہ ان کے تعارف و تذکرہ نویسی کا شرف بھی حاصل ہوا تھا، میں ہر دور میں منصوصات و غیر منصوصات اور مقاصد و وسائل میں فرق کرتا رہا اور مرے نزدیک خوب سے خوب تر کی تلاش اور نافع سے انفع کی جستجو کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوا، اسی طرح میرے نزدیک ہر تحریک، ہر دعوت اور ہر ادارے میں جو دین کی خدمت اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے قائم ہو نمو وارتقاء زندگی اور اس کے مسائل سے واقفیت اور جائز اور ضروری حد تک ان کی تکمیل اور زندگی سے تطبیق کی کوشش ضروری ہے۔ ورنہ وہ تحریک اور ادارہ نمو اور زندگی کی صلاحیت سے محروم اور جمود کا شکار ہو جائے گا اور اس کی افادیت محدود سے محدود تر ہو جائے گی۔

ان خیالات نے جو میرے خاص ماحول، مطالعہ اور ذہنی ساخت کا نتیجہ تھے کسی دور میں ساتھ نہیں چھوڑا، اور میں مولانا کی حیات میں بھی کبھی کبھی تنہائی میں اقبال کا یہ شعر پڑھتا تھا۔

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی، کبھی پیچ و تاب رازی

لیکن مولانا کی قوتِ نسبت اور بے پایاں شفقت اور عملی مشغولیت نے ان کی حیات کے پورے عرصہ میں اس فکر کو دبا رکھا تھا، مولانا کی وفات کے بعد وہ نمایاں طریقہ پر ابھرنے لگی، اس نے پہلے یہ شکل اختیار کی کہ کام کو جو اب سارے ہندوستان میں تقریباً پھیل چکا تھا اور دوسرے ممالک کی طرف بڑھ رہا تھا کچھ زیادہ منظم موثر اور ذہین و علمی طبقہ کے لئے اطمینان بخش اور پرکشش بنانے کے لئے اصول دعوت اور اس کے ان اجزاء کو قائم رکھتے ہوئے (جن کو اس تحریک میں چھ نمبر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) کم تبدیلیوں اور زیادہ اضافوں کی ضرورت ہے..... مختلف مجالس میں مولانا محمد یوسف صاحب اور ان کے اہل شوریٰ سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی، مگر اندازہ ہوا کہ ان کا ذہن اس کا ساتھ نہیں دیتا اور وہ اس کی تائید میں نہیں ہیں اور شاید مولانا کی وفات کے بعد دعوت کے اس ابتدائی مرحلے میں اس احتیاط کی کسی قدر ضرورت بھی تھی، کئی بار متوجہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ جب تک خود اصل داعی کے ذہن میں جو دعوت کا روح رواں ہے کسی ضرورت کا احساس اور کسی تبدیلی کا تقاضا پیدا نہ ہو، باہر سے مشورے دینا، خصوصاً ان لوگوں کا جو عمل اور قربانی دینے والوں کے صف اول میں نہیں ہیں اور جنھوں نے اپنی پوری زندگی وقف نہیں کر دی ہے، مفید اور مؤثر نہیں ہوا کرتا، اور بہت سے داعی اور فرقے دار اس کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں جیسے کوئی ایسا شخص امام کو لقمہ دے جو نماز میں شریک نہ ہو اور جسکے قبول کر لینے کو فقہاء مفسدِ صلاۃ سمجھتے ہیں۔

اس احساس اور بار بار کی کوششوں کے غیر مفید ہونے کے تجربے، نیز جماعت کے اخلاص وللہیت، مولانا محمد یوسف صاحب کی قوت باطنی اور قوت دعوت اور اس میں فنائیت و استغراق اور کام کے ہر حال میں نہ صرف مفید بلکہ زندگیوں میں تبدیلی لانے والا عمل دیکھ کر اس سلسلے کو وہیں روک دینا مناسب سمجھا گیا۔

آخر میں اس موضوع کو سمیٹتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ یہ حضرت مولانا محمد الیاس کی شخصیت اور ان کی دینی دعوت ہی تھی جس پر ہمارے ممدوح حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کی نگاہ انتخاب، کافی تلاش و جستجو کے بعد ٹھیری تھی، اور اگر کوئی شخص ان حضرات کے ذوق مزاج کو پیش نظر رکھے، اور ان حالات و عوامل پر بھی نظر رکھے جو ذوق مزاج کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، مثلاً خاندانی ماحول، ابتدائی تعلیم و تربیت وغیرہ (اس مقالے میں ان عناصر کا مختصر تذکرہ آچکا ہے جنکا حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ذوق و مزاج کے بنانے میں بنیادی حصہ تھا) تو وہ اس انتخاب کو بالکل فطری قرار دے گا۔ اور اسے اس پر کوئی اشکال نہیں ہوگا۔ بہر حال ان دونوں "رفیقوں" نے اپنے تمام علمی و دیگر مشاغل کے ساتھ، نہایت پر عزم اور حوصلہ مندانہ انداز میں اپنے آپ کو عملی طور پر حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی برپا کردہ دینی جدوجہد میں مشغول کر دیا تھا۔ ان کے اس فیصلے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کو جس دینی و تہذیبی ارتداد کا سنگین خطرہ لاحق ہو گیا تھا اس سے ان کی حفاظت اور ہر کچے پکے گھر میں رہنے والے مسلمان کو یہ احساس دلانے کے لئے کہ ایمان و اسلام ہی اس کا سب سے بیش قیمت سرمایہ ہے اور اس سے اس کی حفاظت کے لئے خود فکر اور محنت کرنی ہے، ان کے نزدیک عمومی جد وجہد کا یہ طریقہ کار سب سے زیادہ علمی اور مفید و مؤثر بھی تھا اور منہج نبوت سے قریب تر بھی..... انہیں امید تھی کہ اس کے ذریعہ ایمانی شعور اور اسلامی غیرت و احساس کی دولت بھی عام ہو جائے گی اور انفرادی اصلاح

کے ساتھ ساتھ اجتماعی و قومی سیرت و کردار میں بھی بہتری آجائے گی اور اسی تربیت سے فیض یافتہ افراد ہی ہوں گے جو دوسرے تمام اپنی محاذوں کو سنبھالیں گے۔

یہی وہ امید ہے جو روح کی طرح سرایت کئے ہوئے ہے بیسویں صدی کی چوتھی، پانچویں اور چھٹی دہائی کی ان دونوں حضرات کی سیکڑوں تقریروں اور تحریروں کا سب سے بڑا ذخیرہ "الفرقان" کی فائلوں مین آج بھی محفوظ ہے۔

یہاں یہ بات یاد دلانا بے محل نہ ہوگا کہ حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی شخصیت کے جن پہلوؤں نے حضرت مولانا کو زیادہ متاثر کیا تھا ان میں ایک وہ بھی تھا جس کا تذکرہ "دینی حمیت" کے زیر عنوان انہوں نے ان لفظوں میں کیا ہے:

"مولانا کی فطرت میں دین کی حمیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، ان کی اس دعوت کی ایک بڑی وجہ جو ان کو کسی کل اور کسی پل چین نہیں لینے دیتی تھی، دین کا یہی بڑھتا ہوا تنزل و انحطاط اور کفر کا روز افزوں غلبہ و اقتدار تھا جس کو ان کی حساس اور بیدار فطرت اور ان کا غیور مزاج ایک لمحہ کے لئے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اللہ کی توفیق اور دین کی گہری نظر کی بنا پر انہوں نے دین کے کام کی جو ترتیب اپنے ذہن میں قائم کرلی تھی، اس میں کسی نوری تاثر اور جذبے کی وجہ سے وہ ترمیم اور تغیر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اور اپنی عالی ظرفی اور خداداد ضبط و تحمل سے دوسری چیزوں کو اس طرح برداشت کرتے تھے کہ گویا ان کو اس کی طرف توجہ ہی نہیں یا ان کا سرے سے علم نہیں، لیکن کبھی کبھی پیمانہ ضبط سے کچھ قطرے چھلک کر گرتے اور دل کی انگیٹھی کے کچھ شرارے بھڑک اڑتے تو پاس والوں کو بھی محسوس ہوتا کہ دینی حمیت کے کس طوفان کو مولانا نے دل کے کورے میں بند کر رکھا ہے۔

حضرت مولانا نے مزید لکھا ہے کہ ایک مرتبہ خاکسار راقم نے لال قلعہ کے پاس سے گذرتے ہوئے پوچھا کہ کبھی جناب نے لال قلعہ بھی دیکھا ہے؟ فرمایا میں لال قلعہ کی سیر کو بے حمیتی سمجھتا ہوں، ہاں میں نے بچپن میں اس وقت دیکھا ہے جب دکھانے والے رو رو کر دکھاتے تھے۔ غیر مسلم اہل شوکت کی شان و شوکت کے مقامات و مرکزوں کے متعلق فرماتے تھے کہ اگر کوئی شخص ان جگہوں سے قنوت نازلہ پڑھے بغیر گزرے تو سلب ایمان کا خطرہ ہے۔..... اس سلسلے میں کچھ اور واقعات نقل کرنے کے بعد حضرت مولانا نے لکھا ہے:

"اسی دینی حمیت کی بنا پر آپ نے ابتداء میں حکومت کی جبری تعلیم کی سخت مخالفت کی اور علماء کو اس کی طرف متوجہ کیا، شدھی سنگھٹن کے زمانے میں تحریک ارتداد کی طرف پوری طرح متوجہ ہوئے اور وہ میوات میں کامیاب نہیں ہونے پائی۔

اس کوتاہ نظر راقم کے نزدیک یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے ان دونوں حضرات کو یہ محسوس ہوتا گیا کہ اس تبلیغی جدوجہد کے ذریعہ محدود دائرے میں انفرادی زندگیوں میں تبدیلی تو آرہی ہے مگر دینی حمیت اور اجتماعی شعور کے لحاظ سے ترقی کے بجائے تنزلی بڑھ رہی ہے، اور اس سلسلے کی کوئی کوشش بھی کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی (اس طرح کی کوششوں کی تاریخ بھی کافی طویل ہے) تو اسی رفتار سے ان حضرات کی توجہ اس ملک میں دین کی بقاء و تحفظ کے دوسرے محاذوں کی طرف بڑھتی گئی۔

حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے اپنی زندگی کے آخری ۲۰۔ ۲۵ سالوں میں اپنی بے شمار تقریروں اور تحریروں میں اس سلسلے کے اپنے تاثرات و احساسات اپنے مخصوص حکیمانہ انداز اور شفقت بھرے لب و لہجے میں ظاہر کئے تھے۔ کبھی کبھی ان کی نجی مجلسوں میں اس موضوع پر جب گفتگو چھڑ آتی تھی تو بڑے بڑے درد کے ساتھ یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پہ قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی تھا

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عظیم ترین اصلاحی جدوجہد کے ذمے داروں کو کوئی ایسا محتاط اور درمیانی راستے تلاش کر لینے کی اب توفیق دے دے جس سے ایک طرف تو کام کرنے والوں کی ظاہری اور عملی یکسوئی میں کوئی خاص فرق نہ آئے اور دوسری طرف دیگر اہم اصلاحی تقاضوں کی تکمیل میں بھی ایک جماعتی کارکن کی حیثیت سے نہ سہی، ایک عام مسلمان کی حیثیت سے ان کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہو۔ اور کم از کم درجہ یہ کہ دوسرے دینی کاموں کو بھی دین کا کام سمجھتے رہیں۔ جیسا کہ شروع میں ان کا عام طرز عمل تھا، اور آج بھی بلاشبہ بہت سے افراد کا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر موقع ملے گا تو حضرت مولانا کی روح عالم برزخ میں اس دعا پر آمین کہے گی۔

●●●

شاہ فیصل بن عبدالعزیزؒ کا خط
حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے نام

صاحب الفضیلۃ الشیخ ابوالحسن علی الحسنی الندوی حفظہ اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط مورخہ ۲۷ رجب ۱۳۸۷ھ کو ملا،

ہم آپ کے پاکیزہ احساسات اور اسلامی جذبات کے شکر گزار ہیں، ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہمارا اپنے ہندوستانی بھائیوں سے رُوحانی تعلق ہے جن کے ہمارے ملک سے اخلاص و محبت میں ہمیں ذرا بھی شبہ نہیں ہوتا، ان کو یہاں کام سے نہیں روکا گیا، نہ ایسی ہدایات دی گئی ہیں کہ ان کو روکا جائے، آپ کو جو اطلاع پہنچی وہ صحیح نہیں ہے، ہم اپنی اور دوسری جگہ کے مسلمانوں میں فرق نہیں کر سکتے، سب ہمارے بھائی ہیں اور سب کے ساتھ برادرانہ معاملہ کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم سب کو ان کاموں کی توفیق دے جن میں اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کا اتحاد ہو، اللہ تعالیٰ، آپ کی حفاظت و نگہبانی فرمائے۔

فیصل بن عبدالعزیز

۱۳۸۷/۸/۵ھ

جنرل محمد ضیاءالحقؒ کا خط
حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے نام

مکرمی

السلام علیکم

آپکا خط مورخہ ۲۸ مارچ ۱۹۸۰ء ملا، شکریہ۔

پاکستان میں نفاذ اسلام کے متعلق آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے میں ان سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ ہماری کوشش ہے کہ ہم نظامِ اسلام کو جلد از جلد زندگی کے شعبوں میں نافذ کریں، کیونکہ اسلام کو عملی زندگی میں اپنانا ہمارا صرف دینی تقاضا ہی نہیں بلکہ ہمارے ملک کا دارومدار بھی اسی پر ہے۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کارِ خیر کو مکمل کرنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔

مجھے افسوس ہے کہ آپکو بعض ذاتی مجبوریوں کی وجہ سے پاکستان کا سفر ملتوی کرنا پڑا۔ آپ جب بھی سفر کا عزم کریں، پاکستان کے دروازے کھلے پائیں گے۔

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔

آپ کا خیر اندیش

ضیاءالحق

۲۵ جون ۱۹۸۰ء

مولانا سید ابوالحسن ندویؒ

ایک عہد ساز شخصیت

پروفیسر ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی (سابق ڈائریکٹر عربک چیئر، کراچی یونیورسٹی)

بیسویں صدی کے آخری غروب آفتاب سے صرف چھ گھنٹہ قبل ہندوستان کے ایک چھوٹے سے شہر کی ایک چھوٹی سی بستی تکیہ میں ایک آفتاب علم وہدایت غروب ہو گیا۔ یہ دسمبر 1999ء کی 31 تاریخ تھی اور برصغیر میں رمضان 1420ھ کی 22 تاریخ، اور یہ آفتاب علم وہدایت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی تھے، جو برصغیر میں حضرت مولانا علی میاں بلکہ صرف علی میاں، عرب ممالک میں مراکش سے لیکر کویت تک اور اسی طرح ترکی، ایران، انڈونیشیاء وغیرہ میں شیخ ابوالحسن کے نام سے مشہور تھے، عربوں میں کنیت احترام ومحبت کیلئے استعمال ہوتی ہے۔

اس خاکسار راقم الحروف کو مکہ مکرمہ سے آنے والے ٹیلیفون سے ایک دوست کے ذریعہ رحلت سے صرف ساڑھے تین گھنٹہ بعد یہ اطلاع ملی تو ایسا محسوس ہوا کہ ایک روشنی تھی جو چلی گئی، اندھیرا ہو گیا۔ اک "روشنی" تھی ساتھ گئی آفتاب کے

مولانا کی رحلت سے صرف ہندوستان ہی ان کی روشنی ہدایت سے محروم نہیں ہوا ہے، بلکہ سارا عالم اسلام بلکہ پوری دنیا اس روشنی سے محروم ہو گئی ہے، اس لئے کہ مولانا مرحوم سے محبت کرنے والے، ان کی پر مغز وپرنور تحریروں سے فیضیاب ہونے والے دنیا کے ہر حصہ میں موجود ہیں اس اندوہناک سانحہ ارتحال پر یقیناً مشرق ومغرب میں لاکھوں آنکھیں اشکبار ہونگی بلکہ برسوں اشکبار رہیں گی۔

جان کر منجملہ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ مجھے

یقیناً سید احمد شہیدؒ یا شہید بالاکوٹ کے یہ جانشین خاصانِ خدا میں تھے، اگر جگر مرحوم اپنے آخری دور کی اس غزل میں غالب کا انداز:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر

اختیار نہ کرتے اور حیات ہوتے تو اس وقت مولاناؒ کی زبان میں کہتے:

جان کر منجملہ خاصانِ بیت اللہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے منبر ومسجد مجھے

اور اس میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں کہ مولانا مرحوم خاصان بیت اللہ میں سے تھے، کیونکہ آپ کو 18 دسمبر 1996 (6 شعبان 1417ھ) کے دن بیت اللہ میں وہ اعزاز ملا جو چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ میں اس وقت تک کسی کو نہیں ملا تھا، اور وہ اعزاز یہ تھا کہ اس روز حضور ﷺ کی طرف سے مقرر کردہ کعبہ کے کلید بردار خاندان شیبی کے موجودہ کلید بردار شیبی صاحب نے آپ کو کعبہ کی کنجی پیش کی کہ آپ رابطہ عالم اسلامی کے ان ممبران کے لئے جن کو اس کی ایک ذیلی کمیٹی کے اجلاس کے موقع پر کعبہ میں داخل ہونے کا پروانہ یا اجازت نامہ ملا تھا، ان کے لئے آپ کعبہ کا دروازہ کھولیں، اب تک یہ قاعدہ چلا آرہا تھا کہ کعبہ میں داخل ہونے والوں کیلئے خواہ وہ کتنے ہی معزز مہمان، شاہان وقت یا سربراہان مملکت ہوں ان کے لئے در کعبہ خود خاندان شیبی کے کلید بردار کھولا کرتے تھے، لیکن اس وقت پر شیبی صاحب نے جو مولانا مرحوم کے ساتھ سب سے پہلے سیڑھی پر اوپر چڑھے

تھے بلحہ نقرس (Gout) کے مریض مولانا کو سہارا دیکر سیڑھی سے اوپر لے گئے تھے' اوپر جا کر انہوں نے درِ کعبہ کی چوکھٹ پر کعبہ کی چابی رکھ دی' اور اشارہ کر کے فرمایا "انت شیخ العالم و شیخ الحرم ایضاً فتح الباب بیدک نتبرک" (آپ دنیا کے شیخ اور حرم شریف کے بھی شیخ ہیں' اپنے ہاتھ سے دروازہ کھولئے تاکہ ہم برکت حاصل کریں) مولانا مرحوم نے یہ مقدس امانت اپنے ہاتھ میں لے کر کعبہ کا دروازہ کھولا اور سب سے پہلے آپ ہی اندر داخل ہوئے' پھر شیخ شیبی اور دوسرے مہمان۔ کعبہ کے اندر سابق فرماں روا شاہ سعود بن عبدالعزیز کے پوتے شہزادہ مشعل بن محمد بن سعود نے مولاناؒ سے درخواست کی کہ آپ دعا کرائیں آپ نے دو رکعت نفل پڑھ کر دعا کرائی جس میں شیخ شیبی اور دیگر اندر داخل ہونے والے معزز مہمان آمین کہتے رہے۔

مولانا مرحوم نے اپنی آپ بیتی کاروان زندگی کی جلد ششم میں اس عظیم خدائی اعزاز کا ذکر اپنے مخصوص متواضعانہ انداز میں اس طرح کیا ہے:

"یہ شرف و سعادت جو اس ناچیز گنہ گار کو حاصل ہوئی' اس کا مقابلہ دنیا کے بڑے بڑے اعزاز نہیں کر سکتے۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم۔

(کاروان زندگی 339:6)

مولانا مرحوم کے بعض عقیدت مندوں نے ٹیلی فون سے اس کی اطلاع لکھنؤ' انڈیا کے ایک صحافی کو کر دی تھی اور دوسرے روز 19 دسمبر 1996ء کو اس خبر کو انڈیا کے مشہور انگریزی اخبار Hindustan Times نے اپنے پہلے صفحہ پر نمایاں طور پر شائع کیا اور قومی آواز لکھنؤ نے کافی تفصیل کے ساتھ اس خبر کو شائع کیا ایک مفصل رپورٹ کے ساتھ۔ (1)

مولاناؒ اس سے قبل متعدد بار کعبہ میں داخل ہونے کا شرف حاصل کر چکے تھے اور پہلی بار یہ سعادت 1950ء کے حج میں حاصل ہوئی تھی۔ اس وقت خاندان شیبی کے کلید بردار شیبی صاحب نے از خود مولانا مرحوم کو کعبہ میں داخلے کی دعوت دی تھی اور اس کی بھی اجازت دی تھی کہ جن لوگوں اور ہمراہیوں کو ساتھ لانا چاہیں ان کو لا سکتے ہیں' مولانا کے مرشد حضرت شیخ عبدالقادر رائے پوری نور اللہ مرقدہ (مدفون پنجاب' پاکستان) اور ان کے قافلہ کے لوگ سب مولانا کے ساتھ کعبہ میں داخل ہوئے تھے۔ (2)

خاکسار راقم الحروف حج کی ادائیگی کے فوراً بعد شدید بیمار تھا' اس لئے اس کو یہ سعادت حاصل نہ ہو سکی تھی اگرچہ اس نے اپنا پہلا یہ حج مولانا مرحوم کی معیت میں انہی کے انتخاب سے کیا تھا۔

اور المسجد الحرام سے مولانا مرحوم کا جو تعلق ان کے پہلے حج 1947ء میں قائم ہوا تھا وہ آخری سال وفات تک قائم رہا اور جب سے رابطہ عالم اسلامی Muslim World League اور مدینہ منورہ کی اسلامک یونیورسٹی کا قیام 1962ء میں عمل میں آیا تھا اور مولانا مرحوم ان دونوں اداروں کے فاؤنڈر ممبر مقرر ہوئے تھے' اور اسی طرح رابطہ کی دوسری ذیلی کمیٹیوں کے ممبر ہوئے تب سے تو وہ ہر سال بلحہ سال میں دو تین بار مکہ مکرمہ تشریف لے جاتے تھے۔

مسجد حرام سے اور کعبۃ اللہ سے مولانا کے تعلق کی نوعیت کی یاد مجھے ان کے انتقال سے چند دن قبل خاص طور پر اس وقت آئی تھی جب میں رات کو ساڑھے دس بجے سے مکہ مکرمہ کی تراویح میں (P.T.V کے Live پروگرام میں) قرآن کریم سن رہا تھا' اور اس وقت بھی ہزاروں انسان وسیع و عریض مطاف میں پروانہ وار طواف کر رہے تھے' یہ منظر دیکھتے ہوئے مجھے 1950ء کے وہ لمحات یاد آئے جب میں مولانا مرحوم کے ساتھ حرم شریف کے صحن میں بچھی ہوئی باریک کنکریوں (3) (حصوہ) پر بیٹھا ہوتا تھا' اور مولانا طواف کرنے والوں کے جھرمٹ میں کعبہ کو دیکھتے ہوئے اپنے اس ناچیز شاگرد سے مخاطب ہو کر یہ شعر پڑھتے تھے:

از صد سخن پیرم یک حرف مرا یاد است
عالم نشود ویران تا میکدہ آباد است

سچ ہے کہ جب تک کعبہ آباد ہے قیامت

نہیں آئیگی۔

جہاں تک مسجد حرام کے منبر کا تعلق ہے تو اس سے ایک بار حج سے صرف دو تین دن قبل لاکھوں حجاج کو خطاب کرنے کی سعادت بھی صرف مولانا مرحوم ہی کو 1963ء کے حج میں ملی۔(4)

یہ تو حرم مکہ اور اس کے منبر کا ذکر تھا' دنیا کی اور مساجد اور ان کے منابر مولانا مرحوم کو یاد کر کے جہاں انہوں نے طول طویل سیاحتوں میں ملیزیا سے لے کر امریکہ تک اور یمن و سوڈان سے لے کر شمال میں لندن تک نمازیں پڑھیں اور خطبے دیئے وہ مساجد اور منابر بھی مولانا مرحوم کو یاد کر کے روئیں گے۔

مولاناؒ سے میرا تعلق 20 سال کی عمر میں 1947ء میں قائم ہوا تھا اور مرحوم کی وفات تک یعنی 53 سال یہ تعلق قائم رہا شروع کے چند برسوں میں یہ تعلق قربت جسمانی کے ساتھ جلوت و خلوت میں لکھنو' رائے بریلی' مکہ مکرمہ' مدینہ منورہ' دمشق میں قائم رہا اور برابر مراسلت بھی رہی' پھر جب 1961ء میں انگلینڈ کے زمانہ قیام میں میں نے پاکستانی نیشنلٹی اختیار کر لی تو زیادہ تر یہ تعلق مراسلاتی رہا' لیکن پھر بھی مکہ مکرمہ اور ریاض کی یونیورسٹیوں میں میری ملازمت کے دوران مولانا سعودی عرب تشریف لائے تو میری دعوت قبول کی اور میرے مکان پر کھانا تناول فرما کر میری عزت افزائی کی۔ یادوں کا ایک قیمتی خزانہ ہے جو میرے ذہن میں محفوظ ہے اور انشاءاللہ تعالیٰ ان کو عنقریب قید تحریر میں لاؤں گا' ضروری ہے کہ اس وقت مولانا کے کچھ حالات زندگی قارئین کی نذر کروں۔

خاندان: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مرحوم سیدنا حسنؓ کی ذریت میں سے تھے' اسی لئے اپنے آپ کو حسنی لکھتے تھے' مولانا مرحوم کا شجرہ نسب عبداللہ الاشتر بن محمد النفس الزکیہ کے ذریعہ سیدنا حسنؓ سے ملتا ہے' مولانا مرحوم کے دو اجداد نے موجودہ پاکستان کی سرزمین پر صدیوں قبل اپنے خون کی قربانی دی ہے' اسی لئے پاکستان مولانا مرحوم کو ساری خرابیوں کے باوجود بہت عزیز تھا۔ ایک تو یہی عبداللہ الاشترؒ جو سیدنا حسنؓ کے پوتے عبداللہ المحض کے پوتے تھے' یہ عباسی خلیفہ ابو جعفر المنصور کی خون آشام تلوار سے بھاگ کر 145ھ میں سندھ کی سرزمین آئے تھے' ان کے والد محمد النفس الزکیہ اسی سال مدینہ منورہ میں منصور کی فوج کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے۔ منصور نے عبداللہ الاشتر کا پیچھا سندھ میں بھی نہ چھوڑا' سندھ کے عباسی گورنر سے لڑتے ہوئے وہ شہید ہوئے اور ان کے جاں نثار رفقاء نے بے حرمتی کے خوف سے ان کی لاش دریائے سندھ میں بہادی' تاکہ عباسی لشکر ان کا سر کاٹ کر عراق نہ لے جائے اور وہ کوچہ و بازار میں گشت نہ کرایا جائے (کلفٹن میں ساحل سمندر پر موجود مزار میں مدفون شخصیت کو عبداللہ الاشتر کہنا سراسر غلط ہے(5)

ان جد اعلیٰ کے بعد مولانا کے دوسرے جد امجد سید احمد شہیدؒ ہیں' جنہوں نے رائے بریلی سے اپنے مجاہدین رفقاء (مریدین) کے ساتھ براہ سندھ و افغانستان 1826ء میں سرحد (NWFP) آکر علم جہاد بلند کیا اور موجودہ پاکستان کے اس شمالی صوبہ اور اس کے صدر مقام پشاور کو سکھوں کی غلامی سے آزاد کرایا' اور وہ بالا کوٹ میں 1831ء میں شہید ہوئے۔

سید احمد شہیدؒ نے سرحد میں برصغیر پر انگریزوں کے تسلط کے بعد کلکتہ و دہلی میں ان کے ہوتے ہوئے ایک صحیح اسلامی حکومت قائم کر دی تھی' اور سرحد میں وہ امیر المومنین کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔

یہ تو مولانا مرحوم کے خاندان کے شہیدوں کا ذکر تھا' لیکن برصغیر میں مولانا کی خاندانی بنیاد ساتویں صدی ہجری کے نصف ثانی میں پڑی' جب آپ کے خاندان کے ایک عالم و مجاہد امیر کبیر سید قطب الدین اپنی جماعت کے ہمراہ فتنہ تاتار کے زمانے میں بغداد سے براہ غزنی ہندوستان آئے' جو اس پرآشوب زمانے میں عراق' ایران' اور ماوراءالنہر کے مسلمانوں کے لئے ایک پناہ گاہ تھا' سلطنت دہلی کے دروازے ان ستم رسیدہ مسلمانوں کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ شیخ قطب

الدین کچھ عرصہ دہلی میں شیخ الاسلامی کے منصب پر فائز رہے' پھر انہوں نے نواح الہ آباد میں قلعہ کڑہ اور مانک پور شہر فتح کیا' ہندوستان میں اس وقت تحریک جہاد قائم تھی' سلطان دہلی نے ان کو یہ علاقہ جاگیر میں دے دیا' جہاں وہ اور ان کے احفاد لولاد کئی صدی آباد رہے' طبقات ناصری اور تاریخ فیروز شاہی میں ان سید قطب الدین کا ذکر ہے۔

گیارہویں صدی ہجری سترہویں صدی عیسویں میں اس خاندان کے ایک بزرگ کڑہ مانک پور سے آکر رائے بریلی شہر کے باہر دریائے سئی کے کنارے آباد ہوئے۔ ان بزرگ کا نام شاہ علم اللہ تھا' اور وہ مشہور صوفی بزرگ سید آدم بنوری کے مرید و خلیفہ تھے' اگرچہ ان کا ارادہ مکہ مکرمہ ہجرت کا تھا' لیکن اپنے مرشد کے اشارے پر اس ویران جگہ آکر آباد ہوئے' اپنے اور اپنے اعزہ واقارب کے ساتھ مل کر اپنے ہاتھوں سے ایک چھوٹی سی مسجد بنائی' یہ مقام تکیہ (خانقاہ) کے نام سے مشہور ہوا' عالم گیر نے 1673ء میں شاہ علم اللہ کو ایک جاگیر کی پیش کش کی' لیکن آپ نے قبول نہیں فرمائی اور زہد و فقر اور علم و فضل کی زندگی کو پسند کیا۔ شاہ علم اللہ کی بنائی ہوئی بے مینار کی یہ مسجد آج بھی اپنی جگہ موجود ہے' اگرچہ چند سال قبل اس میں نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے کچھ توسیع کی گئی ہے۔

شاہ علم اللہ کے اس خاندان میں اٹھارویں صدی کے اواخر میں سید احمد شہیدؒ پیدا ہوئے' ان کے عہد میں تکیہ اور رائے بریلی کو جو شہرت حاصل ہوئی وہ اس سے قبل کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ سید احمد شہیدؒ نے مشیخت و تصوف اور روحانیت و للّٰہیت کے ساتھ اس خاندان میں جہاد کی سنت کو زندہ کیا' یہ وہ زمانہ تھا جب رنجیت سنگھ نے پنجاب و سرحد پر قبضہ کر کے مسلمانوں پر زندگی تنگ کر دی تھی اور بہت سی مساجد منہدم کر دی گئی تھیں یا ان میں اذان بند کر دی گئی تھی' دہلی کی کمزور و ناتواں مقلیہ حکومت جو در حقیقت انگریزوں کے تابع تھی۔ کفر کی اس چیرہ دستی کے خلاف بے دست و پا تھی' سید احمد شہیدؒ جنہوں نے جوانی میں لکھنؤ میں اور پھر ٹونک کی مسلمان ریاست میں سپہ گری کی تربیت حاصل کی تھی" اور وہ شاہ عبدالعزیز دہلوی سے بیعت ہو کر ان کے چھوٹے بھائی مترجم و مفسر قرآن شیخ عبدالقادر دہلوی سے روحانی تربیت حاصل کر چکے تھے' اور خود ان کا اپنا فیض انیسویں صدی کی ابتداء میں تکیہ' رائے بریلی میں جاری تھا' دینداری کی ایک باد بہاری ان کے ذریعہ شمالی ہند میں چل رہی تھی' انہوں نے حج بیت اللہ سے واپسی کے بعد اپنے ہزاروں مریدوں کے ساتھ سرحد میں علم جہاد بلند کیا' سکھوں سے اسے آزاد کرایا' اور پھر اپنوں کی غداری سے وادی کاغان کے علاقے بالا کوٹ میں اپنے رفقاء کے ساتھ جام شہادت نوش کیا۔

سید احمد شہیدؒ کی شہادت کے 83 سال بعد اس خاندان میں 1914ء میں جو بچہ پیدا ہوا اور جو نو سال کی عمر میں یتیم ہو گیا اور جس نے بڑا ہو کر اس خاندان کا نام ساری دنیا میں روشن کیا' اس کا نام علی رکھا گیا تھا' وہ دنیا میں ابوالحسن علی ندوی کے نام سے مشہور ہوا' اس نے اپنی ایمان افروز تحریروں اور اپنے نفس گرم اور سوز دروں سے عرب و عجم اور مشرق و مغرب میں لاکھوں انسانوں کے دلوں میں ایمان کا چراغ روشن کیا۔

حضرت مولانا علی میاں کے دادا مولانا فخر الدین ایک ممتاز مصنف اور شاعر تھے' خیالی تخلص کرتے تھے' انہوں نے شعراء وادباء کا تذکرہ "مہر جہانتاب" کے نام کے ساتھ لکھا۔ مولانا مرحوم کے والد حکیم عبدالحئی صاحب مشہور ادیب' نقاد اور اردو و عربی کے ایک مایہ ناز مصنف تھے' ان کی اردو ادب کی تاریخ "گل رعنا" ادبی حلقوں میں مشہور ہے اور عربی میں برصغیر کے علماء' شعراء' ادباء' سلاطین' وزراء' اطباء' فلاسفہ اور دیگر ماہرین فن و ہنر کی تاریخ عربی میں نزھتہ الخواطر کے نام سے 8 جلدوں میں کافی پہلے دائرۃ المعارف' حیدر آباد دکن سے چھپی تھی' جو عالم عرب میں مشہور ہے' مسلمانوں کی یہ منفرد تہذیبی و ثقافتی تاریخ چند ماہ قبل بیروت میں دوبارہ تین بڑے سائز کی جلدوں میں

چھپی ہے 'اور دیگر کتابیں بھی عرب ممالک اور ہندوستان میں چھپی ہیں۔

مولانا مرحوم کی والدہ سیدہ خیر النساء حافظہ قرآن اور شاعرہ تھیں 'بہتر تخلص کرتی تھیں' خواتین کے لئے انہوں نے حسنِ معاشرت کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ مولانا مرحوم کی ایک بڑی بہن بھی مصنفہ تھیں' انہوں نے حدیث کی مشہور کتاب ریاض الصالحین کا ترجمہ زادِراہ کے نام سے کیا جو برسوں سے مقبول عام ہے 'اور کراچی میں دو جلدوں میں شائع ہوا ہے' اس طرح " ایں خانہ تمام آفتاب است" کی بات مولانا مرحوم کے خاندان پر پوری طرح صادق آتی ہے۔

تعلیم و تصنیف: 'مولانا مرحوم کی تعلیم وتربیت ان کی قدسی صفات والدہ اور نیک نفس اور پاکباز بھائی ڈاکٹر مولوی عبدالعلی' ایم بی بی ایس کی زیرِ سایہ ہوئی۔ 'مولانا کو عام روش کی تدریس و تعلیم کے برخلاف ایک ایک علم کی علیحدہ علیحدہ تعلیم دی گئی' پہلے عربی زبان وادب' پھر قرآن و تفسیر' پھر حدیث وفقہ' اور یہ تعلیم انہوں نے اپنے زمانے کے اساتذہ فن سے حاصل کی۔ عربی زبان بچپن سے گھٹی میں پڑی تھی 'انہوں نے چودہ سال کی عمر میں اپنے چچا پروفیسر محمد طلحہ صاحب' پروفیسر عربک اورینٹل کالج لاہور کے ساتھ علامہ اقبالؒ سے ملاقات کی اور بتایا کہ انہوں نے اقبال کی نظم "چاند" کا عربی میں ترجمہ کیا ہے' تو اقبالؒ نے عربی میں اس بچہ سے سوال کیا یہ جاننے کے لئے کہ کیا واقعی اتنی اچھی عربی جانتا ہے 'اقبالؒ "چودہ سال کے اس بچہ کے جوابات ، اور معلومات جان کر بہت خوش ہوئے۔'

'سولہ سال کی عمر میں مولانا نے عربی زبان میں ایک رسالہ سید احمد شہیدؒ پر لکھا جو مصر کے ایک مشہور عالم شیخ رشید رضا نے چھاپا' پھر پچیس سال کی عمر میں مولانا مرحوم نے سید احمد شہید پر اردو میں ایک کتاب لکھی جس نے مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ' سید سلیمان ندویؒ اور مولانا حسین احمد مدنی جیسے علماء سے خراج تحسین حاصل کیا اور انہوں نے اس کے اقتباسات اپنی کتابوں میں نقل کئے۔

' اس طرح مولانا کی تصنیفی زندگی کا آغاز بچپن اور ابتدائے جوانی سے ہو گیا تھا' اپنے خاندانی اثرات کی وجہ سے مولانا مرحوم کا دل اسلام کی دعوت 'اس کے لئے درد مندی اور بے قراری سے معمور تھا' اسی لگن نے ان کو مولانا مودودیؒ سے قریب کیا۔ وہ سن 1941ء سے 1943ء تک لکھنو کی جماعت اسلامی کے امیر رہے' اس دوران ان کا تعلق مولانا محمد الیاسؒ سے ہوا' جنہوں نے اسلاف کے طریقہ پر میوات 'کے علاقے میں تبلیغ کا بڑی بے نفسی اور بے لوثی سے کام کیا تھا' مولانا نے ان کے دل میں اسلام کے لئے صحابہ جیسی تڑپ اور بے قراری پائی 'اور مولانا مودودی کے مشورے سے مولانا یکسو ہو کر مولانا الیاسؒ کی دینی دعوت یا تبلیغ سے وابستہ ہو گئے۔ 'مولانا الیاسؒ کی للّٰہیت اور انابت الی اللہ اور زہد واتقاء اور جذبہ ایمانی سے ان کو بہت متاثر کیا۔ اور مولانا نے ان کی سیرت پر ایک کتاب " مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت" لکھی 'جو 1947ء سے قبل چھپی۔

' مولانا مرحوم 21 سال کی عمر میں ندوہ میں عربی ادب اور تفسیر کے استاد مقرر ہو گئے تھے لیکن ساتھ ہی وہ مولانا مودودیؒ اور پھر مولانا الیاسؒ کی تبلیغی تحریک میں کافی متحرک رہے اور اس کے بعد مولانا نے جو تصنیفات عربی اور اردو میں لکھیں ان کا انداز مولانا مودودیؒ اور عربی مدارس کے علماء ومصنفین سے جدا تھا' ان تصنیفات کا امتیازی وصف گہری تحقیق' وسیع نظر اور سوز دروں کے ساتھ اصلاحی پیغام تھا۔ یہ امتیازی اوصاف مولانا کی شہرہ آفاق عربی کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" میں موجود ہیں' یہ کتاب 1946ء میں مکمل ہو گئی تھی' اس کا اردو ترجمہ "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" 1947ء میں عربی اصل سے تین سال قبل چھپا۔

عربی اصل کتاب مصر کے ایک مشہور علمی ادارے کی طرف سے 1950ء میں چھپی اور اپنے اچھوتے عنوان کی وجہ سے اس نے جلد ہی عرب مصنفین کو اپنی

طرف متوجہ کیا' عرب ممالک میں اس کی بے حد پذیرائی ہوئی۔ اس کتاب کی اشاعت کی وجہ سے مولانا اپنے مصر' سوڈان' اردن اور دمشق کے سفر میں بہت مقبول و معروف ہوئے' اس کتاب کے دسیوں قانونی اور غیر قانونی ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور عرب ممالک کی بہت سے یونیورسٹیوں میں یہ ریفرنس کی کتاب ہے۔ سید قطب شہید جیسے عظیم مصنف نے اس کی تعریف میں ایک طویل مقدمہ لکھا ہے' اور دنیا کی بیشتر زبانوں انگلش' فرنچ' جرمن' اٹالین' انڈونیشی' ترکی' فارسی وغیرہ میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے' انگریزی میں اس کا نام ہے Islam and the world

مولانا مرحوم کی تصنیفات کی فہرست بہت طویل ہے' ایک نوجوان ندوی مصنف طارق زبیر نے مولانا کی عربی تصنیفات کی تعداد 76 اور اردو تصنیفات کی تعداد 268 بتائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا مرحوم کی بہت سی عربی کتابوں کے اردو تراجم شائع ہوئے ہیں اور بہت سی اردو کتابوں کے عربی تراجم شائع ہوئے ہیں' اس لئے کتابوں کی یہ تعداد ہے' جن میں چھوٹی بڑی سب کتابیں یعنی کتابیں اور مختصر رسائل شامل ہیں' مذکورہ بالا ندوی مصنف کی کتاب کا نام ساحتہ الداعیۃ المجاہد الامام ابوالحسن علی الحسنی الندوی و مولفاتہ العربیۃ ہے جو 1998ء میں انڈیا میں چھپی ہے۔

ان میں مشہور کتب ماذا خسر العالم..... کے علاوہ تاریخ دعوت و عزیمت (اردو چھ اجزاء سات جلدیں) ایک حوالہ کی انتہائی وقیع کتاب ہے' اس میں ان اہم شخصیات کی زندگیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے' جنہوں نے مختلف ادوار میں اسلام کے جسم میں نئی روح پھونکی اور اعلیٰ فکری و روحانی کارنامے انجام دیئے۔ یہ کتاب عربی زبان میں 4 جلدوں میں دمشق سے چھپی ہے۔ ایک اہم کتاب اسلام کے بنیادی ارکان پر "ارکان اربعہ" کے نام سے ہے' یہ بھی عربی میں ترجمہ ہو چکی ہے' یہ نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج کے موضوع پر ایک تفصیلی اور تحقیقی کتاب ہے اور تاریخ دعوت و عزیمت کی طرح کافی مقبول ہے' ایک اور فکر انگیز اور مفید کتاب "مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" ہے جو اپنے تجزیاتی اور تنقیدی اسلوب کی وجہ سے بڑی مقبول ہوئی ہے۔

پرانے چراغ (3 جلدیں) ان شخصیات کے سوانحی خاکے ہیں جن سے مولانا کا تعلق رہا' یہ کتاب اردو ادب کا بھی ایک شہ پارہ ہے' مولانا مرحوم کی دل آویز اور اثر انگیز اردو تحریر کی تعریف ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مرحوم اور آل احمد سرور جیسے نقادانِ فن نے کی ہے۔ سات جلدوں میں مولانا مرحوم کی آپ بیتی "کاروانِ زندگی" آپ بیتی ہی نہیں بلکہ برصغیر اور عالم عرب کی ایک دینی' اجتماعی' سیاسی اور فکری تاریخ اور معلومات کا ایک خزانہ ہے۔

جہاں تک مولانا مرحوم کی عربی تحریر' اس کی شگفتگی' دلآویزی اور اثر انگیزی کا تعلق ہے اس پر مصر و شام اور سعودی عرب و عراق و مراکش وغیرہ کے ادباء یکساں طور پر رطب اللسان ہیں' مولانا کی کتاب "مختارات" جو عربی کے نثری ادب کا انتخاب ہے' بعض عرب ممالک کے انٹر کالجوں میں داخل ہے اور ادبائے عرب کا اتفاق ہے کہ یہ عربی ادب کا بہترین مجموعہ Anthology ہے۔ افسوس ہے کہ درس نظامی کو پڑھنے والے عربی مدارس اس کتاب سے اپنے تعصب کی وجہ سے محروم ہیں' اور پست درجہ کی کتابیں لغۃ الیمن و لغۃ العرب پڑھاتے ہیں۔ مولانا نے یہ کتاب ندوہ کے طلبہ کے لئے 1943ء میں لکھی تھی' اور اس نے ندوہ سے سینکڑوں عربی ادیب پیدا کئے ہیں' مولانا مرحوم کی عربی تحریر کی دلکشی اور جمال پوری آب و تاب کے ساتھ "روائع اقبال" میں دیکھا جا سکتا ہے' جو ناچیز راقم الحروف نے دمشق یونیورسٹی میں اپنی تعلیم کے دوران 1957ء میں دمشق کے مشہور اشاعتی ادارے دارالفکر سے چھپوائی تھی' اور پھر متعدد بار چھپی' یہ علامہ اقبالؒ کی بعض شاہکار نظموں اور غزلوں کا عربی ترجمہ ہے' عالم عرب میں علامہ اقبالؒ کی شاعری اور فکر کا اس سے بہتر تعارف کسی نے نہیں کرایا ہے' علامہ اقبالؒ کا

شعر:

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام

مسجد قرطبہ کے ساتھ خود ان کے فکری عمل پر صادق آتا ہے اور اسی طرح مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی فکری تخلیقات پر یہ شعر صادق آتا ہے کہ مولانا کی نثری اور اقبال کی شعری کاوشوں کا منبع دونوں کا زندہ و متحرک ایمان، نفس گرم، جذب دروں اور عشق اسلام و عشق رسول ہے۔

مولانا مرحوم کی تحریروں کو عرب و عجم اور مشرق و مغرب میں جو مقبولیت بیسویں صدی کی آخری تہائی میں حاصل ہوئی وہ کسی ہندوستانی یا پاکستانی مصنف بلکہ کسی عرب مصنف کو بھی نصیب نہیں ہوئی ہے۔ سید قطب کی تصنیفات ضرور بہت مقبول ہیں لیکن وہ صرف بیشتر عالم عرب میں، برصغیر میں بہت کم لوگ ان سے فیضیاب ہوئے ہیں۔ مولانا مودودیؒ کی تحریریں برصغیر میں بہت مقبول رہی ہیں اور ہیں، کسی زمانے میں عرب نوجوانوں اور اصحاب فکر میں وہ کافی مقبول تھیں، لیکن اب جو مقبولیت اور کثرت اشاعت مولانا مرحوم کی کتابوں کو حاصل ہے وہ مولانا مودودیؒ کی کتابوں کو کبھی حاصل نہیں ہوئی، بات یہ بھی ہے کہ مولانا مودودی مرحوم کی تحریریں صرف دماغ کو اپیل کرتی ہیں جبکہ مولانا مرحوم کی تحریریں دل و دماغ دونوں کو اپیل کرتی ہیں، اقبالؒ کے شعروں کی طرح دلوں کو گرماتی ہیں، ان میں ایمان کی حرارت پیدا کرتی اور ان کو متحرک کرتی ہیں۔

اعملی سرگرمیاں: نصف صدی تک مولانا کے قلم سے تصنیفات کا ایک سیل رواں جاری رہا ہے، بیک وقت اردو میں بھی اور عربی میں بھی لیکن اس کے ساتھ ہی مولانا مرحوم ایک طرف اپنی مادر علمی ندوہ کی ترقی میں کوشاں رہے، جس نے ان کے عہد میں وہ ترقی کی ہے، جس کا شبلی اور سید سلیمان ندوی نے خواب بھی نہ دیکھا تھا، 1955ء تک اس میں صرف ایک منزلہ ہوسٹل دارالاقامہ شبلی تھا اور ایک درسگاہ کی عمارت جو ہر چند کہ شاندار تھی، لیکن اسی میں چھوٹے بچوں کا ہوسٹل اور لائبریری بھی نہیں، میں نے اپنے زمانے 49-1948ء میں یہی دیکھا تھا، اب 1996 میں جا کر دیکھا تو دنیا ہی دوسری ہے، چار منزلہ اسٹوری ہوسٹل، لائبریری کی شاندار چار منزلہ عمارت لفٹ کے ساتھ، مجلس تحقیقات علمی کی علیحدہ عمارت اور کانفرنس ہال، ندوہ سے نکلنے والے مختلف عربی و اردو رسائل کے علیحدہ دفاتر، کمپاؤنڈ کے اندر ہی پوسٹ آفس، اسٹیٹ بینک کی شاخ، ایڈمنسٹریشن کے علیحدہ دفاتر وغیرہ غرض ایک نئی دنیا، یہ سب کچھ مولانا کی نظامت (سیکریٹری شپ) کے عہد میں ہوا اور حقیقت ندوہ کے قیام اور پھر اس کے انتظام اور ترقی میں اس خاندان کا بڑا حصہ رہا ہے، مولانا مرحوم کے والد ندوہ کے ناظم رہے، اپنی وفات یعنی 1923ء تک، پھر ان کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب اپنی وفات 1963ء تک ناظم رہے، اور اس کے بعد مولانا علی میاں مرحوم۔ یہ عہدہ بالکل ایسا تھا جیسا کہ علی گڑھ کالج اور پھر یونیورسٹی میں سیکریٹری کا عہدہ رہا ہے۔

اپنے شدید دعوتی انہماک، مسلسل اندرون ملک اور بیرون ملک اسفار، اور پیہم تصنیفی مشغولیت کے ساتھ دارالعلوم ندوہ پر یہ توجہ اور پھر اس کی یہ عظیم الشان اور غیر معمولی ترقی، اس کو مولانا مرحوم کا ایک کراماتی کارنامہ ہی کہا جا سکتا ہے، پھر یہ کہ مولانا مرحوم کے عہد میں ندوہ کے ساتھ ملحق لیکن فاصلہ پر علیحدہ دینی و عربی درسگاہ طالبات کے لئے بھی قائم کی گئی ہے، جو پوری کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے، اس کے علاوہ ہندوستان کے طول و عرض میں بلکہ نیپال و بنگلہ دیش میں ندوہ کا نصاب پڑھانے والی دینی درسگاہیں قائم ہو گئی ہیں جن میں تعلیمی سرٹیفکیٹس ندوہ سے صادر ہوتے ہیں، بالکل اس طرح جیسے کیمبرج کے اے لیول اور او لیول کے امتحانات ہندو پاکستان میں ہوتے ہیں۔

اور پھر اس تعلیمی ترقی کے ساتھ ایک تحقیقی تصنیفی ادارہ یعنی "مجلس تحقیقات ونشریات اسلام" کے نام سے 1959ء میں

قائم کیا انگریزی میں اس کا نام۔

Academy of Islamic Research and Publications

رکھا گیا اور اس سے عربی اردو انگریزی اور ہندی میں دو سو سے زائد چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہو چکی ہیں' جن کی مانگ ساری دنیا میں ہے۔

مولانا مرحوم کی توجہ کا مرکز صرف ندوہ اور ہندوستان و سعودی عرب کی جامعات ہی نہیں تھیں بلکہ وہ مغربی طرز پر قائم یونیورسٹیوں اور خاص طور پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بھی ایسی ہی محبت رکھتے تھے جیسے ندوہ سے ایسی وجہ ہے کہ 1994 میں جب علی گڑھ یونیورسٹی میں حبیب الرحمٰن شروانی ہوسٹل قائم کیا گیا تو اس موقعہ پر افتتاحی جلسہ میں مولانا مرحوم کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے بلایا گیا بلکہ ان کے لئے ایک اعزازی جلسہ کیا گیا اس جلسہ میں جو خطاب مولانا نے کیا اس میں سر سیدؒ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے علی گڑھ کے طلبہ کو بڑے مفید مشورے دیئے۔

اسی طرح آکسفورڈ یونیورسٹی بھی مولانا کی دعوت اسلامی فکر و عزیمت کی جولان گاہ رہی' پروفیسر خلیق نظامی مرحوم اور ان کے فرزند ڈاکٹر فرحان نظامی نے جب یونیورسٹی میں ایک سینٹر آف اسلامک اسٹڈیز قائم کرنے کا منصوبہ بنایا تو خلیق صاحب مرحوم کی نظر اس کے افتتاح اور صدارت کے لئے مولانا مرحوم پر پڑی' مولانا مرحوم 1983ء میں آکسفورڈ تشریف لے گئے صدارتی خطاب پیش کیا' آپ کی قیادت میں وہاں یہ سینٹر قائم ہوا جس کے آپ تاحیات چیئرمین رہے اور ہر دو سال بعد اپنے ضعف و بیماری کے باوجود وہاں تنظیمی اجلاس میں شرکت کرتے رہے۔

امریکہ کا پہلا سفر انہوں نے 1977ء میں آنکھ کے آپریشن کے لئے کیا تھا لیکن دو ماہ وہاں قیام کے دوران آپ نے دسیوں جلسوں اور مختلف شہروں میں مسلمانوں اور امریکنوں کو خطاب کیا' پھر دوسرا سفر 1994ء میں کیا' جب آپ وہیل چیئر پر رہتے تھے' Gout کی وجہ سے چلنا پھرنا مشکل تھا' یہ سفر شکاگو میں ایک جلسہ میں خطاب کرنے کے لئے وہاں کی دعوت پر تھا۔

اس کے علاوہ ہندوستان میں مسلمانوں کو موت و حیات کے جو مراحل پیش آتے رہے اور جن چیلنجوں کا ان کو وقتاً فوقتاً سامنا کرنا پڑا' مولانا مرحوم اس میں پیش پیش تھے' وہ صرف گوشہ عافیت میں بیٹھ کر لکھنے والے ایک مصنف نہ تھے' انہوں نے وہاں کے سربرآوردہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر مختلف برسوں میں متعدد تنظیمیں قائم کیں' جیسے مسلم مجلس مشاورت' دینی تعلیمی کانفرنس' مسلم پرسنل لاء بورڈ وغیرہ' وہ ان تمام تنظیموں کی صدارت کرتے رہے' انہوں نے فساد زدہ خطرناک علاقوں کے دورے بھی کئے اور صوبائی و مرکزی حکومتوں کو مسلمانوں پر زیادتی کے سلسلہ میں متنبہ بھی کیا' مولانا مرحوم کا ایک بڑا کارنامہ مسلم پرسنل لاء کو محفوظ کرنا تھا۔ اس سلسلہ میں مولانا مرحوم نے اندرا گاندھی' راجیو گاندھی' وی پی سنگھ وغیرہ سے ملاقاتیں کیں ان کو خطوط لکھے' وفد لیکر ان سے ملتے رہے' اسی ضمن میں ان کا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے راجیو گاندھی پر اپنی خدا پرستی اور خلوص و سچائی کا ایسا اثر ڈالا کہ ہائی کورٹ یا فیڈرل کورٹ کے فیصلہ کے خلاف راجیو گاندھی نے پارلیمنٹ کا ایک خاص اجلاس بلا کر ایک ایکٹ پاس کرایا جس کی رو سے مسلمانوں کے پرسنل لاء میں حکومت و عدالت کو دخل کرنے کا کوئی اختیار نہ ہوگا۔

اور پھر آخری زمانہ یعنی 1998ء میں جب ہندوستانی مرکزی حکومت نے سرکاری اسکولوں میں بندے ماترم صبح کا گانا اور سرسوتی دیوی کی تصویر کے آگے جھکنے کو ضروری قرار دیا' اور مسلمانوں کا احتجاج کوئی کام نہ کر سکا تو مولانا مرحوم نے اپنے T.V کے انٹرویو میں علی الاعلان یہ کہا کہ اگر حکومت نے اپنا یہ حکم واپس نہ لیا تو وہ مسلمانوں کو یہ مشورہ دیں گے کہ وہ اپنے بچوں کو سرکاری اسکولوں سے ہٹالیں' مسلمان ایک خدائے واحد کے پرستار ہیں وہ کسی دیوی' دیوتا کے آگے سر نہیں جھکا سکتے'

اس مجاہدانہ بیان پر مولانا مرحوم کے پتلے بنا کر ہندوؤں نے جلائے' لیکن مرکزی حکومت کو بالآخر جھکنا پڑا' اور اس نے اپنا حکم واپس لیا' اور مسلمانوں کے لئے بندے ماترم گانا اور سرسوتی کی پوجا اسکولوں میں کرنا ضروری نہ رہا' لیکن ہندو متعصبوں نے اس کے بعد مولانا کی قیام گاہ تکیہ' رائے بریلی پر دھاوا بولا' خوش قسمتی سے مولانا اس رات وہاں نہیں' لکھنو میں تھے' بعد میں صوبائی حکومت نے اس پر معذرت پیش کی۔

اس سب کے پیش نظر مولانا کی وفات سے ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک بڑا سہارا اٹھ گیا ہے اور وہ سب اپنے آپ کو یقیناً یتیم محسوس کر رہے ہوں گے۔

اسی طرح مولانا عرب ممالک میں اسلام پرست عربوں کا بڑا سہارا تھے کیونکہ وہ عرب قومیت کے خلاف جمال عبدالناصر کے زمانے سے ایک ننگی تلوار تھے' انہوں نے اپنی بے شمار عربی تحریروں اور تقریروں میں اس "ابوجہلیت" کے خلاف مردانہ وار آواز اٹھائی' جبکہ بہت سے عرب علماء اس رو میں بہہ گئے تھے' مولانا پوری استقامت اور جواں مردی کے ساتھ امت مسلمہ اور اس کی وحدت کے تصور پر قائم رہے' اسی طرح ان کی تحریروں میں لادینیت اور اشتراکیت پر زبردست کاٹ ہے۔

سعودی عرب اور خلیجی امارات و حکومات کے اسلام پرست عناصر کے لئے بھی وہ ایک بڑا سہارا تھے' کیونکہ وہ بار بار ان ملکوں میں جانے کے باوجود حکمرانوں کی دولت سے مستغنی تھے' اور ان کی عیش و عشرت کی زندگی اور ان کی امریکہ و مغرب پرستی پر بے لاگ اور تعمیری تنقید کرتے تھے' جو وہاں کے لوگ خود نہیں کر سکتے تھے' مولانا مرحوم کو جو مقبولیت و محبوبیت عرب ممالک میں حاصل تھی وہ کسی طرح اس سے کم نہیں تھی جو ان کو ہندوستان میں حاصل تھی' بلکہ عرب تو ان کو برکۃ العصر (برکتِ زمانہ) کہتے تھے۔

اسی طرح مولانا مرحوم ترکی میں انتہائی محبوب و مقبول تھے' اور وہ 1987ء سے برابر ترکی ہر دو تین سال میں جاتے تھے' جہاں ان کی قائم کردہ اسلامی ادبی تنظیم رابطہ ادب کا پہلا اجلاس ہوا' اور بعد میں بھی متعدد اجلاس ہوئے' ترکی میں مولانا مرحوم کے اعزاز میں ایک یادگار سیمینار 1996ء میں منعقد ہوا' جس میں مصر' سعودی عرب' قطر' اردن' دمشق' مراکش اور ترکی کے ممتاز دانشوروں اور یونیورسٹی پروفیسروں نے مولانا مرحوم کے افکار اور شخصی اوصاف پر مقالات پڑھے' اور وہاں کے T.V نے یہ پروگرام نشر کیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ترکی زبان میں مولانا مرحوم کی انتیس کتابوں کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں' مولانا نے خود اپنی کتاب کاروان زندگی میں فرمایا ہے کہ "غیر عربی اور غیر اردو ملک میں ہماری عربی تصنیفات کے ترجمے اتنے شائع اور مقبول نہ ہوئے جتنے ترکی زبان میں ہوئے" (6)

مولانا کی شخصیت: مولاناؒ نے بڑی دلنواز شخصیت پائی تھی' وہ انتہائی متواضع' نرم خو' خوش گفتار' سنجیدہ و متین' بلند حوصلہ' سادہ مزاج انسان تھے' لیکن ان کی تواضع گردن جھکائے رکھنے والے تصنع پسند صوفیوں کی سی نہ تھی اور نہ ان کی سنجیدگی و متانت میں وہ خود پسندی اور کرختگی تھی جو بعض اہلِ علم میں پائی جاتی ہے' ہر وہ شخص جس کو مولانا مرحوم کی شاہانِ وقت اور مختلف سربراہانِ مملکت سے ملاقاتوں کا حال معلوم ہے وہ مولانا کی عزت نفس' خودداری اور عالی حوصلگی کی شہادت دے گا' ایسے بڑے لوگوں کے سامنے مولانا مرحوم نے کبھی اپنے آپ کو کمتر نہ سمجھا' وہ اپنے دینی بزرگوں' اپنے رفقاء بلکہ اپنے طلبہ کے ساتھ تواضع کے سلوک کرتے تھے' لیکن دنیاوی جاہ و جلال رکھنے والوں کے سامنے گردن نیچی نہیں کرتے تھے' مولانا مرحوم نے 1951ء میں اپنے شام و اردن کے سفر سے واپسی پر مدینہ منورہ میں اس خاکسار راقم اور دوسرے اپنے دو شاگردوں کو اردن کے شاہ عبداللہ مرحوم سے اپنی ملاقات کا ذکر سنایا کہ جب شاہ ان کے استقبال کے لئے آگے بڑھے تو مولانا نے ان کے سامنے اسلام علیکم کے بعد چوتھی صدی ہجری کے مشہور بغدادی شاعر الشریف الرضی کے وہ مشہور شعر پڑھے جس میں اس نے عباسی

خلیفہ کو مخاطب کر کے کہا تھا:

"جب فخر کی بات ہو گی تو یہ یاد رہے کہ ہم دونوں عالی نسبی میں شریک ہیں فرق اتنا ہے کہ آپ کو خلافت ملی ہوئی ہے اور میں اس سے محروم ہوں"

اپنے بزرگ اور شفیق استاد کے اس قصہ سے متاثر ہو کر راقم الحروف نے بھی 1991ء میں اسلامی تہذیب کی کانفرنس کے موقعہ پر جب شاہ عبداللہ کے پوتے ملک حسین سے کھڑے کھڑے تمام مندوبین کے ساتھ ملاقات کی تھی' تو عربی میں کہا تھا کہ جلالۃ الملک (یور میجسٹی) اجازت دیں تو عرض کروں کہ ہم دونوں چچازاد بھائی ہیں' لیکن آپ کو فضیلت حاصل ہے کہ آپ بڑے بھائی سیدنا حسنؓ کی اولاد میں سے ہیں' تو شاہ حسین نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا کہ اہلاً وسہلاً ہذا بلدک (یہ تمہارا اپنا ہی ملک ہے)۔

اسعودی عرب کے مختلف بادشاہوں سے مولانا مرحوم کی ملاقاتیں اور مراسلت رہی۔ مولانا برابر ان کو مخلصانہ اور دردمندانہ نصیحتیں کرتے رہے' بلکہ شاہ فیصل کو ایک بار جو حکمت آمیز نصیحت کی تھی اس پر تو شاہ کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی تھی' اس قصہ کا ذکر مولانا نے اپنے خود نوشت سوانح حیات میں نہیں کیا ہے جیسے تواضعاً اور بہت سے اپنی ذات سے متعلق واقعات کا ذکر نہیں کیا ہے' لیکن خورشید ندیم صاحب نے 12 جنوری 2000ء کے جنگ میں اپنے کالم "ایک عظیم روایت کا خاتمہ" میں اس واقعہ کا ذکر کر دیا ہے' خاکسار راقم کو بھی یہ واقعہ پہلے سے معلوم تھا۔

صدر ضیاء الحق مرحوم کی مولانا سے عقیدت کو میں نے خود 1986ء میں اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کراچی میں دیکھا۔ اس خاکسار راقم کے نزدیک مولانا مرحوم کی شخصیت و صفات کی تصویر بہت پہلے ان ہی کے محبوب شاعر اقبال نے اپنی بصیرت سے "مسجد قرطبہ" نامی مشہور نظم کے مندرجہ ذیل اشعار میں کھینچ دی تھی:

خاکی و نوری نہاد' بندہ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل' اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب' اسکی نگہ دل نواز
نرم دم گفتگو' گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز
نقطہ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقین
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

ان اشعار کا ایک ایک لفظ مولانا مرحوم کی شخصیت پر صادق آتا ہے' مولانا مرحوم کے علم کو تو سب لوگ جانتے ہیں' لیکن ان کی للّٰہیت کو ان کے معاصر بزرگ مولانا الیاسؒ' شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ' خود ان کے شفیق استاد تفسیر اور ان کے پہلے مرشد مولانا احمد علی لاہوریؒ وغیرہ اور ان سے قریب ان کے شاگرد اور خدام ہی جانتے ہیں' اور اسی للّٰہیت کے سبب اللہ تعالیٰ نے ان کو خلق خدا میں محبوب بنا دیا تھا' صحیح حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب اپنے کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو وہ اپنے فرشتوں سے کہتا ہے کہ میں اپنے اس بندے سے محبت کرتا ہوں جاؤ زمین پر اعلان کر دو کہ سب اس سے محبت کریں۔

مولانا مرحوم نے نومبر 1997ء میں جب وہ اپنی رابطہ ادب اسلامی کی ایک کانفرنس میں لاہور آئے ہوئے تھے اس ناچیز راقم سے اپنا امریکہ کا ایک عجیب واقعہ سنایا' بات آنکھ کے آپریشن کی تھی جس کے لئے میں بہت دنوں سے امریکہ جانے کا ارادہ رکھتا ہوں' مولانا نے فرمایا کہ فلاڈلفیا میں جس عیسائی سرجن سے انہوں نے اپنی آنکھ کا آپریشن کرایا جس کی بینائی بارہ سال سے جا چکی تھی اور جس کے ہندوستان میں دو آپریشن ناکام ہو چکے تھے' جس امریکن ڈاکٹر نے مولانا کی اس آنکھ کا آپریشن کیا اور کامیاب۔ اس نے مولانا مرحوم سے کوئی فیس چارج نہیں کی یہ کہہ کر Your are a saint. اور میں Saints سے فیس نہیں لیتا ہوں' یہی نہیں مولانا نے بتایا کہ وہ اسپتال میں ہمارے لئے اپنے گھر سے کھانا بھی منگا کر دیتا تھا! سچ بات یہ ہے کہ اللہ اولیاء کے لئے اپنی مخلوق کو مسخر کر دیتا ہے۔

مولانا کی مخلوق سے بے نیازی اور اصحاب

جاہ و ثروت سے استغناء کے تو بیسیوں قصے ہیں نہ انہوں نے مشترکہ فیصل ایوارڈ کی ایک لاکھ ریال کی رقم میں سے اپنے پاس ایک پیسہ رکھا اور نہ 99ء میں عرب امارات کے ایوارڈ سے ملنے والے ایک ملین درہم (ایک کروڑ پچاس لاکھ روپے تقریباً) میں سے اپنے پاس کچھ رکھا بلکہ سب رقم انہی محفلوں میں مختلف تنظیموں اور اداروں کو دینے کا اعلان کر دیا۔ مولانا دمشق یونیورسٹی میں 1956ء اور مدینہ اسلامی یونیورسٹی میں 1963ء میں وزیٹنگ پروفیسر رہے کبھی ان دونوں ملکوں میں ایک پیسہ جائز معاوضہ کا نہیں لیا' ندوہ سے جہاں انہوں نے برسوں پڑھایا سن 1945ء سے تنخواہ لینا مند کر دی تھی مولانا مرحوم کو اپنی کتابوں بلکہ صرف بعض کتابوں کی رائلٹی سے جو ملتا تھا وہی رقم ان کے لئے کافی ہوتی تھی یہ بھی اگر وہ ہندو پاکستان اور عرب ممالک سے پوری طرح لیتے تو لاکھوں روپے سالانہ بنتے لیکن بیشتر ناشر تو مولانا کو کچھ بھی نہیں دیتے تھے اور بہت سی ان کی کتابیں چوری سے چھاپتے تھے لیکن مولانا مرحوم کا شعار تو یہ تھا۔

مرد درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ
ہے کسی اور کی خاطر یہ نصاب زر و سیم

اقبال کا ایک دوسرا شعر اب معمولی تغیر کے ساتھ مولانا کے استغناء اور فیض رسانی پر صادق آتا ہے۔:

ہوا تھی گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا تھا
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے تھے انداز خسروانہ

مولانا مرحوم کی "درویشی" اور خسروانہ انداز کا ذکر تو کسی قدر سطور بالا میں ہو گیا لیکن جہاں تک خیر و ہدایت اور فضل و علم کے چراغ جلانے کی بات ہے تو یہ چراغ ہندوستان کے کونے کونے میں جل رہے ہیں' بیسیوں درسگاہیں اور انجمنیں ہیں جو مولانا کی فکر' دین کے درد' اسلام پر استقامت' خودداری و خود نگری کو عام کر رہی ہیں یہ چراغ مصر میں بھی جل رہا ہے جہاں مصر کے ایک شہر منصورہ میں چند سال قبل ایک مصری عالم نے ایک اسلامک انسٹیٹیوٹ قائم کیا ہے جہاں مولانا مرحوم کی عربی' اسلامی' ادب اور تاریخ کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں یہ چراغ آکسفورڈ میں بھی جل رہا ہے 1983ء سے جس کا سینٹر آف اسلامک اسٹڈیز مولانا مرحوم کی صدارت ہی میں اور ان کی رہنمائی میں اسلامی تحقیق و فکر اسلامی کی اشاعت کا کام انجام دیتا رہا اور امید ہے کہ یہ محکم ادارہ آئندہ بھی یہ خدمات انجام دیتا رہے گا اگر یہ کہا جائے کہ:

یک چراغے است در ایں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

تو ہرگز بے جا نہ ہوگا کہ مولانا مرحوم کے جلائے ہوئے اسلامی فکر و روحانیت کے چراغ ملک ملک جل رہے ہیں۔

ا مولانا حرکت و عمل کا ایک شعلہ تھے اگر ان کے اندرون ملک اور بیرون ملک ساٹھ پینسٹھ سالہ مسلسل سفروں اور تقاریر کی کہانی مرتب کی جائے تو اس ہی سے ایک ضخیم جلد تیار ہو جائے گی ا اس اعلیٰ علمی مقام اور عبادت و ریاضت' اور انابت الی اللہ کے ساتھ مولانا مرحوم میں بذلہ سنجی بھی تھی ایک مرتبہ ایک صحبت میں فرمایا کہ امام شافعیؒ نے لکھا ہے کہ نماز میں بائیں طرف کوئی ثقیل الدم (بد مذاق و بے ذوق) آدمی ہو تو صرف دائیں طرف سلام کہنا ہی کافی ہے' ایک مرتبہ ندوہ میں اپنے ایک عزیز شاگرد سے جو وہاں کی یونین میں صرف کرتے پائجامے میں تقریر کرنے جا رہے تھے فرمایا کہ کیا بغیر شیروانی کے بھی تقریر کی جا سکتی ہے' پھر وہ گھر سے جلدی شیروانی پہن کر گئے۔

ا مولانا کا لباس لکھنو کے عام شرفاء کا لباس تھا' شیروانی اور اسی کپڑے کی کشتی نما ٹوپی یا رام پور کی مخمل کی ٹوپی حجاز مقدس جانے کے بعد سے مولانا ٹوپی پر ایک سفید حجازی رومال بھی اوڑھنے لگے تھے' پاؤں میں ہاف شوز اور موزے' انہوں نے ہندوستان کے بہت سے علماء کا خود ساختہ لباس نہیں پہنا جس کو پہن کر اچھا خاصا آدمی مولانا مودودی کے الفاظ میں قرون وسطیٰ کا انسان لگنے لگتا ہے۔ وہ اپنے کریمانہ اخلاق اور وسیع المشربی کے سبب مغربی تعلیم یافتہ حلقوں میں بھی اتنے ہی مقبول و محبوب تھے جتنے دینی حلقوں میں۔

آج سے 54 سال قبل جو بات مولانا

مرحوم نے مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی وفات پر کہی تھی وہی میری زبان سے اپنے مولانا مرحوم کی وفات پر نکلی کہ ہم تو بے چین و غمگین ہیں لیکن مرحوم کو برسوں کی مسلسل جدوجہد اور انتھک دعوتی کاموں اور اسفار کے بعد اب قبر میں اللہ نے آرام مہیا کیا[1] مولانا مرحوم کے الفاظ مولانا محمد الیاسؒ کی وفات پر یہ تھے "عمر بھر کا تھکا مسافر کہ شاید کبھی اطمینان کی نیند سویا ہو منزل پر پہنچ کر میٹھی نیند سویا"

یہ خاکسار راقم اس جملہ پر اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہے کہ مولانا محمد الیاسؒ تو عمر بھر کے اتنے تھکے مسافر نہ تھے جتنے مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کیونکہ اول الذکر پر اپنی تبلیغی سرگرمی کے علاوہ کوئی بوجھ نہ تھا لیکن مولانا مرحوم پر تصنیف و تالیف کا مسلسل بوجھ تھا' اندرون ملک اور بیرون ملک سینکڑوں سفر تھے' کانفرنسوں کا بوجھ تھا' مختلف تعلیمی و تحقیقی اداروں اور دینی سیاسی تنظیموں کا بوجھ تھا' سینکڑوں جگہ تقریر کرنے کا بوجھ تھا' جتنا مولانا علی میاںؒ تھکے تھے شاید ہی برصغیر میں کوئی عالم اور اہل اللہ اتنا تھکا ہو حتیٰ کہ آٹھ نو ماہ قبل فالج کے حملہ کے بعد اور تین چار ماہ کے بعد افاقہ ہونے کی صورت میں مولانا مرحوم نے پھر فکری کاوش (Activity) شروع کر دی تھی' مضمون املاء کرانا شروع کر دیے تھے ان کا آخری اہم کام مسلم پرسنل لاء بورڈ کے اجلاس کے لئے صدارتی خطبہ تھا جو مولانا نے املاء کرا کے احمد آباد بھجوایا کہ سفر نا ممکن تھا' فردوس بریں کے اس پاکباز مسافر کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بہت نوازا' آپ پر مختلف ممالک میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے چار مقالے لکھے گئے' زندگی کے آخری برسوں میں متعدد کتابیں اردو اور عربی میں آپ کی زندگی پر لکھی گئیں جن میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں:

1- مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مشاہیر واکابر کی نظر میں' تصنیف مولانا ممشاد علی قاسمی۔ دہلی 1998ء

2- سماحة الداعية المجاهد ابوالحسن علی الحسنی الندوی ومولفاته العربية (عربی زبان میں مولانا مرحوم پر تصنیف محمد طارق زبیر ندوی انڈیا 1998ء میں عربی تصانیف کی فہرست و تعارف)

3- ابوالحسن علی الحسنی الندوی الامام المفكر والداعية الاديب (عربی) تصنیف عبدالماجد الغوری دار ابن کثیر دمشق 1998

4- الاستاذ ابوالحسن کا تاباد مفکرا (عربی) از ندز الحفیظ الندوی ۔ انڈیا (یہ مولانا کی تصنیفات کی ببلیو گرافی ہے)۔

5- میر کارواں (اردو) از مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی دہلی نومبر 1999ء یہ سب سے آخری کتاب ہے جو مولانا مرحوم کی وفات سے ڈیڑھ دو ماہ قبل چھپی اور مولانا کے ایک ایسے شاگرد رفیق کے قلم سے ہے جو مولانا مرحوم سے تقریباً ساٹھ سال وابستہ رہے' یہ سب سے عمدہ سوانح حیات اور بیان فکر ہے۔

آخر میں سب سے اہم مولانا مرحوم کی خود نوشت کاروان زندگی ہے (سات جلدیں مجلس نشریات اسلام ناظم آباد نمبر 1 کراچی) جو اردو زبان کے خود نوشت سوانحی ادب میں ایک سنگ میل ہے۔

مولانا مرحوم کے لئے ہم سب کی دعائیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو منور کرے' ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کے فیض علمی و روحانی کو جاری و ساری رکھے آمین۔

حواشی

(1) اس کی تفصیل ملاحظہ ہو' حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی' اکابر و مشاہیر امت کی نظر میں (مطبوعہ دہلی 1998ء)

ص204، 217

(2) کاروان زندگی از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جلد اول ص356 (مجلس نشریات اسلام کراچی)

(3) شاہ فیصل کے عہد سے حرم شریف کی توسیع و تعمیر سے قبل حرم شریف کے صحن میں چاروں طرف چھوٹی چھوٹی کنکریاں بچھی ہوتی تھیں اور ان پر دری کی صفیں اور بیچ بیچ میں سیاہ پتھروں کی راہداریاں یا روشیں تھیں' ان کنکریوں کو عربی زبان میں حصباء کہا جاتا ہے۔ حجاز کی لوکل یا مقامی عربی میں ان کو حصوہ (ح پر زبر اور ص پر جزم) کہا جاتا ہے اس نرم نیچرل فرش پر رات کو گرمی میں لوگ سو بھی جاتے تھے کبوتران حرم کو دانہ بھی انہیں پر ڈالا جاتا تھا اور ہر دو تین ماہ بعد ان کو بدل کر نئی کنکریاں بچھائی جاتی تھیں۔

(4) اس وقت مصلی شافعی سے اذان دی جاتی تھی جہاں سے صرف چند گز کے فاصلے پر مطاف اور کعبۃ اللہ تھا اب توسیع حرم کے بعد یہ مئذنہ کافی دور اندر کی سمت ہو گیا ہے۔

(5) ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ "سید عبداللہ شاہ غازی اور تاریخ" (اس کی تصنیف "تحقیقات و تاثرات" میں مطبوعہ لاہور 2000ء

(6) کاروان زندگی حصہ ششم ص296

میری زندگی کا پہلا تجربہ

یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا کہ میں ایک عظیم اسلامی سلطنت کی مسلح فوجوں سے ملاقات اور ان سرفروش مجاہدین سے خطاب کر رہا تھا، جنہوں نے اپنی زندگی اسلام اور اسلامی مملکت کے دفاع، اسلامی مقدسات کے تحفظ اور اپنی جانب سے ہر آنے والے خطرہ کے مقابلہ کے لئے وقف کر دی، جب مسلح نوجوان صف بستہ کھڑے ہوئے اور اسلامی طریقہ کے مطابق ہم کو سلامی دی اور یہ منظر میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا، تو میرے جسم میں عزم و ایمان اور سرخوشی و سرشاری کی ایک لہر دوڑ گئی، اور طرب و اہتراز کی ایسی کیفیت طاری ہوئی جو اس سے پہلے کبھی نہیں محسوس ہوئی تھی، اس کیفیت سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میری طبیعت رواں ہو گئی اور زبان و ذہن سے پہلے زبان دل سے گفتگو شروع کرتے ہوئے میں نے کہا:

"میرا نشو و نما ایک علمی اور دینی ماحول میں ہوا ہے، مجھے صاحب فکر، صاحب علم اور اہل قلم حضرات کی صحبت سے فیضیاب ہونے اور بے شمار ایسے اجتماعات اور مجالس میں شرکت کرنے کا موقع ملا ہے جن میں علماء اور مقررین کی کثرت ہوتی تھی، جن میں بہت سی یکتائے روزگار شخصیات جلوہ افروز ہوتی تھیں، لیکن آج جو سرشاری، جو رقت، جو خشوع اور جو سعادت و لذت محسوس کر رہا ہوں وہ زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں محسوس ہوئی تھی، اگر میرے بس میں ہوتا اور اس کی اجازت ہوتی تو میں ہر فوجی کی دست بوسی کی کوشش کرتا کیونکہ آپ کا ہاتھ اسلام کے لئے برسرپیکار ہے، آپ کا ہاتھ اسلئے ہتھیار پکڑتا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی مدافعت کرے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "برابر نہیں وہ مسلمان جو بلا کسی عذر کے گھر میں بیٹھے رہیں، اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا درجہ بہت زیادہ بنایا ہے جو اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرتے ہیں بہ نسبت گھر بیٹھنے والوں کے۔"

آپ اسلامی ممالک کے پاسبان ہیں، مسلمان بچوں اور عورتوں کی عزت و آبرو کے نگہبان ہیں، ان مسجدوں کے تقدس اور ان دینی اداروں اور تعلیم گاہوں کے سکون کے محافظ ہیں، جہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ذکر ہوتا ہے، اسلام کی تبلیغ ہوتی ہے، علم کی اشاعت ہوتی ہے، فرائض و سنن کی تعلیم ہوتی ہے، تزکیۂ نفس اور احوال کی اصلاح ہوتی ہے، اسلامی سرحدوں کے پاسبانو! اور نگہبانو! اگر آپ نہ ہوتے، آپ کی جانبازی اور سرفروشی نہ ہوتی اور آپ کی شجاعت و جوانمردی نہ ہوتی تو مؤذنوں کے لئے اذان کی آواز بلند کرنا ناممکن ہو جاتا، نمازیوں کے لئے خدا کے گھر میں فرض کی ادائیگی مشکل ہو جاتی، علم کی اشاعت اور اس امانت کو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کرنے کا کوئی مرکز نہ ہوتا، بوڑھوں، عورتوں اور کمزوروں پر سکون کی نیند حرام ہو جاتی، تاجروں کو اپنی تجارت اور پیشہ وروں کو اپنے پیشوں سے اشتغال دشوار ہو جاتا، ہر مذہبی شعار ہر علمی مصروفیت اور زندگی کے ہر عمل پر آپ کا احسان ہے خواہ کوئی اعتراف کرے یا نہ کرے۔

(حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ)

(اردن، اسرائیل سرحد پر تعینات فوجیوں سے خطاب)

میرے علی بھائیؒ!

پروفیسر عطیہ خلیل عرب

چیئرپرسن شعبہ عربی جامعہ کراچی

علمی، دینی اور عربی زبان واسلامی ادب کے ستون، فقید المثال، معتبر داعی اسلام، ادیب وخوش بیاں مقرر عارف باللہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایک شخص نہیں بلکہ ایک پوری علمی ودینی کائنات کا نام ہے۔ مسلمانان ہند کے لئے ان کا وجود حصن حصین (مضبوط قلعہ) کا درجہ رکھتا تھا، یعنی بقول شاعر

وماکان قیس ھلکه ھلك واحد

و لکنه بنیان قوم تھد ما

شاعر کہتا ہے کہ (قیس کی موت کسی فرد واحد کی موت نہیں بلکہ اس کی موت سے تو پوری قوم کی بنیادیں متزلزل ہوگئیں)

یا یوں کہیئے ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں

تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ہمارے خاندان کا علی میاں کے گھرانے سے دیرینہ علمی، دینی اور گھریلو رشتہ وتعلق ہے نسلاً بعد نسل یہ رشتہ انشاءاللہ قائم رہے گا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء ایک تاریخی اور تاریخ ساز بین الاقوامی دینی وتعلیمی ادارہ ہی نہیں بلکہ اسلامی تربیت گاہ بھی ہے۔ یہاں عظیم ترین اہل علم نے عربی زبان اور دینی علوم کی سرپرستی اور نشر واشاعت کے فرائض انجام دیئے ہیں، ہمارا اس دارالعلوم سے قلبی، روحانی اور آبائی تعلق ہے جبکہ ہمارے دادا جو عربی النسل تھے وہ اس کے شیخ الحدیث اور نانا سید امیر علی ملیح آبادی شیخ التفسیر رہے اور والد مرحوم علامہ خلیل عرب اپنے وقت کے شیخ الادب العربی تھے۔

علی بھائی میرے والد کے محبوب ومایہ ناز شاگرد اور ان کے فاضل اجل والد حضرت مولانا سید عبدالحئی حسنی مصنف "نزھۃ الخواطر" میرے دادا شیخ محمد بن حسین الانصاری اور میرے نانا مرحوم سید امیر علی ملیح آبادی صاحبِ تفسیر مواہب الرحمٰن کے شاگرد تھے (میری والدہ ان کی اکلوتی صاحبزادی تھیں)۔ ہمارے خاندان کے لئے خاص طور پر میرے لئے دوہرا غم ہے، وہ اب میرے والد کی جگہ سرپرست وقدرداں تھے۔ ندوۃ العلماء میرا گھرانہ اور ان کا خاندان اور ندوی اساتذہ وطلبہ میرے جسم وجان کا حصہ ہیں اور رہیں گے۔

دنیا ان کو بڑے بڑے القاب سے یاد کرتی ہے اور بلاشبہ وہ عظیم تر وشریف ترین، کریم النفس، مجاہد فی سبیل اللہ خانوادہ سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند اور ہر قسم کی عزت وتکریم کے مستحق رہیں گے۔ لیکن میری قوت سامعہ نے علی بھائی، اپنی بہن اور بھائی محمد بن خلیل عرب سے سنا اور بچپن ہی سے علی بھائی کہا اور اپنے خاندان کے علم کا واحد وارث تسلیم کیا، اب میں واقعی یتیم ہوگئی ہوں۔

انا للّٰہ وانا الیه راجعون۔

ھیھات لایاتی الزمان بمثله

ان الزمان لمثله لبخیل

اس لئے کہ بقول متمم بن نویرۃ الیربوعی:

ابی الصبر آیات اراھا فانسنی

اری کل حبل بعد حبلك اقطعا

علی بھائی کی میرے نام ہر تحریر خواہر عزیز اختی الفاضلہ سے شروع ہوتی ہے

یا کتاب دی تو للاخت العزیزہ عطیہ بنت استاذنا الجلیل خلیل عرب من اخیہا الی الحسن علی ندوی لکھ کر دی' ہم اپنی قلبی کیفیت کیا لکھیں' کیونکر لکھیں' ہم کو لگتا ہے نہ صرف ہم بلکہ علمی دنیا ایک ایسی ہستی سے محروم ہو گئی جو سلف صالحین کا نمونہ اور قرون اولیٰ کے اہل دل اہل ایمان کامل کی یادگار تھی۔

والد مرحوم علی بھائی کو اور علی بھائی والد کو کس قدر عزیز رکھتے تھے اس کا اندازہ کرنا ممکن نہیں۔ ان کے غم نے ہم کو نڈھال کر دیا وہ ہم پر اس قدر شفقت کرتے اور ایسی حوصلہ افزائی کرتے تھے جس کی مثال نہیں' ہم کسی قابل نہیں۔ والد مرحوم سے بے انتہا محبت رکھتے اور ان کی وفات کے بعد ہماری خبر گیری اور ہمارا خیال رکھتے تھے بڑی بڑی صبر آزما مشکلات میں ہمیں سہارا دیا کبھی تنہا نہ چھوڑا' اپنی تحریر و تقریر میں ادب واحترام اور خلوص و محبت ہی نہیں بلکہ احسان مندانہ جذبات کے ساتھ عربی اردو ہر زبان میں والد کو یاد رکھا اور انہی کے حوالے سے ہمیں کبھی فراموش نہیں کیا۔

حال ہی میں عرب دنیا کو ایشیاء کی مسلم خواتین کی نمائندگی کے لئے ایک بین الاقوامی دینی اجتماع میں کسی خاتون کی ضرورت تھی' علی بھائی سے دیافت کیا گیا تو انہوں نے میرا انتخاب کیا۔ میں نے میٹنگ سے واپس آکر شارقہ سے ان کو فون کیا اور اپنی بے بضاعتی کا اعتراف کیا' اس پر فرمایا "عزیزہ آپ کا ہم پر بڑا حق ہے' ہم اپنے استاذ و محسن و مربی آپ کے والد ماجد کا حق نہیں ادا کر سکتے" ہر موقع پر علی بھائی نے مجھے حوصلہ دیا' پورا ندوۃ العلماء ان کے احترام و تقلید میں میرا قدردان ہے اور ان کے غم میں ان کے عقیدت مند دنیا کے ہر خطے میں بے قرار ہیں جا کہ اجل محتوم اور قضائے مبرم سے کسی کو مفر نہیں ہم ان کی زندگی میں ہر مسئلہ حل کر لیا کرتے تھے' ان کا غم برداشت نہیں ہوتا' آخری بار رمضان المبارک کی 18 یا 19 تاریخ کو ہم نے لکھنو سے فون پر علی بھائی کی آواز سنی بڑا ضعف تھا۔ فرمایا: "خواہر عزیز! ہمارے لئے دعا کیجئے۔ طبیعت ناساز ہے" یہ سن کا ہمارا دل لرز اٹھا اور ہم فکر مند ہو گئے' ہم نے برادر عزیز فضل ربی ندوی اور عزیزم قاری رشید الحسن کو بتایا اور سبھی نے تشویش کا اظہار کیا۔ ہمارا دل ڈوبنے لگا لیکن ان کا خالق حقیقی بھی تو ان سے پیار کرتا ہے قرآن کریم جس پر علی بھائی نے آخر دم تک عمل کیا وہ سورۃ یاسین کی تلاوت کرتے ہوئے اپنے رب سے جا ملے وہ جنتی تھے اور نفس مطمئن نہ کی جو علامت قرآن کریم میں ملتی ہے اسی طرح مومنانہ شان سے داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ہمیں اس موقع پر الخنساء ارثی العرب کا شعر یاد آتا ہے جو ہمارے دلی جذبات کا ترجمان ہے۔

دفعت بك الخطوب وانت حی
فمن ذایدفع الخطب الجلیلا

(اے بھائی! جب تک تو زندہ رہا میں ہر غم تیرے سہارے اٹھالیا کرتی تھی لیکن تیرے غم کا جو پہاڑ مجھ پر ٹوٹا ہے وہ کون اٹھائے گا)۔

اسلامی دنیا اور مسلم امت علی بھائی کی ہمیشہ احسان مند رہے گی اور ان کی بے لوث علمی و دینی خدمات ان کی یادگار ہی نہیں بلکہ ملت کا قابل فخر سرمایہ اور اس کی رہنمائی کا سامان رہیں گی' عربی ہو یا اردو ان کی تقریر و تحریر میں روانی اور سحر آفرینی تھی۔

حق تو یہ ہے کہ زندگی بھر علی بھائی اسوہ حسنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرتے رہے اور مسلم امت کی کردار سازی' اصلاح معاشرہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنا ہی ان کا مقصد حیات تھا کہ یہی اہل ایمان واہل تقویٰ کی پہچان ہے۔ دنیا سے بے نیاز انسانیت کی خیر وفلاح کیلئے دیس پردیس ہر جگہ بلکہ دنیا کے کونے کونے میں زبان و قلم سے جہاد کرتے رہے۔

بین الاقوامی سطح پر مشرق و مغرب میں ان کے شاگردوں کے بھی شاگرد لاکھوں کی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں جو ان کے مشن دعوت حق اور تدریس و تبلیغ کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ علی بھائی کے لاکھوں روحانی عقیدت مند ہیں ان کی روحانیت

بے نفسی، تواضع وانکساری، للّٰہیت عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر ان کے عمل نے اللہ رب العزت کے کرم سے ان کو اخلاقی وروحانی پیشوا کا مرتبہ عطا کر دیا۔

بعض غیر مسلم بھی ان کی انسانیت دوستی کے قائل اور عقیدت مند رہے ہیں، علی بھائی دنیا بھر میں متعدد تعلیمی وتبلیغی مراکز کے بانی اور صدر ہونے کے ساتھ ساتھ کئی ممالک برطانیہ، امریکہ نیز عرب وہندوپاک کی جامعات کے معزز رکن تھے، ان کی عربی کتب عرب اور غیر عرب دنیا کی جامعات کے نصاب میں شامل ہیں، اور ان کی زندگی میں ان پر تحقیقی مقالات لکھے گئے، وہ رابطہ ادب اسلامی کے بانی وصدر تھے، بلا مبالغہ بیسویں صدی کے اکابرین میں ان کی مثال نہیں ملے گی۔

علی بھائی علم وعمل کے ایسے چراغ ہر جگہ روشن کر گئے ہیں جو ہمارے لئے مشعل راہ رہیں گے اور اس طرح علی بھائی اپنی کتب میں اپنے قائم کردہ بے شمار دینی مدارس اور دینی اداروں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے وہ آج بھی لاکھوں دلوں کی دھڑکن اور آنکھوں کی بصیرت ہیں۔

ہر گز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

علی میاں امت مسلمہ کے محسن تھے، یہی وجہ ہے کہ آج دنیا بھر کے مسلمان خود کو یتیم محسوس کر رہے ہیں۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اس صدی کے عظیم انسانوں اور جدید اسلامی احیاء کے جلیل القدر بانیوں میں سے ایک تھے۔ ان کے انتقال سے عالم اسلام اپنے ایک گرانقدر محسن سے محروم ہو گیا، مولانا علی میاںؒ نے دعوت وتبلیغ کا کام اپنے طالب علمی کے دور سے شروع کر دیا تھا۔ ندوۃ العلماء ان کی علمی اور دعوتی سرگرمیوں کا مرکز رہا۔ جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت سے بھی ان کی زندگی کے مختلف ادوار میں تعلق رہا۔ اخوان المسلمون اور اسلامی احیاء کی تمام ہی اہم تحریکوں سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ میں ان کی وفات کو بالکل اسی طرح محسوس کر رہی ہوں جس طرح اپنے والد محترم اور مشفق استاذ اور رہنماؤں کی شفقت اور سرپرستی سے محرومی کو محسوس کیا تھا، مولانا علی میاںؒ میرے اور میری نسل کے مسلمانوں ہی کے نہیں بلکہ پوری امت مسلمہ کے محسن تھے ان کی زندگی میں اسلاف اور بزرگوں کی جھلک نمایاں ہوتی تھی اور وہ ایک خلق کے لئے چشمہ نور وہدایت تھے۔ ان کا تعلق صرف بھارت سے نہیں پوری دنیا کے مسلمانوں سے تھا اور ہم سب ان کے اٹھ جانے سے اپنے آپ کو ایک بار پھر یتیم ہوتا محسوس کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ مولانا علی میاں کو جنت کے اعلیٰ ترین درجات میں جگہ دے اور ان کے تمام لواحقین کو صبر جمیل سے نوازے۔

میرا ورثہ

"میرا تعلق اس خاندان سے ہے جو شرک وبدعات کے معاملہ میں سربکف رہا ہے اور جو اس معاملے میں زیادہ ذی الحس واقع ہوا ہے۔ میرا نسبی اور روحانی اور ذہنی تعلق حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ سے ہے جنہوں نے اس ملک میں احیاء توحید وسنت کی دعوت کا علم بلند کیا اور اس کے لئے جان کی بازی لگادی۔ مجھے یہ پوری تاریخ عزیز ہے، میں اس پورے ورثہ کو سینہ سے بلکہ آنکھوں سے لگاتا ہوں۔ میری تمام تحریریں میری حقیر وکاوشیں اور کوششیں سب اسی ورثہ کی حفاظت اس کی تبلیغ واشاعت اور اس کی بازیافت میں صرف ہوئی ہیں۔"

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

دنیائے اسلام کے محبوب و محترم

مولانا علی میاںؒ

پروفیسر خورشید احمد

مدیر ترجمان القرآن لاہور

بیسویں صدی نے ملت اسلامیہ کے جسم وجان پر بہت سے تیشے چلائے اور خصوصیت سے اس کے آخری عشرے میں تو کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ ایک طرف افغانستان کے جہاد میں بے پناہ قربانیاں دی گئیں فلسطین لہولہان ہے، مسجد اقصیٰ محبوس ومحصور ہے، بوسنیا اور کوسووا میں خون کی ندیاں بہائی گئیں، کشمیر جل رہا ہے، اور شیشان میں خون مسلم کی ارزانی حد سے گزر گئی ہے تو دوسری طرف اس صدی میں اسلامی فکر کی معمار اور اسلامی احیاء کی تاریخ ساز شخصیت ایک ایک کر کے رخصت ہو گئیں۔ چلتے چلتے بھی بیسویں صدی ایک اور چرکا لگا گئی، بر عظیم پاک وہند کے صف اول کے دینی رہنماؤں کی آخری نشانی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی جدا ہو گئے۔

22 رمضان المبارک بروز جمعہ 31 دسمبر 1999ء نماز جمعہ سے کچھ ہی قبل تلاوت قرآن میں مصروف مولانا علی میاں ایک عالم کو سوگوار چھوڑ کر رب حقیقی سے جا ملے ....انا للہ وانا الیہ راجعون، آنکھیں اشک بار ہیں، روح مضطرب وافسردہ ہے لیکن دل اللہ کے فیصلے پر مطمئن ہے۔ کل من علیھا فان ویبقی وجہ ربك ذوالجلال والاکرام فبای آلاء ربکما تکذبن ۔(الرحمٰن 55:26-28) (ہر چیز جو اس زمین پر فنا ہو جانے والی ہے اور صرف تیرے رب کی جلیل و کریم ذات ہی باقی رہنے والی ہے، پس اے جن وانس، تم اپنے رب کے کن کن کمالات کو جھٹلاؤ گے؟)

سید ابوالحسن علی 11 محرم 1333ھ (جنوری 1914ء) رائے بریلی یوپی کے ایسے معزز ومحترم خانوادہ سادات میں پیدا ہوئے جو رشد وہدایت اور دعوت وجہاد میں بڑا نام رکھتا تھا۔ مجاہد ملت حضرت سید احمد شہیدؒ کا تعلق اسی خاندان سے تھا۔ علی میاں کے والد اور والدہ دونوں علم وتقویٰ کے اعلیٰ مرتبہ پر تھے آپ کے والد مولانا حکیم عبدالحئی لکھنوی نزھۃ الخواطر کے مولف تھے جو پانچ ہزار نامور ہندوستانی مسلمانوں کے تذکرے پر مبنی ایک انسائیکلو پیڈیا ہے اور گل رعنا بھی آپ ہی کی تالیف ہے جو اردو کے نامور شعرا کا پہلا مربوط تذکرہ ہے۔ مولانا عبدالحئی ندوۃ العلماء کے مہتمم اور دینی اور علمی حلقوں میں ایک اونچا مقام رکھتے تھے۔ آپ کی والدہ محترمہ خیر النساء حافظہ قرآن اور حسن اخلاق اور تقویٰ وشرافت کا نمونہ تھیں۔ بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی، والد کے انتقال کے بعد علی میاں کے مربی بنے۔ وہ دینی اور دنیوی علوم کے جامع، ندوہ کے فارغ التحصیل اور والد کے انتقال کے بعد اس کے ناظم تھے۔ علی میاں نے حفظ قرآن کے بعد عربی، فارسی اور اردو ابتدائی تعلیم حاصل کی اور پھر ندوہ، دیو بند اور مدرسہ قاسم العلوم لاہور (مولانا احمد علی) سے علوم دینی کی تحصیل کی۔ 1934ء میں ندوۃ العلماء لکھنو، میں تدریسی زندگی کا آغاز کیا۔ 1951ء میں ندوۃ کے دعوت و تبلیغ اور درس وتدریس کے ذریعے لاکھوں انسانوں تک اللہ کے دین کو پہنچانے کا فرض ادا کیا، مشرق ومغرب اور عرب وعجم میں یکساں مقبولیت حاصل کی۔ عالم اسلام کے اعلیٰ ترین اعزازات حاصل

کیئے اور سب سے بڑھ کر دنیا کے ہر گوشے میں سرور عالم ﷺ کے پروانوں کے دلوں میں عزت اور محبت کا مقام پیدا کیا۔ دنیا میں رہے لیکن دنیا کی آلائشوں سے دامن بچائے رکھا۔ دعوت و تبلیغ کو زندگی کا مشن بنایا اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا: من المومنین رجال" صدقو اما عاھدوا اللہ علیہ فمنھم من قضیٰ نحبہ (الاحزاب 23:33) ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کیئے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے' ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا۔

مجھے نصف صدی کے چوٹی کے اہل علم و فضل سے ملنے اور ان سے استفادہ کرنے کی سعادت حاصل رہی ہے لیکن علی میاںؒ ان منتخب بزرگوں میں سے ہیں جن کی شخصیت سب سے منفرد تھی:

آفاق ہا گردیدہ ام
مہر بتاں وزدیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام
لیکن تو چیزے دیگری

مولانا علی میاںؒ سے میرا تعارف ان سے بالمشافہ ملاقات سے بہت پہلے ان کی تصانیف کے ذریعے ہوا۔ اسلامی جمعیۃ طلبہ کے اولین دور ہی میں ان کی کتاب "سیرت سید احمد شہید" پڑھی اور اس کتاب سے نہ صرف سید احمد شہید ہی سے گہرا تعلق قائم ہوا بلکہ خود مولانا علی میاں کی شخصیت بھی دل میں گھر کر گئی۔

مولانا علی میاںؒ کے بڑے عزیز دوست اور ساتھی مولانا مسعود عالم ندوی نے' جن سے میرا بہت ہی قریبی تعلق تھا اور جمعیت کے اس دور کے تمام ہی ذمہ دار' ان سے بہت گہرا ربط رکھتے تھے اور وہ بھی ہم سب پر بڑی شفقت فرماتے تھے' مولانا علی میاں کی محبت اور عظمت کے نقوش ہمارے دلوں پر مرتسم کر دیئے' انکے علم و فضل' ان کی للّٰہیت اور کیفیت عبادت' ان کی عربی دانی اور شوق دعوت و تبلیغ یہ سب دل و دماغ پر نقش ہو گئے۔ ان کی کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" جو ان کی شہرہ آفاق عربی کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" کا اردو ترجمہ تھا پڑھی' جس نے فکر و نظر ہی کو جلا نہ بخشی بلکہ روح کو تڑپا اور گرما بھی دیا۔ اس کے بعد مولانا علی میاں کی ہر تحریر بڑے ذوق و شوق سے پڑھی اور اس طرح دل و نگاہ میں ان کی شخصیت کا ایک خاص مقام بن گیا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی کے بعد میں جس شخصیت کی تحریروں سے سب سے زیادہ استفادہ کیا' وہ مولانا علی میاں ہی ہیں۔

مولانا علی میاں سے پہلی ملاقات 1954ء میں لاہور میں ہوئی۔ میں اس وقت جمعیت کا ناظم اعلیٰ تھا۔ بالمشافہ ملاقات میں ان کو اس ذہنی تصویر سے ہم آہنگ پایا جو ان کی کتب کے مطالعے سے بنائی تھی۔

آخری ملاقات برطانیہ میں 1996ء میں ہوئی جب وہ اسلامک فاؤنڈیشن میں تشریف لائے اور خطاب فرمایا۔ ہمارے ساتھ خصوصی نشست بھی ہوئی اور پھر اس کے بعد نوٹنگھم میں مسجد دارالعلوم کے افتتاح کی تقریب میں' میں نے خرم اور مناظر احسن نے شرکت کی۔ یہ ان سے آخری ملاقات تھی۔ درمیان کے 42 برسوں میں درجنوں بار ان سے ملنے اور استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ اور الحمد للہ ان کی شفقت اور ان کے پیار میں اضافے ہی کا گمان رہا۔ میرے لئے تو وہ استاذ' مربی اور محسن تھے لیکن ان کی عظمت ہے کہ انہوں نے اس طرح کا معاملہ کیا کہ لطف عام بھی لطف خاص کا مزہ دے گیا۔

مولانا علی میاں ایک نامور عالم دین' ایک بلند پایہ مصنف اور دانش ور' ایک صاحب طرز ادیب' ایک سحر انگیز خطیب اور ایک منفرد مورخ اور سیرت نگار تھے لیکن سب سے بڑھ کر وہ ایک داعی ایک مبلغ ایک مصلح اور ایک صاحب دل مزکی اور مربی تھے' ان تمام اوصاف کے اجتماع نے ان کو بیسویں صدی کے اسلامی احیاء کے معماروں میں ایک درخشاں مقام پر متمکن کیا۔ میں جب بیسویں صدی کی اسلامی فکر کی قوس قزح پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے ان کا فکر و اسلوب ایک ایسا گلدستہ معلوم ہوتا ہے جس میں اس دور کے کئی اہم مفکرین اور داعیوں کے متفرق پہلوؤں کا اجتماع نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں

علامہ اقبال کا سوز و گداز' مولانا مودودی کی عقلیت اور تصور دین کی جامعیت' علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کا ذوق تاریخ اور مولانا اشرف علی تھانوی' مولانا محمد الیاس' مولانا عبدالقادر رائے پوری اور مولانا محمد زکریا کی روحانیت کا امتزاج نظر آتا ہے۔ علی میاں کے یہاں یہ سب ایک دوسرے کے ناقض نہیں' ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے ہیں۔ اور یہی وہ نکتہ ہے جسے ناقدین علم و فن نے نظر انداز کر دیا ہے۔

مولانا علی میاں کا اصل میدان تاریخ اور دعوت ہے' سیرت اور انسان سازی ہے' روح کی بیداری اور امت کی ترقی کے لئے اسلاف کے نمونے کا احیاء ہے ان کے یہاں خانقاہ اور جہاد' تزکیہ اور انقلاب دونوں دھارے ساتھ ساتھ رواں نظر آتے ہیں' کبھی وہ ایک کو نمایاں کرتے ہیں اور کبھی دوسرے کو۔ پہلی تالیف سے (جو 1939ء میں شائع ہونے والی "سیرت سید احمد شہید" تھی) آخری کتاب (تاریخ دعوت و عزیمت) تک تزکیہ اور جہاد کا چولی دامن کا ساتھ باقی رہتا ہے۔ ان کا ذوق اور خاندانی اور دعوتی ماحول جب ان کو "دین کی جدید تعبیر و تفہیم" کے باب میں کچھ خدشات اور خطرات سے دوچار کرتا ہے' اور وہ کچھ تصور اور اسالیب کے بارے میں تردد اور اضطراب کا اظہار کرتے ہیں تب بھی دین اور قوت کے تعلق' احیاء اور اقامت کی خواہش اور طلب' اسلامی حکومت کے قیام اور غلبے کی تمنا کے اظہار پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں۔ "دعوت و عزیمت" کی آخری جلد میں "سیرت سید احمد شہید" کے پہلے ایڈیشن کی ان عبارتوں کو جوں کا توں رکھتے ہیں جن میں "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحات" کا عکس دیکھا جا سکتا ہے 1977ء میں شائع ہونے والی "سیرت سید احمد شہید" (سلسلہ تاریخ دعوت و عزیمت) حصہ اول میں کتاب سے اسی مقصد کا اعادہ کیا گیا ہے جو 1936ء میں رقم کیا گیا تھا یعنی "اسلام کی خدمت اور نوع انسانی کی سعادت کا ایک ہی لائحہ عمل ہے جو اس کتاب میں بیان کیا ہے' اور وہ وہی ہے جس کے مطابق رسول اللہ ﷺ آپ کے خلفائے راشدینؓ اور بعض مجدد دین امت نے عمل کیا' یعنی دنیا میں اسلامی شریعت اور خلافت کا صحیح نظام قائم کرنا اور اسلام کے اخلاقی روحانی' مادی' سیاسی غلبے کی کوشش کرنا" (ص 37) پھر "سید صاحب" کی سیرت پر اجمالی نظر کے باب میں دعوت دین کا کام کرنے والے تمام بزرگوں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے صاف الفاظ لکھتے ہیں کہ "نفس کے مجاہدے کے ساتھ کفار سے جہاد" اور "شرعی حکومت" کا قیام اسوہ رسالت مآب ﷺ کا جزو لاینفک ہے' دعوت اور خدمت کے تمام کام اہم اور لائق تحسین لیکن "ان سب کے حلقے اور عمل کے دائرے محدود ہیں" اور "سید صاحب نے اس نکتے کو اچھی طرح سمجھا کہ حکومت الٰہی کے قیام اور اسلامی نظام' قوانین و حدود کے اجراء اور ماحول کی تبدیلی کے بغیر یہ سب کوششیں "کوہ کندن و کاہ بر آوردن" ثابت ہوگی" (ص 50-51)

مولانا علی میاں کا میدان عمل سیاست نہ تھا' ان کی جملہ کاوشیں دین کے ہمہ گیر اور جامع تصور کی تشریح و توضیح پر مبنی ہیں اور وہ ہمیشہ ملت اسلامیہ کے عروج اور غلبے کا خواب دیکھتے رہے۔ یہ بات بڑی اہم ہے کہ جب 1980ء میں انہیں فیصل ایوارڈ ملا تو اس کے ساتھ ملنے والی رقم کا نصف انہوں نے جہاد افغانستان کے لئے اور نصف "تحفیظ القرآن" کے مدارس کے لئے وقف کیا۔ ملت اسلامیہ کا کوئی بھی مسئلہ ہو' اس پر ان کا موقف ہمیشہ اسلام اور امت مسلمہ کے بہترین مفاد کے مطابق ہوتا تھا۔ بھارت کے مسلمانوں کے لئے انہوں نے دعوت و تبلیغ اور اصلاح معاشرہ کے ساتھ مسلم پرسنل لا کے تحفظ' شاہ بانو کیس میں اسلامی قانون کی بالادستی' اسکولوں میں بندے ماترم کے خلاف احتجاج کی قیادت کی اور بابری مسجد کے سلسلے میں مجاہدانہ موقف اختیار کیا۔ عالم اسلام کے مسائل خواہ ان کا تعلق فلسطین سے ہو یا افغانستان سے' کشمیر سے ہو یا بوسنیا ہے' انہوں نے حق اور انصاف کے مطابق پوری جرأت سے اپنے خیالات کا اظہار کیا' بین الاقوامی پلیٹ فارم پر

ہمیں بارہا ساتھ کام کرنے کا موقع ملا' بھارت کی حکومت نے بار بار کوشش کی کہ کشمیر کے معاملے میں ان سے کوئی بات اپنی تائید میں کہلوائیں لیکن انہوں نے کبھی ایسا نہ کیا' نجی گفتگو میں ہمیشہ یہ کہا کہ کشمیر کے لوگوں کا حق ہے کہ اپنے مستقبل کا فیصلہ اپنی مرضی سے کریں۔

مولانا علی میاں کو پاکستان سے گہری محبت تھی اور نفاذ شریعت کی ہر کوشش کے وہ موید رہے۔ وہ زور دیتے تھے کہ اللہ سے کئے ہوئے وعدے کو پورا کرو' مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر جو تقریر انہوں نے کی اور جن جذبات کا اظہار اپنی خود نوشت "کاروان زندگی" (جلد دوم) میں کیا' وہ پڑھنے کی چیز ہے اپنی پہلی ملاقات میں جنرل ضیاء الحق کو مسجد اقصیٰ کا ماڈل پیش کیا اور جو الفاظ اس موقع پر ادا کئے وہ ان کے جذبہ ایمانی' امت سے محبت اور حق و باطل کی کشمکش میں مسلمانوں کے کردار کے بارے میں ان کے تصور کے عکاس ہیں: "اس ہدیئے میں (زبان حال سے) اشارہ بھی تھا کہ مسجد اقصیٰ کی بازیافت اور اس کا استخلاص بھی ایک صاحب ایمان' مسلم صدر مملکت کی ذمہ داری میں ہے (پرانے چراغ' حصہ سوم)۔

مولانا علی میاں کا اسلامک فاؤنڈیشن سے بڑا گہرا قلبی تعلق تھا۔ جب بھی برطانیہ تشریف لاتے' فاؤنڈیشن ضرور آتے' مولانا کی کتابوں اور تقریروں کی انگریزی میں اشاعت کی سعادت بھی فاؤنڈیشن کو حاصل ہوئی۔ 1996ء میں نوٹنگھم کی مسجد میں اپنے عام خطاب میں مولانا مودودی اور ان کی علمی اور دینی خدمات کو بڑے موثر الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔ فاؤنڈیشن کے کام کی حوصلہ افزائی فرمائی' نام لے کر عزم اور راقم کی مساعی کے لئے کلمات خیر ارشاد فرمائے اور مسلمانوں کے تمام دینی کام کرنے والوں کے درمیان اتفاق اور تعاون کی نصیحت فرمائی۔ مولانا علی میاں نے مولانا مودودی سے اپنے علمی اختلافات کا بھی اظہار بڑے شائستہ انداز میں کیا ہے۔ اور ان کی خدمات کا اعتراف بھی بڑے کھلے دل سے کیا ہے بلکہ خود اپنے فکری سفر میں ان سے استفادے اور ان کے اثرات کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا ہے' "ندائے ملت" میں مولانا مودودی کی وفات پر ان کا انٹرویو دیکھنے کی چیز ہے۔

اس امر کے اظہار میں کوئی مبالغہ نہیں کہ مولانا علی میاں صرف اردو ہی کے صاحب طرز ادیب نہ تھے بلکہ عربی زبان پر انہیں غیر معمولی دسترس حاصل تھی' انہیں بلا شبہ بیسویں صدی کا عربی کا سب سے اچھا غیر عرب ادیب قرار دیا جا سکتا ہے' عربی زبان کا شوق ان کو بچپن ہی سے تھا اقبال کی ایک نظم (چاند) کا عربی ترجمہ انہوں نے 16 برس کی عمر میں کیا اور خود اقبال سے داد لی۔ ان کا پہلا عربی مضمون سید احمد شہید پر سید رشید رضا کے مشہور مجلہ "المنار" میں 1937ء میں شائع ہوا۔ اس وقت مولانا علی میاں کی عمر 17 سال تھی اقبال کو عرب دنیا میں متعارف کرانے کی سعادت سب سے پہلے علی میاں کو حاصل ہوئی۔ ان کی کتاب "روائع اقبال" (جس کا اردو ترجمہ "نقوش اقبال" کے عنوان سے شائع ہوا ہے) اس سلسلے کی سب سے کامیاب کوشش ہے۔ عرب دنیا ان کی فصاحت اور بلاغت کا لوہا مانتی ہے۔

علی میاں کو عالم اسلام کے اہم ترین اعزازات حاصل ہوئے۔ جامعہ دمشق اور جامعہ مدینہ میں ان کو وزٹنگ پروفیسر کا مقام حاصل تھا۔ 30 سے زائد ممالک میں بین الاقوامی کانفرنسوں اور سیمینار میں شرکت۔ 1999ء میں دوبئی میں 1998ء کی اہم ترین اسلامی شخصیت کا ایوارڈ دیا گیا۔ رابطہ عالم اسلامی اور جامعہ اسلامیہ مدینہ یونیورسٹی کے بانی ارکان میں سے تھے۔ مؤتمر عالم اسلامی لبنان کی مجلس عاملہ کے رکن تھے۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر اور مسلم مجلس مشاورت ہند کی شوریٰ کے رکن تھے۔ علی میاں صرف ہندوستان کے مسلمانوں کے گل سرسبد ہی نہیں' پوری اسلامی امت کا سرمایہ تھے اور ان کے قلم اور زبان نے پوری دنیا کے مسلمانوں کی خدمت اور رہنمائی کی۔

مولانا علی میاں نے دعوت

و تبلیغ کا کام اپنے طالب علمی ہی کے دور سے شروع کر دیا تھا' ندوۃ العلماء ان کی علمی سرگرمیوں کا مرکز رہا' جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت سے بھی ان کی زندگی کے مختلف ادوار میں گہرا تعلق رہا۔ اخوان المسلمون اور اسلامی احیاء کی تمام ہی اہم تحریکوں سے ان کا گہرا ربط تھا۔ اسلامک فاؤنڈیشن سے بھی موصوف کو خصوصی تعلق تھا۔ خود مجھے گزشتہ 50 برس سے ان کی مشفقانہ سرپرستی کا شرف حاصل رہا اور ان کی وفات کو بالکل اس طرح محسوس کرتا ہوں جس طرح اپنے والد محترم اور مشفق اساتذہ اور رہنماؤں کی خصوصیت سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی' مولانا امین احسن اصلاحی کی شفقت اور سرپرستی سے محرومی کو محسوس کیا تھا۔

میں نے مولانا مودودی اور مولانا علی میاں دونوں کے افکار اور کارناموں سے خوشہ چینی کی ہے لیکن دونوں کے مزاج اور اسلوب میں جو فرق تھا اسے میں کبھی کبھی اس طرح بیان کرتا ہوں کہ مولانا مودودی انسان کے دماغ کے ذریعے اس کے دل میں اترتے ہیں اور قلب پر چھا جاتے ہیں' جبکہ مولانا علی میاں دل کے راستے فکر و نظر کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں اور روح کو تازگی فراہم کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس دور کے مسلمانوں کے ان دونوں محسنوں کو بہترین اجر سے نوازے' ان کے درجات بلند کرے اور جو شمعیں انہوں نے روشن کی ہیں' وہ ہمیشہ تابندہ رہیں۔

مولانا علی میاں نہ صرف میرے اور میری نسل کے مسلمانوں کے بلکہ پوری امت مسلمہ کے محسن تھے۔ ان کی زندگی میں سلف کے بزرگوں کی جھلک دیکھی جا سکتی تھی اور وہ ایک خلق کے لئے چشمہ نور وہدایت تھے۔ ان کا تعلق صرف بھارت سے نہیں پوری دنیا کے مسلمانوں سے تھا اور ہم سب ان کے اٹھ جانے سے اپنے آپ کو پھر سے یتیم محسوس کر رہے ہیں۔ غم شدید ہے مگر اللہ کے فیصلے پر قانع ہیں اور ان کے لئے دل کی گہرائیوں سے مغفرت اور رفع درجات کی دعائیں کرتے ہیں اور رب حقیقی سے دعا بھی کرتے ہیں کہ اس امت کو ان جیسے حق کی طرف بلانے والوں دین کا احیاء کرنے والوں سے برابر سرفراز فرماتا رہے تاکہ رشد وہدایت کا یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے۔

اللہ تعالیٰ مولانا علی میاںؒ کو جنت کے اعلیٰ ترین درجات میں جگہ دے اور ان کے تمام لواحقین کو صبر جمیل سے نوازے۔ (آمین!)

سلطان جائر

"کبھی کبھی رجحانِ عام، ایک بڑے طبقہ کی پسندیدگی اور طاقتور تاثر اور بہت سے اہلِ علم اور اہلِ قلم کی کسی تحریک کی تائید "سلطان جائر" کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے، جس سے اختلاف اور تنقید کسی سلطنت اور اقتدار سے اختلاف و تنقید سے کم خطرناک نہیں ہوتی۔"

علی میاںؒ

محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم

"محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نبوت ایک نئے دور کا آغاز تھی، نبی آدم میں سے جس کو بھی سعادت و خیر کا کوئی ذرہ ملا وہ خواہ امیر المومنین علی بن ابی طالبؓ ہی کے مرتبہ کا کوئی شخص کیوں نہ ہو، سیدنا محمد بن عبداللہ ﷺ کے واسطہ ہی سے نصیب ہوا۔

عجب کیا گر مہ و پروین میرے نخچیر ہو جائیں
کہ برفتراک صاحب دولتے بستم سر خود را

وہ دانائے سبل ختم الرسل، مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

طہران میں آیت اللہ العظمیٰ مرزا خلیل کمرئی کی طرف سے دیئے گئے استقبالیہ میں ایرانیوں سے خطاب۔

مدینے والا

پروفیسر ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی

علی میاں کی پوری زندگی مدینے سے وابستگی کا نام ہے۔ انہیں جو کچھ ملا' وہ جو کچھ تھے اسے فیضانِ مدینہ کہئے۔ ان کے رب نے انہیں ابدیت کا راستہ دکھایا۔ علم' علم پر عمل' علم اور عمل کی ہم آہنگی کے ساتھ مسلمانوں کی ہمہ جہت خدمت۔ وہ داعی الی اللہ تھے اور یہی میراثِ نبوت ہے' ان کے لہجے کی نرمی نسیم مدینہ کی ہر ادا اپنے دامن میں رکھتی تھی اور ملی معاملات میں ان کی استقامت پہاڑوں کی یاد دلاتی تھی۔ وہ حلقہ یاراں اور رزمِ حق و باطل دونوں کا حق ادا کرنے کی توانائی اور سکت رکھتے تھے۔

علی میاں کی کتاب "کاروانِ مدینہ" میں نے پہلے بھی کئی بار پڑھی تھی' مگر کوئی سات آٹھ سال ہوئے عزیز گرامی فضل الرحمٰن صاحب ابن شرقی" نے مدینہ میں مجھے دی اور مدینہ منورہ میں اس کتاب کا پڑھنا میرے لئے ایک نیا تجربہ بن گیا' بالخصوص وفودِ امت سے متعلق مضمون۔ مسجد نبوی الشریف میں دوسری تیسری صف میں بیٹھ کر یا مواجہ شریف کے قریب بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر درود و صلوٰۃ پڑھتے رات کی خاموشیوں میں یوں محسوس ہوتا کہ وہ اکابر و رجالِ عظیم میری ادھ کھلی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے ہیں۔ رمضان المبارک کے آخری عشرے کی ابتدائی راتوں میں خلوت کی ایسی گھڑیاں میسر آ ہی جاتی ہیں علی میاں کے اس مضمون نے اس خیال کو میرے لئے حقیقت بنا دیا کہ اس امت کے مصنفوں کا حسن خیال اور جمال تحریر' سپاہیوں اور سپہ سالاروں کی تلواروں کی کاٹ' حکمرانوں کا انداز جہاں بینی (صرف جہاں گیری نہیں) علماء کے علم میں آہ سحر گاہی اور گریہ نیم شبی کے عناصر' ماؤں کی شفقت۔ ان سب میں اسی ذات کی تعلیم اور نفس حیات نقش شامل ہے۔

یہ اہلِ سیف و قلم' صاحبانِ جود و عطا
نقوشِ پا سے ہوئے کتنے کارواں پیدا

وقار صدیقی اجمیری نے سچ کہا تھا کہ تاریخ محمد ﷺ کا نشانِ کفِ پا ہے

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ذات گرامی میرے لئے کئی سمتیں اور جہتیں رکھتی ہے۔ وہ میرے مرشد تھے۔ ہندوستان اور پاکستان کی دوری نے مجھے ان کی محفلوں میں حاضری کا موقع کم دیا' لیکن علی میاں کے مرید خوش قسمت ہیں کہ ان کی کتابیں' ان کی محفلوں کا درجہ رکھتی ہیں۔ میرے نزدیک وہ اردو کے اُن چند لکھنے والوں میں سے ہیں۔ جن کی کتابیں اپنے قاری سے باتیں کرتی ہیں' علی میاں کی آواز صفحہ کاغذ سے ابھر کر ہمارے کان تک پہنچتی ہے' اور پھر کان کے ذریعہ نہاں خانہ ٔ جاں تک۔

علی میاں کو میں نے بچپن اور لڑکپن سے دیکھا۔ کانپور اور لکھنو کا فاصلہ ہی کتنا تھا' علی میاں اکثر کانپور آتے۔ وہ میری دوسری ماں کے پھوپھی زاد بھائی تھے اور باجی امی کے علاوہ میرے ماموں جان سید ابوبکر حسنی ندوی بھی کانپور میں مقیم تھے' علی میاں کے کئی اور عزیز کانپور میں رہتے' ڈاکٹر سید ابو محمد صاحب وغیرہ۔ علی میاں آتے۔ دلوں اور گھروں میں عید آجاتی۔ پھر میں پندرہ سولہ سال کی عمر میں پاکستان آگیا اور یوں علی میاں کو دیکھنے اور ان سے ملنے کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ مگر علی میاں ہمارے دور کی ایسی آواز تھے' ایسے آدمی تھے جن کی فیض رسانی ملاقات اور مقام کی محتاج نہ تھی۔ میں علی میاں کی کتابیں پڑھتا رہا اور اپنی تعمیر کرتا رہا' خاص طور پر تاریخ دعوت و عزیمت کی جلدوں نے تو میری فکری تعمیر میں بڑا حصہ لیا ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کی کوئی مربوط اور بسیط تاریخ اب تک نہیں لکھی گئی ہے۔ اور ویسے بھی یہ کسی ایک آدمی کا کام نہیں اور نہ کسی

ایک سلسلہ کتب کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ تو ایک مسلسل کام ہے' لیکن میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ آج صرف علی میاں کی یہ کتاب ہی ایسا علمی کارنامہ ہے جو آج کے مسلمانوں کو اپنے حقیقی ماضی اور روایات سے روشناس کراتا ہے۔

علی میاں کئی بار پاکستان آئے' اپنے عزیزوں سے ملنے' اہل پاکستان کو ان کی ذمہ داریوں سے باخبر کرنے۔ ایوان صدر اور صدر پاکستان نے اپنی آنکھیں ان کے استقبال کے لئے فرش راہ کیں' لیکن علی میاں کو جو خوشی بنوری ٹاؤن کی مسجد میں اپنے رشتہ کے داماد قاری رشید الحسن صاحب کے حجرہ میں آتے یا کسی اور عزیز کے کچے پکے مکان میں' وہ کہیں نہ ملتی' میں نے قاری صاحب کے حجرے ہی میں مولانا عبدالرشید نعمانی کی وساطت سے علی میاں سے بیعت کی اور علی میاں نے فرمایا کہ مولانا نعمانی کو میرا قائم مقام سمجھنا۔ الحمدللہ میں نے ان کے اس فرمان کی پوری پاس داری کی۔ اگست 1999ء میں مولانا نعمانی کا انتقال ہوا' اور اس کے بعد نہ جانے کیوں ایک خوف سا مجھ پر طاری ہو گیا اور آخر وہ خوف ایک حقیقت بن گیا۔ میں ان دنوں مسجد نبوی میں علی میاں کی زندگی اور صحت کے لئے مسلسل دعا کر رہا تھا اور وہ بھی خود غرضی کے تحت۔ پختہ ارادہ تھا کہ میں اور بیوی یہاں سے واپسی پر ہندوستان جائیں گے اور کچھ وقت علی میاں کے ساتھ گزاریں گے۔ مگر ہماری تمناؤں اور ارادوں سے تو کارِ جہاں ترتیب نہیں پاتا۔

"من لایشکر الناس لایشکر اللہ" کے مفہوم اور گہرائیوں سے علی میاں سے زیادہ واقف ہمارے دور میں شاید ہی کوئی اور ہو۔ سن مجھے یاد نہیں' غالباً یہ گزشتہ صدی کے چھٹے عشرے یا پانچویں عشرے کے آخری برسوں کی بات ہے۔ مولانا علی میاں اسلامی اقتصادی کانفرنس میں کراچی تشریف لائے تھے۔ اس سفر میں مولانا منظور نعمانی بھی ان کے ساتھ تھے۔ میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ نام بتایا۔ بہت تپاک سے ملے۔ حاضرین سے فرمایا یہ میرے بھانجے ہیں' مدت کے بعد ملاقات ہو رہی ہے اس لئے تعارف کی ضرورت پڑی۔ پھر مسکرا کر فرمایا کہ اور چہرے بدل بھی تو جاتے ہیں۔ اور پھر مولانا نے حاضرین محفل سے فرمایا کہ "آپ نے میری تقریروں اور تحریروں میں یہ شعر سنا اور پڑھا ہو گا۔

چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پر نسیم
کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا

مصحفی کا یہ شعر میں نے پہلی بار کشفی صاحب کے کسی مضمون میں پڑھا تھا" میں حیرت زدہ ہو گیا۔ اللہ اکبر۔ اتنے بڑے آدمی نے اتنی چھوٹی سی بات کو یاد رکھا اور اس کے ذکر کو مناسب جانا۔ رشید احمد صدیقی صاحب کی بات یاد آئی کہ بڑا آدمی معمولی بات کو بادنیٰ بہانہ غیر معمولی بنا دیتا ہے۔

دنیا کے کئی اسلامی ملکوں کے سربراہوں اور حکمرانوں سے مولانا کے شخصی تعلقات تھے اور انہوں نے ان تعلقات کو ملت اسلامیہ کی فلاح و بہبود کے مشوروں اور منصوبوں کا ذریعہ جانا۔ کبھی کوئی ذاتی منفعت حاصل نہیں کی' اور خشیت اللہ کے امین اس مرد جلیل نے کسی دنیوی سربلندی کو در خور اعتنا نہ جانا۔ علی میاں غالباً چوبیس گھنٹوں کے لئے پاکستان آئے۔ صدر ضیاء الحق مرحوم کو علم ہوا تو انہوں نے فون کیا کہ ازراہ کرم دو چار گھنٹے کے لئے اسلام آباد تشریف لے آئیے۔ فوجی طیارہ آپ کا منتظر ہے۔ مولانا نے جواب دیا کہ یہ تھوڑا سا وقت میرے عزیزوں کی امانت ہے۔ میری معذرت قبول کر لیجئے۔ اور صدر ضیاء الحق علی میاں کو دیکھنے اور ان سے ملنے کراچی تشریف لے آئے۔ ضیاء الحق انسان تھے اور جن حالات میں گھرے ہوئے تھے' ان میں ان سے غلطیاں بھی ہوئیں اور وہ اسلامی نظام کے قیام کے سلسلہ میں وہ کچھ نہ کر سکے جو چاہتے تھے' لیکن واقعات و آثار ان کے خلوص کے شاہد ہیں' اور ضیاء الحق کا انکسار

حقیقی اور بہت گہرا تھا۔ جب ضیاء الحق صاحب نے علی میاں سے پوچھا کہ مجھے کچھ اوراد و ظائف بتا دیجئے تو علی میاں نے فرمایا کہ آپ مسلسل درود پڑھتے رہئے اور اپنے کاموں میں مصروف رہئے یہی آپ کیلئے کافی ہے۔

اپنے ایک سفر ہند میں، میں علی میاں کی زیارت کے لئے لکھنو گیا۔ ندوۃ العلماء کے مہمان خانے میں ان کی محفل کی کیفیت بیان کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔ ہر آدمی مودب، مگر مناسب طور پر گفتگو میں حصہ لیتا ہوا۔ مجھے میرے مرشد نے خاص طور پر بولنے اور پاکستان کے حالات پر کچھ کہنے کی اجازت دی۔ میری بیوی دوسرے کمرے میں تھیں۔ وہ بیعت ہونے کے ارادے سے گئی تھیں۔ میں نے علی میاں سے یہ بات عرض کی۔

وہ اٹھ کر دوسری کمرے تک تشریف لے گئے اور دروازے کے باہر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور اپنا انگوچھا بیوی کے دوپٹے کا ایک کونا ہاتھ میں لے کر انہیں اپنے حلقہ ارادت میں شامل کیا۔ بیعت کرنے کے بعد کچھ وظائف بتائے جو مجھے بتائے ہوئے وظائف سے زیادہ تھے۔ حقیقی مرشد کو اپنے مرید کے ظرف کا اندازہ ہوتا ہے۔ بیعت کے بعد علی میاں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ اب کی بار کراچی آئیں گے تو ایک وقت کا کھانا تمہارے ہاں کھائیں گے۔ اس کے بعد علی میاں ایک ہی بار پاکستان گئے۔ وہ رابطہ ادب اسلامی کے ایک اجلاس میں لاہور گئے اور کراچی ان کی آمد سے محروم رہا۔

اسی شام علی میاں جب کرسی پر بیٹھنے لگے تو میں نے محسوس کیا کہ ان کے گھٹنوں میں خاصی تکلیف ہے۔ میں نے ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھا۔ بڑی تیزی کے ساتھ انہوں نے ہاتھ ہٹا دیا اور بے ساختہ فرمایا۔ "یہ کیا کرتے ہو" میں نے عرض کیا "حضرت! یہ رسم مریدی نہیں بلکہ میں تو دعا پڑھ کر دم کرنا چاہتا تھا" علی میاں خاموش ہو گئے اور جب میں دم کر چکا تو فرمانے لگے کہ مدتوں بعد کسی نے ان کے لئے یوں دعا کی اور دم کیا' ورنہ اب تو بس ان سے ہی دعا کرانے والے آتے ہیں۔ اور پھر علی میاں نے وہ واقعہ بیان فرمایا کہ جب حضرت عمر فاروقؓ نبی کریم ﷺ سے عمرہ کی ادائیگی کی اجازت لینے آئے تو خیر البشر اور ختم المرسلین ﷺ نے اجازت دیتے ہوئے فرمایا "میرے بھیا' اپنی دعاؤں میں مجھے نہ بھولنا"

علی میاں کے جانے کے بعد اللہ کی اس وسیع و عریض دنیا کی روشنی کچھ کم ہو گئی ہے' وہ اس خاک داں کے روشن چراغ تھے اللہ ایسے دوسرے چراغوں کو روشن رکھے۔ آمین

ترقی کی بنیاد

انسان مجموعہ ہے جسم و روح، قلب و عقل و جوارح کا، انسان حقیقی سعادت اور فلاح اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتا اور انسانیت کو متوازن ترقی نہیں ہو سکتی جب تک کہ انسان کی یہ تمام قوتیں مناسب طور پر اُس کے مرتبہ کے شایانِ شان نشو و نما اور پرورش نہ پائیں۔ دُنیا میں صالح تمدن کا اس وقت تک وجود نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایک ایسا دینی اخلاقی، عقلی مادّی ماحول نہ قائم ہو جائے جس میں انسان کے لئے بسہولت تمام اپنے کمال انسانی کو پہنچنا ممکن ہو اور تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ زندگی کی رہنمائی اور تمدن کی جہاز رانی ان لوگوں کے ہاتھ میں نہ ہو جو رُوحانیت و مادّیت دونوں کے قائل، دینی و اخلاقی زندگی کا نمونہ کامل، عقل سلیم اور علم صحیح سے متصف ہوں، اگر اُن کے عقیدہ یا تربیت میں ذرا سا بھی رُخنہ یا دھبّہ ہو گا تو وہ ان کے قائم کردہ تمدن میں بہت پھیل جائے گا۔ اور مختلف مظاہر اور صورتوں میں ظاہر ہو گا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

پیغام

ہارون الرشید (بشکریہ روزنامہ جنگ)

پاکستانی فوج کے سربراہ جنرل محمد ضیاء الحق نے مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے توسط سے اللہ کے آخری پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے ایک عہد باندھا تھا............ وقت آگیا ہے کہ یہ راز بیان کر دیا جائے' جنرل پرویز مشرف کو اس وعدے سے آگاہ کر دیا جائے اور یہ عہد ان کی طرف منتقل کر دیا جائے۔

ایک صادق اور امین گواہ موجود ہے جو پوری ذمہ داری اور تفصیل کے ساتھ اس تحریر پر شہادت دے سکتا ہے اور جنرل پرویز مشرف اس گواہ سے ذاتی طور پر واقف ہیں یہ ان کی سیکورٹی کونسل کے رکن ڈاکٹر محمود احمد غازی ہیں۔ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے نائب صدر اور سپریم کورٹ کے سابق جج۔

بہت دن پہلے ڈاکٹر صاحب نے یہ واقعہ اس عاجز کو سنایا تھا' تب انہوں نے اشاعت کی اجازت مرحمت نہ کی تھی۔ جمعہ کی شب جب کسی اور موضوع پر گفتگو کیلئے اس صاحب علم کو زحمت دی گئی تو ازراہ کرم انہوں نے رونگٹے کھڑے کر دینے والا یہ واقعہ میرے لئے دہرایا اور اشاعت کی اجازت عطا کی۔

پورے 24 گھنٹے میں نے معاملہ کے سیاق وسباق پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ پیغام منتقل کرنے کا وقت ہے اور اب اس میں تاخیر نہ ہونی چاہیے۔

یہ آٹھویں عشرے کا ذکر ہے (تاریخ اخبارات کی فائل سے متعین کی جاسکتی ہے) جب مدینہ منورہ سے جنرل محمد ضیاء الحق کے رفیق کار جناب اے کے بروہی نے ٹیلی فون پر ان سے رابطہ کیا اور بتایا کہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ جدہ سے بھارت جاتے ہوئے نصف دن کیلئے کراچی میں قیام کریں گے وہ انتہائی اہم پیغام لیکر آ رہے ہیں' لہٰذا صدر راولپنڈی سے کراچی پہنچ کر ان سے مل لیں۔ معلوم نہیں عظیم قانون دان نے سرکار ﷺ کا حوالہ دیا یا نہیں۔ تاہم جنرل محمد ضیاء الحق نے فوراً ہی آمادگی ظاہر کی۔ حجاز سے اے کے بروہی بھی ان کے ساتھ آئے۔

جیسا کہ بعد میں جناب بروہی نے ڈاکٹر محمود غازی کو بتایا کہ یکایک انہیں الجھنوں نے آلیا تھا اور وہ قرار کی تلاش میں حجاز مقدس گئے تھے۔ مدینہ منورہ میں مولانا ابوالحسن علی ندویؒ سے ان کی ملاقات ہوئی۔ وہ شخص کہ عالم کی حیثیت سے تاریخ جس کا تذکرہ ابوالکلام آزادؒ' علامہ اقبالؒ' مولانا اشرف علی تھانویؒ اور سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے ساتھ کرے گی اور جہاں تک ان کے خاص ہنر یعنی عربی زبان میں نثر نگاری کا تعلق ہے ساری دنیا جانتی ہے عرب وعجم میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا' اس آدمی کی ذاتی زندگی اجلی پاکیزہ اور قابل تقلید تھی۔

مدینہ منورہ میں اے کے بروہی نے مولانا ابوالحسن ندویؒ کو یکایک اس حال میں دیکھا کہ اضطراب ان کے پورے پیکر سے پھوٹ رہا تھا۔ سرکار ﷺ کا پاک بازامتی گنبد خضریٰ کے سائے میں حیران اور ہراساں تھا۔ یہ کس قدر تعجب خیز بات تھی؟

ابوالحسن علی ندویؒ ایسے لوگ اپنے اضطراب کا راز بیان نہیں کیا کرتے لیکن اے کے بروہی غالباً اسی لئے مدینہ منورہ بلائے گئے تھے کہ پیغام سنیں اور پہنچا دیں۔ ابوالحسنؒ نے جنہیں پیار سے علی میاں کہا جاتا تھا خواب میں سرکار ﷺ کو دیکھا تھا اور عالی مرتبت ﷺ نے ان سے خواب میں یہ

پوچھا کہ انہوں نے آپ کی حفاظت کا کیا انتظام کیا ہے۔ جیسا کہ بعد میں علی میاں نے بیان کیا وہ مضطرب ہو کر اٹھ بیٹھے لیکن کچھ دیر میں دوبارہ سوئے تو پھر سے سرکار ﷺ کی زیارت ہوئی اور آپ ﷺ نے دوسری بار سوال کیا: تم نے میری حفاظت کا کیا انتظام کیا ہے؟

رسول اللہ ﷺ کے دونوں امتی اضطراب، حیرت رنج خوف اور تعمیل کی آرزو کے ساتھ بہت دیر تک اس سوال پر غور کرتے رہے کہ سرکار ﷺ کے ارشاد کا مفہوم کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نورالدین زنگی کا سا معاملہ نہ تھا، جب دو بدبخت یہودیوں نے مرقد مبارک میں نقب لگانے کی جسارت کی تھی۔ نو سو برس سے سیسے کی دیواریں جسم اطہر کی حفاظت کرتی ہیں اب اس اشارے کا مفہوم شاید کچھ اور تھا۔

آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس معاملے کو عالم اسلام کی سب سے بڑی سپاہ کے سردار جنرل محمد ضیاء الحق کے سپرد کر دیا جائے۔ ان کے نزدیک اس پیغام کا مطلب یہ تھا کہ سرکار ﷺ کی سرزمین بالخصوص اور عالم اسلام بالعموم خطرات سے دوچار ہے۔

یہ سمجھ میں آنے والی بات تھی کیونکہ سرکار ﷺ کو اپنی امت سے بڑھ کر کبھی کسی چیز کی فکر لاحق نہ ہوئی تھی۔ بیان کرنے والے بیان کرتے ہیں کہ جزا و سزا کے دن عظیم الشان انبیاء سمیت ہر شخص اپنی جان کے روگ میں مبتلا ہو گا سرکار ﷺ اس روز بھی امت کے غم خوار ہوں گے۔

خیر مقدم ہو چکا، عظیم استقبالیہ تقریب برپا کی جا چکی اور تنہائی کا لمحہ وارد ہوا۔ یہ وقت ان سب پہ بہت بھاری تھا۔

سادہ سچے اور کھرے آدمی نے سارا عرب جس کے حسن بیاں کا مداح تھا، صاف اور آسان الفاظ میں خواب دہرایا۔ پھر شائستہ آدمی نے اپنا ہاتھ شائستہ جنرل کے گریبان پر رکھا اور کہا میں نے سرکار ﷺ کا پیغام آپ کو پہنچا دیا۔ قیامت کے دن حضور ﷺ کے سامنے مجھ سے سوال کیا گیا تو اسی گریبان کو تھام کر آپ کو سامنے لے جاؤں گا اور عرض کروں گا کہ میں نے فرض چکا دیا تھا یہ کہتے ہوئے 73 سالہ عالم دین رو دیا۔ گداز اور درد کی شدت سے شاید اس کا پورا پیکر کانپ رہا ہو گا۔ بروہی روئے اور محمد ضیاء الحق بھی روئے کہ دونوں گریہ کرنے والے آدمی تھے۔ لیکن جنرل کیلئے یہ فیصلے کی ساعت تھی۔ وہ زیادہ دیر رو نہ سکتا تھا، لہٰذا اس نے جلد ہی خود کو تھام لیا۔ پانچ لاکھ فوج اور ایٹمی پاکستان کے سربراہ نے اپنے آنسو پونچھے پھر انکسار اور عاجزی لیکن محکم لہجے میں انہوں نے کہا اگر آنجناب کو پھر سے حضور ﷺ کی زیارت نصیب ہو تو نہایت ادب سے عرض گزاریں کہ پاکستانی فوج کا آخری سپاہی تک کٹ مرے گا لیکن مدینہ منورہ اور حرمین شریفین پر آنچ نہ آنے دے گا، کون جانتا ہے کہ اس وقت جنرل کی آنکھوں میں کیسی چمک ہو گی اور وہ کن رفعتوں کو چھو رہا ہو گا۔ جنرل نے اپنا وعدہ کس طرح پورا کیا؟ میرا خیال ہے کہ ایٹمی پروگرام کی تکمیل اور حفاظت سے۔ پھر وہ قتل کر دیئے گئے اور ظاہر ہے کہ انہیں ان لوگوں نے قتل کیا جو عالم اسلام کے دشمن تھے۔ ان کے جانشین صدر غلام اسحاق خان ایک نوکری پیشہ آدمی تھے اور ان سے کسی کو کوئی امید نہ تھی۔ لیکن تاریخ شہادت دے گی انہوں نے امانت داری کے تمام تقاضے پورے کر دکھائے۔ وہ امریکی سازشوں کے سامنے ڈٹے رہے حتیٰ کہ اقتدار سے الگ کر دیئے گئے۔ بے نظیر کو ایٹمی پروگرام میں مداخلت کی اجازت ہی نہ تھی۔ وہ ایسی بد قسمت پاکستانی حکمران تھیں جنہیں کہوٹہ میں داخل ہونے کی توفیق تک نہ ہو سکی۔

جہاں تک نواز شریف کا تعلق ہے جلد ہی کھل جائے گا کہ انہوں نے صرف کارگل پر پہنے والے پاک لہو کا سودا نہ کیا تھا بلکہ وہ افغانستان، اسامہ بن لادن، ایٹم بم اور میزائل پروگرام کا قضیہ چکانے کا وعدہ بھی کر چکے

تھے لیکن پھر ایک ذرا سی غلطی انہیں اسی طرح اڑا لے گئی جیسے تنکے کو آندھی اڑا لے جاتی ہے۔ اب یہ جنرل پرویز مشرف اور ان کے بلند عزم رفقاء کی ذمہ داری ہے جن میں سے بعض کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ شاید گردنیں کٹوا دیں مگر پاکستان اور اسلام سے بے وفائی نہ کریں۔ اس عاجز کا فرض صرف یہ تھا کہ 1980ء کی پاک فوج کے سربراہ نے سید ابوالحسن علی ندویؒ کے توسط سے سرکار ﷺ کے ساتھ جو وعدہ کیا تھا وہ 2000ء کی سپاہ اور اس کے سرداروں تک پہنچا دیا جائے۔ اس سوال پر غور کرنا ان کا کام ہے کہ کیا ایٹمی پروگرام کے بغیر یہ وعدہ پورا کیا جا سکتا ہے اور یہ کہ کیا سی ٹی بی ٹی پر دستخطوں کے بعد یہ پروگرام محفوظ ہوگا؟

رہ گیا وہ شخص جو سی ٹی بی ٹی پر دستخطوں کیلئے بہت بے چین ہے تو تحقیق کر لی جائے کہ اس شخص اور اس کی اولاد کے مفادات پاکستان سے وابستہ ہیں یا امریکہ سے ..... اس عاجز کے پاس کچھ شواہد موجود ہیں۔ وقت آیا تو وہ قوم کے سامنے پیش کر دے گا۔ اگر وہ زندہ رہا' اگر اس کا سر اس کے کندھوں پر سلامت رہا۔ "اور اللہ کی رحمت سے صرف گمراہ ہی مایوس ہوتے ہیں۔" (القرآن)

وہ دلوں کی انجمن کے ہوں امیر انجمن

مولانا محمد ثانی حسنی

اے خدائے ذوالمنن اے شاہ شاہان زمن!
ہیں ترے صحرا و بن' کوہ و دمن سرو و سمن!

میرے ماموں جی ہیں مولانا علی ابوالحسن
گلشنِ دل کے ہمارے برگ و بوئے چمن

ان کے حق میں کر رہا ہوں آج تجھ سے اک دعا
گر قبول افتد زہے عز و شرف خلاقِ من

ان کے علم و فضل میں تو خیر و برکت کر عطا!
وہ رہیں ہم پر الٰہی دیر تک سایہ فگن

میرے مالک کر انہیں منجملہ خاصان حق
کر عطا ان کو خدایا مرد حق کا بانکپن

دے کمال معرفت تو کر عطا قرب و رضا
دے کے خاص الخاص انکو نسبت شاہِ زمن

اپنے لطفِ خاص سے یارب ودیعت کر انہیں
صدقِ بوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ علیؓ خلقِ حسن!

آل و اصحابِ نبی ﷺ کا کر انہیں تو جانشیں
ان کو پہنا اولیاء و اصفیاء کا پیرہن

ان کو اس دورِ خزاں میں شبلی و عطار کر
وہ دلوں کی انجمن کے ہوں امیر انجمن

وہ رہِ حضرت مجدد الفِ ثانی پر چلیں
وہ کریں اظہارِ حق کا باندھ کر سر سے کفن

دے ثبات ان کو تو شاہِ ولی اللہؒ کی
فضل رحماں کی مبارک راہ پر ہوں گامزن!

چشمہ صافی سے ان کے اک جہاں سیراب ہو
ہند سے تا کاشغر اور ازمر اکش تا یمن!

ڈال دیں وہ ذرہ خاکی پہ گر اپنی نگاہ
تیری قدرت سے بنے وہ ذرہ پھر لعل یمن

لب کشائی جب کریں تو ہو زباں گوہر فشاں
کر دیں وارفتہ زمانے کو علی شیریں سخن

ان سے ہو قائم جہاں میں پھر سے شوکت دین کی
گونج اٹھیں ان کی اذانِ حق سے پھر کوہ و دمن

ان کی پھونکوں سے مجھے یارب شرارِ بولہب
ہر نفس ہو عام دینِ مصطفائی کا چلن

توڑ کر رکھ دے طلسم سامری ان کی نظر
خاک میں مل جائے فرعون کا سارا مکر و فن

ان کو عزم و حوصلہ دے اور بلند اقبال کر
ان سے پائے زندگی اسلام کا عہد کہن

ان کو یارب شعر درج ذیل کا مصداق کر
از طفیلِ خاتم پیغمبراں شاہِ زمن!

درکفے جامِ شریعت برکفے سندانِ عشق
ہر ہوسنا کے نداند جام و سندان باختن

ایک عظیم علمی روایت کا خاتمہ

خورشید ندیم

(بشکریہ روزنامہ جنگ)

31 دسمبر کی شب جب بیسویں صدی رخصت ہوئی تو اس کے ساتھ علم و فضل کا وہ چراغ بھی بجھ گیا جو بر صغیر پاک و ہند کی مشترکہ اور روشن علمی روایت کا آخری امین تھا۔ ایک طرف ماہ و سال کے پیمانے سے ایک عہد کا خاتمہ ہوا اور دوسری طرف فکر و نظر کا ایک دور اپنے اختتام کو پہنچا۔ اس رات ندوۃ العلماء کے عظیم فرزند مولانا سید ابو الحسن علی ندوی اپنے پروردگار کے حضور جا پہنچے۔ نظری اعتبار سے انیسویں صدی کو مغرب میں افکار کا دور Age of Idealogy کہا گیا ہے کانٹ، کومٹے، مل، سپنسر، نطشے، شوپن ہار، ہیگل، مارکس صاحبان فکر و نظر کی ایک کہکشاں ہے جو اس صدی کے آسمان پر بکھری ہوئی ہے، اس عہد میں فلسفہ تاریخ کو علم کی دنیا میں یہ مقام ملا کہ انسان کی قسمت سازی میں وہ ایک بڑا عامل قرار پایا۔ دنیا مارکس کی جدلیاتی مادیت (Di alactical Materialism) نطشے کے سپر مین" اور فلسفہ جرمنی کے تصور خودی (Egoism) سمیت ان گنت نئی فکری تعبیرات سے آشنا ہوئی، بالکل اسی طرح بیسویں صدی میرے نزدیک مسلم فکر کے حوالے سے افکار کا دور (Age of Muslim Idealogy) ہے۔ ایک طرف مصر میں محمد عبدہ، رشید رضا، حسن البناء، سید قطب شہید اور محمد الغزالی جیسے حضرات نے علم و عرفان کا چراغ روشن کیا اور دوسری طرف ایران و عراق کی سرزمین پر ابو القاسم الخوئی، باقر الصدر، مرتضیٰ مطہری اور علی شریعتی جیسے لوگوں کا غلغلہ بلند ہوا۔ انڈونیشیا محمد ناصر اور شمالی افریقہ میں مالک بن نبی جیسے صاحبان علم کا ظہور ہوا، بر صغیر کا معاملہ تو سب سے منفرد رہا، سرسید احمد خان، شبلی نعمانی، علامہ اقبال، حمید الدین فراہی، ابو الکلام آزاد، سید ابو الاعلیٰ مودودی اور امین احسن اصلاحی جیسے جلیل القدر لوگ پیدا ہوئے جن کے افکار نے آج بھی ایک زمانے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ سرسید احمد خان اگرچہ 1898ء میں دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن ان کے افکار نے بیسوں صدی کے بر صغیر کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا، اسی وجہ سے ہم ان کا شمار بیسویں صدی کے مفکرین میں کرتے ہیں۔

بر صغیر میں جنم لینے والی فکری روایت میں ایک نام مولانا ابو الحسن ندوی کا بھی ہے جو علی میاں کے نام سے معروف ہیں۔ یہاں ایک متوازن دینی فکر کے فروغ میں ندوۃ العلماء کا اپنا حصہ ہے۔ ندوہ نے جو بڑے لوگ پیدا کیے ان میں ایک علی میاں بھی تھے۔ اپنے علم و فضل اور حسن سیرت کے اعتبار سے وہ فی الواقعہ ہمارے اسلاف کی نشانی تھے۔ وہ علماء کے اس کردار کی عملی تصویر تھے جس کا ذکر قرآن مجید نے کیا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ساری عمر ایک داعی اور نذیر بن کر جیے، انہوں نے "انذار" کی وہ ذمہ داری حسن و خوبی سرانجام دی جس کا تذکرہ سورۃ توبہ (22:9) میں کیا گیا ہے۔ مولانا نے تمام عمر ایک غیر مسلم ریاست میں گزاری لیکن وہ پوری امت کیلئے فکر مند رہے۔ جو لوگ مولانا کے عربی زبان کے ذوق سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ علی میاں ایسی فصیح و بلیغ زبان لکھتے اور بولتے تھے کہ اہل عرب بھی اس کے سحر میں کھو جاتے۔ عرب بہت کم کسی کی عربی دانی کا اعتراف کرتے ہیں۔ علی میاں ہمارے عہد کے شاید واحد عجمی ہیں جن کی فصاحت و بلاغت کو وہ رشک بھری نظروں سے

دیکھتے تھے۔ مجھے خیال ہوتا ہے کہ مولانا اگر عہد جاہلیت میں ہوتے تو عرب کے فصحاء ان کی زبان دانی کے اعتراف میں ان کو سجدہ کرتے۔ ان کی یہی فصاحت تھی جس نے شاہ فیصل کو مبہوت کر رکھا تھا اور وہ ہمہ تن گوش مولانا کے سامنے کھڑے تھے۔

مولانا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا" میں سوچ رہا ہوں کہ ہمارے ہاں بھی ایک بادشاہ گزرا ہے' آج کا بھارت' پاکستان' سری لنکا' برما' نیپال دور دور تک اس کی حکومت تھی' اس نے اپنے باون سالہ عہد اقتدار میں بیس برس گھوڑی کی پیٹھ پر گزارے' اس کے دور میں مسلمان آزاد تھے' خوشحال تھے' ان کیلئے آسانیاں تھیں لیکن بادشاہ کا حال یہ تھا کہ وہ پیوند لگے کپڑے پہنتا تھا' وہ قرآن مجید کی کتابت کر کے اور ٹوپیاں بنا کر گزر اوقات کرتا' رات بھر اپنے پروردگار کے حضور کھڑا رہتا اور اس کے دربار میں اپنے آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرتا' اس وقت مسلمان حکمران غریب اور سادہ تھے اور عوام خوشحال اور آسودہ' آج آپ کا یہ محل دیکھا تو خیال آیا کہ سب کچھ کتنا بدل گیا ہے' آج ہمارے بادشاہ خوشحال ہیں اور بڑے بڑے محلات میں رہتے ہیں اور دوسری طرف مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ فلسطین میں بے گھر ہیں' کشمیر میں ان کا لہو ارزاں ہے' وسطی ایشیاء میں وہ اپنی شناخت سے محروم ہیں' آج میں نے آپ کے محل میں قدم رکھا تو اس تقابل میں کھو گیا" راوی کا بیان ہے کہ جب علی میاں خاموش ہوئے تو شاہ فیصل کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا' اب ان کی باری تھی۔ پہلے ان کے آنسو نکلے پھر ہچکی بندھ گئی' اس کے بعد وہ زار زار رونے لگے' وہ اتنی بلند آواز میں روئے کہ ان کے محافظوں کو تشویش ہوئی اور وہ بھاگتے ہوئے اندر آگئے' شاہ فیصل نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے باہر جانے کو کہا' پھر مولانا سے مخاطب ہو کر بولے" وہ بادشاہ اس لئے ایسے تھے کہ انہیں آپ جیسے ناصح میسر تھے' آپ تشریف لاتے رہیں اور ہم جیسے کمزور انسانوں کو نصیحت کرتے رہیں" اس ملاقات میں شاہ فیصل نے ندوۃ العلماء کیلئے ایک خطیر رقم پیش کرنا چاہی' لیکن مولانا نے انکار کر دیا اور کہا کہ بندہ کے معاملات اللہ تعالیٰ کی عنایت سے بہتر طور پر چل رہے ہیں۔ علی میاں ایسے شائستہ اطوار تھے کہ ان کے معاصرین میں کم لوگ ان کی مثل ہوں گے۔ وہ ایک دور میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے متاثر ہوئے اور جماعت اسلامی کے کارکن بن گئے لیکن جلد ہی علیحدگی اختیار کر لی۔ افتادہ طبع کے اعتبار سے وہ ایک زاہد اور عبادت گزار آدمی تھے۔ اس لئے انہیں تبلیغی جماعت میں زیادہ کشش محسوس ہوئی اور انہوں نے اپنی راہیں جدا کر لیں لیکن یہ کام اتنی خاموشی سے ہوا کہ بہت کم لوگوں کو اس کی خبر ہوئی۔ بہت عرصے کے بعد انہوں نے اس اختلاف کا برملا اظہار کیا جو ان کی جماعت سے علیحدگی کا سبب بنا' ان کا خیال تھا کہ مولانا مودودی کی تعبیر ذہن میں سیاست کی طرف جھکاؤ اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس کے نتیجے میں ان کی شخصیت میں عدم توازن پیدا ہو گیا ہے۔ اس افراط کے باعث وہ شخصیت وجود میں نہیں آتی جو دین میں مطلوب ہے' انہوں نے اپنی اس رائے کا اظہار اپنی کتاب "عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" میں کیا ہے۔ اس اختلاف کو بیان کرتے وقت انہوں نے مولانا مودودی کے علمی وقار اور دینی خدمات کا لحاظ رکھا اور کہیں بھی شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا' مولانا مودودی کے ساتھ احترام اور محبت کا تعلق مولانا کی وفات تک باقی رہا' مولانا مودودی کا معاملہ تو ایک طرف رہا ان کی شائستگی کا یہ عالم تھا کہ جب انہوں نے "قادیانیت" کے عنوان سے کتاب لکھی تو اس میں غلام احمد قادیانی کا تذکرہ" غلام احمد صاحب قادیانی" کے الفاظ سے کیا۔ بلاشبہ یہی ایک حقیقی داعی کی شان ہے۔ وہ مناظرہ باز اور کج بحث نہیں ہوتا اس کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ وہ مخاطب تک حق کی بات پہنچا دے تاکہ وہ پلٹ آئے۔ وہ اسے صفحہ ہستی سے مٹانے کے درپے نہیں ہوتا۔ علمی اعتبار سے اگرچہ

انہوں نے "تدبر قرآن" یا "تفہیم القرآن" جیسی کوئی یادگار نہیں چھوڑی لیکن اس کے باوجود ان کا تحقیقی و تصنیفی کام اتنا وقیع ہے کہ بیسویں صدی کے مسلم فکر کے ارتقاء کا جائزہ لیتے وقت اسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ "نبی رحمت" کے ذکر جمیل سے لے کر ایک مورخ کی طرح انہوں نے چھ جلدوں میں "تاریخ دعوت و عزیمت" مرتب کی۔ "مطالعہ قرآن کے اصول و مبادی" اور "حدیث کا بنیادی کردار" جیسے مسائل پر ایک جید عالم کی طرح قلم اٹھایا" معرکہ ایمان و مادیت" سے لے کر "مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" جیسے عصری مسائل کو بھی موضوع بنایا ان کے پاس ایک سوانح نگار کا قلم تھا اور ایک مصلح کا بھی۔ علامہ اقبال سے انہیں گہری عقیدت تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ پہلے آدمی تھے جنہوں نے موثر طور پر عالم عرب کو اقبال سے متعارف کرایا۔ مولانا کی یہ کتاب "نقوش اقبال" کے عنوان سے اردو میں بھی ترجمہ ہوئی اقبال کے ساتھ ان کی یہ محبت آخری وقت تک باقی رہی۔ جی چاہتا ہے کہ انہیں اقبال ہی کے الفاظ میں آخری بار مخاطب کیا جائے۔

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثل ایوان سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

سحر و دل کشی کے اسباب

تاریخ کی شہادت اور انسانی نفسیات کا بار بار کا تجربہ ہے کہ جب بھی بڑے سے بڑے فساد عقیدہ، ضلالت اور کج روی کے ساتھ حوصلہ مندی، مہم جوئی اور تقشف و جفاکشی کے مظاہر جمع ہو جاتے ہیں تو اس تحریک و دعوت میں ایسی دل کشی اور ساحری پیدا ہو جاتی ہے کہ اچھے اچھے عاقل و ذکی، دین پسند اور صاحب مطالعہ و نظر اشخاص کو اس کے اثر سے محفوظ رکھنا اور اس کی ثناخوانی اور مدّاحی سے روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ قرنِ اوّل کے خوارج کی تحریک، چھٹی ساتویں صدی میں باطنیوں کی تحریک، اور حسن بن صباح اور قلعۂ الموت کے فدائیوں کے کارناموں اور خود ہندوستان کی بعض نیم عسکری تحریکوں اور تنظیموں کے بارہ میں حوصلہ مند نوجوانوں اور اقتدار و سیاسی طاقت کی شمع کے پروانوں کی والہانہ و خود فراموشانہ کیفیات (جن کو زیادہ زمانہ نہیں گزرا) اس کی گواہ ہیں، اور یہی مرحلہ حق و ہدایت کو معیار سمجھنے والوں اور عقیدۂ صحیحہ اور منصوصاتِ قرآنی کے بارہ میں حمیت و غیرت رکھنے والوں کے امتحان کا موقعہ ہوتا ہے اور ان کو اس اعلان حق کی دعوت دیتا ہے جو سحر انگیزی کی اس فضا میں "کلمة حق عند سلطان جائر" کا ثواب و مقام دلانے کا ضامن ہوتا ہے۔

——— حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

موت العَالِمُ موت العَالَمْ

خطاب مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ

مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نوراللہ مرقدہ کے سانحہ ارتحال کی خبر جوں ہی دارالعلوم حقانیہ میں پہنچی۔ تو یہاں پر غم واندوہ کی ایک طوفانی لہر دوڑ گئی اور دوسرے دن یکم جنوری 2000ء کو نماز ظہر کے بعد آپ کی روح کو ایصال ثواب کے لئے ختمات قرآن پاک اور تعزیتی اجتماع کا اہتمام کیا گیا۔ اس کے بعد درد وکرب میں ڈوبے ہوئے اجتماع سے حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ نے ان کی شخصیت سوانح وکردار پر مختصر (پشتو) خطاب فرمایا۔ جس کو آپ کے فرزند اکبر مولانا حامد الحق حقانی ٹیپ ریکارڈر سے ضبط کر کے قارئین الحق کی نذر کر رہے ہیں............ (ادارہ)

میرے معزز علماء کرام اور طلباء عظام!

آج کے ختم قرآن کا مقصد ایک عظیم شخصیت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (علی میاں) کی وفات پر ان کو ایصال ثواب بخشوانا مقصود ہے جو علمی دنیا کیلئے عظیم سانحہ ہے۔ آپ عالم اسلام کے عظیم المرتبت اور جید عالم دین تھے۔ آپ صرف ایک جید عالم ہی نہیں بلکہ داعی اسلام اور عالم اسلام کے عظیم مفکر اور برصغیر کے بلند پایہ اکابرین کی آخری نشانی تھے۔ وہ کل ہندوستان کے شہر رائے بریلی میں اس دنیائے فانی سے رحلت فرما گئے ہیں۔ آپ میں اکثر طلباء ان کے اصل مقام اور شخصیت سے شاید پورے طور پر واقف نہ ہوں لیکن جو بڑے علماء اکابر ہیں وہ ان کی خدمات سے بخوبی واقف ہیں۔ اور وہ سب حضرات اس عظیم سانحہ اور صدمہ کو پوری امت کیلئے عظیم الشان نقصان سمجھتے ہیں۔ آپ ایک ایسے عالم اور مبلغ تھے جن کا پوری امت کے ساتھ تعلق رہا۔ اگرچہ لسانی لحاظ سے وہ ہندوستان کے باشندہ تھے لیکن اقوام عرب کے قلوب میں بھی محبوب تھے۔

عرب کے تمام علماء مورخین' مفکرین' دانشور اور اخبارات کے مدیران حضرت کو استاد کا درجہ دیا کرتے تھے۔ آپ کو وہ الداعی الکبیر کہا کرتے تھے کہ آپ عالم اسلام کے سب سے بڑے داعی ہیں۔ اردو زبان کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں عربی زبان پر ایسا عبور دے رکھا تھا کہ عرب بھی ان کی طرح فصیح اور بلیغ عربی نہیں لکھ سکتے تھے۔ آج وہ عرب حضرات حضرتؒ کی عربی سے استفادہ کرتے ہیں۔ ابھی آپ جوان تھے کہ جامعہ الازہر وغیرہ کے بڑے بڑے مشائخ نے آپ کی بڑی بڑی کتب مطالعہ کیں تو انہوں نے آپ کے بارے میں رائے دی کہ یہ تو عجیب اور نادر کتب کے مصنف ہیں۔ اسی طرح حضرت نے عربوں کے ساتھ ساتھ یورپ کے لوگوں کو بھی اپنا پیغام پہنچا دیا اللہ تعالیٰ نے حضرت کو یہ محبوبیت اور مقبولیت بخشی تاکہ سارے عالم میں اسلام کی ترجمانی اور دعوت۔ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے پھیلانا چاہتے تھے۔ وہ سب کو

واضح اور دو ٹوک پیغام دیا کرتے تھے عربوں میں گئے جہاں شاہ فیصل' شاہ خالد' شاہ فہد جیسے بادشاہ' مصر کے حکمران اور اردن امارات کے حکام ان کی مجالس میں موجود ہوتے تھے "اسمعها صريحة منى ايها العرب" جیسے خطبات اس کی واضح مثالیں ہیں۔ غرض اللہ تعالیٰ نے ان کو کلام حکمت اور انداز اور گفتار کا طریقہ عجیب عطا فرمایا تھا۔ کہ ہر انسان عام وخاص کے دل پر اثر انداز ہوتا تھا۔ اور اب عمر کے آخری حصے میں اللہ تعالیٰ نے ان پر امریکہ اور یورپ کے مزید دروازے بھی کھول دیئے تھے۔ وہ وہاں کی یونیورسٹیز اور کالجز میں بھی اسلام کا پیغام پہنچاتے رہے۔ گویا کہ آپ ایک جامع الصفات شخصیت تھے۔ زمانہ جدید میں قحط الرجال ہے۔ ایک فرد بہت بڑا جید' مدرس ہوگا ضخیم کتب کی شروح پر عبور ہوگا لیکن وہ داعی نہ ہوگا۔ بڑا مصنف ہوگا تو انہیں فن تقریر پر عبور حاصل نہ ہوگا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرتؒ کو فن تحریر و تقریر کے ساتھ ساتھ عربی ادب میں اعلیٰ مقام عطا فرمایا تھا۔ تصوف روحانیت اور امت کے غم میں رات دن وہ فکر مند رہتے اور ان کی گہری نظر عالم اسلام کے امراض پر بھی تھی کہ عالم اسلام کس مرض میں مبتلا ہے اور آپ بیماری کو سمجھ گئے تھے کہ عالم اسلام کی بیماری مغربیت ہے۔ اور مغرب کے فلسفہ و تہذیب اور تمدن نے عالم اسلام کو تباہ و برباد کر دیا ہے یہ آپ کا خاص موضوع تھا۔ گہ مغربیت کے فتنے جو مادہ پرستی وغیرہ کی شکل میں اٹھکر عالم اسلام کو تہس نہس کر دینا چاہتے ہیں۔ اگر وہ مصطفیٰ کمال کی صورت میں تھے یا کسی بھی لادین کی صورت میں تو ان کے مقابلے میں وہ دلائل لیکر میدان میں نکلے' جب عربوں پر قومیت پرستی سوار تھی' قومیت کا بہت بڑا نشہ ہوتا تھا تو مصر والے کہا کرتے تھے کہ "نحن ابناء الفراعنه" جمال عبدالناصر جیسا ڈکٹیٹر لیڈر کے سامنے کوئی اور اس دور میں کوئی کلمہ حق نہیں کہہ سکتا تھا لیکن حضرتؒ میدان میں مقابلے کیلئے اترے اور قلم اور تحریر سے تمام فتنوں کی سرکوبی کی۔ تاریخ کے میدان میں آپ ایک عظیم مورخ بھی تھے۔ ابن خلدون کا جس طرح اسلام کے عروج اور زوال اور اقوام کے تنزل اور اسلام کے اصولوں پر گہری نظر تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا ندویؒ کو ان سے زیادہ نئے دور میں وسیع النظری عطا فرمائی تھی۔ قوم پرستی' مادیت' سیکولر ازم مغربیت کو حضرت زہر قاتل سمجھتے تھے' وہ زہر قاتل کا تجزیہ و تشخیص اس طرح کرتے تھے کہ امت اس سے کیسے بچے' دوسری طرف اسلام کے رموز پر اللہ تعالیٰ نے انہیں گہری نظر عطا کی تھی۔

انہوں نے "الارکان الاربعه" کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی' اسلام کے ان چار بنیادی ارکان پر جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ جس میں نماز' روزہ' حج زکوٰۃ اصول عبادات کا قدیم وجدید مذاہب سے موازنہ کیا اور سارے فلسفے جمع کئے' اس کے ساتھ علماء و طلباء کو دعوت دیتے تھے کہ اپنے ان ائمہ واکابرین کی جو کہ عزیمت اور استقامت کے علمبردار تھے کہ انہی کے نقش قدم پر چلیں۔ تاریخ دعوت و عزیمت ان کی کئی جلدوں پر مشتمل مستقل کتاب ہے۔ عزیمت اور دعوت اسلام مجدد اول عمر بن عبدالعزیز سے مجدد الف ثانی اور ان کے بعد تک یہ ساری وہ کتابیں ہیں جن کا طلباء کیلئے مطالعہ کرنا بہت ضروری سمجھتا ہوں۔

حضرتؒ علماء و طلباء کیلئے ایک بہت بڑا ذخیرہ میراث میں چھوڑ چکے ہیں۔ اور دوسرے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک اور بڑی عزت یہ بخشی ہے کہ سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ نے ڈیڑھ سو سال پہلے انگریزوں اور سکھوں کے خلاف ایک بہت بڑا (جہاد اول) کیا تھا۔ آج اگر افغانستان یا کسی دوسرے خطہ میں جہاد جاری ہے تو یہ انہی دونوں شہداء کے جہاد کے اثرات ہیں۔ آپ طلباء کو تاریخ معلوم ہوگی کہ انہی شہداء نے یہ پہلی جنگ اسی سرزمین اکوڑہ خٹک پر لڑی تھی۔ یعنی جہاد کا آغاز اسی دارالعلوم کی

مٹی پر ہوا تھا۔ آپ حضرت سید احمد شہید کی اولاد میں سے اور ان کے جانشین اور خاندان کے حقیقی وارث تھے۔ گویا تجدید دین کا کام اللہ تعالیٰ ان سے لینا چاہتا تھا۔ "سیرت سید احمد شہید" مولاناؒ نے تحقیقی کتاب نو عمری میں لکھی۔ گھر سے نکل کر اکوڑہ خٹک اور گردونواح کے قصبوں کی مساجد میں راتیں تکالیف میں گزار کر عظیم شہداء کے حالات دریافت کرنے کے بعد تحریر فرمائی تھی۔ یہ آپ کی جوانی کی پہلی کتاب ہے۔

حضرتؒ ہمیں اپنے واقعات میں اکوڑہ خٹک کے گردونواح میں اپنے قیام کے بارے میں بتایا کرتے تھے اب تاریخ سید احمد شہیدؒ میں "جنگ اکوڑہ" ایک مستقل باب ہے۔

بہر حال وہ ایک عظیم داستان ہے حضرتؒ کو علماء اور اکابرین پیار سے علی میاں کہا کرتے تھے۔ ان کا خاندان ہندوستان کا بڑا علمی خاندان تھا۔ ان کے والد ماجد ہندوستان کے بڑے مورخ تھے۔ حضرت مولانا عبدالحئیؒ الحسنی "نزهة الخواطر" کی کئی جلدوں میں ہندوستان اور پاکستان کے بڑے علماء کی تاریخ وحالات مرتب کر چکے ہیں۔ ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند ایک بڑا عظیم ادارہ ہے جس کا اپنا ایک انداز ہے جس کا تعلق دینی علوم اور روحانیت وغیرہ کے ساتھ ہے۔ اور دوسرا بڑا ادارہ علی گڑھ ہے جو کہ انگریزی علوم کا علم بردار ہے اس کے بعد اکابرین نے ایک ادارہ قائم کیا جس میں دیوبند کی روح بھی موجود ہو لیکن اس میں روحانیت کے ساتھ عربی ادب' اردو اور دیگر زبانوں میں فصاحت اور بلاغت کے ساتھ اسلام کی تعبیر وتشریح بھی امت کے سامنے کی جاسکتی ہو۔ وہ ادارہ علامہ شبلی نعمانی وغیرہ نے قائم کر دیا تھا اور اس کو "ندوۃ العلماء" کہتے ہیں وہ ہندوستان میں تیسرا بڑا ادارہ ہے' ندوی جتنے بھی کہلاتے ہیں یہ ندوۃ العلماء کے مستفید حضرات ہیں مثلاً حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی' علامہ سید سلیمان ندوی' جس طرح حقانی حضرات کی نسبت حقانیہ کی طرف منسوب ہے۔ علی گڑھ والے فارغ التحصیل "علیگ" کہلوانا پسند کرتے ہیں اور دیوبند کے فارغ التحصیل "دیوبندی" کہلاتے ہیں۔

اس وقت ندوۃ العلماء کی سرپرستی تقریباً پچھلے چار عشروں سے حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ فرما رہے تھے' وہ ندوۃ کے روح رواں تھے۔ بہر حال حضرتؒ ایک جامع الصفات شخصیت تھے بھائیو! ہم ایک طبقہ ایک برادری ہیں خاندان میں ایک چھوٹا بچہ وفات پا جائے تو پورے خاندان کو صدمہ لاحق ہوتا ہے۔ اس وقت تو خاندان کا ستون اور سردار ہم سے رخصت ہو کر اس دنیا فانی سے رحلت فرما گئے ہیں۔ عربی شاعر نے سچ کہا ہے کہ۔

وما کان قیس هلکه هلك واحد
ولکنه بنیان قوم تهدما

بھائیو! اس وقت پورے برصغیر میں قحط الرجال ہے۔ پچھلے زمانہ میں ایک سے بڑھ کر ایک عالم اور محبوب شخصیات ہوتی تھیں۔ جو خلاء کو پر کر دیا کرتی تھیں۔ لیکن اب وہ صورت حال نہیں ہے۔ افراد کار ختم ہو چکے ہیں۔ حضرت علی میاںؒ کی وفات حسرت حیات ساری ملت کے لئے ایک بڑا سانحہ ہے اور ایک علمی خاندان کے لحاظ سے ہمارا فرض ہے کہ ہم حضرتؒ کے لئے دعا کرتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں عظیم درجات اور اعلیٰ مقامات پر فائز فرمائے۔ انہوں نے ملت کے لئے سینکڑوں کتابوں کا صدقہ جاریہ چھوڑ رکھا ہے جو آخرت میں ان کے کام آئے گا۔

حضرتؒ کا ہمارے ساتھ ہمیشہ محبت اور شفقت کا برتاؤ رہا۔ تیس چالیس برسوں سے ان کا الحق کی مناسبت سے خصوصاً میرے ساتھ قلبی اور قلمی تعلق وسرپرستی کا رشتہ رہا۔ اس لحاظ سے ہم ایک مشفق سرپرست سے محروم ہو گئے۔ ایک مرتبہ ہم انہیں دارالعلوم کا دورہ کرنے لے آئے تھے' وہ نہایت بیمار اور کمزور تھے لیکن ضعف کی حالت میں بھی انہوں نے ہماری تمنا پوری

فرمائی۔ اپنے اسی دورے کے موقع پر قدیم دارالحدیث کی دوسری منزل پر احاطہ اسماعیلہ اور احاطہ سید احمد شہید کے سنگ بنیاد حضرتؒ نے اپنے دست مبارک سے رکھی تھی۔

عزیز طلبا! آپ کو اس تعزیتی جلسہ سے اتنا پتہ چل چکا ہے کہ حضرتؒ اس صدی کی ایک عظیم ہستی تھیں۔ اور وہ اب ہم میں نہ رہے لیکن وہ کون تھے ان کے علوم کیا تھے یہ تجسس اپنے ذہنوں میں ضرور رکھیں۔ تاکہ ان کی تصانیف آپ مستقل پڑھتے رہیں۔ ان کے علوم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ فصیح و بلیغ انگریزی، فرانسیسی، فارسی، عربی اور ترکی میں منتقل ہو چکے ہیں۔ ان کا کلام فلسفہ اصول و ہدایات پر مبنی دنیا بھر میں اللہ تعالیٰ پھیلانا چاہتے تھے۔

آخر میں آپ سب اس ختم قرآن پاک کا ایصال ثواب حضرتؒ کی روح پر اور اپنے اساتذہ کرام اور اکابرین پر ضرور بھیجیں۔ اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ملت کے اس غمخوار و غمگسار اپنے بندے کے درجات بلند فرمائے اور بہترین مقامات قرب وارض پر فائز فرما دے اور ہم سب کو اس کے مشن پر چلنے اور آگے بڑھانے کی توفیق دے۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

مغرب کی کشکولِ گدائی مناسب ہے یا دُنیا کی رہنمائی کا منصبِ عالی

● "مغربی تہذیب کو پوری طور پر گھن لگ چکا ہے، وہ اب محض صلاحیت اور زندگی کے استحقاق کی بنا پر نہیں جی رہی ہے بلکہ اس لئے کہ بدقسمتی سے کوئی دوسری تہذیب اس کی جگہ لینے کے لئے تیار نہیں، اس وقت جتنی تہذیبیں یا قیادتیں ہیں، یا تو مغربی تہذیب کی لکیر کی فقیر، اور اس کی ایک رُوکھی پھیکی تصویریں، اور اِتنی کمزور اور شکست خوردہ ہیں کہ اس سے آنکھیں نہیں ملا سکتیں، اب اگر اسلامی ممالک اور عالمِ اسلام مجموعی طور پر اس خلاء کو پُر کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکے جو مغربی تہذیب کے خاتمہ سے عالمِ انسانی میں پیدا ہوگا تو اس کو دُنیا کی امامت کا دوبارہ منصب تفویض کیا جاسکتا ہے جو سنۃ اللہ کے مطابق ایک جری و قوی اور تازہ دم ملت یا قیادت کے سپرد کیا جاتا رہا ہے، اب ان قائدین کو یہ فیصلہ کرنا چاہئے کہ کیا مغرب کی دائمی حاشیہ برداری اور کشکولِ گدائی مناسب ہے، یا دُنیا کی رہنمائی کا منصبِ عالی، اور عالمِ انسانی کی ہدایت کی مسند رفیع جس سے (نبوت کے بعد) بڑھ کر کوئی سرفرازی اور سربلندی نہیں، میرے نزدیک یہی اس وقت مسلم ممالک سب سے بڑا اور حقیقی مسئلہ ہے اور اسی سوال کے جواب پر (کہ مغربی تہذیب کے بارے میں یہ ممالک کیا رویہ اختیار کرتے ہیں) اس بات کا انحصار ہے کہ دُنیا کے نقشے میں اُن قوموں کی نوعیت کیا قرار پاتی ہے، اور ان ملکوں میں اسلام کا کیا مستقبل ہے۔"

● حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

طاب حیًا وطاب میتًا

زندگی بھی خوشگوار، موت بھی شاندار

مولانا عبداللہ عباس ندوی

وہ واقعہ جس کو ایک نہ ایک دن آنا ہی تھا، وہ 22 رمضان المبارک 1420ھ (31 دسمبر 1999ء) کو پیش آگیا۔ یعنی حضرت مخدوم ومربی مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے وفات پائی۔

اللہم قدس روحہ واکرم مثواہ

یا نفس أجملی جزعا

فـانک ماتحذرین قد وقعا

اے نفس شورش غم پر قابو رکھ، جس بات کا تجھے ڈر تھا وہ بات پیش آگئی۔ خلود، ہمیشگی کی زندگی، آخرت کے لئے ہے، عالم ناسوت کے لئے فنا مقدر ہے۔

بہ گیتی گر کسے پائندہ بودے

ابوالقاسم محمد ﷺ زندہ بودے

کسی کی موت پر اظہار غم کوئی نئی بات نہیں ہے، اس کے سیکڑوں اور ہزاروں اندازِ بیان ہیں، نظم ونثر دونوں میں یہ صنف ادب مشہور ہے، لیکن ہر طرح کے مبالغوں سے پاک، انتہائی حقیقت پسندانہ، سادہ اور سچا، دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا، بے تصنع اور سخن سازی سے برا سیدنا ابوبکر صدیقؓ کا جملہ ہے۔ سرکار دو عالم ﷺ کی وفات کے بعد آپ کے جسد اطہر کے پاس تشریف لائے، جبین مبارک کو چوما اور کہا۔ "طبت حیا وطبت میتا" آپ کی زندگی پاکیزہ اور اچھی رہی اور آپ کی موت بھی پاکیزہ اور اچھی رہی۔ آج رسول کریم ﷺ کے ایک امتی، اللہ کے بندہ بے نوا ابوالحسن علیؒ پر یہی جملہ ہر طرح صادق نظر آتا ہے۔ آج وہ اللہ کے لطف وکرم کے محتاج، اس کی مغفرت کے طلبگار، اس کی رحمتوں کے امیدوار ایک جسد خاکی ہیں، حضرت مولانا سیدنا مرشدنا اور اسی قافیہ وترکیب کے سیکڑوں الفاظ نام سے پہلے اور نام کے بعد لکھے جاسکتے ہیں۔ مگر یہ سب دنیاوی زندگی کے القاب تھے، آخرت کا لقب صرف وہی ہے جس میں عبدیت کا اظہار ہو۔

بات کہی تھی خلیفہ رسول برحق نے، اور جس کے حق میں کہی تھی وہ سرور کائنات اور فخر موجودات تھے، مثال وتشبیہ تعریف وتشخص میں نہیں دی جارہی ہے۔ ہاں اس نور کا ایک شمہ، اس سمندر کا ایک قطرہ، ایک بندہ خدا اور رسول پاک ﷺ کے متبع سنت فرد پر صادق آرہا ہے۔

طاب حیا...... زندگی کامیاب، بلند اقبال رہی، مقبولیت عند اللہ کا تاج زریں آخری سانس تک سر پر رہا، مقبولیت ونورانیت ایسی جو عہد قریب میں کہیے یا اس صدی میں اس درجہ وسیع پیمانے پر شاید ہی کسی کو حاصل ہوئی ہے۔

ایک فقیر بے نوا، بے تاج وگھر نے بادشاہی کی، دلوں پر حکومت کی، ملک سے باہر صرف عرب کے کسی ایک خاص حصہ میں نہیں بلکہ تمام عرب ممالک میں، مشرق قریب، اوسط، اور بعید کے ہر خطے میں، وہ دینی کتابوں کا مصنف جس کی کتابیں پڑھنا علم وثقافت کی دلیل ہو اور جس سے ناواقفیت جہل ونادانی کی علامت ہو، جو بغیر کسی فکر وفن اور بغیر سیاسی قلابازیوں، انجمن سازیوں کے، پارٹیوں اور جماعتوں پر بھاری ہو، جس کے ایک بول سے "اوراقِ حکومت پر شکن" آجاتی ہو، جو زندگی بھر کسی گورنر یا صدر حکومت کی، یا وزیر اعظم یا وزیر اعلیٰ کی کوٹھیوں کے چکر لگاتا ہوا نہ دیکھا گیا ہو، بلکہ خود حکمراں ہی، اپنی حکمرانی کے زمانے میں بھی اور حکمرانی ختم ہونے کے بعد بھی اس کے در پر آئے ہوں، جو بادشاہوں اور جمہوریتوں کے صدروں سے نہ ملنے سے ڈرا ہو، اور نہ ڈر کر بات کی ہو، ایک ہی وقت میں

متعدد آل انڈیا اور آل ورلڈ جماعتوں کا صدر ہو مگر اپنے بوریہ فقر سے ایک انچ ٹلا نہ ہو' جس کو اگر کسی غیر مسلم نے دیکھا تو برملا کہا "یہ چہرہ کسی جھوٹے کا نہیں ہو سکتا" اور مسلمان نے دیکھا تو اس کی عقیدت و محبت کا دم بھرتا رہا۔ جس نے کسی بڑی سے بڑی کانفرنس یا بڑے سے بڑے مہمان کی خاطر اپنے معمولات ورد وظائف میں ایک لمحہ کی تقدیم و تاخیر نہ کی ہو۔ غیرتِ دینی اور حب نبوی علیہ ﷺ میں جس نے وقت کے کسی بڑے سے بڑے جابر حکمراں کی پرواہ نہ کی ہو۔ "طاب حیا" کی اس سے زیادہ روشن' واضح' بے داغ تصویر اس عہد میں نمایاں دیکھی گئی ہے؟

فرمودہ صدیقی کا دوسرا جملہ "طاب میتا" اور دعائے ماثورہ "اللھم بارک فی الموت وما بعد الموت" کی قبولیت بھی دنیا نے دیکھ لی۔ رمضان المبارک کا مہینہ' فالج زدہ اور کمزور جسم کے ساتھ تمام روزے پورے کئے' ایک وقت کی فرض نماز کیا سنت و مستحب بھی فوت نہیں ہوئی' تلاوت و اوراد میں کوئی لمحہ بھر کا فرق نہیں آیا' شدید علالت میں بھی جس کی جماعت نہ چھوٹی ہو' جمعہ کا دن اور جمعہ کے تمام آداب مسنونہ' حجامت' غسل' وضو سے آراستہ' معمول کے مطابق مسجد جانے کے لئے تیار' تلاوت کے دوران جب سورہ یٰسین کی گیارہویں آیت "فبشرہ بمغفرۃ واجر کریم" پر آخری سانس لی ہو' "طاب میتا" کی اس سے اچھی تفسیر کس نے دیکھی اور پڑھی ہے۔

حرم بیت اللہ اور حرم نبوی شریف کے مذنہ (اذان دینے کی جگہ) سے یہ آوازیں بلند ہوتی ہیں 'الصلوٰۃ علی المیت الغائب' علی سماحۃ السید ابی الحسن علی الحسنی الندوی۔ اس نماز میں خادم الحرمین الشریفین اور ان کے وزراء وحکام شریک تھے' تو دوسری طرف اللہ کے وہ اشعث واغبر (پراگندہ حال و پراگندہ مال) بندے بھی تھے جو ہزاروں میل کی مسافتیں طے کر کے حرمین میں ستائیسویں شب گزارنے آئے تھے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ علیہ ﷺ کسی جنازے کی نماز پڑھا رہے تھے صلاۃ جنازہ کی دعا کے الفاظ سن کر صف بستہ نمازیوں میں ایک صحابی نے کہا "لیتنی کنت المیت" کاش میں ہی میت ہوتا اور میری نماز جنازہ ہوتی۔ امت اسلامیہ میں آج بھی ایسے ہزاروں نفوس ہیں جن کے دل میں یہ بات آئی ہوگی جب ایک ہندی المولود قصباتی مسلمان کے لئے مسجد حرم میں بیس لاکھ اور مسجد نبوی میں 8 لاکھ مسلمان زائر جنازہ غائبانہ پڑھ رہے تھے۔

اس غم کی کہانی میں یہ شادمانی تابناک روشنی ہے!!

ملک کا سرمایہ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی ؒ
کراچی یونیورسٹی (پاکستان)

اگر مجھ سے کوئی کسی ملک کی تعریف کرے اور بتائے کہ وہ بڑی فوجی طاقت کا مالک ہے، اس کی معاشیات بڑی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے، دُنیا کی بڑی طاقتوں سے اس کے بڑے اچھے تعلقات ہیں، اور ان کی نظر میں اس کا بڑا احترام ہے، تو مجھے یہ سُن کر اطمینان نہیں ہوگا، میں کہوں گا کہ مجھے یہ بتایئے کہ وہاں کے اسکولوں اور کالجوں سے لے کر یونیورسٹیوں کے طلبہ تک نئی نسل کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں کس درجہ کا احساس ذمہ داری پایا جاتا ہے، ان میں ضبط نفس کی کتنی طاقت ہے، ان میں اپنے تاثرات کو حدِ اعتدال میں رکھنے کی کتنی صلاحیت اور قانون کے احترام کی کتنی عادت ہے؟ اگر وہ صاحب کہیں گے کہ اس کی طرف سے تو میں اطمینان نہیں دلا سکتا تو میں کہوں گا کہ پھر مجھے اس ملک کے حال و مستقبل کے بارہ میں کوئی اطمینان نہیں ہے۔

حضرت مخدومی و مرشدی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس خط کا عکس جس میں اس عاجز کو اپنی تصنیفات و مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی مطبوعات اور دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی عربی نصاب کی کتابیں پاکستان میں طبع واشاعت کی اجازت مرحمت فرمائی ——— فضل ربی ندوی

باسمہٖ

Phones [22948 23547 Tele. : NADWA

Abul Hasan Ali Nadwi

DARULULOOM NADWATULULAMA

LUCKNOW-1 (India)

ابو الحسن علي الحسني الندوي

ندوة العلماء لكهنؤ — الهند

تحریر آنکہ

عزیز القدر مولوی فضل ربی سلمہ اللہ تعالیٰ وبارک فیہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ امید ہے کہ تم بخیر و عافیت ہو، اور حالات حسب معمول ہوں گے۔ تمہارے والد ماجد سابق ملاقاتیں یاد ہیں، تم سے ایک بار جدہ میں رواروی کی ملاقات ہوئی، لیکن وہ بس ذرا سا اور میں [illegible] ہو گیا تھا، اطمینان سے ملنا نہ ہو سکا، [illegible] برادر زادہ عزیز محمد میاں سلمہ نے تمہارا بہت تذکرہ کیا، وہ بڑے اچھے تاثرات اور تعلق لے کر آئے تھے، تمہاری سعادت مندی، اہل تعلق اور محبت سے بہت ہی خوشی ہوئی، اللہ تعالیٰ تم کو دینی و دنیوی ترقیات سے نوازے، اور اپنے مقبول و مخلص بندوں میں شامل فرمائے،

محمد میاں سے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ تم ایک اسلامی مکتبہ اور دار الاشاعت قائم کرنا چاہتے ہو، جس کا خاص مقصد ہماری تصنیفات، اور مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی مطبوعات کی پاکستان میں اشاعت ہو، ہم بہت خوشی سے اس کی اجازت دیتے ہیں کہ تم ان کی اور دار العلوم کی [illegible] شائع کرو، اور مجلس کی مطبوعات پاکستان میں طبع ہوں، اور ان کی ان حلقوں میں اشاعت ہو، اور جو ان کے مخاطب ہیں [illegible] ہماری بہت سی ان کتابوں کے طبقوں میں پہنچیں، جو خاص طور پر ان کی [illegible] زیادہ ضرورت ہے، لیکن ان تک نہیں پہنچ سکی ہیں، جن کا اثر بھی [illegible] زیادہ ہے اور [illegible] کتاب ہیں، دینی خدمت کے طور پر انجام دو، اور اس کام کو ایک مقصد اور ایک اہم دینی خدمت سمجھو، اور تم اس کو ایک اہم خدمت بقدر ضرورت [illegible] اگر تم اس کام کو کرنے کو تیار ہو، اور [illegible] زیادہ خوشی ہوگی، تم اس کا طریقہ سمجھ لو، تم کو دو [illegible] صحیح دینی [illegible] اور ہم کو اس سے زیادہ خوشی ہوگی، تم خود واقف ہو اس حق کو ادا کر سکو گے، جو ہمارا تمہارے اوپر عائد ہوتا ہے، علمی اور [illegible] سے تم خود واقف ہو، [illegible] سال تک تمہارے [illegible] رہ چکے ہیں، یہ ہمارا [illegible] مقام [illegible] ہیں، ان تفصیلات طے کر لو، ان کا فیصلہ ہمارے [illegible] مجلس کا فیصلہ ہے، نصاب کی کتابوں کے متعلق

ان سے بات کر لیجیے، وہ مطبوعات کا ایک ایک دو دو نسخہ اپنے ساتھ لا رہے ہیں،

حاجی صاحب کی معرفت بعض کتب اسلام آباد و کراچی بھجوا دیں،

میرا خیال ہے پہلے "نقوش اقبال" و "مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" کا

ترجمہ اور شائع کیا جائے، پھر "تاریخ دعوت و عزیمت" "ندوۃ العلماء" ارکان اور ... کا

نثار الحق ندوی کا سلام قبول ہو،

دعاگو

ابوالحسن علی

٣٠ ربیع الثانی سنہ

کتابت اور طباعت کا معیار بہت اچھا ہونا چاہیے، جو یہاں سے بہتر

وہاں ممکن ہے،

دیگر خطوط کے لئے ملاحظہ فرمائیں "مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے خطوط بنام فضل ربی ندوی" مطبوعہ مجلس نشریات اسلام کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابو الحسن علی الحسنی الندوی
ندوۃ العلماء - لکھنؤ - الہند

PHONE: 22948
29174
TELE.: NADWA

Abul Hasan Ali Nadwi
DARULULOOM NADWATULULAMA
LUCKNOW – 226007 (INDIA)

عزیز گرامی مولوی فضل ربی ندوی سلمکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ ابھی ابھی عزیزم [illegible] سے ملاقات ہوئی

[illegible]

[illegible]

کئی بار خیال آیا [illegible]

اور [illegible]

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

والسلام
ابوالحسن علی
۳ رمضان [illegible]

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نور اللہ مرقدہٗ کے اپنے قلم سے تحریر کردہ خط کا عکس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجامعة الإسلامية
بالمدينة المنورة
المؤتمر العالمي لتوجيه الدعوة وإعداد الدعاة
٢٤ - ٢٩ / ٢ / ١٣٩٧

۲۳ جمادی الآخرہ ۱۴۰۱ھ

عزیز القدر عزیز گرامی میاں فضل ربی سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

[illegible] مخدوم و مشفق حاجی عبدالرفیق صاحب [illegible] انا للہ وانا الیہ راجعون [illegible]
[illegible] اچانک [illegible] مختلف [illegible] انتقال [illegible]
[illegible] محسوس ہوا [illegible] اچانک پیش آیا [illegible] ہم سب لوگوں کو [illegible]
افسوس ہے کہ کراچی میں ان کی خدمت میں حاضری کا وقت کم ہوا [illegible] ضعف بھی
بڑھ رہا تھا، لیکن [illegible] شفقتیں رہیں [illegible]
[illegible] ہوا [illegible] دہلی میں جب بھی ملاقات ہوئی ہمیشہ محسوس ہوا [illegible]
[illegible] سچی دینداری، بزرگانہ شفقت [illegible]
[illegible] برکت [illegible] اللہ تعالیٰ [illegible] نیک نامی [illegible]
[illegible] زندگی گزاری [illegible] انتقال [illegible]
[illegible] ترکہ [illegible]
[illegible] لیکن [illegible] لکھ رہا ہوں [illegible]
[illegible] اساتذہ [illegible] کی طرف سے توجہ کرو۔
[illegible] عمر میں برکت دے [illegible]
یہاں حاجی صاحب مرحوم کے لیے [illegible] ایصال ثواب کا انتظام کیا جا رہا ہے

والسلام
دعا گو
ابوالحسن علی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Phone { 22046 / 20174 TELE.: NADWA

Abul Hasan Ali Nadwi
DARULULOOM NADWATULULAMA
LUCKNOW-226007 (INDIA)

ابو الحسن علي الحسني الندوي
ندوة العلماء - لكهنؤ - الهند

١٢ ستمبر ٧٨ء

عزیز القدر فضل ربی بارک اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ تم اور مکرمی حاجی عبد الرحیم صاحب اور تمام افراد خاندان بخیر و عافیت ہوں گے۔ رمضان المبارک میں
تم کو ایک مفصل خط لکھا تھا جس میں الحمد للہ ختم کرنے والوں کی تحریر تیار ہو گئی ہے؟ ڈاک سے اصل
بعض مناسب نہیں رہی اب ہے ندوہ کا خیال ہے کہ تم واقعہ رکھتے ہیں ان شاء اللہ جب
چھپ جائے گی تو جلد ہی بھیجی جائیں گی چنانچہ حسب ذیل اشیاء اسکے ذریعہ بھیجی جا رہی ہیں

١- مجلس تحقیقات و نشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ اور مجلس نشریات اسلام ناظم آباد کراچی کے درمیان
مجلس تحقیقات و نشریات اسلام ہند کی مطبوعات کی پاکستان میں طباعت کا قانونی معاہدہ۔
٢- نیا جدید اعمال بطریقہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کے درمیان جن کی طباعت پاکستان میں
مجلس نشریات اسلام کی طرف سے ہو سکتی ہے۔
٣- عالم عربی کا المیہ، کچھ ملت اور بعض رسائل جن کی طباعت ابھی پاکستان میں نہیں ہوئی۔
٤- رسالہ ندوۃ کا الف ب درسی اور اسکے تحریرات ٢٥ عدد (احمد رحیم) پاکستان کو بھیجنے کے لئے
رسالہ مجلہ کی طرف سے شائع کیا جا سکتا ہے۔ مقصد ہے کہ تعلق طلباء مشرق و جنوب اسکے لئے لکھائی
بہ تعداد ١٥
امید ہے کہ تم سرپرست کی طلباء کتاب مشرق کے طلباء لکھنؤ والے آفسٹ کے ذریعہ تم کتاب جلد سے جلد
چھپوانے کی کوشش کرو گے۔ یہاں کے لئے گئے جھے ہیں دقتیں تھیں شاید بہت جلد یہاں ہو سکو
دوبارہ چھپوانے کی نوبت آئے۔ پہلے طلباء نسخے بھیجے جا رہے ہیں۔

تمہاری طرف سے خود بہت تاخیر ہوئی کہ سلسلہ منقطع سا ہے، اتنی تاخیر نہ کیا کرو دل لگا رہتا ہے۔
حاجی صاحب کی خدمت میں بہت بہت سلام۔ سب بچوں کو دعا۔

والسلام
دعاگو
ابو الحسن علی

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

کی چند اہم شاہکار تصنیفات

تاریخ دعوت و عزیمت مکمل
مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش
انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر
منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین
دریائے کابل سے دریائے یرموک تک
تذکرہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ
تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات و احسانات
تبلیغ و دعوت کا معجزانہ اسلوب
مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں
نئی دنیا (امریکہ) میں صاف صاف باتیں
جب ایمان کی بہار آئی
مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت
حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب
عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح
تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک
مطالعہ قرآن کے مبادی اصول
سوانح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ
خواتین اور دین کی خدمت
کاروان ایمان و عزیمت
سوانح مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ

نبی رحمت مکمل
حدیث کا بنیادی کردار
معرکۂ ایمان و مادیت
پرانے چراغ مکمل
ارکان اربعہ
نقوش اقبال
کاروان مدینہ
قادیانیت
تعمیر انسانیت
حدیث پاکستان
اصلاحیات
صحبتے با اہل دل
کاروان زندگی مکمل
مذہب و تمدن
دستور حیات
حیات عبدالحئیؒ
دو متضاد تصویریں
تحفۂ پاکستان
پاجا سراغ زندگی
عالم عربی کا المیہ

ناشر — فضل ربی ندوی —— فون ۶۲۱۸۱۷-۶۲۰۸۹۶

مجلس نشریات اسلام، ناظم آباد مینشن ۱۔ کے ۳۔ ناظم آباد ۱ کراچی ۱۸
اسٹاکسٹ : مکتبہ ندوۃ قاسم سینٹر اردو بازار، کراچی